بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء کھن جلد ۲ نمبر ۳

ماہوار

تمدن

سال نمبر ۸۵

ترقی تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر شیخ محمد اکرام بیرسٹرایٹ لا۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

ماہ قسم اول ۱؎ باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قسم دوم ۸؎ تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ ۴؎

پاکیزہ ٹی اور دلی

مضامین پڑھنے والی بیبیوں نے اکثر پڑھا ہوگا

اور سنا بھی ہوگا کہ عرصہ دراز سے دہلی کے خاندانی اطبا کی زیر نگرانی دواخانہ نورتن دہلی جاری ہے یہ دواخانہ عرب۔ عدن۔ افریقہ امریکہ لندن۔ آسٹریلیا وغیرہ وغیرہ ملکوں میں اپنے مفید مجربات کا سکہ جما چکا ہے دواخانے نے حال میں چند جدید ادویہ و روغن تیار کیے ہیں انمیں سے ایک

روغن دل بہار گیسو دراز ہے

خوبصورتی بڑھانے عجیب چیز بنائی ہے اور اسپر لمبے اور خوشبو والے بال تو غضب ہی ڈھاتے ہیں ہمارا دل بہار دماغ کو خوشبو سے معطر کرتا ہے بالوں میں نرمی اور چمک اور جلد میں مہک پیدا کر دیتا ہے اسکی خوشبو انسان کو از خود رفتہ کر دیتی ہے قیمت عہ

خوشبودار سپاریاں

یہ چھالیہ دانتوں کو مضبوط گلے کو صاف منہ کو معطر کرتی ہے دو چار ڈلیاں کھا لینے سے منہ میں عجیب خوشبو ہو جاتی ہے محفل کا سنگھار ہے قیمت فی ڈبیہ ۳؍ فی درجن عہ

خضاب لاجواب

یہ عرق چند منٹ میں سفید بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر داغ دھبہ نہیں آتا سفر حضر سردی گرمی میں بلا تکلف استعمال ہوتا ہے قیمت فی شیشی معہ برش ایک روپیہ

خمیرہ جواہر والا

دل اور دماغ اور اعصاب و قلب کو قوت دیتا ہے۔ خفقان کو زائل کرتا ہے قوت حافظہ کو بڑھاتا ہے کمزوری اعصاب کو دور کرتا ہے۔ فی بکس ۱۰ تولہ عہ

المشتہر حکیم محمد یعقوب خاں مالک دواخانہ نورتن دہلی۔ بازار فراشخانہ

قفس

عرفجہ کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا۔ کہ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی
روتی تھی و فورِ الم کی وجہ سے اپنے گالوں کو سُرخ کر رہی تھی۔ اور بھرائی ہوئی آواز
میں کہتی جاتی تھی "حسن۔ مرگیا۔ دُنیا کی ہوا اُسے کیوں راس نہ آئی تو کیا مجھ
سے ناخوش ہوگیا۔ یا خوشی کی وجہ ؟ نہیں! نہیں! وُہ زندہ ہے! اور ہے!
اوسکی خبرِ مرگ غلط! اور بالکل غلط!"
اسکے بعد ناقابل برداشت رقت نے اوسکی آواز بند کردی۔ اور وہ پھر
رونے لگی۔ عرفجہ یہ تمام ماجرا کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اور ششدر و حیران تھا دلمیں،
اس نے شرم و حجاب بالائے طاق رکھدیا۔ خیر جگہ! نئے آدمی، سُنیں گے تو
کیا سمجھیں گے۔ اچھا اب اس سے تبادلۂ خیالات کی کوئی صورت ہونی چاہئے
مگر اوسکا رونا تو تھمے، یہہ منصوبہ بچار کر اس نے سمیہ کی طرف ایسے تیوروں
سے دیکھا۔ گویا اُس کے حرکات اوسکی نظر میں خفیف اور سخت قابل ملامت ہیں۔

اور کہنے لگا "تیرا خیال ہے کہ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں مگر تو خوب سمجھتی ہے کہ جھوٹ کی قطعاً مجھے عادت نہیں، اسے یقین جان کہ حسن کا چراغ زندگی مدینہ سے نکلتے ہی خاموش ہو گیا۔ اب وہ کسی طرح مر کر جی نہیں سکتا۔ اور اسکے ساتھ اپنی جان کو ہلاک کرنا منظور ہے تو یہ اختیاری امر ہے۔"

اِس طنزیہ کلام کو سُنکر سمیہ کی طبیعت قابو سے جاتی رہی اور کڑی زبان میں "بے شک مجھے بھی اب موت ہی چاہیئے۔ کیونکہ حسن کے بعد جینے کا اب مجھے کوئی مزہ نہیں، فریب و دغا سے اوس کی جان لینے والوں کو خدا اپنے پنجۂ غضب میں گرفتار کرے، جس طرح ایک بیگناہ کے خون میں تو نے اپنے ہاتھ آغشتہ کیے ہیں کیوں میرا کام بھی جلدی سے نہیں کام کرتا۔ میں اپنا خون تجھے بحل کرتی ہوں بشرطیکہ تو میری مشکل کو جلد آسان کر دے۔" اتنا کہنے کے بعد پھر سیل اشک اوسکی آنکھوں سے رَواں ہو گیا اور وہ زار زار رونے لگی۔ عرفہ نے اپنے منصوبہ کا برعکس نتیجہ دیکھکر نہایت و دلدہی کے لہجہ میں مخاطب کرکے کہا۔ "جانِ پدر تو یہ یقین کر کہ حسن کو میں نے اپنے ہاتھ سے نہیں قتل کیا البتہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے اِس نتیجہ کو پہونچا۔ اب رونے سے اور فضول اپنی جان کھونے سے حاصل، شکر کر، کہ اوسکی حیات نے قبل اس کے اوس سے بیوفائی کی کہ تیرے اوسکے درمیان کوئی رشتہ قائم ہو، ورنہ آج جو عزت تجھے حجاج کی نظروں میں حاصل ہوگی وہ اُس صورتمیں.........

سمیہ (نہایت برہمی اور آشفتگی سے قطع کلام کرکے) یہ حجاج روسیاہ کون؟ میرے درمیان اوسکا کیا دخل؟ میں حسن کے سوا کسی کی صورت تک نہیں دیکھ سکتی۔ وہ میرا حبیب تھا۔ اور اُس سے زندگی و مَوت کا تعلق تھا۔ اگر وہ مر گیا تو اُس سے میرا تعلق منقطع نہیں ہوا۔" پھر کچھ سوچکر، اور آنکھیں بند کرکے" نہیں۔

حسن مرا نہیں، وہ زندہ ہے۔ البتہ وہ ایسی جائے امن میں ہے کہ تجھ سے ظالموں کا دستِ تظلم اب اُسے کوئی گزند نہیں پہونچا سکتا۔

عرفجہ۔ اچھا یوں اُسکے قتل ہو جانے کا یقین نہیں کرتی۔ اوسکی لاش دیکھکر تو یقین لائے گی۔

یہہ بات سُنتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔ اور کہنے لگی۔

"اُس کے دشمنوں کی لاش میں دیکھوں، اے خالق و مالک تیری ہی فریاد ہے اے ظالم! کاش! تو اس کے ساتھ میری جان بھی لے لیتا۔ اور اس تلخکامی کی زیست سے مجھے رہائی دلاتا۔ تو نے اپنے محسن کے جان لینے میں جب دریغ نہ کیا جسنے تجھے اور تیرے اہلِ بیت کو پنجۂ موت سے چھڑایا تھا۔ تو میرے قتل میں کیوں باک کرتا ہے۔ "وَیْلٌ لَّکَ مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ"

عرفجہ مغلوب الغضب اور تُند خو جن وہم مصالح کے لحاظ سے ابتک ضبط کو کام میں لا رہا تھا آخری کلمات توبیخ سنکر باوجود وہی مصلح اب بھی قابل حاظ جنے کے بھی ضبط پر قدرت نہ رکھ سکا۔ سخت پیچ و تاب کھا کے تھر تھراتی ہوئی مگر جبار آواز میں کہا "خاموش! نابکار! باپ سے مخاطبت کا یہی طریقہ ہے۔ واللہ واللہ اگر فرزندی کی حُرمت اور تیری بے بسی کا خیال نہوتا تو ابھی تیرا قصہ پاک کر دیا جاتا خیر! ایک مرتبہ اور تجھے اپنے نیک و بد انجام کے سوچنے کا موقعہ دیا جاتا ہے اس کے بعد بھی اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آئی تو تو ہے۔ اور یہ خنجر" آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے اُس نے اپنی کمر سے لگے ہوئے خنجر کو کھینچکر اسکے پھل کو قصداً جنبش دی۔ جو برق سا چمک رہا تھا مگر اس سے بجائے اسکے وہ کسی قسم کا خوف یا اثر ہو اوس نے پھرتی سے اپنے وحیلہ دگرتی اکا تکمہ کھولکر کہا بیشک گویا میں موت سے ڈر جاؤنگی۔ تجھے قسم ہے کہ اس خنجر کو میرے سینہ میں پیوست کر کے اسکا اور

تمہارا دونوں کا کام پورا کر دے کیونکہ محسن کے بعد دنیا اب میرے لیے بمنزلہ دوزخ کے ہے۔ اور اوسکا عذاب زندگانی ہے۔ اس سے اگر کوئی نجات ہے تو وہ موت ہے" یہہ کہتے ہوئے وہ سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ دماغ اور دل نے غیر معمولی تاثرات نے اوسکے چہرہ پر بھی حُمکس اور تھکن کے آثار نمایاں کر دیے تھے۔

عزمجو نے پھر درشت لہجہ میں کہا "کیوں؟ جو مشقتیں میں نے تیری غور پرداخت میں اُٹھائیں اور جو تکلیفیں برداشت کیں۔ اب برابر ہونے پر مجھ سے اوسکا یہی صلہ ملنے والا تھا۔ کمبخت! بے شک تو گردن زدنی ہے۔ اگرچہ تیرے ناپاک خون سے میں اپنے ہاتھ ملوث نہ کرونگا مگر انواع و اقسام کے اذیتیں جنکا آج تک تیرے سوا کسی پر امتحان نہوا ہوگا وہ جلد تر تیری زندگی کا خاتمہ کر کے رہیں گے" بات پوری کرکے بلند آواز سے "قنبر" اِدھر آنبان سے یہہ لفظ نکلا تھا کہ سفی الفور ایک شب منظر حبشی غلام سامنے آموجود ہوا۔ جس نے گردن جھکا کر نہایت انقیاد کے لہجہ میں کہا "لبیک یا مولائی" (دیکھئے اے آقا غلام حاضر ہے) جسے حکم دیا گیا کہ سمیہ کے ہاتھ پیر خوب کسکر رسیّوں سے جکڑ دیے جائیں، اور کہا کہ "اس رُوگردانی و انحراف کی پاداش میں آیندہ قطعاً کوئی ملائم برتاؤ اس کے مقابلہ میں رَوا نہ رکھا جائے گا" یہہ حکم سُنتے ہی قنبر سمیہ کی طرف تعمیل حکم کے لیے بڑھا۔ اُسے قریب آتا دیکھکر سمیہ کے دل و دماغ میں غیرت و حمیت کا ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ جس نے اوس میں قوت اور قوت کے ساتھ سیماب واری پیدا کر دی۔ وہ اپنی جگہ سے ایک فوری جست کے ساتھ دور جا پہونچی اور ڈپٹ کر کہا "دور ہو! سامنے سے! منحوس خبردار!

قریب آیا،" مگر غلام نے اِس کی جھڑکی کو نہایت لاپروائی سے سُنا، اور اپنی جیب سے رسّی نکالتے ہوئے جو پہلے سے شاید اِسی خیال سے رکھ لیگئی تھی دوبارہ اُسکی طرف بڑھا۔ اور اُس کے دونوں ہاتھ تھام لئے جن کے چھڑانے کی غضبناک دماغی قوت کے ساتھ اوس نے کوشش کی۔ مگر آخر عورت ذات تھی قوی الجثہ حبشی غلام سے کسی طرح اوس کی پیش نہ گئی۔ اور بالآخر بہزار خرابی اُس نے اوس کے ہاتھوں کو رسّیوں سے جکڑ ہی دیا۔

جسپر غریب سمیہ بہت چیخی چلّائی۔ ہاتھوں کو باندھ کر اوس کے جسم کو بھی وہ خیمہ کی چوب سے باندھنا چاہتا تھا کہ یہہ اوسکی گرفت سے آزاد ہوکر بھاگی۔ مگر بدحواسی میں خیمہ کی چوب کی اِس زور سے ٹکر کھائی کہ گر کر بے ہوش ہوگئی۔ غلام کو پورا موقعہ ہاتھ آیا۔ اور اُس نے خوب طرح سے اوسکا سارا جسم رسیّوں سے کسکر باندھ دیا۔

(۳۹)

سب ساتھ والے اس تمام ماجرے کو سکوت اور حیرت سے دیکھ اور سُن رہے تھے۔ مگر عرفجہ کی سخت مزاجی کی ہیبت ایسی غالب تھی کہ کسیکو قریب جانے یا دخل دینے کی جرأت نہوتی تھی۔ باانیہمہ امۃ اللہ سے صبر نہوسکا۔ وہ خیمہ کے قریب ایک خرمہ کے درخت کی آڑ سے تمام کیفیت دیکھنے اور سُننے لگی۔

یہانتک کہ جب خیمہ کی چوب سے سمیہ کے ٹکرا کر گرنے کی آواز آئی۔ [illegible] پھر اوس کے بعد بالکل خاموش ہوگئی۔

[illegible] کے بہری فرمائش [illegible] پہلے ہی سُن چکی تھی۔ اب اوس سے کسی طرح

صبر نہو سکا، جوشِش جان نثاری سے بے چین ہوکر، اور عرفجہ کے خوف و دہشت کو تھوڑی دیر کے لئے بالائے طاق رکھکر وہ در آتی ہوئی خیمہ کے اندر چلی گئی۔ اور ہاتھ جوڑکر نہایت الحاج کے ساتھ عرفجہ سے کہنے لگی۔

متعجب سے ہے کہ حضور نے میری سیدہ (مالکہ) کو عدول حکمی کا مرتکب سمجھ کے تعزیر فرمادی، حالانکہ یہہ جسارت صاحبزادی سے صرف ناز پروری اور بے نہایت شفقتوں کی بنا پر ہوئی۔ جو صرف بچپن کی ایک معصومانہ اَدَا ہے، بھلا یہ ممکن ہے کہ آپ کسی امر کو چاہیں، اور اُس سے اونکو واقعتہً انکار ہو۔ یا تعمیل میں عذر، مگر ہر وقت انسان کا دماغ یکساں نہیں رہتا۔ ایسا ہوجاتا ہے کہ بعض وقت سیدھی سی بات کا اثر انسان کے خیال پر اُلٹا پڑتا ہے، جس امر خاص کے متعلق حضور کو اسقدر برہمی اور غصہ وگرمی کی زحمت گوارا فرمانی پڑی، لونڈی سے ارشاد فرمائیں، اگر انکار کی نوبت آئی تو اِس کنیز کا سَر قلم کر لیا جائے۔

سمیسہ پر جبر و سختی کرنے سے عرفجہ کا منشاء یہ تھا کہ وہ مخوف ہوکر اور رُعب میں آکے حجاج سے عقد پر راضی ہوجائے۔ تاکہ حجاج کو کوشاد کامی و مقصدوری کے منزل پر پہونچاکر عرفجہ کو اوس سے اپنے منافع ذاتی کا خراج وصول کرنے کا موقعہ ملے

کسی پچھلے باب میں ہم ابھی بتا آئے ہیں کہ عرفجہ طبعاً نہایت بدطینت و بدسرشت، جاہ دولت، زرپرست، اغراض ذاتی پر حقیقی عزت و وقعت کو قربان کرنے والا واقع ہوا تھا، پس حجاج سے رشتہ جوڑکر

اور ایسے ناشدنی اور منحوس متنفس کے ناپاک ذوق وشوق پر اپنی ماہ طلعت، عقل و ہنر میں عدیم المثال لڑکی کی بھینٹ چڑھاکر وہ متوقعہ فتوحات سے جلد متمتع ہونا چاہتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ حجاج سمیہ کا نادیدہ مفتون وشیدا ہے۔ پس اوس کی خریداری میں حجاج مہر کے نام سے آخری سوال المضاعف کرکے اندازہ وشمار سے افزوں رقم کی پیشکش میں بھی دریغ نہیں کرے گا مگر سمیہ پر اسوقت علانیہ جبر و سختی میں اُسے خیال مانع آتا تھا، وہ یہ کہ مدینہ کے اونچے اور محترم گھرانوں کی ذی وقار خواتین اوسپر خاص لطف وکرم فرماتی ہیں، اونھیں سمیہ پر کسی جبر و سختی یا دباؤ پڑنے کا حال معلوم ہوا، تو یہاں سے حریم خلافت تک اس بات کا غلغلہ بلند ہوئے بغیر نہ رہیگا، اور اوسوقت اچھے اور برے دونوں قسم کے نتائج کا احتمال ہے۔

ادھر حسن کی ریشہ دوانیوں کا بھی کھٹکا تھا، مگر حسن کی ذات کا کانٹا اوس کے قتل کی سازش کو کامیاب سمجھنے کی وجہ سے نکل گیا تھا، یہہ بھی خیال تھا، حجاج سے سمیہ کا تنفر اس واقعہ سے یقیناً اوس حد کا نہ رہ جائیگا +

غزل

عالی ندوی

یاد حق چھوڑ کے اب عشق بتاں کی ٹھہری — دل بیتاب کہاں سے یہ کہاں کی ٹھہری

جب خموشی نے بہت بات بگاڑی اپنی — تم پاس سے کچھ حسن بیاں کی ٹھہری

اپنے کوچے سے وہ اٹھوائیگا مجھکو ترسلے — دل بے صبر اگر آہ و فغاں کی ٹھہری

در بتخانہ پہ خوش ہوکے لگایا بستر — ہم جو کعبے سے پھرے یاد بتاں کی ٹھہری

ظرف دیکھے تو بہت اسنے بلانوشوں کے — آکے باسط پہ نظر پیر مغاں کی ٹھہری

مثنوی ناز و نیاز

عشق کی مجھسے عزیزو پوچھو کچھ بات — عشق سے بامزہ ہے موت و حیات

عشق میں لوگوں نے جانیں دی ہیں — تلخیاں عشق کی کیا شیریں ہیں

عشق سمجھو تو عجب ہے کچھ چیز — درد و داغ اسکے بھی کتنے ہیں عزیز

عاقلوں سے ہے بہت عشق نفور — عقل سمجھے اُسے کب ہے یہ شعور

یار اس کے سبھی سودائی ہیں — ساکن کوچۂ رسوائی ہیں

پیرہن کے نہیں پابند اسیر — کفنی پھاڑتے ہیں اس کے فقیر

کچھ لباس ہی نہیں زیبائے عشق — خاک ہے جامۂ رعنائے عشق

عشق کا مرتبہ ہے بسکہ بسیط — کب قیاس و خرد اسپر ہوں محیط

ہے نہ جینا ہی حلاوت کے ساتھ — مرگ بھی اس میں ہے لذت کے ساتھ

عشق کا رنج ہے راحت کا رشک — اسکی تلخی ہے حلاوت کا رشک

ایک ہے دل میں چھپا رکھنے کی گوں — ایک چھاتی سے لگا رکھنے کی گوں

اُن سے جو وحشی ہیں مانوس ہے عشق — آتشِ خرمنِ ناموس ہے عشق

انکا سامان ہے بے سامانی — تن پہ ہے پیرہنِ عریانی

کارپرداز جنوں ہے اسکا — محرم راز جنوں ہے اسکا

ربط رکھتا ہے دیوانوں سے — راہ اِسے چاک گریبانوں سے

جسنے کچھ بھی اسے پہچانا ہے — وہ سڑی خبطی ہے دیوانہ ہے

افسانۂ عبرت!

ایک یتیم بچہ اپنے باپ کی قبر پر

ایکدن گورِ غریباں میں ہوا میرا گذر
دل کے داغ ابھر آئے دیکھے بساطِ خاک پر

ہنس رہی تھیں جا بجا ٹوٹی ہوئی قبریں جہاں
عالمِ اسباب کی نیرنگیوں کو دیکھکر

آ رہی تھی ہر طرف سے بُو چراغِ کشتہ کی
اُف اعاذ اللہ وہ عالم کہ ٹکڑے ہو جگر

اُنکی قبروں پر کہ جو تھے مجلس آرائے وجود
شمع روشن تھی نہ تھی اک چادرِ گلہائے تر

رو رہی تھیں صرف ناکامی پہ اُنکی حسرتیں
کوئی ماتم کرنیوالا تھا نہ کوئی نوحہ گر

ہر طرف تھا ایک ہیبت ناک عبرت کا خروش
اک ادائے خامشی چھائی ہوئی تھی شمع پر

ہُو کا عالم اور بھیانک رات اور وہ بیکسی
ہلگیا دل عالمِ گورِ غریباں دیکھکر

ایک سناٹا سا میرے دلمیں پیدا ہوگیا
اُف یہ وحشتناک قبریں اور یہ منظر الحذر

بیکسی کھینچے لیے جاتی تھی مجکو اُسطرف
گونجتی تھی پردۂ ظلمت میں خاموشی جدھر

خونِ دل بہنے لگا آنکھوں سے دھیان آیا مجھے
دفن اسی عبرت سرا میں ہے مرا مشفق پدر

یہ خیال آتے ہی دوڑا ایک تربت کی طرف
فاتحہ پڑھنے کو تنہا۔ خاک برسر۔ نوحہ گر

دیکھے ذرات کو دی جذبِ دل نے زندگی
خاک میں جنبش اُدھر تھی ہل رہا تھا دل اِدھر

دونو کانوں میں بھرا تھا نغمۂ سوز و گداز
دونو آنکھوں سے رواں تھا دجلۂ خونِ جگر

ننھے ننھے ہاتھ اپنے قبر پر رکھے ہوئے
پڑھ رہا تھا سورۂ الحمد میں با چشمِ تر

دفعتاً اُمڈا جو دل رو رو کے میں کہنے لگا
مجھسے اے بابا خفا تم ہوگئے کیوں اسقدر

کیا سبب ہے کونسی مجبوریاں درپیش ہیں
اتنی رات آئی ہے اور اب تک نہیں چلتے ہو گھر

٢

سو رہے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں پرند ۔ زمزمے کرتے نہیں اسوقت مرغانِ سحر
ہائے یہ عالم کہ دنیا کر رہی ہے سائیں سائیں ۔ اور اکیلا رو رہا ہوں میں تمہاری قبر پہ
ہر طرف سے یہ درندوں کی صدائیں ہولناک ۔ یہ ڈرونی رات یہ قبریں یہ جنگل پُر خطر
تم نے چھوڑا تھا کبھی تنہا مجھے ایسی جگہ؟ ۔ گود میں لیلوٹ مجھے معلوم اب ہوتا ہے ڈر
آسماں پر ایک سناٹا سا ہے چھایا ہوا ۔ ڈوبتے تاروں سے پیدا ہیں کچھ آثار سحر
ڈوبتے تارو! ذرا مجکو تمہیں تعلیم دو ۔ ضبط میں کیونکر کروں آنسو یہ عالم دیکھکر
اے ہوائے سرد کے جھوکو! تمہیں کہتے چلو ۔ طول غم میں ٹھنڈی سانسیں کسطرح ہوں مختصر
خاک قبرستاں گواہی دے تو ہی اس بات کی ۔ میرا دل ویران زیادہ ہے کہ یہ تیرا کھنڈر؟

تیرا بابا میری ایسی کٹ رہے ہیں رات کے سب ۔ اب بھی رحم آتا نہیں ہے تمکو میرے حال پر
شمع و گل ممکن نہیں بابا بہت نادار ہوں ۔ دل کی آہیں شعلہ زا ہیں خونفشاں ہے چشم تر
تازہ گل لاؤں کہاں سے آہ! تربت کیلئے ۔ پھول سے رخسار میں رکھے ہوئے ہوں تم پہ
اے مرے مجبور بابا اے ساکن ایوان خاک ۔ اس خرابہ میں بھلا کسطرح کرتے ہو بسر
میں ہوں اے بابا وہی پروردۂ آغوش ناز ۔ جسکے سینہ پر جسے سوتے تھے اپنے رات بھر
کیوں کفن میں منہ چھپایا میں بڑی منحوس ہوں ۔ دیکھتے تھے میرا منھ تم اُٹھکے ہنگام سحر
منتوں پر منتیں تھیں میرے جینے کیلئے ۔ تھیں دعاؤں پر دعائیں تا نہ لگجائے نظر
منع کر دیتے تھے فوراً تم اشارہ سے ہمیں ۔ غیر الفت سے بھی کوئی جھڑک دیتا تھا اگر
اب یہی ہم ہیں کہ مانگیں بھی تو مل سکتا نہیں ۔ مرگئے تم جب سے ہم پر ہے حقارت کی نظر
چلوؤں خون آپکا بڑھتا تھا بابا تونے مری ۔ گود میں مجکو لیے پھرتے تھے آپ ٹوہ پہر
خیر اے بابا ذرا یہ بات بھی رکھئیے گا یاد ۔ آج بابا تو ہم سے لیتے نہیں کچھ آپ اگر
روٹھکر اٹھا ہی تھا چلاتے کے بین روتا ہوا ۔ قبر سے آواز آئی اے مرے نور نظر
میں فدا تجھ پر اے یہ کیا غضب تم نے کیا ۔ ایسے ویرانہ میں آتا ہے کوئی جانِ پدر

اے مرے نازوں کے پالے میں عجب عالم میں ہوں
گود میں لیکر تجھے کسطرح پہونچاؤں گھر

آہ اے معصوم بچے کیا کروں مجبور ہوں
تیری ان باتوں سے ٹکڑے ہوگئے قلب و جگر

ہائے ظالم موت تو نے کیا ستم مجھ پر کیا
کتنے بچے ہوگئے یوں تیرے ہاتھوں دربدر

تو یہاں آیا کسی نے تجھکو دیکھا بھی نہیں
کتنے مرتے ہی ہوئے ایسے اعزا بیخبر

قوم بھی تیری خبر گیری نہیں کرتی ہے کیا
بسر یہاں ہوتی ہے کیا اب فقر و فاقہ میں بسر

ہائے دنیا سے میں کیا کیا حسرتیں لیکر اٹھا
تیرا سہرا بھی نہ دیکھا میں نے اے لخت جگر

سخت مجبوری ہے بیٹا ہم کہاں اور تم کہاں
گھر سدھارو گھر سدھارو وقت ہے یہ پرخطر

میں بھی زندہ ہوں خدا تجھکو اگر زندہ رکھے
شاد رہ تو اے مرے نخل تمنا کے ثمر

جا مری جان جا بس اتنا روح کو صدمہ نہ دے
پھر کبھی آنا. مگر تنہا نہ آنا اے پسر

یاد رکھ میری وصیت اے نہال آرزو
قوم کی حلقہ بگوشی میں بسر کر عمر بھر

ہے تری وابستگی اُس سے مرا قومی شرف
چھوڑنا دامن نہ اُنکا وہ چھڑائیں بھی اگر

تیری ذلت بھی اگر ہو اُسکو عزت جاننا
زندگی کرنا بہر نوع انکی خدمت میں بسر

جتنی باتیں میں نے اعجاز محبت سے کہیں
قوم سے کہنا مری جانب سے اے نور نظر

ہو عزیز نکتہ پرور کی زبانی یہ پیام
وہ بہت روتا ہے خلوت میں تمھارے حال پر

سبکو پڑھ کر تم سنا دینا مرا یہ خط شوق
مجتمع ہو قوم جس جلسہ میں ایکبار پدر

السلام اے ساکنان بزم ہستی السلام
اُس جگہ ہم ہیں کہ تم سے کر نہیں سکتے کلام

تھے کبھی اس بزم میں تم سب سے سرگرم سخن
ہوگئے ہیں آج مجبوری سے ہم بمہر دہن

کس طرح آکر ملیں ہم آ نہیں سکتے یہاں
دور ہیں تم سے بہت اب ہم کہاں اور تم کہاں

ہو مبارک تمکو اس دنیا کا منظر دیکھنا
اب کبھی [illegible] سے تمکو [illegible] دیکھنا

ساز و برگ عالم ہستی [illegible] سبکے کیا نہیں
[illegible]

دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگ دنیا ہو گیا — ہائے کیا سمجھے ہوئے تھے ہم یہاں کیا ہو گیا
خواب تھا ان دوستوں کا جلوہ برق آفریں — آنکھ جب کھولی تو دیکھا وہ کہیں ہیں ہم کہیں
آہ! وہ لختِ جگر وہ تازہ نخلِ مدعا — چھُٹ گیا ہے مجھ سے اور میں ہو گیا اس سے جدا
اب یہ ہدیہ آرزوئے نیکنامی میں دیا — اپنا فرزند آپکو میں نے غلامی میں دیا
باعثِ آرامِ جاں۔ لختِ جگر دلبند تھا — میں تھا پیکر اور میری روح یہ فرزند تھا
مَیں جُدا دل سے ہوا مجھ سے جُدا دل ہو گیا — دفعتاً کیسا یہ پردہ آ کے حائل ہو گیا

میرے رشتے سے بھتیجا ہے مگر سمجھو غلام
اس سے زائد کچھ نہیں کہنا ہے مجھکو والسّلام

عدالتِ علی

مرزا محمد ہادی عزیز

غلام کون تہا؟

ایکدن دار القضا میں آگئے دو مستغیث — عبد آقا کو بتاتا تھا یہ ہے میرا غلام
اور آقا مدعی اسکا یہ میرا زر خرید — دونو دعووں پر گواہوں کا نہایت ازدحام
محوِ حیرت ہو گیا دار العدالت میں ہر ایک — حکم فرماتے ہوئے دونو کو یہ مشیرِ انام
"سر نکالو اپنے دار الشرع کی کھڑکی سے تم" — امرِ حق ظاہر ہوا جاتا ہے اب بین الانام
کہکے یہ قنبر سے پھر ارشاد فرمایا کہ ہاں — عبد کی گردن اُڑادے سے تیغِ بے نیام
تو لگر تلوار قنبر نے بڑھایا جب قدم — کھینچکر جلدی سے گردنکو نکل بھاگا غلام
سرنگوں آقا رہا اِک شانِ استقلال سے — جس سے ظاہر ہو گیا تہا اوسپر کا اتہام

اِس قضیہ کی حقیقت پر نظر ڈالیں عزیز
جنکو علم النفس سے دنیا میں ہے اکفی دق تمام

میرن صاحب

(۱)

یوں تو مرزا نوشہ کا زمانہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی شمع شب رفتہ کی طرح گل ہوگیا، مگر کل تک اُس اُجڑی ہوئی محفل کی دو چار صورتیں موجود تھیں۔ ان صحبتوں اور مجلسوں کو درہم وبرہم ہوئے زمانہ ہوچکا مگر میر مہدی مجروح اور میرن صاحب کے دم سے اُس دور کی یاد پھر تازہ تھی۔ سو میر مہدی مجروح کو رحلت کئے آج چھ یا سات برس ہولئے اور ۲۹ر جنوری ۱۹۱۲ء جمعہ کی صبح کو میرن صاحب بھی راہی ملک بقا ہوئے اور انکے ساتھ ہی مرزا اسداللہ خاں غالب کے زمانہ کا دفتر بھی طے ہوگیا۔ مرزا کے ہم جلیسوں میں سے ممکن ہے ابھی اور لوگ زندہ ہوں اور یوں تو جناب مولانا الطاف حسین[1] حالی صاحب کی ذات مغتنمات میں سے ہے اور مرزا کی یاد اُنکے دم اور یادگار غالب سے قائم ہے۔ مگر میرن صاحب کہاں۔ جہاں اُردو کے چرچے ہیں وہاں غالب بھی موجود ہیں اور جو غالب کے کلام سے آشنا ہیں وہ میرن صاحب کے نام سے لاعلم نہیں۔ جب تک اُردوئے معلیٰ کے مکتوبات باقی ہیں میرن صاحب کا نام بھی باقی رہے گا۔

میرن صاحب صرف مرزا کے ہم جلیس ہونے کے لحاظ سے ہی تبرک نہ تھے بلکہ اسکے علاوہ غدر سے پہلے کے بزرگوں اور قلعہ کے لوگوں کا بھی نمونہ تھے۔ وضع قطع۔ بات چیت۔ حسنِ اخلاق۔ آداب صحبت غرضکہ ہر لحاظ سے وہ اُس گئے گذرے زمانہ کی یادو تھے۔ بات بات میں وضع کی

[1] افسوس مولانا حالی نے بھی رحلت فرمائی

پابندی اور ہر کلمہ میں بات کا پاس۔ صورت شکل میں ۔ یہی کسی زمانہ میں
نہایت خوبرو وجیہ نوجوان ہونگے جس کے آثار آخر دم تک انکے چہرہ
سے عیاں تھے۔ نقشہ و نگار نہایت سلیس اور جبین کی فراخی شرافت کی
شاہد۔ آنکھ بڑی اور خوبصورت تھی۔ رنگ کبھی کھلا ہوا ہوگا مگر اب بوجہ
ضعیفی اور ہجوم امراض سانولا ہوگیا تھا۔ پرانی وضع کے مطابق ڈاڑھی چڑھی
رکھتے تھے۔ قلعہ کے قطع و برید کا انگرکھا زیب تن۔ سر پر گول سوزنی
کی یا کمرخی ہوئی ٹوپی۔ اور پیرہن ہمیشہ حاشیہ دار سلیم شاہی جوتا۔ کاہی
انگرکھے پر صدری۔ سید ہا تنگ پائجامہ۔ اور یا تو کندھے پر ایک بڑا سا
رومال۔ یا بغل میں پرانی وضع کے مطابق دوپٹہ اور اکثر ہاتھ میں چھڑی
ہوا کرتی تھی۔ اس آخری زمانہ میں ضعیفی سے کمر جھک گئی تھی۔ مگر اللہ رے
پابندی وضع اگر لال دروازہ سے تیسرے چوتھے کا چوڑیوالوں کا پھیرا تھا
تو وہ نہ ناغہ ہوتا تھا۔ اور اگر دوسرے تیسرے روز کا مٹیا محل کا قاعدہ
تھا تو اسمیں نہ فرق آتا تھا۔ ایسا پاس وضع اس زمانہ میں عنقا ہے۔ جو
راہ ورسم دوستوں سے تھی اس میں بل نہ آنے دیتے تھے اور جس
محبت و الفت کے عزیز مستحق تھے اسمیں کوتاہی نہ ہوتی تھی۔ جس قاعدہ
اور قرینہ کے اول دن سے پابند تھے اس میں سر مو فرق نہ ہونے
پاتا تھا۔

اس زمانہ کے چھچوری مزت پھرت اور خسیب و روز کی توچل میں آیا سے
بے حد نالاں تھے۔ اور شاکی تھے کہ اس زمانہ کے تعلیم نہ بڑے کا
ادب سکھائے نہ چھوٹے کا لحاظ۔ لوگوں کی کم بضاعتی اخلاق اور زمانہ
کے مصنوعی طمطراق سے قطعی ناخوش تھے۔ اور اپنے زمانہ کے

خلوص پابندیٔ وضع۔ اور صدق دلی کے نوحہ گر۔ کہا کرتے تھے۔
"بھائی اب وہ زمانے کہاں۔ اور اب وہ باتیں کہاں۔ نہ وہ دلّی ہے
اب اور نہ وہ لوگ ہیں۔ غدر سے پہلے یہ دہلی تھوڑی تھی جو آج ہے۔
اسے لو وہ اب چاندنی چوک میں نہر کہاں ہے۔ اور وہ حوض کہاں ہے
جس کی جگہ اب وہ تمہارا گھنٹہ گھر ہے۔ پھر وہ صحبتیں کہاں اور وہ پہلے
لوگ اور انکے اخلاق کہاں" حقیقت تو یہہ ہے کہ میرن صاحب کی گفتگو
سُنکر مرزا کے زمانہ کی روح تازہ ہوجاتی تھی اور نہ صرف اس زمانہ کا نقشہ
آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا بلکہ ان لوگوں کی بات چیت کا بھی مزہ آجاتا
تھا۔ صد حیف آج میرن صاحب بھی فسانہ ہو گئے۔ مگر کون رہا ہے اور
کون رہجائے گا۔ مگر انکے ساتھ ہی اُس پُرانے زمانہ کی طرز تعلیم کی حلاوت
اور چاشنی بھی اب ختم ہے۔ اس زمانہ میں نہ وہ سادگی و خلوص ہے
اور نہ وہ لب و لہجہ۔ اِدھر تو غیر زبانوں اور باہر کے لوگوں کا میل ہوا
اُدھر جدید تہذیب اور نئی روشنی کی عنایت سے جو رہی سہی باتیں تھیں وہ
بھی عنقا ہو گئیں جب کبھی جدید ترقی و تہذیب کا ذکر آتا تھا تو اکراہ سے
کہا کرتے تھے کہ ہاں ہوگی۔ باقی یوں اب ریل اور برقی روشنی اور
برقی تار وغیرہ کے عادی ہو گئے تھے۔ بالعموم میرن صاحب کی باتوں
میں ایک بھولاپن ہوتا تھا جو بدقسمتی سے اس زمانہ کے بچوں میں بھی
مفقود ہے۔ اور جو اس دور کے لوگوں میں عام طور پر پایا جاتا تھا۔
جب کبھی غالب کا ذکر آجاتا تھا۔ نہایت ادب سے نام لیتے اور
ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر سفلہ پسندیٔ زمانہ کے ہمیشہ شاکی تھے ذاتی تعلقات
کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے عزیز تو عزیز وہ عزیزوں کے دوستوں

اور دوستوں کے عزیزوں سے بھی وہی خلوص کا برتاؤ رکھتے تھے۔ اور اگر کسی اس زمانہ والے میں پرانی اخلاق یا حسنِ آداب کی چھینٹ بھی پاتے تھے تو خاص ملاطفت و اُنسیت سے پیش آتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ مایۂ فی زمانہ گراں ہے۔

مرزا کی دوستی پر بجا ناز تھا۔ اور مرزا کے خطوط حرزِ جاں تھے۔ خود بھی شعر و سخن سے خاص شوق تھا اور شعر کہتے بھی تھے۔ مگر بجز انکے احباب خاص کے اور کسی نے نہ آجتک انکا کلام دیکھا نہ سُنا۔ مگر انکے خطوط میں ضرور مرزا کا طرز نمایاں تھا اور روشِ تحریر میں اُردوئے مُعلیٰ کی چاشنی موجود تھی۔ انکے نبیرہ سید محمد رؤف علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا دہلی پر علمی دنیا کا فرض ہے کہ وہ میر صاحب کے خط اور انکے کلام کے ذخیرہ سے دنیا کو محروم نہ رکھیں۔ نیز انکے نانا صاحب مرحوم کے متعلق جو بھی قلم سے نکلیگا قابل قدر ہوگا۔

(۳)

گذشتہ سال جب میر صاحب زندہ تھے ایک دن حسنِ اتفاق سے وہ سید محمد رؤف علی صاحب کی علالت کے زمانہ میں نواسے کی خیر صلاح کو چوڑیوالوں آنکلے اور میں بھی اس وقت وہاں معمول کے موافق موجود تھا۔ اُس دن کے بعد پھر مجھے قدمبوسی حاصل کرنی نصیب نہ ہوئی جو قلق مجھے تا زیست رہیگا اور وہ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس دن ارادتاً مینے مرزا کا ذکر چھیڑ دیا اور ارادہ کر لیا کہ آج جو لفظ انکی زبان سے نکلیگا قلم بند کروں گا۔ کیونکہ ہر لفظ بیش بہا ہوگا اور یہ خود شمعِ شب رفتہ ہیں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں انکی زندگی کا بھروسہ

نہیں جو بھی حاصل ہوجائے وہ غنیمت ہے۔ اور بلاکسی بات کے چھیڑے
وہ خود کبھی ہرگز ایک لفظ مرزا کے متعلق یا دلی زمانہ کے متعلق اپنی زبان
سے کہنے والے نہ تھے۔ خیر جو کچھ انھوں نے اس دن اپنی زبان سے
کہا میں نے قلمبند کرلیا اور ذیل میں موجود ہے۔ مگر صد ہزار افسوس
کہ یہ معاملہ مکمل نہ ہوا اور آج ادھورا ہی طبع ہوگا۔ اِدھر آنکی علالت
اور ادھر میرے یہاں آجانے نے اِس مکالمہ کو پُورا نہ ہونے دیا۔
ورنہ ارادہ تھا کہ خود اُن کی زبان سے مرزا کے حالات اور اس وقت کی
کیفیات سُنکر قلمبند کرتا۔ مگر اب وہ دلّی ہی نہ رہی جس میں تل بندھتے تھے
اب کہاں میر نصاحب اور کہاں اس مکالمہ کی تکمیل۔ مگر جو ہے ہدیۂ
ناظرین ہے۔

میں۔ کیوں حضرت (حضرت) مرزا کا زمانہ تو خوب یاد ہوگا۔

میر نصاحب۔ لے لو نہ یہہ خوب کہی۔ ارے بھئی یاد کیسا۔ واہ واہ!
یاد کسے کہتے ہیں۔ میری مرزا نوشہ کے ہاں رات دن کی نشست و
برخاست تھی۔ ہر وقت کی صحبت تھی۔ ہر وقت کا ملنا جلنا تھا۔ جب سے
مرزا نوشہ کا انتقال ہوا زندگی بدمزہ ہوگئی۔ زیست کا لُطف جاتا رہا۔
اب کہاں وُہ صحبتیں۔ ہم بھی اب چراغ سحری ہیں۔ کوئی دن کی ہَوا ہے
اب کون باقی ہے دلّی میں۔ اُس زمانہ کے لوگ اب کہاں پیدا ہیں اور
مرزا نوشہ جیسے لوگ تو اب پیدا ہی کہاں ہوتے ہیں۔ اُنکے وہ اوصاف
تھے کہ انتہا کا ہیکو ہے۔ دکر انتہا کا ہیکو ہے میر نصاحب کا خاص اپنا
فقرہ تھا) کوئی بات لطیفہ سے خالی نہ تھی۔ بات بات میں ظرافت نکلتی
تھی۔ تمام محفل کو ہنساتے رہتے تھے۔ اور رنج سے تو واسطہ کیا۔ ادہر

متانت بھی ایسی کہ کچھ انتہا کا ہیکو ہے۔

میں۔ جی ہاں حضت بجا و درست ارشاد ہوا۔ اب وہ زمانے کہاں رہے خواب و خیال ہوگئے۔

میر نصاحب۔ ہاں بھائی۔ ان صحبتوں کا لطف بس انہی تک تھا۔ اب نہ وہ لوگ ہیں، نہ وہ باتیں ہیں۔ نہ وہ تہذیب ہے۔ اب تو وہ نئی روشنی ہے اور نئے لوگ ہیں۔ بھائی میر مہدی (میر مہدی مجروح) کہا کرتے تھے کہ وہ جگنو بھی ہوتا ہے نا۔ پٹ بیجنا۔ بس اس کی مثال ہے۔

میں۔ میر مہدی مجروح نے بھی اچھی طبیعت پائی تھی۔ بجا ارشاد ہوا۔ واقعی موجودہ روشنی کی وہی مثال ہے جو آپ نے فرمائی۔

میر نصاحب۔ میں قلعہ میں رہا کرتا تھا اور بھائی میر مہدی اردو بازار میں رہا کرتے تھے۔ اردو بازار بلاقی بیگم کے کوچہ کے سامنے ہی تھا۔ اب تو وہ کھنڈر ہے۔

میں اور بھائی میر مہدی دونوں روز مرزا نوشہ کے ہاں جایا کرتے تھے۔ یا تو میں بھائی میر مہدی کو لیلیا کرتا تھا یا وہ مجھے لیلیا کرتے تھے۔ ہم نے مرزا صاحب کے ہاں قدم رکھا اور کہا "حضت آداب عرض ہے"۔ اور ادھر سے انھوں نے کہا "میں بھی آداب عرض کرتا ہوں"۔ ادھر سے ہم نے چھیڑنے کو کہا کہ حضت یہ کیا۔ اور ادھر سے انھوں نے کہا "بھی تمہارے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ آئیے بھی۔ آج کئی دن کے بعد آئے۔ کہاں رہے"۔ اور ہم نے کہا اجی حضت ابھی تو ہو کے گئے ہیں۔ اور وہ بولے "نہیں اور کے ہو گے۔ یہاں نہیں آئے"۔ اور ہم اصرار کر رہے ہیں کہ ابھی تو ہو کے گئے تھے۔ پھر وہ مسکرا کے کہتے۔

دو بمبئی میں ضعیف بھولا بھالا آدمی تم لڑکوں کے سکھے میں آجاتا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔"

مزاج اسقدر نازک تھا کہ انتہا کا ہیکو ہے۔ کوٹھی پر نشست تھی اور دُور دُور کے لوگ آ کے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ چار ملازم تھے اور کلو انکے داروغہ تھے۔ محفل میں ہر ایک کے سامنے علیحدہ علیحدہ کلیاں بھری رکھی رہا کرتی تھیں اور انکا قاعدہ تھا کہ ذرہ کچی چلم پیا کرتے تھے۔ اگر نیا آدمی ناواقف آتا اور کلی سامنے رکھی گئی اور اس نے کہیں پینی شروع کردی۔ بس اُسی وقت مرزا صاحب سمجھ گئے کہ باہر کا آدمی ہے۔ تہذیب سے ناواقف ہے اور اُسی وقت انکا مزاج بگڑ گیا۔ کلو کو آواز دی اور کہا آپ کو سلفہ بھر کے لادو۔ اور وہ بیچارہ (باہر کا آدمی) بولا "جی نہیں تو اسی پیتا ہوں" اور وہ کہہ رہے ہیں جی نہیں خدا جانے آپ نے کس وقت پیا ہوگا آپ کو طلب ہے۔ داروغہ آپ کو سلفہ بھر کے لادو۔ اور وہ آدمی ہے کہ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔

بہت سے صاحب غرض انکے پاس آیا کرتے تھے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ کوئی صاحب غرض ہے تو اُس کی زیادہ تواضع کرتے تھے۔ اور چلنے سے پہلے بلا کے داروغہ کے کان میں کہہ دیتے کہ ان کی پانچ یا دس روپیہ سے تواضع کرنا۔ مگر وہاں روپیہ کہاں تھا۔ باسٹھ روپیہ آٹھ آنے کی پنشن تھی اور کچھ اور اِدھر اُدھر سے روپے تین سو ایک ہو جاتے تھے۔ مگر وہ دس پندرہ دن کا بھی خرچ نہیں تھا۔ حالت یہ تھی کہ اگر اس وقت ایک ہزار کی تھیلی ان کے ہاتوں میں دیدیجئے تو صبح تک ایک پیسہ نہ رہے۔ اب کلو نے کہا کہ پچاس روپے پرسوں لایا تھا سب

ہو چکے۔ اچھا تو بنئے کے ہاں باسن گروی رکھدو اور آپ کی پانچ روپیہ سے تواضع کرد۔ یہ سنتے ہی وہ گئے اور کہیں سے روپیہ لے آئے اور جس وقت صاحب غرض نے زینے کے نیچے قدم دھرا انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے یوں نذر کے طور پر پانچ یا دس جیسا موقعہ ہوا اُسے دیدیے۔ یہ حالت ان کی رحمدلی کی تھی۔ اب یہ طبیعتیں کہاں ہیں۔

بھائی میر مہدی اور میں دن میں کئی کئی دفعہ جایا کرتے تھے۔ دوپہر کو وہ آئی ہوئی غزلیں بنایا کرتے تھے۔ نواب کلب علی خاں کے باپ نواب یوسف علی خاں کی بھی غزلیں آیا کرتی تھیں۔ ایک دن جو ہم پہونچے تو بیٹھتے ہی مرزا نوشہ نے عادت کے موافق ایک شعر سُنایا۔

کیسی شفا کہاں کی شفا، یہ بھی چند روز
قسمت میں تھا کہ ناز مسیحا اُٹھائیے

ہم نے سنتے ہی کہا سُبحان اللہ سبحان اللہ کیوں نہو آپ کی طبیعت کہنے لگے "وہیں یہ کیا کہا۔ مُنہ پر طمانچے مارو۔ میں کیا۔ یہ نواب یوسف علیخاں صاحب کا شعر ہے"! تکبر سے تو واسطہ کیا۔

میں۔ ہاں قبلہ کیوں نہ ہو۔ بھلا ایسی طبیعتوں میں تکبر کہاں۔

اس کے بعد میں نے اور چند سوالات کیے مگر ہزار بد قسمتی کہ اُسی وقت انکے جواب قلمبند نہ کیے۔ اسی ارادہ کرنے میں رہا کہ آج اس معاملہ کو مکمل کرونگا اور کل کرونگا۔ اور بالآخر وہ قبر میں جا سوئے۔

اس آخری عمر اور ضعف میں بھی میر نصاحب کی آواز ایسی تازہ اور بلند تھی کہ اچھے جوان شرما جائیں۔ مگر ہجوم امراض سے اسقدر نحیف و زار ہو گئے تھے کہ ان کی زندگی کا ایک دن کا بھروسہ نہ تھا۔ وہ کیا اُٹھ گئے

کہ زمانۂ غالب کے کارواں کی آخری طناب قطع ہوگئی۔ اب سوائے علمی تذکروں اور داستانوں کے اُس زمانہ کا اور کیا باقی ہے۔ شاید ادھر اُدھر کوئی باقی بھی ہے تو کیا بس شمع سحری ہے۔ اِدھر صبا کا جھونکا آیا اور قصہ تمام ہُوا۔ ع

جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

محمد آصف علی

غزل

اِک اِک اَدا میں ناز ہیں پنہاں ہزارہا — اُٹھتے شباب کے ہیں نگہباں ہزارہا

پھاڑے ہیں ہمنے روز گریباں ہزارہا — دیکھے جنوں میں روز بیاباں ہزارہا

دیوانگئ عشق کا بڑھتا ہے سلسلہ — آباد ہوتے جاتے ہیں زنداں ہزارہا

اک میں ہوں یہہ۔ کہ پوچھنے والا نہیں کوئی — اک تم ہو وہ۔ کہ روز ہیں خواہاں ہزارہا

کس کس کی اِک ادا میں بر آئے آرزو — ہیں دل میں شوقِ وصل کے ارماں ہزارہا

اب تھک کے پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں ہم کہیں — جوشِ جنوں سے ہوگئے احساں ہزارہا

اے حسن تیری چشم فسونگر کو دیکھکر — کافر ہزار ہیں تو مسلماں ہزارہا

دم گھُٹ رہا ہے ضبط فغاں کیا کروں بتا — گھبرا رہے ہیں سینہ میں ارماں ہزارہا

کوچہ میں اُنکے ایک قیامت ہے ہر گھڑی — نالاں ہزارہا ہیں۔ تو گریاں ہزارہا

دیکر فریب مہر وہ لیتے ہیں دلِ — بنتے ہیں اُنکے بندۂ احساں ہزارہا

وحشت میں خوب خاک اُڑائی ہے مدتوں — دیکھے ہیں ہمنے دشت و بیاباں ہزارہا

اب مانجاؤ۔ سامنے آجاؤ اِک ذرا — مضطر ہیں شوقِ دید کے ارماں ہزارہا

سب سے جُدا ہے سب سے الگ میری طرز ہے
محفل میں سے رضا ہیں سخنداں ہزارہا

رضا صفی آروی

تازہ غزل

رگیں کھنچنے لگیں اب نزع کا ہنگام آتا ہے
ہٹا دو ورنہ اُنکے سر پہ اب الزام آتا ہے

دم آخر لکھے تھے جسمیں اپنے تجربے مجکو
وہ خط شوق دیکھوں کسکے کسکے کام آتا ہے

جناب واعظ عزلت گزیں سے عرض اتنی ہے
فقط یہ دیکھ لیں محفل میں کیونکر جام آتا ہے

نگاہیں مست ساقی می پرست اور رند متوالے
اُلٹ جاتی ہے محفل جب کبھی یوں جام آتا ہے

کسی محفل میں اب جانیکے قابل ہی نہیں اہل
وہ عالم ہے زباں پر اکثر اونکا نام آتا ہے

لڑاتے ہیں نظر خمخانہ ہستی کے متوالے
حباب اُٹھتا ہے بزم تازہ کا اور جام آتا ہے

نہ پوچھو کس قدر ہوگا عذاب آخرت سے اُسپر
شب غم جس مریض عشق کو آرام آتا ہے

سکوں ہو کس طرح میرے دل سیماب فطرت کو
جہاں بجلی تڑپتی ہے وہاں آرام آتا ہے

سمجھتا ہوں یہ دلکا درد اک دن رنگ لائیگا
نظر آغاز میں مجکو مرا انجام آتا ہے

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ ابر و باد یہ قبریں
تمھیں اے سونیوالو کس طرح آرام آتا ہے

یہ ساماں چھپ رہے ہیں گر رہا ہے پردہ دنیا
نہ دیکھا جائیگا اب جسمیں وہ ہنگام آتا ہے

الٰہی وہ شفق بنکر دیار حسن میں چھپ لے
برابر خون دل جو صبح سے تا شام آتا ہے

مرے چہرہ کو لے چادر ہٹا کر دیکھنے والے
مریض ہجر کو دیکھ اس طرح آرام آتا ہے

جلائینگے وہ آکر شمع تربت خیر ہے تمکو
بھلا کون ایسے ویرانے میں وقت شام آتا ہے

عزیز باوفا نے دیر میں کچھ چوٹ کھائی ہے
حرم میں آج باندھے جامہ احرام آتا ہے

عزیز لکھنوی

حکیم بریانداس

نہایت عقیل و ذکی تھا۔ اس کی زوجہ میلیس بہت موٹی تازی بدصورت تھی۔ اتفاق سے اُس زمانہ کی بعض عورتوں نے اوس کی بھدی سی تصویر مذاقاً بنائی جسکو دیکھکر بریانداس کو بڑا غصہ آیا اور فوراً اپنی بیوی کے پاس پہونچا۔ سوء اتفاق کہ وہ اُس وقت ایک سیڑھی پر چڑھی ہوئی تھی - بریانداس نے جاتے ہی اُس کے پیٹ میں اِس زور سے لات ماری کہ وہ سیڑھی سے نیچے گر کر فوراً مرگئی اور اُس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ بھی ضایع ہوگیا۔ اسکو مُردہ دیکھکر حکیم بہت ہی پچھتایا اور اسی غم وغصہ میں اُن عورتوں کو پکڑوا بُلایا جنھوں نے وہ تصویر بنائی تھی۔ اور اوس کی بیوی کی ہلاکت کا باعث ہوئی تھیں اور اون سب کو جلوا دیا۔ جب اوس کی بیوی کی موت کی خبر اُس کے خُسر کو پہونچی تو اُس نے اپنے نواسوں کو بُلوا بھیجا تاکہ اُنھی کو دیکھکر اپنی تسلی کرے۔ جب یہہ اُس کے پاس پہونچ گئے تو اُس نے دونوں سے کہا کہ " بھلا تمھیں معلوم ہے کہ تمھاری ماں کو کس نے قتل کیا ہے؟ بڑا چونکہ احمق تھا کچھہ نہ سمجھا مگر چھوٹے کو سخت رنج ہوا اور اُس نے اُسیوقت اپنے دل میں عہد کرلیا کہ شہر کو رنفیتہ جاکر اپنے باپ سے کبھی کلام نہ کرونگا اور نہ اُس کا کہا مانونگا۔ جب یہہ دونوں پھر اپنے باپ کے پاس گئے تو اُس نے یہ معلوم کرنے کے لیئے کہ اُن کے نانا نے (جسکا نام ابریتلی تھا) کیا کچھ کہا ہے بڑے بیٹے سے بہت سے سوالات کیے۔ مگر وہ اپنی حماقت کی وجہ سے

صاف بات نہ بیان کرسکا۔ البتہ اتنا معلوم ہوگیا کہ اونکے نانا نے
اُنپر یہہ ظاہر کردیا ہے کہ اون کی ماں کی موت کا باعث اون کا باپ ہی
تھا۔ جب اُس نے بڑے بیٹے سے زیادہ پُرس وجو کی تو اوسکو وہ
باتیں یاد آگئیں جو اُس کے نانا نے چلتے وقت دونوں سے کہی تھیں
اور اُن سب کا اعادہ کرایا۔ اس پر بریانداس نے چاہا کہ اپنے اور
اپنے خسر کے درمیان میں اپنے چھوٹے بیٹے کو واسطہ بنائے۔
چنانچہ تمام اہل شہر کو حکم دیدیا کہ اگر یہہ چھوٹا بیٹا کسی کے یہاں آئے تو
اوسکو نکال دیا جائے تاکہ وہ یہہ سمجھے کہ مجھے میرے باپنے نکال
دیا ہے یا نکال دینا چاہتا ہے۔
چنانچہ لوگوں نے ڈر کے مارے ایسا ہی کیا۔ چند روز کے بعد اس کے
بعض خیرخواہوں کو اسپر رحم آیا اور اُس کے باپ کی مخالفت کرکے
اوسکو اپنے گھروں میں پناہ دینے کا ارادہ کرلیا۔ مگر بریانداس نے
اُن لوگوں کو بُلاکر دہمکایا کہ اگر ایسا کروگے تو چُن چُن کر قتل کردیئے جاؤگے
اب تو کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ اور اوس مظلوم سے کوئی بات تک کرنیکا
روادار نہ ہوا۔ الیکفرعون دن رات مارا مارا پھرتا تھا۔ لوگ اس سے اس
طرح ڈرتے تھے کہ جیسے درندے سے۔ اِس حالت میں اُسکا باپ اس
کے پاس آیا تو اوسکو چار روز سے بھوکا پایا۔ یہہ دیکھکر اوس کا بھی دل
پسیجا اور کہا کہ "تم سمجھتے ہو کہ تم اس مُصیبت میں کس وجہ سے پھنسے کیا تم
یہہ نہیں چاہتے کہ تم میرے ملک و خزاین کے مالک بنو؟ آخر تم میرے
بیٹے ہو اور شہر کورنتیہ کے امیر ہو۔ اگر تمھیں اپنے والد کے مرنے کا
رنج ہے تو مجھے تم سے زیادہ رنج ہے۔ مگر جو کچھہ ہونا تھا ہوچکا آخر مینے

بھی اس پر صبر کیا ہے. تم اس حالت پر اپنے ہاتھوں پہونچے ہو. نہ اپنے باپ کی مخالفت کرتے نہ اِن دہاڑوں کو پہونچتے۔ اب تمہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ باپ کی مخالفت کا یہہ نتیجہ ہوتا ہے۔ میں اب بھی تیار ہوں کہ تمکو پھر گھر لے چلوں" بیٹے کے پہلو میں باپ سے بھی زیادہ پتھر کا دل تھا اوس نے بے خوف خطر یہہ جواب دیا کہ "جو سزا تم نے میرے پناہ دینے والوں کے لیے مقرر کی ہے اوس کے مستحق تم خود ہو" بریانداس نے بیٹے کی یہ جفا دیکھکر اوسکو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ٹالنے کے لیے اوسکو قورقیرہ بھیجدیا جو اوسی کی مملکت میں واقع تہا۔ اور اُدھر اپنے خسر ابرتقلی سے اسلیئے ناخوش ہوا کہ وُہی باپ بیٹوں کی دشمنی کا بانی مبانی ہوا ہے۔ اور انتقام لینے کے لیے ایک بڑی فوج تیار کی اور خود اپنے خسر پر چڑھ دوڑا اور نہایت آسانی کے ساتھ اوسکو گرفتار کرکے قید کر دیا۔

مدتوں کے بعد جب بریانداس بہت ہی بوڑہا ہوگیا تو اوس نے ایک شخص کو قورقیرہ بھیجکر ایکفرعون کو بُلایا۔ تاکہ سلطنت اوسکو دیکر خود الگ ہو جائے۔ ایکفرعون نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا بریانداس کو چونکہ اپنے اس بیٹے سے بے انتہا محبت تہی اس لیے اوس نے اپنی بیٹی کو بھیجا کہ وہ اپنے بھائی کو جس طرح ہوسکے سمجھا بجھا کر لے آئے.

اس نے جاکر اپنے بھائی کو بڑی بڑی قسمیں دلائیں اور کہا کہ "کیا تم یہہ چاہتے ہو کہ سلطنت ہمارے خاندان سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے۔ کیونکہ شوکت اوس خوبصورت عورت کی طرح ہے کہ جو عفیفہ نہو۔ آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے پہلو میں۔ کیا تمکو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہمارا باپ بہت ہی بوڑھا ہوگیا ہے اور اوس کے موت

کے دن قریب آگئے ہیں۔ اگر تم جلد نہ پہونچے تو ہمارا ملک و عزت سب جاتی رہیگی۔ اس لیے تمھیں چاہیئے کہ فوراً جاؤ اور یہہ عزت وجاہ جو تمہارا حق ہے ضایع نہ کرو" الیکفرعون نے قسم کہائی کہ جب تک بریانداس شہر کورنتیہ میں رہیگا وہ ہرگز واپس نہ جائے گا۔ یہہ سنکر اوسکی بہن واپس چلی آئی۔ اور اپنے والد سے تمام قصہ بیان کردیا۔ بریانداس نے پھر اپنے بیٹے کو کہلا بھیجا کہ" چونکہ تم قسم کھا چکے ہو کہ جب تک میں اس شہر میں ہوں تم اس میں قدم نہ رکھوگے۔ اس لیئے میں نے قصد مصمم کرلیا ہے کہ اپنی باقی عمر شہر قورقیرہ میں گزار دوں" الیکفرعون یہہ سنکر راضی ہوگیا۔ اور دونوں نے اپنا اپنا قیامگاہ بدل لینے کی تیاری کی۔ مگر جب اہل قورقیرہ کو یہہ امر معلوم ہوا تو وہ بہت ڈرے کہ ایک دیوانہ ہمپر مسلط ہوا چاہتا ہے۔ اس لیے اونھوں نے الیکفرعون کو قتل کردیا۔

بریانداس کو اب اپنے بیٹے کی طرف سے یاس کلی ہوگیا۔ اور اسکی پاداش میں اوس میں اوس شہر کے بڑے بڑے آدمیوں کے تین سو لڑکوں کو گرفتار کرکے ہلیاطس کے پاس بہیجا کہ اون سب کو خصی کرکے اپنا غلام بنالے۔ اتفاق سے وہ کشتی جس میں یہہ بدنصیب لڑکے تھے جزیرہ شامس میں پہونچی وہاں کے لوگوں کو جب ان مظلوموں کو حال معلوم ہوا تو اون کو بڑا رحم آیا اور اون سے خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ تم سب اب خانہ دیانہ میں چلے آؤ کہ وہاں سے پھر گرفتار کرنے کی کسیکو جرات نہیں ہوسکتی۔ اور شہر کو رنتیہ والوں کو وہاں سے نکالنے کی کسی طرح ہمت نہیں ہوسکتی۔ اس طریقہ سے یہہ بدنصیب بھی

بچ گئے۔ اور بریانداس کو بھی اون لوگوں کے غدر کا خیال نہ ہوا مظلوموں کو اسقدر صدمہ پہونچانے کا اون لوگوں نے یہہ انتظام کیا کہ ہر روز بہت سے آدمی بل کربت خانہ کے سامنے ناچتے اور اثنار رقص میں کھانے پینے کی چیزیں اوس کی طرف پھینک دیتے۔ شہر کورنتیہ والے بہت روز یہہ تماشا دیکھتے رہے آخر تھک کر چلے آئے۔ بریانداس کو یہہ واقعہ سُنکر اور بھی رنج ہوا کہ وہ حسب دلخواہ اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام بھی نہ لے سکا

اسی وقت حکیم نے اپنے ہلاک کا ارادہ کیا۔ وہ یہہ چاہتا تھا کہ میرے مدفن کی کسی کو اطلاع نہو۔ اس لیئے اوس نے یہہ تدبیر کی کہ دو جوانوں کو بلاکر اونھیں ایک غیر آباد راستہ کا پتہ دیا اور کہا کہ رات کو وہ وہاں گشت کریں اور جو شخص تنہا اونکو نظر آئے اوسکو قتل کرکے فوراً وہیں دفن کر دیں۔ اونکو رخصت کرکے چار اور جوانوں کو بلایا۔ اور اونکو حکم دیا کہ رات کو اوس موقعہ پر جو دو آدمی ایک جگہ ملیں اونکو قتل کرکے فوراً اسی مقام پر دفن کر دیا جائے۔ ان چاروں کو رخصت کرکے اور بہت سے آدمیوں کو بلوایا اور اسی طرح ان چاروں کے قتل کا انتظام کر دیا۔ اور مقررہ وقت پر خود تنہا اوس مقام پر پہونچا۔ اور قتل کرکے دفن کر دیا گیا۔ پھر اوس کے دونوں قاتل۔ اور پھر اونکے قاتل۔

لیکن یہہ تدبیر بھی بدقسمتی سے اوس کے لیئے کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ اہل کورنتیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے اس کا بڑا مقبرہ بنایا اور اوس پر پچی کاری کی +

محمد خلیل الرحمن

وفا

بنی نہ وجہ تسلی مری اَدا ئے وفا
وہ ناز مست رہا شوخ۔ بیوفائے وفا

وہ شعلہ رُو جو ہوا آج رہگرائے وفا
چراغ پا نہ ہا دستِ نارسائے وفا

جو اہلِ دل ہو جو صاحب نظر ہو وہ دیکھے
طلسمِ راز کا منظر حرم سرائے وفا

ہمارا صدق و صفا عینِ آرزو ہوجائے
جنون حصار نہ بن رنگتی نمائے وفا

بِلا وہ صحنِ چمن میں بہار لالۂ و گل
نگاہِ شوق ہوئی صبح دلکشائے وفا

ہر ایک دم دمِ شمشیر کا رہا رُو کش
جفا قفا میں سپر تھی مری ردائے وفا

حریفِ اُنس ہے نا حق یگانہ بیداد
نہیں ہنا قشۂ غیر ما سوائے وفا

نہ التفاتِ نظر ہے نہ امتیازِ ولا
خیالِ غیر نہو شکلِ مدعائے وفا

اَدا نورد ہے کیسا وہ عشوہ مستانہ
کہا پسند نہیں جام خودنمائے وفا

خلافِ وضع نہ سمجھے حقیقتِ رُودا
ہوا وہ فتنہ ادا محو ماجرائے وفا

جلال رنگ کے واماندہ ہیں نیاز طریق
شکستہ بستہ مقید ہیں دست و پائے وفا

گئی وہ عشوہ گری دامِ حسنِ تمکیں سے
وہ عشق ساز ہوا شیوہ آزمائے وفا

زہے کرشمہ وہ بیمہر شوخ کہتا ہے
بیا فدائے وفا ہاں بیا فدائے وفا

یہی ہے بلبلِ کشمیر تیرا جلوہ شہید
اِدھر کو رُخ نہیں بیگانہ آشنائے وفا

بقا فنا کا تعین کہیں نہ ہو ساقی
ستم شعار کو منظور ہے فنائے وفا

عریانِ خیرابات ساقی

حیاتِ انسانی پر دو پرندوں کی بحث

کوہ سنسار کی بلند چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں رات اندھیری تھی اور زیتون کے درخت پر اصفہانی چکور کا خانماں برباد جوڑا ایک دوسرے کے پروں میں مُنہ چھپائے بیٹھا تھا موسم سرد تھا ہُوا فرّاٹے بھر رہی تھی ٹھنڈی ہُوا کا ایک جھونکا زور سے چلّا چلتے چلتے گلے ملے اور ایک ہلکی سی شاخ بادِ تند کی حراست میں اپنے وطن سے روانہ ہوئی زمین نے استقبال کو ہاتھ بڑھائے مگر پرندوں کے رخسار نازک نے مہمان نوازی کی ابتک بھولے بھالے جانوروں کے ننھے دل مظالم صیاد کو جو دن بھر لوٹتے رہے فراموش نہ کر چکے تھے گھر برباد ہو چکا تھا وطن چھٹ گیا تھا اور دونو حرمانِ نصیب حسرت آمیز نظروں سے آشیانہ کو خیرباد کہہ چکے تھے صیاد ان کی تاک میں تھا اور آفتاب کے ڈھلتے ہی یہہ جوڑا بسیرا لینے کی غرض سے شمال مشرق کی طرف روانہ ہوگیا دن اڑا چلا جا رہا تھا اور پرند پُوری طاقت سے پرواز کر رہے تھے قدرت کا اثر غالب آیا اور کوہ سنسار کے دامن میں روز روشن نے پردیسیوں کو دغا دی زیتون کے درخت پر دونو بیٹھ گئے کہ رات بسر کر کے صبح آگے بڑھیں۔

مُصیبت زدہ جوڑا شاخ کے گرتے ہی چونک پڑا اور نر نے مادہ سے کہا۔

پیاری! رات بھی اطمینان سے گذرتی معلوم نہیں ہوتی چلو اور

کہیں چلے چلیں۔

مادہ۔ اگر سنگدل انسان ہماری جان کا ایسا ہی دشمن ہے کہ وہ ہماری اس محبت کو مطلق نہیں دیکھ سکتا تو آپ اجازت دیجئے کہ میں گرفتار ہو جاؤں اور اس طرح آپ ان مصیبتوں سے نجات پائیں۔

اتنا سنتے ہی نر نے مادہ کے رخسار کو بوسہ دیا اور خاکی مائل پروں پر منہ رکھکر سچی محبت کا شکریہ ادا کرنیکے بعد کہا۔

موہنی صورت اتنی قربان جاؤں زندگی کی بہار اسی دم سے ہے اگر تقدیر میں مفارقت لکھی ہے تو صیاد کا شکار میں ہوں نہ کہ یہہ چاندسی صورت۔

مادہ۔ اچھا چلو کسی طرف اڑ چلیں کلیجہ دھڑک رہا ہے اس سنسان وقت میں یہہ کھڑکا کاہے کا تھا۔

نر۔ چلو! شاید کوئی پتہ تھا! رات کا وقت ہے رات بھی اندھیری دُور چلنا مناسب نہیں چلو کسی اور درخت پر چل بیٹھیں۔

دونو نرمادہ اُڑ گئے رات جوں توں ایک اور درخت پر کاٹی۔

صبح صادق کا سہانا وقت تھا کہ نر نے مادہ سے کہا سورج نکل آیا چلو اب ایسی جگہ چلیں جہاں انسان کا نام ونشان تک نہ ہو اور اب ہم مدۃ العمر صورت دیکھنی تو درکنار ایسے سفاک جیش کا نام بھی نہ سُنیں۔

انسان! اوہ! صبح ہی صبح کس کمبخت کا نام زبان پر آیا کس قدر خود غرض کس درجہ مکار توبہ توبہ اسکا دل جذبات سے خالی وہ محبت سے نا آشنا ہوس کا بندہ مطلب کا دوست یقیناً وہ اس حالت کی قدر نہیں کرسکتا جب ہم اپنے آشیانہ میں ایک دوسرے کر بند

قربان ہوں جب فضائے عالم میں اڑتے ہوئے میری ہر نظر محبت میں ڈوبی خلوص میں بھری تیری پیاری صورت پر پڑے۔

یہہ کہکر نر نے لپٹ کر مادہ کو گلے سے لگا لیا۔

مادہ۔ میری رائے انسان کی بابت ایسی سخت نہیں ہے ہم میں بھی ایسے پرند موجود ہیں جو ہماری آزادی کے دشمن ہمارے خون کے پیاسے اور ہماری جان کے خواہاں ہیں اسی طرح انسان میں بھی بعض ضرور پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتے ہونگے۔

آؤ اب ہم انسانی دنیا کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ حیوان کی یہہ جنس جو اشرف و اعلیٰ ہونے کی مدعی ہے کس کس رنگ میں جلوہ گر ہے۔

دو نو نر مادہ ہوا میں اُڑے اور آبادی کی طرف روانہ ہوئے دوپہر کے سنسان وقت میں انکا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جہاں ایک بیوہ عورت ساتھ آٹھہ برس کے اپنے یتیم بچہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھہ رہی تھی بیگم لونڈیوں سے بد تر تھی گھر بنکر بگڑ چکا تھا اور زر و جواہر لٹانے والی دو دو دانوں کو محتاج تھی جو بچہ اشرفیوں میں کھیلا جس کی ہر ادا پر باپ پروانہ تھا اس وقت پہچ گو دڑ کا لال تھا کپڑے پھٹے پُرانے اور پاؤں ننگے تھے دو وقت کا فاقہ تھا اور یہہ معصوم ما سے رو رو کر روٹی مانگ رہا تھا۔

بدنصیب ما انقلاب زمانہ کی تصویر بنے بچے کا مُنہ تک رہی تھی اور اس ظالم دیور کی جان کو دعائیں دے رہی تھی جس نے تمام مال جائداد پر بے ایمانی سے قبضہ کر لیا اور بھاوج بھتیجے کو نکال باہر کیا ماںتا کی ماری

بہ ظاہر خاموش تھی مگر کلیجہ خون کے آنسو رو رہا تھا جب بچہ کی ہٹ حد سے زیادہ بڑھی اور جگر کا ٹکڑا زمین پر لوٹنے لگا تو ضبط نہ کر سکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُٹھی لال کو کلیجہ سے لگایا اور گود میں لیکر بیٹھ گئی سر کے بالوں پر مُنہ رکھکر پیار کیا اور کہنے لگی۔

میرے چاند ابھی روٹی پکاتی ہوں لو اُٹھو پانی لاؤ آٹا گوندھوں۔

بچہ۔ آٹا کہاں ہے! ہنڈیا خالی پڑی ہے! پیسے لاؤ مرلی سے آٹا لے آؤں۔

ما۔ چندا میرے پاس پیسے نہیں ہیں یہہ پیک لیجاؤ صراف کو دینا وُہ جتنے پیسے دے اسکا آٹا لے آنا۔

بچہ۔ اماں بیگم! میں اتنی دور جاؤں!

ما۔ میں دروازہ میں کھڑی ہوں جاؤ بھاگ کر لے آؤ شاباش شاباش

دونو ما بیٹے دروازے میں تھے کہ دیور نے گھر میں قدم رکھا بچہ یہہ کہکر اہا چچا جان آئے دوڑ کر لپٹ گیا بھاوج سہمی ہوئی گھر میں آگئی۔

دیور۔ تم پردہ کرو! میرے ساتھ قرق امین ہے تمہاری تمام جائداد میرے قرضہ کو کافی نہ ہوسکی اٹھارہ روپیہ چھ آنے باقی ہیں میری ماما تم سے صاف طور پر کہہ گئی کہ سرکار فرماتے ہیں تم یہہ بنگالے کی مینا دیدو مگر تمہاری تقدیر میں تو عدالت کے زور سے دینا تھا خوشی سے کیوں دیتیں میرا بچہ دو گھنٹہ اس کے لیئے رویا ہے آخر بچہ ہی تو ہے اسکو بھی ضد آگئی۔

یا تو اٹھارہ روپیہ چھ آنے دو ورنہ جو برتن بھانڈا ہے وہ اس پنجرے کے ساتھ اور دو قرق امین صاحب آجایئے۔

وہ دیور جو اس بیگم کے نمک سے جوان ہوا جو ہر وقت ہاتھ باندھے حاضر
تھا جس کے غریب بچے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتے تھے ایک جھوٹی دستاویز
بنا کر آج اس قابل ہوگیا کہ سینتالیس ہزار کی جائداد بارہ ہزار روپیہ نقد
ہضم کرے معصوم و یتیم بھتیجے کی مینا اپنے بچہ کے واسطے قرق کرنے آیا
بھاوج جو دیور کا منہ تک رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ کچھ جواب دے
قرق امین کا نام سنکر کوٹھڑی میں گھس گئی دو تین آدمی وردی پہنے اندر
گھس آئے اور ایک لوٹہ ایک پاندان ایک پتیلی ایک کٹورا اور مینا کا پنجرہ قبضہ
میں کر لیا۔

پنجرے کے اُتارتے ہی بچہ مچل گیا اور رو کر کہنے لگا۔

اچھی چچا جان! میری مینا نہ لو۔ معصوم کی گریہ وزاری کون سنتا تھا وہ
ظالم چچا کے ۔ حکم کا منتظر ہی رہا دور مال باہر جا پونچا۔

جب بچہ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو ماں تاکی ماری باہر نکلی مینا بچہ
کا نام لے لے کر پکار رہی تھی بچہ زمین پر ٹہنیاں کھا رہا تھا سنگدل
چچا ٹھٹے لگا رہا تھا بچہ کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا چمکارا پیار کیا سمجھایا اور
کہا۔

"میں اپنے بچہ کو اور مینا منگا دوں گی"

بچہ۔ میری اماں بیگم! میری مینا چچا جان سے چھین لو۔

ماں بیٹے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے آفتاب غروب ہو رہا تھا اور ایک
بن باپ کا مظلوم بچہ آٹھ پہر کا بھوکا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا دکھیاری
ماں جس کا کلیجہ نکل رہا تھا کلیجہ کے ٹکڑے کو اُٹھا کر اندر لائی اسکا بلکنا کلیجہ پر
تیر چلا رہے تھے بچہ کو کھٹولے پر لٹایا تھپک تھپک کر لوریاں دیں آنکھ

لگ گئی تو عشا کی آواز کان میں آئی اُٹھی وضو کیا اور روتی ہوئی جانماز پر کھڑی ہوگئی۔

دونو میاں بیوی بسیرا لے چکے تھے ان واقعات نے مادہ کا کلیجہ دہلا دیا دفعتہً نر نے بآواز بلند کہا۔

من موہنی! دیکھا انسان کو؟ چلو اب خدا کے واسطے ایسی جگہ چلو جو انسان کی دسترس سے کوسوں دور ہو۔

اتنا کہکر نر ہوا میں اُڑا اور اس کے ساتھ ہی مادہ روانہ ہوئی رستے بھر نر انسان کی ہستی پر لعنت ملامت کرتا رہا بالآخر رستے فیصلہ قطعی یہہ کیا کہ انسانی شہر ہمارا مسکن نہیں ہوسکتے ہم اس برفستان میں رہیں گے جہاں اس ارذل المخلوقات جنس کا گذر قطعاً ناممکن ہو۔ مادہ جو انسان کی حمایت پر اڑی ہوئی تھی اب بھی اس انجام پر متفق نہ ہوئی اور کہنے لگی۔

یہہ سنگدل چچا جس نے پھول سے بھتیجے اور پردہ نشین بیوہ پر ظلم توڑے لاریب انسانی ہستی کا بدتریں نمونہ ہے میں اس مخلوق کی نمک خوار ہوں میں نے اس کی محنت سے فائدہ اُٹھایا ہے ہری بھری کھیتیاں میرے سامنے لہلہائی ہیں یہاں سے کئے ہوئے ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی مینے پیا ہے مجھے چلنے میں عذر نہیں مگر چند سے حس افراد کا وجود تمام جنس کو بدنام نہیں کرسکتا۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے باقی حصہ یہیں بسر کرو اور صبح پھر ایک دفعہ کریں۔

باقی رات دونو میاں بیوی نے اسی گفتگو میں ختم کی اور علی الصباح آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔

دس بجے کے قریب دونو ہوا میں اڑے اور دوپہر کو قصر جعفری

(جعفر برکی وزیر ہارون رشید) پر ٹھیلے۔

دوپہر کی توپ چل چکی تھی کہ ایک بدنصیب مسافر محل کے پیچھے آیا اس کے ساتھ بیوی اور تین بچے تھے متواتر فاقوں سے ان کی صورت بگاڑ دی تھی ان کا لباس فقیروں سے بدتر تھا اور بھوک کی وجہ سے ان کے قدم نہ اُٹھتے تھے وہ اس مقام پر بیتاب ہوکر گر پڑے اور تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو مسافر جعفر برمکی کو پوچھتا ہوا محل کے اندر داخل ہوا۔

اب دن کے تین بجے ہونگے کہ ایک شخص محل سے باہر نکلا اور اس نووارد سے دریافت کیا کہ کیا ہے؟ کس کو دریافت کرتے ہو؟

مسافر: میں خلیفہ کے وزیر سے ملنے آیا ہوں میرا وطن بصرہ ہے آج سے چار سال پہلے میں وہانکا مشہور رئیس حمیر ابن اعظم تھا قحط نے میری دولت کا خاتمہ کیا اور بچا کھچا اساسہ سرکاری مالگذاری کی نذر ہوا اب ہم ایک بیوی اور تین بچے پانچ آدمی افلاس و گرسنگی سے مجبور ہوکر جعفر کی پناہ میں آئے ہیں اندیشہ ہے کہ اتنی دیر میں میرے بچے جنکو رزق کی صورت دیکھے آج چوتھا روز ہے تڑپ تڑپ کر سڑک پر نہ مرگئے ہوں۔

شخص یہ کہتا ہوا ممکن ہوا تو میں جعفر کو تمہارے آنیکی اطلاع کردونگا محل کے اندر واپس چلاگیا مسافر کچھ دیر تک انتظار کرکے اپنی تقدیر پر روتا ہوا واپس چلا دروازہ پر اس نے ایک شخص کو دیکھا جو اسکا منتظر تھا اس شخص نے مسافر کو جُھک کر سلام کیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ چلیئے دونو غسلخانہ میں داخل ہوئے پانی تیار تھا اس شخص نے مسافر سے غسل

کی التجا کی اور اس کے بعد کپڑے بدلوا کر کھانا پیش کیا انواع و اقسام کے کھانے سونے چاندی کے برتنوں میں چُنے گئے اور بھوکے پیاسے مسافر نے کئی روز بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا نواڑی مسہری پر نرم نرم بچھونا بچھا ہوا تھا دارو غہ فرش نے اسوقت عرض کیا کہ دوسرے کمرے میں تشریف فرمایئے۔ مسافر ادھر تھکا ہوا ادھر بھوک میں کھانا کھا کر جو پلنگ پر لیٹا تو صبح کی خبر لایا آنکھ کھلی تو دن کے نو بج چکے تھے خادم پاؤں دبا رہا تھا انگڑائی لیکر بیدار ہوا تو غسل کے واسطے پانی بدلنے کے لیے لباس تیار تھا فارغ ہوا تو طرح طرح کے کھانے نایاب میوے لاجواب کباب حاضر تھے کھا چکا تو بیوی بچوں کے خیال سے خدام سے کہا کہ جعفر برمکی کہاں ہیں ؟

خادم۔ مجھے علم نہیں۔

مُسافر۔ مجھے اب رخصت کیجیے میرے بچے اور بیوی جنکو میں سڑک چھوڑکر آیا تہا شاید مر گئے ہوں۔

خادم یہہ سُنکر باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد وہی شخص جو سب سے پہلے بلا تھا حاضر ہوا اور عرض کی۔

آپ کو یہاں کچھ تکلیف ہوئی ہو تو معاف فرمایئے جعفر کو اپنے مشاغل سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ آپ جیسے مہمانوں کی حسب حیثیت خاطر کرے میں شب کو بھی چار مرتبہ حاضر ہوا مگر آپ آرام فرما رہے تھے اس لیے کچھ عرض نہ کرسکا۔

مسافر۔ میں آپ کی عنایت کا شکریہ اَدا نہیں کرسکتا میرے بیوی بچے کل دوپہر کے سڑک پر پڑے ہوئے ہیں اب مجھے رخصت کیجیے۔

شخص۔ میں شکریہ کا مستحق نہیں آپ کا غلام ہوں! اگر آپ کی یہہ ہی خواہش ہے تو چلئے تشریف لے چلئے۔

مسافر یہہ سُنکر اُٹھا آگے آگے وہ تھا پیچھے پیچھے یہہ شخص سڑک پہونچکر مسافر نے ایک چیخ ماری اور کہا میرے بال بچے خدا معلوم کیا ہوئے۔

نہیں یہ دو انسان تھے دو پرند اسوقت اس شخص سے نے مسافر سے آگے بڑھ کر کہا میرے ساتھ تشریف لے آیئے مسافر حیران و پریشان روتا پیٹتا ساتھ ہولیا تھوڑی دیر میں پرند و انسان چاروں ایک عالیشان مکان پر پہونچکر ٹھنک گئے اب اس شخص نے مسافر سے التجا کی کہ

"آپ اندر تشریف لیجا یئے"

مسافر ششدر رہ گیا تعجب سے اس شخص کا منہ دیکھا مگر مکرر اجازت پاکر اندر داخل ہوا کیا دیکھتا ہے کہ بیوی اور بچے اس محلسرا میں زرق برق پوشاکیں پہنے غُل رہے ہیں دریافت پر معلوم ہوا کہ دونو وقت سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پہونچ جاتا ہے اور پچاس تھان کپڑے کے اس وقت جب یہہ اس گھر میں داخل ہوئے ہیں بھیجدیے گئے۔ چار نوکر خدمت کے واسطے تعینات ہیں۔

دونو میاں بیوی ششدر و متحیر تھے کہ ابتک جعفر برمکی کا پتہ چلا نہ مہمان نواز کی صورت دیکھی ایسا شخص انسان نہیں ہوسکتا وہ فرشتہ ہے یا انسان کی صورت میں خدا۔

رات ہو چکی تھی اور پرند جوڑا انسانوں سے زیادہ متعجب تھا

[illegible] رات کو وہی شخص جو سب سے پہلے مسافر سے ملاقی ہوا جو مسافر کو یہاں تک پہونچا گیا دروازہ پر حاضر ہوا دستک دی اور درخواست کی کہ پردہ کیجئے میں اندر حاضر ہونگا عورت اندر چلی گئی اور یہہ شخص سر پر ایک خوان لیئے داخل ہوا اسکی آنکھ سے زار و قطار آنسو جاری تھے وہ مسافر کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑکر کہا یہہ بیس ہزار روپیہ کی اشرفیاں قبول فرماکر اپنا قرضہ ادا کیجئے اِس کھنڈر کو اپنا گھر سمجھئے اور اگر مہماں نوازی میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو معاف کیجئے۔ جعفر برمکی میں ہی گنہگار ہوں۔

جعفر کا خلق اسکی مہماں نوازی اسکا عجز و انکسار ایسی چیزیں تھیں کہ دونو میاں بیوی بیتابانہ پاؤں پر گر پڑے جعفر انکی تسلی و تشفی کرتا باہر نکلا شام کے سات نجے ہونگے کہ شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی۔

جعفر برمکی وزیر سلطنت کا سر بادشاہ کے حکم سے اُڑا دیا گیا۔

اِس خبر کے اُڑتے ہی شہر میں کہرام مچ گیا سینکڑوں مرد اور ہزاروں ہی عورتیں ڈاڑھیں مار مار رو رہے تھے صبح کے وقت جب جنازہ قبرستان میں پہونچا ہے کوسوں تک میدان آدمیوں سے پٹا پڑا تھا ظہر کے قریب یہہ تن بے سر سپرد خاک کیا گیا اور لوگ روتے پیٹتے گھروں کو رخصت ہوگئے۔

آدھی رات کا سنسان وقت تھا اور دو نوپرند سرو کے درخت پر بیٹھے جعفر برمکی کی انسانیت کے گیت گا رہے تھے اسکی جوانمرگی پر آنسو بہا رہے تھے کنارہ فرات پر سمندر میں ڈوبی ہوئی ہوا وزیر بغداد کو لوریاں دے دے کر سُلا رہی تھی دفعتہ ایک آواز گونجی اور یہ الفاظ

سُنائی دیئے۔

اے انسان کی صورت میں! فرشتے وزیر بغداد ہمسے وُہ سب کچھہ چھین لیا جو تونے دیا تہا اے خدا کے بھیجے ہوئے سچّے انسان ہماری تکلیفوں کا خاتمہ کر۔

یہہ کہکر ایک عورت قبر پر گری یہہ وہی بدنصیب مسافر کی بیوی تھی جسنے قبر کو بوسہ دیا اور گر کر رخصت ہوئی۔

دونو پرند چیخیں مارتے ہوئے اُڑ گئے اور مادہ نے نر سے کہا دیکھا انسان کو یہہ ہے وہ مخلوق جس کے وجُود پر ہم فخر کر سکتے ہیں ÷

غزل

مہتاب گر جبیں ہے تو رخسار آئینہ — حق تو ہے یہ کہ ہے رخ دلدار آئینہ
کیا ہو دو چار سے رخ دلدار آئینہ — زانو سے ہٹ گیا ہے حیادار آئینہ
دیدار تیرے رخ کا جو اکبار ہو نصیب — دیکھے نہ عمر بھر ترا بیمار آئینہ
پھولوں کا عکس اُس رخِ رنگین کا عکس ہے — اوس شوخ نے بنا دیا گلزار آئینہ
پرتو جو پڑ رہا ہے رخ صاف کا ترے — معلوم ہوتے ہیں در و دیوار آئینہ
پیش نگاہ رہتا ہے دن رات ہر گھڑی — ایسا ہوا ہے یار کا غمخوار آئینہ
آئینہ میرے دل کا ہے حاضر برائے دید — رکھا ہے سامنے ترے بیکار آئینہ
دیکھا صبح اوٹھ کے کسی مست ناز نے — مستی سے ہو رہا ہے جو سرشار آئینہ
تصویر اپنی دیکھ چکا وہ مسیح جب — کہنے لگا کہ ہے دل بیمار آئینہ
ہے شغل آئینے سے تجھے مجھکو تیری چاہ — طالب میں تیرا تو ہے طلبگار آئینہ
بلبلؔ باسط تمہارے نالہ و شیون کا ہی قصور — اودہر ہوا جو حال دل زار آئینہ — غنی

مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام! رام

کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی ہو دنیا کی روش — کچھ عجب انداز سے ہو اسکا سارا انتظام

آرزوے دل کی خاطر جاں کھپاتا ہو کوئی — اپنے مقصد کا کوئی کرتا ہے مشکل انصرام

اسکی کچھ پروا نہیں ہے دل کسیکا دُکھ گیا — ہنس کے کہتا ہو بشر یوں ہو گیا میں شادکام

زہر میں اک اک بجھائی ہو ستمگر تیری بات — صرف کہنے کو ہیں شیریں تیری باتیں لاکلام

خود غرض میں جانتا ہوں تجھے وہ میٹھی چھری — زخم ہو جسکے نہیں ممکن کسی ڈھب التیام

ہاں اوسیکا سر جدا کرنیکو تو تیار ہے — جوش الفت میں تو جسکے ہو کہانیکو غلام

ایسے ہی بیخود ہو وہ نشہ ہرن ہوتا نہیں — پی چکا ہو جبکے کچھ ایسا مئے اُلفت کا جام

حیف تو کرتا ہو ایسے مشتِ باطن کو حلال — تیری فرقت میں جسے ہوتا ہو خواب و خور حرام

مُنہ پہ جسکے قول ہارا دستگیری کیلئے — اب مٹانیکو اُسی بیکس کے اتنا اہتمام

دل کسی لاچار و بیکس کا نہیں ہے توڑنا — ہاں خدا کے گھر کا ہو منظور تجھکو انہدام

کونسی بنیاد کھدوں اس فسوں سازی کی ہو — دل سے لاؤں کس طرح سے پر زباں تک او ستمگر

سُن لو باسط غور کر لو مختصر سی بات ہے — ہے "تعصب" پر فقط قطعِ کلام و اختتام

اپنا مسلک صلح کل ہے صلح جوئی کام ہے — "یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام"

غزل

شاید نصیب ہوں بتِ ایماں شکن کے پاؤں — چھوتا ہوں جاکے زیرِ زمیں برہمن کے پاؤں

دیکھا ہو اوسنے کس گلِ رعنا کو باغ میں — حیرت سے گڑ گئے ہیں جو سروِ چمن کے پاؤں

کرنا ہے امتحان کششِ حسن کا اُسے — رکھتی نہیں شمع جو باہر لگن سے پاؤں

نقشِ قدم سے نقشۂ گلزار کھنچ گیا — کیا گل کھلا گئے ہیں مرے گلبدن کے پاؤں

"باسط رسا ہو طالعِ ناساز گاریوں — اپنا سر نیاز ہو اُس سیمتن کے پاؤں"

تعلیم جدید اور اُردو زبان دانی

یہ تو طے ہو چکا ہے کہ مسلمان اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہیں تو اُن کو تعلیم جدید پانے میں سعی بلیغ کرنی ہوگی کیونکہ تعلیم کے بغیر ان کے قومی امراض کا علاج ناممکن۔ اور اگر قومی امراض اسی طرح بغیر علاج جاری رہے تو اس قوم کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا یعنی ذلیل ترین اقوام بنکر نوع انسان کے طبقات زیریں کے اسفل السافلین میں غرق ہوکر نظروں سے غائب ہو جانا اور قوموں کے شمار سے اس انتہائے ذلت کی وجہ سے نکل جانا ایک اٹل نتیجہ ہے۔

تعلیم جدید کا مفہوم زیادہ تر علوم جدیدہ تجربیہ میں ترقی کرنا ہے۔ اِن علوم کا دائرہ معلومات اسقدر وسیع ہو گیا ہے کہ ایک ایک علم پر قدرت کاملہ حاصل کرنے کے لیئے ایک عمر درکار ہے اور اگر دو چار علوم میں مہارت تامہ حاصل کرنی منظور ہو تو دنیا و مافیہا کو بھلا کر اُن ہی علوم میں دن رات مستغرق رہنا لازم ہوگا۔ علاوہ اِس کے جس زبان کے ذریعے سے ہم اِن علوم کو سیکھ سکتے ہیں وہ زبان انگریزی ہے۔ جو ایک غیر زبان ہے اور بجائے خود اس قدر وسیع اور محنت طلب زبان ہے کہ چندسال اُسکے سیکھنے کیواسطے بھی وقف کرنے ہونگے۔ نتیجہ یہ کہ تعلیم جدید پانے کے واسطے علوم جدیدہ اور زبان انگریزی میں اسقدر استغراق درکار ہے کہ جب تعلیم جدید کی ترقی ہماری قوم میں خاطر خواہ ہوگی تو مشرقی زبانوں کے سیکھنے کے لئے کوئی وقت مشکل ہی سے بچیگا

اور مشرقی زبانوں کا علم اور مذاق لازمی طور سے تنزل پذیر ہوگا۔ اب بھی جبکہ مغربی یا جدید تعلیم صرف تعلیم زبان انگریزی وادب انگریزی تک عموماً محدود ہے مشرقی زبانوں میں ہم لوگوں کو بہت کم مہارت ہے بلکہ از روئے انصاف یہ سمجھئے کہ محض سطحی واقفیت ہے۔ جب وہ تعلیم خاطر خواہ ہونے لگیگی تو اُسوقت تو ضروری ان زبانوں کی تعلیم معدومی کی حد کو پہونچے گی۔

اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب جدید تعلیم خاطر خواہ ہونے لگیگی اور جو حق اس کی ترقی کا وہ ادا ہونے لگیگا تو اُردو زباں دانی اور اُردو ادب دانی کا کیا حال ہوگا اور اگر کوئی زوال اُردو کو پہونچنے کا اندیشہ ہے تو اس زوال کا انسداد کیا ہو سکتا ہے۔

اُردو زباں اپنی طبیعت کی رُو سے ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کے ٹھیک جاننے کے لئے اسکے ساتھ تین چار اور زبانیں بھی جاننی ضروری ہیں۔ عربی فارسی سنسکرت انگریزی اِن زبانوں سے کم و بیش واقفیت ہو بلکہ فارسی کے تو ادب سے بھی واقفیت ہو تب اُردو دانی کا معمولی حق اَدا ہو سکتا ہے۔ سنسکرت جاننے کی ضرورت کو ہنوز لوگ عموماً نہیں سمجھے مگر حق یہ ہے کہ اُردو زبان کو عالمانہ طور سے جاننا اور اُس کے سینکڑوں نہایت ضروری اور کار آمد بلکہ بُنیادی الفاظ کی تاریخ اور اصلیت کو صحیح صحیح دریافت کرنا سنسکرت اور بھاشا کے علم پر موقوف ہے اور جب زباندانی کو زباندانی کے علمی طریقوں سے سیکھنے کا رواج ہوگا (اگر کبھی وہ رواج ہوا) تو لوگ اُردو کے ماہر کامل بننے کے واسطے سنسکرت بھی پڑھا کرینگے۔

جب اُردو کی زباندانی چند اور زبانوں کے جاننے پر موقوف ہوئی تو اور بھی قوی اندیشہ ہے کہ جہاں عموماً مشرقی زبانوں کا علم تعلیم جدید کی ترقی کے ساتھ تنزل پذیر ہوگا وہاں اُردو کو خاص ضرر پہنچے گا۔ ہم کو اس ضرر کے روکنے کی بعض تجویزیں پیش کرنی ہیں۔

اِس تنزل کے روکنے کا ایک سبب تو قدرتی طور پر موجود ہوگا اور انسانی فطرت سے اُمید پڑتی ہے کہ وہ سبب کم و بیش ہمیشہ اُردو زبان دانی کی امداد کیا کرے گا۔ وہ سبب نوع انسان کا اختلافِ مذاق ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ سب تعلیم یافتہ لوگ معقولی یا علوم تجربیہ کے دلدادہ ہی ہو جائیں۔ کچھ لوگ علمِ ادب سے بالطبع شوق رکھنے والے ہمیشہ موجود رہیں گے اور چونکہ یہ اُمید قوی ہے کہ ہماری زبان اُردو ہی رہیگی اس لیے اسکے ادب کو پڑھنا کچھ بڑی محنت بھی نہ چاہیگا اور جو محنت اس میں خاص ملکہ پیدا کرنے کے لیے درکار ہے وہ بوجہ خصوصیت مذاق وہ لوگ کر بھی سکینگے اس طرح چند اہلِ مذاق قوم میں ہمیشہ موجود ہونگے جو علمِ ادب میں کچھ لکھا بھی کرینگے اور ادب کو پڑھا بھی کرینگے۔

لیکن اگر اُردو زباں دانی اور ادب دانی کو محض اس اختلافِ مذاق کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے تو یہ ایک نہایت ہی متوکلانہ حالت ہوگی اور علمِ ادب کو ایسی حالت میں رکھکر قوم تحسین یا مبارکباد کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں ہر ایک ترقی یافتہ قوم کا ہمیشہ سے ایک علمِ ادب چلا آیا ہے اور یورپ کی ترقی یافتہ قومیں اور چیزوں میں ترقی کرنے کے علاوہ علمِ ادب میں ترقی کر رہی ہیں اور وہاں اچھے اچھے علمی مذاق کے لوگ علمِ ادب کے مطالعہ کا شغل بھی رکھتے ہیں۔ پس مسلمانوں کے ہاں بھی ایسے سامان

ہونے چاہئیں کہ اُن کی علمی ترقی کے زمانے میں اُن کے ہاں بھی علم ادب
کا چرچا ترقی پذیر ہو۔ اور یہ نہ ہو کہ صرف معدودے چند لوگ مذاقِ ادب یا نہ
رکھتے ہوں۔ بلکہ قوم میں ادب کے قدر دانوں اور جوہر شناسوں کی بھی
کثرت ہو اور ادیب لوگ جو علمِ ادب میں تصنیفات اور تالیفات کر کے
اس علم کے ذخیروں کو وسعت دیتے ہیں وہ بھی زیادہ تعداد کے
ساتھ ہوں۔

اس کی تدبیریں انگریزوں کی مثال سے سیکھ سکتے ہیں۔ انگریزی کو
ٹھیک ٹھیک جاننے کے لئے بھی کئی زبانیں جاننا اور انگریزی ادب سے
پورا لطف اُٹھانے کے لئے کئی زبانوں کے علمِ ادب سے واقفیت
ضروری ہے۔ لاطینی اور یونانی کے الفاظ اس کثرت سے انگریزی میں
موجود ہیں۔ کہ لاطینی اور یونانی جاننا ان الفاظ کے ٹھیک استعمال کے
لئے ضروری ہوا۔ یورپ کی اور زبانوں کے الفاظ بھی کثرت کے ساتھ
پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں علمِ ادب میں یونانی عقائد قدیمہ کی تلمیحات
اور دیگر تاریخی یا روایتی اشارات اس قدر ہیں کہ اُن کے لئے بھی یونانی اور
لاطینی ادب کا جاننا لازم آیا۔

لیکن انگریزوں نے اس کا علاج ایسا اچھا کر لیا ہے کہ شاید لاطینی
یا یونانی کا ایک حرف سیکھنے کے بغیر بھی انگریزی زبان اور انگریزی ادب
میں کما حقہٗ کمال پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ کتبِ لغات اس قدر صحیح اور محققانہ
اور ساتھ ہی اس قدر صاف اور مختصر لکھی گئی ہیں کہ جس لفظ کی تاریخ چاہو۔
فوراً معلوم کر لو۔ علم اللسنہ کی کتابیں ایسی صفائی کے ساتھ اور اس قدر
عام فہم لکھی ہیں کہ غیر زبانوں کی باقاعدہ تعلیم پانے کے بغیر بلکہ اُن کی

ابجد تک جاننے کے بغیر اُن کے تمام ضروری ابتدائی قواعد معلوم ہو جائیں انگریزی محاورات کے اُصول مدوّن کر دیئے۔ کہ غیر ملکوں کے لوگ بھی چند روز کی محنت اور توجّہ میں انگریزی محاورے پر قادر ہو جائیں۔ تلمیحات اور قصص جنکا ادب میں ذکر ہے اُن کی ڈکشنریاں الگ بنا دیں جیسی فارسی میں مصطلحاتِ وارستہ ہے (اگرچہ تلمیحات اور مصطلحات میں فرق ہے) صرف و نحو کے قاعدے ایسے علمی طریقوں سے اور ایسے جامع اور مانع لکھے گئے ہیں کہ غلطی کا موقع باقی نہیں چھوڑا۔ عروض بدیع اور بیان کی کتابیں عمدہ سے عمدہ موجود۔ اُصول تنقیدِ کلام۔ تذکرہ غرض ہر ایک فن کی کتابیں مختصر سے مختصر اور مبسوط سے مبسوط اور سب عام فہم موجود ہیں۔ کوئی ضرورت لاطینی اور یونانی سیکھنے کی نہیں ہے۔ انگریزی زبان میں ہی اُس میں پُورا پُورا کمال پیدا کرنے کے سارے سامان موجود ہیں۔ ایسے ہی سامان ہم کو اُردو میں پیدا کرنے چاہئیں۔ لُغت میں اشتقاقِ الفاظ کی بحث عمدہ عمدہ اور جامع کتابوں میں لکھکر شائع کرنی چاہیئے۔ تلمیحات اور قصص کی کتابیں اُصول محاورات کی کتابیں۔ بدیع اور بیان کے ضروری قواعد کی کتابیں۔ عروض کی کتابیں۔ غرض جس جس قسم کی کتابوں کا ذکر انگریزی ذکر میں لکھا گیا وہ سب اُردو میں مُہیّا ہونی چاہئیں۔ اُردو زبان کا سچّا دوست وہ ہے جو اس کام کا کوئی معتدبہ حصّہ کر گذرے۔ اب بھی عربی اور فارسی کا علم ہماری قوم میں باقی ہے مگر آیندہ اس کے رہنے کی اُمید کم ہے۔ اب اگر کچھ سامان ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ پھر وقت نہ رہیگا۔ میں نے بھی ایک کام ایامِ طفولیت میں شروع کیا تھا یعنی اُردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب مولوی محمد حسین آزاد کی جامع القواعد فارسی کے طریقے پر لکھی تھی

چونکہ وہ لڑکپن سے خالص جوش میں شروع ہوئی تھی اسلئے اختتام کو بھی
پہونچ گئی تھی چنانچہ وہ کتاب مکمل موجود ہے اور ارادہ ہے کہ انشاءاللہ
تعالےٰ اُسپر ایک کامل نظر ثانی کرکے اور نیز اُس کی کوتاہیاں پوری کرکے
اُس کو شائع کرونگا۔ اِسی طرح ایک ایک کام ہمارے نوجوان دوست
اپنے ذمے لیلیں تو چند سال کی محنت کے بعد اُس قسم کی کتابیں بہم پہونچ
سکتی ہیں جن سے اُردو زباندانی اور اُردو ادب کے مذاق میں ترقی کرنا
آسان ہو جائے محنت کے صرف میں کفایت شعاری کرنا سائنس کا
ایک نہایت قابل قدر حصل ہے۔ اِسی کفایت شعاری کے اُصول کو
ہر جگہ قابل عمل بنانا چاہیئے۔

میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں کہ گو ایسی کتابیں بھی لکھی جائیں پھر بھی
اُردو زباندانی کے کمال کے لیئے فارسی زبان اور ادب اور عربی
زبان کا جاننا ضروری ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر درجہ کمال کے لئے
اُردو کے زباں داں کو یہ کتابیں ہی مکتفی ہونگی۔ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے
کہ زباندانی کے خاصے اچھے کمال کو سہل الحصول کرنے سے یہ ہوگا کہ
اُسکو آسان پاکر بہت لوگ حاصل کرینگے اور جب بہت لوگ حاصل کرینگے
تو اُنھیں میں سے وہ لوگ بھی نکل آئیں گے جو خاص کمال حاصل کرینگے
اور اس درجۂ اختصاص کے لئے عربی اور فارسی کی طرف رجوع کرینگے
علاوہ ازیں عربی ہماری قوم میں دینی حیثیت سے ہمیشہ رہیگی اور اُمید ہے
کہ اُسکے ساتھ ساتھ فارسی بھی رہیگی اور اسلئے خاص شوق کے آدمیوں کو
اُن زبانوں اور اُن کے ادب سے بہرۂ کافی حاصل کرنے کا موقع حاصل رہیگا
لیکن جو لوگ خاصکر ایسی فرصت نہ رکھتے ہوں یا اتنی محنت اُٹھانا کسی

باعث سے گوارا نہ کرسکیں۔ کیا وجہ ہے کہ جسقدر لطف زبان اور ادب کا اُٹھانے کی قابلیت وہ رکھ سکیں اُن کو اُس قابلیت کے حاصل کرنے کے معقول ذریعے نہ دیے جائیں۔ علم سینہ بسینہ ہمیشہ انعدام کے خطرے میں ہے۔ احاطۂ تحریر میں آجائے تو محفوظ ہوجاتا ہے۔ سخن فہمی کے ہزاروں نکات ہیں کہ یا تو حیز تحریر میں مدوّن ہوسکے نہیں۔ یا آسکے ہیں تو ایک مسلسل شکل میں یکجا نہیں۔ کوئی با مذاق شخص شہد کی مکھی کی طرح ہزاروں پھولوں سے گرد نثار ہوتا پھرے تب کہیں کچھ حاصل کرسکے۔ چونکہ خود شاعروں اور مصنفوں کی ایک اعلیٰ غرض ہے کہ اُن کے جوہر شناس دنیا میں موجود ہوں اسلئے اُن نفائس اور نکات کو ایک مسلسل اور مرتّب اور مجتمع شکل میں دنیا کے حوالہ کرنا خود شعرا اور مصنفین کے فائدے کے لیئے ہے اور اِسی سے دُنیا کو بھی فائدہ پہونچ جائیگا۔ ہم خرما و ہم ثواب اور کیا چاہیئے۔ جنسِ کمال کے گاہک پیدا ہوں۔ خاطر خواہ قیمت دینے والے پیدا ہوں اور لوگ اُس خالص مسرت اور اعلیٰ فلسفے سے لُطف اور فائدہ حاصل کریں جو علمِ ادب میں ہے۔

پس مَیں اُردو زبان اور اُردو ادب کے تمام خیر خواہوں اور اُن کی ترقی اور استقلال کے آرزومندوں کو مخاطب کرکے مذکورۂ بالا تجویز غور اور بحث اور سب سے بڑھکر عمل کے لئے اُن کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں کہ کون کون اہلِ ہمت سے کس کس کام کو کرکے دکھا سکتے ہیں +

نیرنگ
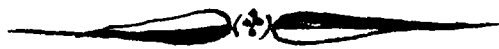
حال میں جب میں الہ آباد سے لکھنؤ جا رہا تھا اتفاق
سے ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کی ملاقات
کا مجھکو ایک عرصہ سے اشتیاق تھا یہہ صاحب مذہباً عیسائی
تھے مگر لٹریچر پر ان کے احسانات اِس قدر زیادہ تھے کہ ان کی
وقعت میری نگاہ میں مسلمانوں سے کم نہ تھی کانپور تک میں اِن کا
ہمسفر رہا بہت سی باتوں کے بعد میں نے اُنسے یہہ بھی دریافت
کیا کہ اسلام کی بابت آپ کی رائے کیا ہے۔ دو سوا دو گھنٹہ
تک اس موضوع پر میری اِن سے گفتگو ہوئی انکا دعوے
تھا کہ یورپ کا موجودہ تمدن مذہبی اصول پر مبنی ہے اور میں اس کے
برخلاف تھا تاہم اسلام کی بابت انکا خیال اسقدر درست تھا کہ مجھکو
ایک عیسائی کی زبان سے پیغمبر اسلام صلعم کی نسبت ایسے
الفاظ سنکر بہت ہی تعجب ہوا موسیٰ عیسیٰ اور محمد علیہم
السلام کی شریعت پر بحث تھی وہ مسلمانوں کی
موجودہ حالت اور اسلام کو لازم و ملزوم قرار دیتے
تھے اور میں اِس کے برخلاف تھا بالآخر اِس منصف شخص
نے یہہ اعتراف کیا کہ پیغمبر اسلام صلعم نامور تاریخی

تاریخی شخصوں میں سب سے بڑا آدمی ہے۔ مگر اُسنے میرے اقوال کی تردید میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی بدحالی سے استدلال کیا اور کہا کہ مذہب اسلام کی جو تعریف تم نے بیان کی ہے آجکل مسلمان اُسکے بالکل برعکس ہیں۔ میں نے کہا اسلام اور مسلمانوں کے درمیان غالباً اسیقدر فرق ہے جس قدر کہ عیسائیت اور عیسائیوں کے درمیان ہے۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ ایک انصاف پسند شخص کے لیئے یہی کافی ہے کہ اسلامی تمدن کی بُنیاد صرف مذہب اسلام کے ذریعے سے قائم ہوئی اور جسقدر وہ مذہب میں بدعتیں ایجاد کرتے اور اُس کے صراط مستقیم سے منحرف ہوتے گئے اُسیقدر تمدن کا سایہ اُن کے سروں سے دور ہوتا گیا حتّےٰ کہ اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے جسکو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر یوروپین تمدن جس کو آجکل لوگ مسیحی تمدن کے نام سے موسُوم کرتے ہیں اُس کی بُنیاد اُس وقت قائم ہوئی جبکہ اہل یورپ کو مسلمانوں کے ساتھ میل جول کا اتفاق ہوا اور اُنکی کتابیں لیکر اپنی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یُورپ کی قومیں تمدن اور شائستگی میں جسقدر ترقی کرتی جاتی ہیں اُسیقدر وہ عیسائیت سے دُور ہوتی جاتی ہیں۔ یہانتک پہنچ کر ہماری بحث کا خاتمہ ہوا۔

المنار

ہائے شبلی - وا حالی

بپا آج کیوں شور ماتم ہے گھر گھر زمانہ ہے کیوں نوحہ خواں زار و مضطر
یہہ کیا تازہ آفت اب آئی ہے سر پر دل و جاں میں برپا ہے کیوں شورِ محشر

زمانہ نے وہ داغ دلکو دیا ہے
کہ دُنیا میں اندھیر چھایا ہوا ہے

رواں دونوں آنکھوں سے آنسو ہیں پیہم کیا دونوں ہاتوں نے دل لے کے ماتم
بنے مرثیہ خواں دل و جانِ پُر غم مُصیبت میں ہیں مبتلا دونوں عالم

جدا ہم سے ہیں ہائے شبلی و حالی
نہ پوچھو جو حالت ہے اب جان و دل کی

اگر ایک تھا مایۂ فضل و عزت تو تھا دوسرا افتخار فضیلت
اگر ایک تھا خوش دل صاف طینت تو تھا دوسرا معدن حسن خلقت

جو شبلی سے تھی رونق بزم دُنیا
تو حالی بھی تھا وجہ عزت جہاں کا

ریاض جہاں میں اگر گُل تھا شبلی تو حالی تھا اُس گُل کی بُو بھینی بھینی
جو تھی ایک سے اپنے دل کی تسلی تو راحت بنی دوسری ذات جاں کی

غرض دونوں جانانِ جانِ جہاں تھے
وہ دو ایک بے مثل جادو بیاں تھے

کہاں روٹھکر ہمسے اب جا بسے وہ خفا ہو کے ہمسے کہاں کو گئے وہ
جیے جب تلک قوم ہی کے رہے وہ مرے بھی تو اب قوم ہی پر مرے وہ
"نہیں قوم میں اب نہ شبلی نہ حالی ہمیں اب قوم تیرا ہے اللہ والی"

هو الناصر

اوم بائی

آئیگی موت تو ہو جائیگا درماں اپنا | جاکے مرقد میں نکل جائیگا ارماں اپنا
تجھسے اُمید عبث تجھسے تمنا ہی عبث | تو نہیں اور نہوگا کسی عنوان اپنا

۲۴ مارچ سنہ ۱۹۱۴ء کو میں بیلا پور ایک ہندو رئیس کا بلایا ہوا دہلی سے پہونچگیا جنھیں صدہا بیدراج اور بہت حکیم اور سترہ سول سرجن لاعلاج کہہ چکے تھے علاج شروع ہو چکا تہا اور اس بستی کے رہنے والوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ فراق دہلوی دو آرکان جی سومنات دلاولپنڈی کاشی پراگ اجودھیا جی پشکر جی ہردوار بہت سے ہندو تیرتھ اور جاترا کے مقاموں پر رہچکا ہے اور صوفیانہ خیال (ویدانت) میں ڈوبا ہوا ہے اسواسطے بہت سے ہندو میرے پاس آنے لگے اور پرشار بھیٹیں پڑھنے لگیں اور ہندو سوسائیٹی کے نت نئے قصے میرے کان میں پڑنے لگے انھیں لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے ۴ میل کے فاصلہ پر ایک اوجڑ گاؤں سے متصل گنگا کے کنارے ایک بائی ٹھیری ہوئی ہیں جو سنسکرت ودیا ایسی جانتی ہیں جن کے آگے بڑے بڑے پنڈت مُنہ نہیں کھول سکتے ہیں اور ویدانت میں بھی پُورا دخل ہے اور اونکی زبان میں بھی تاثیر ہے جس بیمار کو یا حاجتمند کو دُعا دیتی ہیں اونکا بھلا ہو جاتا ہے یہ بھی سُنا ہے وہ کسی راجہ کی بیٹی اور ایک راجہ کی رانی ہیں اونکے کمٹ میں اینور

وپر ماتما ایسا بیٹھا کہ راج پاٹ کو لات مار کر سنیاس لے لیا اِس آخر کے فقرہ نے میرے دل پر اثر کیا اور میں سمجھا کہ بائی کی لائیت ضرور عجیب ہوگی اوسنے ملنا چاہیئے ۱۵ اپریل کو میں تانگہ میں سوار ہوکر اوجڑ گاؤں کے پاس پہونچا اور راہبر مجھے گنگا کے کنارے بائی جی کے استہان پر لے آیا مینے دیکھا دریا کے قریب دو چھپر پڑے ہوئے ہیں چھپروں کے آگے نیم کے کچھہ درخت ہیں جنکے ٹہنے ٹہنیاں ملکر ایک خاصہ سائبان بنگیا ہے انکے نیچے چبوترہ ہے اور اوسپر بوریا بچھا ہوا ہے اور بائی جی آسن مارے بیٹھی ہیں اونکے سامنے بہت سی ہندو عورتیں مرد حاجت مند اہل غرض حاضر ہیں بائی جی کے پیچھے دو عورتیں ساڑہی باندھے مؤدب کھڑی ہیں جو قرینہ سے اونکی نوکر یا چیلی معلوم ہوتی ہیں بائی جی سے جب میری آنکھیں چار ہوئیں تو میں سمجھا پورنماشی کا چندرمان گنگا کے کنارے اُتر آیا ہے عمر تیس برس سے کم نہ تھی مگر چونکہ گلشن حسن کو کسی گلچیں نے چھیڑا تک نہ تھا اسلئے سر سے پاؤں تک تازگی اور بہار ایسی تھی جیسے بارہ برس کے کنیان میں ہوتی ہے چہرہ کا بھولاپن کہے دیتا تہا کہ حقیقت کے غلبہ نے مجازی لطف اور لذتوں سے بالکل بے خبر رکھا ہے ململ کی آدہی ساڑہی باندھے اور آدہی اوڑہے ہوئے تھیں ماتھے اور بازوں پر سرخی گنگا جی کی پوتر مٹی صندل کی جگہ لگی ہوئی تہی مگر خوبصورت بدن کی جوت اوس میں سے پھوٹ رہی تھی یا چاندنی جھلک بدلی میں سے چھن رہی تہی پیشانی سے ایک اُنگلی تک ایک رومال سموسہ کے طور پر سر سے بندھا ہوا تہا میں نے سلام کیا اور سلام کے جواب میں بائی جی نے بندگی کہہ کر اشارہ کیا

کر آپ اوپر آ بیٹھے میننے دو روپیہ اپنی جیب سے نکال کر بائی جی کے
قدموں کے پاس ڈالدئے مگر اونکی چیری نے وہ روپیہ اُٹھاکر مجھے
دیدئے اور کہا بائی جی کسی کی نذر بھینٹ یا دکشنا نہیں لیتی ہیں میننے
بائی جی سے بہت اصرار کیا مگر روپیہ نہ لیئے چند منٹ میں سب اہل
حاجت رخصت ہوگئے اور میں رہگیا تو بائی جی نے بڑے خلق سے
میرا نام اور میرا وطن پوچھا اور جب میں اسکا جواب دیچکا تو فرمایا
آپنے میرے پاس کیوں تکلیف کی ہے میننے کہا صرف آپکے درشن
کرنے کے لئے کیونکہ میننے بہت لوگوں سے آپ کی قابلیت اور
دیانت کی تعریف سنی تھی میری یہ بات سُنکر بائی جی نے اپنا سر نیچا
کرلیا اور دیر تک خاموش رہیں پھر تصوّف کے متعلق باتیں ہونے لگیں
بائی جی تو اس کوچہ سے آگاہ تھیں ہی مگر میننے بھی بائی جی سے ایسی
باتیں کیں جس سے وہ خوش ہوئیں اور چلتے وقت کہنے لگیں حکیم جی
فرصت ہو تو پھر اِدھر پھیرہ کرنا میننے اپنے دل میں کہا۔ ؎

گو نپاؤں اسکی باتیں گو نپاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھسے یہ پری پیکر کھُلا

میننے کہا مریضوں سے چھٹکارہ ملیگا تو ضرور حاضر ہونگا جب میں اُٹھا
تو بائی جی نے اپنی چیلی کو اشارہ کیا وُہ دو ناریل اور چار پانچ ککڑیاں
جو باریکی اور پتلے پن میں مجنوں کی پسلیاں یا لیلیٰ کی اونگلیاں تھیں اور
کچھ کیلے لائی اور مجھے دینے لگی میننے یہ سب ترکاری لیلی اور کہا بائی
جی جو آپ نے مجھے دیا وہ میننے لیلیا مگر آپنے میری بھینٹ نہ لی اسکا
افسوس ہے بائی جی کہنے لگیں حکیم جی تم دنیا دار ہو تمھیں فقیر کا دیا ہوا کچھ

سے لینا عیب نہیں ہے مگر ایک تارک الدنیا فقیر کو روپیہ پیسہ سے لینا برا پاپ ہے۔ مئی کے آخر تک میں بائی جی سے کئی بار ملا اور بائی جی کا التفات میری طرف بڑھ گیا اس ڈیڑھ مہینہ کے عرصہ میں مینے بائی جی کے کیریکٹر پہ ایک گہری نظر ڈالی اور مجھے غور کرنے سے یقین ہوگیا کہ یہ ضرور کوئی امیرزادی ہے اور کوئی صدمہ اُٹھاکر اسنے یہ فقیری لی ہے ایک دن مینے دل کڑا کرکے کہہ ہی دیا کہ آپکا نام کیا ہے اور وطن کہاں ہے اور آپ کس طور سے فقیر ہوئی ہیں میں اس کے سننے کا مشتاق ہوں۔

بائی جی حکیم صاحب میں سارے ہندوستان میں چل پھر آئی مگر آج تک یہ سوال کسی نے مجھسے نہیں کیا میں جہاں ٹھیری لوگوں نے اپنی ہی رام کہانی میرے آگے کہی کوئی بھبوت لیکر چلا گیا کسی نے منتر پوچھا کسی نے جنتر کا سوال کیا اور پوچھ کر لنبا ہوا کسی نے یہ نہ پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں کی ہو کیونکہ جو لوگ خودغرضی میں مُبتلا ہوگئے وہ کسی اور کی مصیبت سے کب واسطہ رکھیں گے ہزاروں آدمیوں میں ایک آپ مجھسے بے غرض ملے اور میرے حال کی معلوم کرنے کے مشتاق نکلے گو میرا ناچیز حال آپکے سننے کے لایق نہیں ہے مگر ابکے پھیرہ پر میں کسی شخص کا قصہ آپ کو ضرور سُنادوں گی۔ یکم جولائی کو میں بائی جی کے پاس پھر گیا اور اونکی بڑی خوشامد کی تو انھوں نے سلسلہ کلام اس طرح چھیڑا۔

(۲)

پشکر جی ایک تالاب کا نام ہے جو اجمیر سے ۷ میل کے فاصلہ پر

ناگ پہاڑ سے اُدھر اُتر کی طرف واقع ہے اس مقام کو برہما جی نے
عبادت کے لیے پسند کیا تھا برہما جی کا مندر سوائے پشکر کے ہندوستان
بھر میں نہیں ہے اس تالاب کے کنارے پر ایک بہت بڑا قصبہ آباد
ہے جو پشکر کے نام سے منسوب ہے اس قصبہ کی ساری عمارتیں چُونہ
گچی اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور اس سے چند قدم پر شمال کی طرف پہاڑ
کا سلسلہ کوسوں تک چلا گیا ہے جو اگست ستمبر میں ہریاول دُوب اور
قسم قسم کی پہاڑی درختوں کی سرسبزی سے بالکل زمردین ہو جاتا ہے
قصبہ کی پختہ دو منزلہ عمارت پر چڑھ کر دیکھا جاتا ہے تو پہاڑ کا ہرا
ہرا عکس تالاب میں دکھائی دیتا ہے اور دیکھنے والے کو گمان ہوتا
ہے کہ سبز پری اپنے جوبن اور اپنے بناؤ سنگھار کو آبدار آئینہ میں
دیکھ رہی ہے قصبہ کی شہر پناہ پر جب مور ناچتے ہیں اور اوپر سے
چھم چھم مینہ برستا ہے تو ایک عاشق مزاج نوجوان کو یہ خیال بند بتا
ہے کہ حور وشش کنچنوں کا ناچ راجہ اندر کو پسند آ گیا ہے اور وہ عالم
بالا کے نشیمن میں سے اوپر سچے موتی نچھاور کر رہا ہے ہندو دھرم
کے جاتری جو پشکر آتے ہیں وہ اجمیر ہو کر زیادہ آتے ہیں کیونکہ اجمیر
آر ایم آر کا ایسا جنکشن ہے جہاں بمبئی مدراس دکن سندھ مالوہ اور
ادھر باندی کوئی نارنول پھلیرہ کی شاخیں کلکتہ نیپال وغیرہ ملکوں کے
مسافروں کو اکٹھا کرتی ہیں جب اجمیر سے جاتری پشکر جی کو جاتے ہیں
تو انھیں پہاڑی تانگا اور مضبوط ٹم ٹم کرایہ کو ملتی ہیں جن میں چالاک خچر
یا یابو جُتے ہوتے ہیں اناساگر ہی سے پہاڑ کی سلامی شروع ہو جاتی
ہے اور تقریباً تین چار میل تک پہاڑ پر چلنا پڑتا ہے اس پہاڑ پر

سڑک سرکار انگریزی کے با اقبال ہاتوں نے بنائی ہے جس میں پہاڑ بڑی صنعت سے کاٹ کر مسطح کیا گیا ہے اس سڑک کے قریب اگلے زمانہ کے رستہ کے بھی کچھ کچھ نشان پائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر دل دھڑکتا ہے کہ اِس بیڈول اور ناہموار راہ سے کیونکہ لوگ آتے جاتے ہونگے۔ جولائی ۱۸۹۲ء کی چوتھی تاریخ کو ایک تانگہ پشکر سے اجمیر کی طرف دوڑا آرہا تھا مگر کوچبین اسپر بھی گھوڑہ کو چابک سے پیٹ رہا تھا کیونکہ شام ہو چلی تھی آفتاب پہاڑ کے پیچھے جا چکا تھا اور گھنٹہ بھر پہلے جو پرندجا بجا زمین پر بیٹھے ہوئے اپنا کھاجہ تلاش کر رہے تھے اوڑ اوڑکر اپنے آشیانوں کو چلدیئے تھے اور چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے نیلے آسمان میں اوڑنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مینچسٹر کی بنی ہوئی دریں کا رنگین سائبان آسمان میں تنا ہوا ہے تیز رفتار ٹونگہ جب ایسی جگہ پہونچا کہ جہاں سے پشکر اور اجمیر آدہوں آدہ دور رہتا تھا تو ٹونگہ کا ایک پہیہ ٹوٹا اور پہیہ کے ٹوٹتے ہی کوچبین ایک طرف تانگہ ایک طرف گرا تانگہ کے ساتھ گھوڑا بھی سپٹے آیا اور وہ ہات پاؤں مارنے لگا تو تانگہ کا بالکل بھرکس نکل گیا اور تانگہ کے اندر سے شور و فریاد سُنائی دی اور دو عورتیں بہت دقت کے ساتھ اوسکے نیچے ہانپتی کانپتی روتی دھوتی نکلیں جو اسمیں سوار تھیں ایک عورت کوئی ساٹھ برس کی بڑھیا ہوگی دوسری عورت کی عمر پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی اسکی ریشمی ساڑھی اور سونے کا جڑاؤ گہنا کہہ رہا تھا کہ یہ امیرزادی ہے اس رنگین بہاس اور قیمتی زیور نے اسکے حُسن و جمال کو کچھ چار چاند لگائے تھے بلکہ اس پری پیکر کی اُٹھتی جوانی گورے رنگ اور ہاتھ پاؤں کی نزاکت

اعضا کے سڈول ہونے سے بباس اور گہنے کو بھاگ لگ گئے
تھے یہ دونوں عورتیں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں سامنے میں کوچمین سر
سہلاتا ہوا ٹونگہ کے نیچے سے نکلا اور اوسنے بڑی مشکل کے ساتھ گھوڑہ
کے ساز کے بکسوئے کھولکر گھوڑے کو اٹھایا اور ان عورتوں سے کہنے
لگا آپکے چوٹ تو کہیں نہیں آئی بوڑھی عورت بولی نہیں پرمیشر نے بال بال
بچا لیا کم سن پریزاد کہنے لگی یہاں سے اجمیر کتنی دور ہے کوچمین نے کہا
جتنی دور ہم پشکر سے آئے ہیں۔

پریزاد لڑکی اب کیسے ہوگی شام تو ہوگئی ہم اجمیر کیونکر
پہونچیں گے۔

کوچمین بھلا صاحب میں کیا بتاؤں ٹونگہ میرا نہیں ہے سیٹھ جی
کا ہے جب وہ سنیں گے کہ ٹونگہ ٹوٹ کر آزاد ہوگیا تو رام جانے مجھپر
کیا انٹ توڑینگے اور تنخواہ کے تمام ادھی ہی نہیں دینگے۔ اس قسم کی
دو چار باتوں میں شام آگئی اور پہاڑ کی سرسبزی ہوناک سیاہی کے
رنگ میں تبدیل ہونے لگی ٹونگہ والا چپ بیٹھا ہوا تھا اور عورتوں کا کلیجہ
جنگل اور پہاڑ کے سناٹے سے دہلا جاتا تھا وہ سن چکی تھیں کہ پشکر جی کے
اردگرد گونڈ بھیل لٹیری قومیں رہتی ہیں اور اکیلے دوکیلے مسافر کو تو
جیتا چھوڑتے ہی نہیں زیور اس وقت پریزاد لڑکی کے لیئے وبال جان
ہوگیا تھا جب اندھیرا زیادہ ہوا تو یہ دونوں عورتیں چیخیں مار مار کر رونے
لگیں مگر اس اجاڑ میں کون بیٹھا تھا جو انکی ہمدردی کے لیئے نکل آتا
یکایک پریزاد لڑکی کو کچھ خیال آیا اور اوسنے پشکر جی کی طرف منہ کرکے
کہا اے میری برہما جی اے سری پشکو جی مجھے تو میرے ماتا پتا دونوں دکھتے

تھے کہ تو اکیلی نہ جانا مگر میں آپ کے تیرتھی کے شوق میں چلی ہی آئی
اب آپ مجھے کسی چیتہ یا شیر کو کھلائیں گے یا میری جان آبرو کسی چور
سے برباد کروائیں گے اے مہاراج میری جلدی مدد کیجئے لڑکی ابھی دُعا
میں مشغول تھی جو ایک گاڑی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور کوئی بیس
منٹ میں دو تانگے آگے پیچھے پشکر کی طرف سے آتے ہوئے نظر
آئے ان عورتوں کا تانگہ بیچ سڑک میں ٹوٹا ہوا پڑا تھا اس لئے جب وہ
دونوں ٹونگہ پاس آئے تو ایک دم سے رُک گئے اور ٹوٹے ہوئے
تانگہ کے کوچبان سے ان آنے والوں ٹونگہ کے کوچبانوں سے بات
چیت ہوئی اس کوچبان نے کہا میری تانگہ کی سواریاں دکن کی رہنے
والی دو عورتیں ہیں اس بات کے سُنتے ہی ایک نوجوان مرد پھرتی کے
ساتھ ٹونگہ میں سے اُترا اور اُسنے پاس آکر اون دونوں عورتوں کو غور
سے دیکھا اور اُسے یقین ہوگیا کہ یہ مُلک دکن کی رہنے والی ہیں اس
نے تلنگی زبان میں عورتوں سے پوچھا کہ دکن میں آپ کس مقام کی
رہنے والی ہیں۔

بوڑھی عورت ہم بیدر کے رہنے والے ہیں یہ لڑکی راجہ
گھنشیام سنگھ کی پتی بیاہی بیٹی ہے جو علاقہ بیدر کے ایک مشہور
رئیس ہیں اور انھیں راجہ کا خطاب ہے آنکھوں سے اندھے ہوگئے
ہیں اور رانی اور بچوں کو لیکر آجکل تیرتھ جاترا کے لیے دکن سے
ہندوستان آئے ہیں اور اجمیر میں ٹھیرے ہوئے ہیں سفر کی تکان سے
کچھ طبیعت خراب ہے اسلئے وہ اور اونکی رانی پشکر جی نہیں آئے
یہ لڑکی ہٹ کرکے چلی آئیں پشکر جی سے پلٹتے ہی ٹونگہ ٹوٹ گیا اب

میں اور یہ جنگل میں بیٹھے رو رہی ہیں۔ نوجوان پوربی عورت سے تلنگی زبان میں جواب سُنکر خوش ہوا اور کہنے لگا آپ گھبرایئے نہیں، ہمارے پاس دو تانگہ ہیں ایک تانگہ میں ہم سب مرد بیٹھے جاتے ہیں اور ایک تانگہ آپکے لیے خالی کئے دیتے ہیں اوس میں آپ سوار ہو جایئے اور ہمارے ساتھ چلیے ہم آپ کو آپکے مکان پر آرام سے پہونچا دینگے جہاں آپکے ماں باپ ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ان باتوں میں دونوں ٹونگہ والوں نے اپنی اپنی ڈبل لال ٹینیں روشن کر لیں اور اوس نوجوان امیرزادہ کا خدمتگار ایک برقی لال ٹین جلا کرے آیا پانچوں لال ٹینوں کی روشنی سے سڑک پر دن نکل آیا اور اس پریزاد لڑکی کی اس نوجوان سے چار آنکھیں ہوئیں پریزاد لڑکی نے دیکھا کہ ایک بیس برس کا جوان رعنا انگریزی لباس پہنے ہوئے بغل میں تلوار دبائے کھڑا ہے جس کی آنکھوں کی حرکت تلوار کی دھار سے کم نہیں ہے بدن سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اِدھر اس نوجوان نے لڑکی کو دیکھا اور دیکھتے ہی اوس کے جگر میں عشق کا نشتر چبھ گیا ایک نے دوسرے سے بات چیت نہیں کی مگر بے بولے چالے ہی ہزاروں سوال جواب ہو گئے۔

نوجوان (بوڑھیا سے) کیوں مائی تمہارا کیا نام ہے۔

بوڑھیا حضور مجھے کندن کہتے ہیں۔

نوجوان آپ برہمنی ہیں۔

کندن جی مہاراج۔

نوجوان اور تمہاری راج کماری کا کیا نام ہے

کندن حضوران کا نام اوم بائی ہے۔

نوجوان میں ان کے سارے گھرانے سے واقف ہوں کیونکہ ہم اور یہ لوگ سورج بنسی ہیں۔

کندن۔ مہاراج آپ کا کیا نام ہے اور دکن میں آپ کس شہر کے رہنے والے ہیں۔

نوجوان میرا نام رام سنگھ ہے اور صوبہ زنگل میں پنتیم گڈھ کا رہنے والا ہوں۔

کندن رام سنگھ تو پنتیم گڈھ کے راجہ کا نام ہے کیونکہ میرا بھتیجہ اسی راجہ کی سرکار میں نوکر ہے۔

رام سنگھ میں وہی رام سنگھ ہوں۔ اچھا آپ اور آپکی راج کماری ٹونگہ میں سوار ہوجائیں کیونکہ اندھیری بڑھتی جاتی ہے اور پہاڑ کا رستہ ہے۔

کندن مہاراج آپنے ہم پر بڑی دیا کی۔

راجہ کچھ دیا کی بات نہیں ہے اول تو ہم تم ایک دیس کے رہنے والے پھر راجگنشیام سنگھ کا اور ہمارا ایک خون یہ ہو سکتا تھا کہ ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے اور اگر ہم آپ ایک دیس ایک خاندان کے نہوتے تو بھی انسانی ہمدردی کے خلاف تھا کہ دو کمزور بیکس عورتیں رات کے وقت بیابانِ جنگل میں دوہائی دیں اور مرد اور مرد بھی راجپوت جن کی گھٹی میں مروّت اور غیرت گھولکر ڈالی گئی ہے وہ انھیں چھوڑ کر چلا جائے

اوم بائی اور کندن برہمنی کو راجہ رام سنگھ نے ٹونگہ میں سوار کروایا اور اون کا تانگہ آگے کر لیا پھر دوسرے ٹونگہ میں مع نوکروں کے آپ سوار ہوئے اور دس بجے رات کے اجمیر پہونچے اور جب تک دونوں عورتیں اپنے مکان میں چلی نہ گئیں باہر کھڑے رہے کندن نے راجہ صاحب

سے کہا کہ آپ ہی ہمارے ساتھ آیئے لیڈر اوم بائی کے پتا سے ملیئے مگر انھوں سنے کہا اسوقت مہاراج کو تکلیف ہوگی رات بہت گئی ہے صبح آکر ملونگا اوم بائی کے باپ گھبرا رہے تھے اور رانی جی سے کہہ رہے تھے کہ اوم بائی بڑی ضدن لڑکی ہے پردھتنی کو ساتھ لیکر پشکر جی چلی گئی نہ ہمارا کہنا سُنا نہ تمہارا یہ ہندوستان کا ملک ہے دس بجگئے رات اندھیری ہے اور ابتک نہیں آئی پرمیشر خیر کرے جو اس میں اوم بائی اور کندن پہونچ گئیں اور رستہ کی مصیبت راجہ رام سنگھ کی ہمدردی بیان کی راجہ گھنشیام سنگھ نے کہا اوم بائی نے غلطی کی جو ایسے بھلے آدمی اور رئیس کو گھر تک نہ لائیں اور باہرے باہر ٹال آئیں اول تو وہ ہم سے حیثیت میں بہت بڑے رئیس ہیں پھر ہمارے گوت کے بھائی ہوتے ہیں۔ تیسرے تمہاری جان آبرو بچائی اونکا بڑا شکر ادا چاہیئے تھا +

(باقی دارد)

حررۂ حکیم ناصر نذیر فراق از شہر دہلی رودگران مد رسالۂ دتمند خان مکان ظریف مرحوم

غزل

اوٹھ کے چہرے سے نقاب یار آدھی رہگئی — آدھی نکلی حسرت دیدار آدھی رہگئی
ایصنم کل تنگ تھا تسبیح اس کے رو برو — آج کیا ہے سرخیٔ رخسار آدھی رہگئی
نصف کیوں اُلٹی نقاب رُخ جاناں اے صبا — میرے دل میں حسرت دیدار آدھی رہگئی
مضطرب کیوں ہے دل ناداں شب غم بیقرار — رات تو اب اے مرے غمخوار آدھی رہگئی
تخلیئے میں دشمن بد بیں ہوا آکر مخل — ہوکے اونسے وصل کی گفتار آدھی رہگئی
شکل میری دیکھکر کہتے ہیں سب احباب یوں — تیری صورت ہجر کے بیمار آدھی رہگئی
نیم بسمل کرکے روکا ہاتھ اے قاتل عبث — کیوں نکلکر میان سے تلوار آدھی رہگئی
نیم شب کو نیم راضی وہ ہوئے باربط عبث — رات آدھی رہ گئی تکرار آدھی رہگئی

صبحِ صادق

ہے صبح کا کیا سماں سہانا گویا ہے طلسمِ جا ددانا
وہ نُورِ سحر کی آمد آمد وہ مرغِ سحر کا چہچہانا
کہسار کا منظرِ دل آویز انوارِ شفق کا رنگ لانا
وہ حسنِ ملیحِ سبزۂ تر بیگانہ بھی لو ہوا یگانا
وہ گھاس کے فرشِ مخملی پر پھولوں کا ہنستا مسکرانا
وہ اوس کے موتیوں کی چادر فرّاشِ صبا کا لا بچھانا
اشجار کا جھومنا ہُوا سے شاخوں پہ گلوں کا سر ہلانا
ہونا وہ جہاں کا بقعۂ نور سورج کا اُفق سے سر اُٹھانا
وہ رقصِ نسیمِ صبحگاہی مرغانِ سحر کا وہ ترانا

از سینہ برآورد نفیرم
بر عرش ہے بروصفیرم

کیا صبحِ بہار مسکرائی سوئی ہوئی جاگ اُٹھی خدائی
ٹوٹا وہ طلسمِ خوابِ نوشیں گویا ہوئی موت سے رہائی
چڑیاں ہیں خوشی سے چہچہاتی ہیں بلبلیں محوِ خوشنوائی
بستی میں ہے دُھوم نامِ حق کی چرواہے نے بن میں تان اُڑائی
دیکھو کیا ابر نے بنایا جھولا کہسار پر ہوائی
تنتے ہیں چنار و سرو و شمشاد دکھلاتے ہیں شانِ کبریائی
گاتے ہیں پرند، پھول ہنستے فوّاروں نے دُھوم ہے مچائی

پانی کا بھی عجیب ہے نظارہ
تالاب میں پھول ہے کنول کا
یہ آب و تاب یہ صفائی
آئینہ ذوق خود نمائی

تاروں سے بھی بڑھ گئے ہیں گلِ تر
ہے ناز زمیں کو آسماں پر

منظر ہے یہ کیا ہی پیارا پیارا
کہسار کی اونچی چوٹیوں پر
یہ نور عجب ہے جس کے آگے
وہ شب کی سبھا ہوئی ہے رخصت
سورج تیرے نور نے جہاں میں
آکاس کا کیا چمک اٹھا ہے
عالم پہ ہے بیخودی سی طاری
گلشن میں پرند نعرہ زن ہیں
جنگل، بن، باغ، شہر، کہسار
دلکش، دلچسپ اور دل آرا
وہ چاند کا آخری نظارا
اب چاند رہا نہ کوئی تارا
ہے نور جہاں میں محفل آرا
ہر چیز کے روپ کو نکھارا
بے حد بے انت بے کنارا
دیکھے جسے دید کا ہو یارا
چشموں نے زمیں سے جوش مارا
ایک ایک بجا کے خود پکارا

از نشۂ دوست حسنِ مستیم
نا میکش بادۂ الستیم

قدرت نے تو ہے کتاب کھولی
پھولوں سے پیام پر صبا نے
ہیں صحنِ چمن میں گل پریشاں
دامانِ نسیم کو ٹٹولو
گلبن کا ابھار پر ہے جوبن
شاخوں پہ پھدکتے ہیں پرندے
آتی نہیں پر سمجھ یہ بولی
غنچوں کی گرہ زباں سے کھولی
کھیلی گلشن میں کس نے ہولی
پھولوں سے بھری ہوئی ہے جھولی
کلیوں کی ہوئی ہے چاک چولی
ہیں انکی ادائیں بھولی بھولی

غنچہ نہیں شاخ یاسمیں پر
ہے شاہد گلستاں کی ڈولی
بلبل کی الاپ دلنشیں ہے
کیا پیاری ہے عاشقوں کی بولی
سنبل نے زلف کو سنوارا
نرگس حیراں نے آنکھ کھولی

یہ قابل دید ہے نظارا
شاہد پردے میں آشکارا

نت روپ نیا دکھانے والا
نت رنگ نئے میں آنے والا
جاندار کو کرنے والا بیجاں
بے جان کو پھر جلانے والا
ہر چیز سے آپ ہو کے باہر
ہر چیز میں خود سمانے والا
لب تشنہ زمیں کو دیکے پانی
یہ سبزہ و گل اگانے والا
اس خاک کو دیکے صورت پاک
افلاک کا سر جھکانے والا
پھل پھول ہزار کر کے پیدا
الوان نعمت بچھانے والا
اک کن میں نظام کر کے موزوں
یہ بزم کہن سجانے والا
تاروں کو سما میں کر کے روشن
انوار ازل دکھانے والا
ثابت ہیں تو ہیں اسی سے قائم
سیار تو وہ چلانے والا

ہر چیز میں ہے ظہور اسیکا
صبح صادق میں نور اسیکا

صادق۔ از کشمیر

نمبر ۲۱ نوٹ ڈاکٹر ایس کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹۱۵ء کی خوبصورت تیار ہوئی ہے وہ مفت شریف پڑھے لکھے اشخاص کے نام اور پورا پتہ لکھنے پر جنتری بذا بلا قیمت و محصول بھیجی جاتی ہے

طاقت بڑھانیوالا پھل

کولا نامک افریقہ کا ایک نہایت قوت دینے والا پھل ہے زیادہ فکر و محنت کی وجہ سے یا غم و بیماری و تبدیلی آب و ہوا کے سبب بدن کمزور ہو گیا تو اسکو استعمال کیجیے نئی طاقت پیدا ہوتی ہے یہ دم کو بڑھاتا ہے۔ اس لیے گھوڑے کی سواری پہاڑ کی چڑھائی کسرت گانا پڑھنا پڑھانا وغیرہ کاموں میں پہلے اسکو استعمال کرنے سے دم نہیں پھولتا۔ ہول دل۔ دھڑکن کو روکتا ہے رات کو جاگنا ہو تو اسکو پی لیجیے تکان نہیں ہوگا یہ شراب اور افیون کی عادت کو چھوڑاتا ہے مفصل حالات فہرست بلا قیمت منگا کر دیکھئے قیمت ۳۲ مجوز کی شیشی ایکروپیہ محصول ۵

اصلی پیپرمنٹ کا تیل

پیپرمنٹ کا تیل درد۔ بدہضمی اور ریاح کے فساد کے لیے ایک بہت ہی مشہور دوا ہے یہ پیپرمنٹ سے کہیں بڑھکر بہتر اور مفید ہے۔ اسی پیپرمنٹ میں تارپین کا تیل ملا کر ایک کی تین تین شیشیاں بنا کر لوگ بازار میں چار چار آنہ اور چھ چھ آنہ پر بیچتے ہیں قیمت آدہ اونس شیشی دس آنہ اور محصول ڈاک وغیرہ ایک شیشی سے چار شیشی تک پانچ آنہ ۵

ادویات ہر جگہ دوکانداروں اور دوافروشوں سے مل سکتی۔ ورنہ کارخانہ سے طلب کیجیے

پلیگ سے کیوں ڈرتے ہو

سوا اور سب بیماریوں کے اس سے ڈرنیکا سبب یہ ہے کہ اب تک لاکھوں انسان اس موذی عارضہ کے پنجہ ظلم سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ گاؤں کے گاؤں اوجاڑ ہو گئے شہر کے شہر تباہ ہو گئے اس وجہ سے اس کے نام ہی سے دہشت ہوتی ہے پلیگ میں مبتلا ہونیکے بعد پھر کوئی علاج نہیں ہے لیکن بنظر حفظ ماتقدم ڈاکٹر ایس کے برمن کی پلیگ روکنے والی گولیاں منگوا کر ضرور رکھیں۔ اس گولیوں کے استعمال سے جسم کے خون میں کچھ ایسا اثر ہوتا ہے جس سے پلیگ کیڑے نہ ٹھہر سکتے اور نہ اونکا زہر اثر کر سکتا۔ وقت پر ان گولیوں کے استعمال سے ہزار ہا انسان پلیگ سے محفوظ رہتے ہیں آپ بھی غافل نہیں ہیں ایک گولی روزانہ ٹھنڈے پانی کیساتھ نگلیں اور بچوں کو نصف یا چوتھائی قیمت ۶۰۔ گولیوں کی ڈبیہ ۲۔ ۱۶ گولیوں کی ڈبیہ ۱۲ محصول ڈاک ایک سے چار ڈبیہ تک ۵

وقت پر صلاح

جو دوست بچے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے کہ موسم گرما آ گیا ہے اس موسم میں کھانسی بیماری کے باعث ہیضہ ہونیکا خوف رہتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے پہلے ہی ایک اصل عرق کافور منگوا کر اپنے گھر میں ڈال رکھیں جس سے اپنے یا پڑوسیوں کی وقت پر حفاظت ہو سکے۔ یہ اصلی عرق کافور عرصہ تیس سال سے تمام ہندوستان میں جاری ہے یہ عرق گرمی کے دست پیٹ کے درد و متلی کیلیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے قیمت ایک شیشی ۴ محصول ڈاک ایک شیشی سے ۴ تک ۵

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

جلد (۲) فروری سنہ ۱۹۱۵ء نمبر (۵)

رجسٹرڈ ایل نمبر (۸۵۸)

تمدن

معاشرتی تمدنی ۔ ادبی ۔ فلسفی ۔ اخلاقی ۔ تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹرز ۔ شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا ۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ قسم اول ۳ قسم دوم ۲ ۔ قیمت فی پرچہ ۴

کتبہ جعفر دہلوی

عِصمت

دہلی

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین
کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہو کنواری لڑکیوں
کیواسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت
اُن کو بتائیگا۔ کہ کنوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی محبت
بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت انکا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اس کیلئے
اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ سسرال والوں
کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف
با اطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں وہ بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری
گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے
عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے تأمل خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی
گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُن پر کیا کیا ہیں کیا طریقہ ہیں جن
سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھربار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں
کو دعائیں دیں گے عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے
خاندان کیساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کی سچ مچ کی بیگم بنا دیگا۔

ٹائٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا
فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بنانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت
کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر ماہ میں (۶۴) صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول ہوتی ہیں سالانہ قیمت ([illegible])

منیجر عصمت، و تمدن، دہلی

بوسۂ ندامت

(ایک فاحشہ کے مکان پر)

اے، مہ جبین، یہہ، چاندسی صورت، رسیلی، آنکھیں، شام سے، میرا، دل، بیچین کر رہی ہیں، آہ، یہہ، پھول، سے رخسار، مجھکو تباہ کر گئے، مار گئے۔

اے حسینہ، مجھپر رحم کر، میرے، گلے میں۔ یہہ بلوریں، ہاتھ، ڈالدے، آ، اے، مہوش، میرے، قریب آ، اجازت دے، کہ میں، اِس موہنی، صورت، کو سجدہ، کروں، مُنہ سے بول، اے مہوش، میری التجا، قبول کر، رات، آدھی سے، زیادہ گذر چکی، حکم دے کہ رات کا بقیہ حصہ، وُہ وقت، جبتک، بلبل خوش الحان، صبح کا پیغام لائے، تیری، خدمت میں، گذاردوں، جواب دے، اے آسمانی حور، مجھپر، کرم کر، میں مسافر ہوں، مہمان ہوں۔

یہہ، چاندی کا سکہ۔ دس روپیہ، اِس حسن خداداد کی اُجرت،

ان، گلاب سے پھولوں کا معاوضہ، ان، ظالم آنکھوں کی، نذر، قبول کر، ممنون کر۔

شراب کا دور، شروع ہوگیا، حسینہ، کی قاتل آنکھیں، سُرخ ہوکر، اور بھی، سفاک ہوگئیں، دو بج چکے تھے، چشم سرگیں، نشہ میں چور، نیند سے مجبور ہوئی، زلف سیاہ، میرے ہاتھ پر لہرائی، اب حسینہ کا سر، میرے زانو، پر تھا۔

قدرت، اس صنعت پر، ناز کر سکتی ہے، یہہ ایک پھول ہے، بھونرے اس کے گرد، جھومتے ہیں، شہد کی مکھیاں، ان نازک لبوں پر بھنبھناتی ہیں، ہُوا، ان کالے ناگوں سے کھیلتی ہے،

کیسا، سرسبز و شاداب چمنستان پیش نظر ہے، اس باغ کا ہر پھول، خوشنما، ہیں، ایک، ادھیڑ عورت سے ٹکوے ٹکوں کا تیوں میں، راتیں بسر کرنیوالا، انسان، آج، دُنیا، کی، بیش بہا، جنت میں ہُوں۔

ہُشیار ہو، اے حسن کی دیوی، آنکھ کھول، اجازت دے، کہ ان، شگفتہ پھولوں کو، سر پہ رکھوں آنکھوں سے لگاؤں۔

تین بج رہے تھے، حسینہ نے آنکھ کھولی، ایک بجلی، تھی، کہ چمکی، اور چمک کر گری، دل، اور جگر، دونو، تڑپ رہے، ایک کشش تھی، جذبۂ فطرتی، جس نے ان نیم وا، آنکھوں، تک پہونچا دیا، موتیوں سے آبشار، پہاڑ، کی چوٹیوں سے گر رہے تھے، ایک

ہلکا سا دور، اور، چلا، اور، چشم، نرگسی، مست ہوکر، بند ہوئی۔
وہی زلف سیاہ میرے ہاتھوں پر تھی۔
زندگی، کا انتہائی، مقصود، دنیا، کی بہترین کامیابی، یہہ مجسم حسن دوگھنٹہ، کا اور، میری، آنکھوں میں مہمان ہے، یہہ جڑاؤ مالا، جو اس، کے کھلے ہوئے سینہ پر، لوٹ رہی ہے۔
آہ! صبح کا پیغام سے آئی، بالیوں کے پھول باسی ہوئے، زیور، ٹھنڈا، پڑ گیا۔
کیسا، اچھا وقت، اور تاروں بھری رات ہے، کاش، باقی عمر اس صورت کی پرستش میں بسر ہوتی۔
مملکت حسن، پر سکہ چلانے والی، ملکہ، بیدار، ہو، ایک، نو وارد، تیرے، دربار، میں، حاضر ہوا ہے، تیری، حکومت، کا مداح، تیری، سلطنت، کا معترف۔
یہہ چند لمحہ، کی کھلی ہوئی کلی، ایک دریائے لطافت، ہی، جو لہریں لے رہا ہے، گلاب کے دو پھول، دونو آنکھیں، کنار دریا پر، جھوم جھوم کر، اپنا، منہ، چوم رہے ہیں، ہوا، انکو، سرسرا رہی ہے، ایک عالم، بیخودی ہے، اور، اس، تصویر کا ہر عضو، دوسرے عضو، کا دلدادہ، تحیر میں، بیہوش ہے۔
پانچ، بج رہے تھے، ہاتھوں، کے گجرے مرجھا چکے تھے، مگر، مہک، باقی تھی، اور، میرے، مسخر، دل پر، تیر برسا رہی تھی، حسینہ نے، پھر آنکھ کھولی، ایک انگڑائی لی، اور، غلط ہوش ہوگئی، اب وہ، شراب جس نے، رات بھر ساتھ دیا، زہر تھی، جو تھا،

تمام رات، آگے بڑھنے کو، ہنچکچے، منت کر رہے تھے، سر، پاؤں پر تھا، اور ایک، جام، کی التجا، شمع، میری، حالت زار، پر، ٹمٹما رہی تھی، مگر، حسینہ، کا پتھر دل، موم، نہ ہوتا تھا،۔

ظالم حسینہ، اتنا ظلم نہ کر، میں، بیگناہ ہوں، میں نے، معاوضہ دیکر، بھی اپنے ہاتھ کو اِس قابل نہ سمجھا کہ اسے سیمتن، تجھے ہاتھ لگاؤں، میرے ارمان، میری اُمنگیں، اب تک میرے دل میں ہیں رونا، دل، تیری، نزاکت کا، مفتوں، حسینہ، میں نے رات بھر، تیری پرستش کی ہے، کیا میں، اتنی اعانت کا مستحق نہیں ہوں، کہ، گو صبح ہوگئی۔ مگر ایک آخری جام . . . .

،، جو وقت تمنے مقرر کیا تھا، وہ پورا ہوا، اگر تم۔ اور، روپیہ، دے سکو، تو میں حاضر ہوں، ورنہ، ایسے ایسے، عاشق، روز، آتے ہیں، اور جاتے ہیں، تڑپتے ہیں، اور مرتے ہیں،۔

اِدھر، یہہ فقرے ختم ہوئے، اور اُدھر، حسینہ، بجلی، کی طرح، سناٹے سے، نکل گئی،۔

او، بیوفا آنکھوں، والی حسینہ، میرے پاس، صرف، یہ روپیہ اور ہیں، ایک دفعہ، رسیلی، آنکھوں سے، درشن اور کر لینے دے،۔

بہت اچھا، آپ کو، یہہ آنکھیں، بہت پسند، آئیں، حکم ہو، تو نکال کر، حاضر کروں،۔

سنگدل، مہ جبین، میں، اِن آنکھوں کا دشمن، نہیں، شیدا ہوں، یہہ میرا کام ہے، کہ، میں، ان پر قربان ہوں،۔

ان ہی، قاتل، آنکھوں کا، صدقہ، چند لمحہ، میرے پاس، بیٹھ جا،
بہتر ہوگا۔ کہ آپ شب کو، تشریف لائیں، مجھے، اس وقت،
ایک اور صاحب سے ملنا ہے، آپ دیکھتے ہیں، سات بج رہے،
ہیں، صرف، آدھ گھنٹہ باقی ہے، اسی میں، مجھکو، نہانا بھی ہے،
کپڑے بھی، بدلنے ہیں۔ اور.................
اچھا، رخصت،۔

اے، مہ جبین، ایک روپیہ، اور موجود ہے۔ دُور سے شکل دکھا
دے کہ، ایک دفعہ، قدرت، سے، اس صریح ظلم، تیری، آنکھوں کو
اور، دیکھ لوں۔

مجھے، حاضر ہونے میں کیا عذر ہے، مگر، روپیہ.........
آپ کہہ رہے تھے...... تم نہایت دھوکے باز، آدمی
ہو، مجھے، بلا وجہ حیران کیا۔
تو...... مجھے، زیادہ بات کرنے کی فرصت نہیں۔

ظالم آنکھیں، میری، آنکھ سے، اوجھل، ہوگئیں، ایک دفعہ،
اور، پرستش کی کوشش کی، مگر بے سود، صدائیں، بیکار، گریہ
وزاری، فضول تھی، وُہ صورت، خواب، اور وہ باتیں، خیال
ہوگئیں، رات کا سماں، آنکھوں میں تھا، مگر، جس دم کی رونق تھی،
اسکا نشان، نہ ملتا تھا، دُنیا، آنکھوں میں، اندھیری تھی، وہ، رسیلی
متوالی، آنکھیں، جو، رات بھر، ذبح کرتی رہیں۔ نظر، نہ، آتی تھیں،
بیہوشی، ہشیاری، منت، گریہ وزاری، بہت سی، کیفیتیں،
گذر گئیں، لیکن، بیوفا، حسینہ، آکر نہ پھری،۔

دوپہر کے قریب، جب، حالت، زیادہ، خراب تھی، اور، دل، بیساختہ، سنجیدہ، ہوش کی، صدا دے، رہا تھا، ایک، سپید، پگڑ، سامنے آیا، اور، کرخت آواز، سے کہا۔

"بہتر ہوگا، کہ، تم، فی الفور، یہاں سے غارت ہو جاؤ"

چلو، چلو، اٹھو، نکلو۔

کیسا، ظالم، ملک الموت، وحشی۔ بدتہذیب، سنگدل، روسیاہ تھا، دم بھر، نہ ٹھکنے دیا، اور یہہ جسد خاکی، ترستا، پھڑکتا، ایک سمت، روانہ ہوا۔

دل، حسینہ کا کلمہ پڑھ رہا تھا، اور، زبان عالم خیال میں اس، حسن خداداد کی، داد، دے رہی تھی، نزع کی کیفیت، تھی، جنگلوں کی، خاک چھانی، باغوں میں، ٹکریں ماریں، مگر، کسی طرح، تسکین، نہ ہوئی، کائنات، کی ہر شئے، حسینہ کی یاد، تازہ کر رہی تھی، دن اسی حالت میں بسر ہوا، شام کے قریب، جب، اطمینان کی کوئی صورت منظر نہ آئی، رات کا پیش خیمہ سر پر آپہونچا، تو اس توقع پر، کہ، شاید، کچھہ، نقدیر میسر ہو جائے، اور، رات، پھر، حسینہ تک پہونچا دے، گھر کا رخ کیا۔

محلے کے بچے، آزادی، کا لطف اٹھا رہے تھے، اور عصمت کی بیکس، دیویاں، کچھہ رانڈیں، کچھہ زمانہ، کی، ماریاں، برقعے، اوڑھے منیوں کی، دوکانوں پر، سودا سلف، خرید رہی تھیں، اب ایک دوسرا عالم تھا، یہہ چاند، کے ٹکڑے، ظاہری، آنکھوں میں، ابدنما،

بے عزت، غریب، مفلس تھے، لیکن، چشمِ بینا۔ انکی، روشنی، تمام دُنیا میں دیکھ رہی تھی۔ گھر کے، پاس، فاقے، والا چھپیدیئے بیٹھا تھا۔ اور، بچے چاروں طرف جمع تھے۔ ان میں، ایک میری پانچ برس کی، معصوم بچی، جو قدرت کی، امانت، اور چندروز کی، میرے پاس، مہمان تھی، اس لیئے کہ اس کے پاس، پیسہ نہ تھا، کھانے والے بچوں کا، منہ، مڑ مڑ، دیکھ رہی تھی، اس نے مجھکو دیکھا، ڈر کے مارے سہم گئی، اور لرز کر گھر میں بھاگی، مگر اسکی، خوف زدہ آنکھیں، میرے، کان میں، یہہ کہہ گئیں۔ سنگدل، باپ، تیری، رات، آنکھوں کی، پرستش میں، اور، ہماری رات، فاقہ میں، بسر ہوگئی، گھر میں پہونچا، تو، پاکدامنی کی حُور، جس نے، صورت دیکھتے ہی، دوپٹہ، سنبھال کر اوڑھا، اس قیامت خیز، گرمی میں، چولھے کے آگے بیٹھی، روٹی پکا رہی تھی، کپڑے، چکٹ، تھے، پسینہ بہ رہا تھا، بچہ، گود میں لیٹا، دودھ پی رہا تھا، اور، بدنصیب ما، اپنی، اس، لازوال دولت، پر، زندگی کی، تمام خوشیاں، قربان کر رہی تھی، یہہ خاص حالت، میرے استقبال، کو آگے بڑھی، اور، بآواز، بلند کہا، بازاری، آنکھوں کے بندے، غور کر، ہماری، رات، کس طرح، صبح ہوئی۔

عفت کا وُہ بیش بہا جوہر، جو، باورچیخانہ میں، جگمگا رہا تھا، تسکین، کو اُٹھا، اور، اس، آسمانی، حُور نے، دسترخوان بچھا کر، کھانا، چُنا، سر کے وہ چند، بال، جو، سفید، ہو چکے تھے، اور ہماری ابتدائی، عمر کے ہمراز تھے، یوں گویا ہوئے۔

"ہم تیرے ظلم کا شکار ہوئے اور ہماری بیگم، تیرے ہاتھوں برباد ہوئی!"

یہہ صورت، جو اَب، بگڑ چکی تھی، اپنی اصلی تصویر میں، میرے سامنے آئی، اس نے عمر، میرے ساتھ بسر کی تھی، اور میرے ہی گھر میں، میرے اوپر، جُدائی کی دولت، لٹا چکی تھی، اس وقت، آنکھیں، اس، حالت کا، پتہ دے گئیں، جب، سب سے پہلے، سامنے ہوئی تھیں، اور گھر کے چپہ چپہ نے، کہا، یہہ عفت وعصمت کا وُہ سدابہار پھُول، جس کے فنا ہونے کے بعد بھی، اس کی مہک، تمام خاندان، کو، معطر رکھیگی، جس نے اپنا، ظاہری حُسن، تجھپر فدا کیا، اب، بے اعتنائی کا مستوجب نہیں، اسوقت، کج ادائی، شیوۂ حیوانیت ہے، یہہ گلاب، مُرجھاکر، اور رنگ لایا ہے، اسکی، خوشبُو، تیز ہوُئی، اور اسکا حسن دوبالا ہوگیا۔

میں یہہ سُنکر، آگے بڑہا، اور عمر بھر کی، ہمراز، آنکھوں کو، بوسہ دیا، بہ ظاہر یہہ ایک، جذبہ، فطری تھا، مگر درحقیقت افعال گذشتہ کی ندامت تھی، جس میں، یہہ عہد، شامل تھا، کہ، اَب، صرف موت، ہم دونوں کو جدا کرسکتی ہے ◆

ایک عالم رہ گیا ہاتھوں کو بس ملتا ہوا — جب چراغ عمر ہی گل ہوگیا جلتا ہُوا
بادشاہو نکو بھی خاک میں مِلتا ہُوا — یہہ موا جب قافلہ اس روح کا چلتا ہُوا

(از بیاض کہنہ)

غزل

نتیجۂ فکر جناب مولانا آزاد سبحانی

جوشِ فریادِ ستم پھر دلِ بیتاب میں ہے
یعنی بنیادِ وفا حلقۂ سیلاب میں ہے

جب کبھی وعدہ انھیں یاد دلایا بولے
اور دم بے ابھی پیمانِ وفا خواب میں ہے

پاسِ ناموس ترے ہاتھ ہمارے ضبط اثر
آج پھر تارِ رگِ جاں کفِ مضطراب میں ہے

نگہِ یار پئے دل ہے خدا خیر کرے
نظر برق رگِ پارۂ سیماب میں ہے

مٹ گئی بزمِ وفا غیر کے ہاتھوں صد حیف
خاک اڑتی ہوئی اب صحبتِ احباب میں ہے

تجھ میں خود چشمِ بصیرت نہ رہی اے واعظ
ذوقِ سجدہ ہی لب تک خمِ محراب میں ہے

موجِ گل کم نہیں کچھ موجِ بلا سے ہمکو
یہ سبق ہر ورقِ عالمِ اسباب میں ہے

تیرے سرمست وہ میکش ہی نہیں پیرِ مغاں
آج بھی کیف وہی تیرے مئے ناب میں ہے

دل کے کھنچنے کا سبب کیا ترے ابرو کو
یعنی کچھ اس کی جھلک چہرۂ مہتاب میں ہے

لطف کا ذکر ہی کیا اب تو بلا ساز وں کو
جور بھی سلسلۂ جوہرِ نایاب میں ہے

کچھ ادھر بھی نظر اے خانہ بر اندازِ جہاں
اپنا حصہ بھی تری بخشش کمیاب میں ہے

ڈر ہے پھر شور نہ پڑ جائے خدا خانوں میں
آج بیتاب وہ دل گوشۂ جلباب میں ہے

چشمِ باطن یہ غزل کیا ہے حقیقت یہ ہے
ایک طوفاں نہاں دیدۂ پر آب میں ہے

کہتے ہیں ہو چکا افسانۂ منصور کہن
شہرۂ قصۂ آزاد اب اس باب میں ہے

ایک گلی کتب خانہ

انسان بھی عجیب متضاد صفات کا مجموعہ ہے ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے ہمیشہ بیزار رہتا، اور گذشتہ کی طرف آہِ سرد بھر بھر کر دیکھتا ہے، اور دوسری طرف جب خود اپنی طبع خدا داد پر نظر ڈالتا ہے تو سر افتخار آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے، اور گزری ہوئی نسلوں کے بڑے سے بڑے کارنامے بھی اُس کو ہیچ سے گرد و غبار میں لپٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ گو قدم سعی کا ہمیشہ آگے بڑھتے رہنا زمانے کا اقتضا رہے، اور جہاں ہم پرسوں تھے وہاں کل نہ تھے، اور جہاں کل تھے وہاں آج نہیں ہیں، لیکن جس طرح کہ گھوڑ دوڑ میں جیتنے کے مقام سے کوئی گھوڑا آگے اور پیچھے نکلتا ہے، اسیطرح جولانگاہِ عالم میں بعض قومیں مدارجِ ترقی پہلے طے کرتی ہیں اور بعض بعد میں، لیکن سب کو کم و بیش ایک ہی راستہ قطع کرنا پڑتا ہے، اسمیں شک نہیں کہ زمانے کی مجموعی ترقی کے اعتبار سے متاخرین کو متقدمین پر تفوق ہوتا ہے کیونکہ ہر زمانے میں موجودہ نسل تمام گزشتہ نسلوں کی وارث ہوا کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سی باتیں جو ہماری نظر میں جدت کا رنگ لئے ہوئے اور بلا تکلف اپنی ہی خداداد ذہانت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، در اصل نہیں ہوتیں، اگر تاریخ عالم کے کرم خوردہ صفحوں کو ذرا بھی توجہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں نہ سہی مگر دوسری قوموں میں ضرور اس قسم کے مدارج ترقی

سب پہلے ہی طے ہوچکے ہیں، اور حضرت سلیمانؑ کا یہ ارشاد کہ "آفتاب کے تلے کوئی چیز نئی نہیں ہے" نہایت صحیح ہے۔ کتب خانوں ہی کو دیکھئے کہ اس زمانے میں لندن میں برٹش میوزیم اور پیرس میں بیلوتہیک نیشنیل کو دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم اس بارہ میں تو کسی قوم نے زمانہ سابق میں ایسی توجہ نہ کی ہوگی۔ لیکن ایشیائے کوچک کے کھنڈر جن کو صدیوں کے گرد و غبار نے تودہائے خاک بنا دیا ہے، دبی زبان سے کہتے ہیں ع

این خیال ست و محال ست و جنوں

اور فلک شعبدہ باز بھی کبھی ہمکو نیچا دکھانے کے لئے فراموشی کی نقاب جو ہزاروں سال تک گرم و سرد زمانے کا مقابلہ کرتے کرتے کچھ متحجر سی ہوگئی ہے، اٹھا کر قدامت کی کچھ ایسی جھلک دکھا دیتا ہے کہ ہم دنگ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ابتدا میں عہدِ طفلی کی طرح انسان کا سینہ ہی اُسکا کتب خانہ ہوتا ہے، لیکن جب قوم میدانِ ترقی میں قدم رکھتی ہے اور تمدنی ضرورتوں کی وجہ سے تمدن کے رُخ مختلف اور ذخیرۂ معلومات اسقدر وسیع ہوجاتا ہے کہ دہاں نہ ایک شخص اُن سب کی پیروی کرسکتا ہے اور نہ ایک شخص کا حافظہ اُس کا متحمل ہوسکتا ہے اور نہ ایک یا چند اشخاص اُس کی اشاعت پوری قوم میں کرسکتے ہیں تو کتابت کی ضرورت محسوس ہوتی اور کتابت کے ساتھ کتابیں اور جہاں کتابیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوئیں، کتب خانے عالم وجود میں آتے ہیں۔ انسان جبکہ دماغی ترقی کے اس درجہ پر پہونچتا ہے تو تمدنی طور پر بھی وہ بہت سے مدارج طے کرچکتا ہے، اور رباب کو جو نسبت

سابق میں افراد سے اور اُسکے بعد سرگروہ خاندان سے تھی، وُہی نسبت اب بادشاہ کو رعایا کے ساتھ ہوتی ہے اور اسلیئے دوسکر انتظامات کے ساتھ دماغی ترقی کا انصرام بھی بادشاہ ہی کے ہاتھ میں ہتا ہے۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جن قوموں نے سب سے پہلے لباسِ تمدن زیب بدن اور انسانی دماغ کی سوتی ہوتی ہوئی قوتوں کو بیدار کیا وہ مصری اور بابلی تھے، لیکن مصریوں نے جہاں تک کہ دریافت ہو سکا ہے، کوئی باقاعدہ کتبخانہ قائم نہیں کیا، اور اُس کی وجہہ یہ تھی کہ اُن کے یہاں علمی ترقی کا دار و مدار پیشوایانِ مذہبی تھا، اور وہ اپنی گرم بازاری کے لئے ضرور سمجھتے تھے کہ اپنے فتوحاتِ دماغی کو غیر حقیقی روشنی کے ہالے میں ایسا چھپا دیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہ کام نہ کرے، اور اُن کو اُن میں کسی اور عالم کا جلوہ نظر آئے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ آجتک اُن کے کارنامے دُنیا کے خیال میں ایک عظیم الشان راز کی ہیبت اور وقعت رکھتے ہیں، لیکن بایںہمہ اُن کے اُولوالعزم بادشاہوں کے پُرشان مقابر اور اُن کے تعمیر کیے ہوئے بوالعجب چوپہل مینار جو اپنے فوق الانسان استحکام سے گرم و سرد زمانے پر طعن مارتے ابدالاباد سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اپنے بوقلموں کتبوں سے کتب خانوں کا کام دیتے ہیں۔ لیکن برخلاف اسکے اہل بابل نے جو قدامت میں اہلِ مصر سے کم نہ تھے مگر عام اثر میں اُن سے بہت بڑھے ہوئے تھے کیونکہ دنیا کی موجودہ ترقی کی بُنیاد اُنھیں کے مبارک ہاتھوں نے ڈالی تھی، ابتدا ہی میں ترویج علوم کی طرف توجہہ کی اور چونکہ ہر زمانے میں ہر قوم اپنی ضرورتیں اُنھی چیزوں سے پورا کیا کرتی ہے، جو آسانی سے

ہاتھ آسکتی ہیں۔ اور سرزمین بابل میں دجلہ وفرات کی طغیانیوں کی بدولت عمدہ قسم کی چکنی مٹی بکثرت موجود تھی، اسلئے اُنھوں نے مٹی کی کچی اینٹوں یا تختیوں کو جنھیں بعد میں پکا دیا کرتے تھے، تحفظ و ترویج علوم کا ذریعہ بنایا، اور اس قسم کی گلی کتابوں سے بڑے بڑے کتب خانے قایم کیے۔ اگرچہ اہل بابل کے علوم کی جھلک ہم تک واسطہ در واسطہ اہالی اسیریا و فینشیا و یونان کے ذریعے سے پہونچی ہے لیکن افسوس ہے کہ زمانے نے اُن کے علمی ذخیروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گو اہل یورپ کے محنت طلب علمی تجسس نے جستہ جستہ اُن کی گلی کتابوں کو اُن کے بھولے ہوئے شہروں کے کھنڈروں سے نکالا ہے، لیکن جو عظیم الشان کتب خانے اُنکے علم پرست بادشاہوں نے قائم کئے تھے۔ وہ ریگ زمانہ میں ایسے نہیں دبے کہ نکالے سے نکل سکیں، قدیم کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل کیا دُنیا کا سب سے پہلا کتب خانہ شاہ سارگن نے، جو حضرت عیسےٰؑ کی پیدائش سے تین ہزار آٹھ سو سال پیشتر گزرا ہے، قائم کیا تھا۔ اس بادشاہ نے ایک ضخیم کتاب تنویر بیل کے نام سے تصنیف کرائی تھی، جو بہتر جلدوں میں تھی اور جسمیں علم ہیئت و نجوم کے مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی۔ بادشاہ سارگن کے کتب خانہ کے علاوہ ایک مشہور کتب خانہ سنقریا لاریسا میں تھا جسمیں خاصکر علوم ریاضی کے متعلق کثرت سے کتابیں جمع کیگئی تھیں۔ اور ایک اور قدیم کتبخانہ نپور میں تھا اور اسیطرح ارک اور کوتھا کے کتب خانے بھی قابل ذکر ہیں۔ بخت نصر کے زمانے میں، جو ۶۰۴ ق۔م۔ میں گزرا ہے دو عظیم الشان

کتب خانے خاص بابل میں قائم ہوئے تھے، مگر ان سب کتب خانوں کا صرف نام ہی نام باقی ہے۔

اہل بابل کے برخلاف اہل اسیریا، جو اُنھیں کے ایک شاخ تھے اس بارہ میں زیادہ خوش قسمت تھے۔ چنانچہ جو کوشش نینوا کے کھنڈروں کے کھودنے میں ہوئی، وہ زیادہ بارآور ثابت ہوئی ہے۔ اور ایک پورا کتب خانہ جو شاہانِ اسیریا کی علم پروری کی یادگار ہے۔ ہاتھ آگیا ہے، اگرچہ سلطنت اسیریا کی قدامت کا پتہ ۱۹۰۰ق.م تک لگا ہے، لیکن چونکہ علمی ترقی کے لیئے استحکام سلطنت اور تمدنی ترقی لازم ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ دراز تک کسی بادشاہ کی توجہ اِس طرف نہیں ہوئی، لیکن ۷۴۵ ق.م میں جبکہ تغلت پلیسر ثالث تخت نشیں ہوا تو اُس نے اِتنا کیا کہ قدیم سلاطین کے کتبوں کو دستِ فنا سے محفوظ کرنے کے لئے جمع کیا، اور اُن کی نقول سے ایک کتب خانہ کی بُنیاد ڈالی، اور اُس کے بعد شاہ سارگن جو ۷۲۲ق.م سے لیکر ۷۰۵ق.م تک حکمراں رہا، بعض رسالے علم ہیئت و نجوم وغیرہ کے داخل کر کے اُس کو اور وسعت دی۔ سارگن کا بیٹا سناکرب جو ۶۸۱ق.م تک تخت نشیں رہا، تاج شاہی کے ساتھ ذوق علمی کا بھی وارث ہوا تھا اور اُس نے قوانین اسیریا کا مجموعہ اور چھوٹے چھوٹے تاریخی اور مختلف قسم کے علمی رسالے داخل کتب خانہ کیے اور اُسی نے کتب خانہ کو قلاہ سے نینوا میں بھی منتقل کیا، اُس کے بعد اُسکے خلف الرشید اشر بنی پال المتوفی ۶۲۶ق.م۔ اسنے اُس میں بہت سے تاریخی اور

اور دیو بانی کے رسالے شریک کیے۔ اگرچہ اس خاندان کے تمام بادشاہ علمی قدر دانی کے لحاظ سے آفتاب تھے، لیکن علمی دنیا کا سب سے بڑا محسن اشرہیدن کا بیٹا اور جانشین اشریبنی پال تھا، جو ۶۲۶ق.م. میں اپنا نام پردۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے یادگار چھوڑ کر راہیِ ملک عدم ہوا، اُس کی اُلوالعزمی صرف بیرونی فتوحات اور اندرونی انتظامات ہی پر محدود نہ رہی، بلکہ اُس کے علمی ذوق نے بابل کے مٹے ہوئے علوم کو بھی حیاتِ جاوید بخشی۔ اُس کے مبارک عہد میں ہزارہا منقوش تختیاں جو تقریباً ہر علم و فن کے متعلق اور ہر مقام سے لائی گئی تھیں نینوا کے کتب خانہ میں داخل ہوئیں اور اُس کے کتبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایسی محنت سے جمع کرنے کی غرض صرف رفاہِ خلق اللہ تھی کہ لوگ عام طور پر اِس بے نظیر علمی ذخیرہ سے فیضیاب ہوں اور رعایا میں علم کی اشاعت ہو، اشریبنی پال نے اس کتب خانے کو ایک عالیشان محل میں رکھا تھا، جو سلطنت اسیریا کی بربادی کے ساتھ تباہی کے نذر ہوا، لیکن نینوا کے عبرت ناک کھنڈروں نے اُسکو کئی ہزار برس تک اپنے سینے میں امانت کی طرح محفوظ رکھا، یہانتک کہ اہلِ یورپ کو اُلوالعزمی نے صدہا سال کے خس و خاشاک سے اِس بے بہا خزانے کو نکالا۔ یہ بھی حُسنِ اتفاق یا اُن قدیم لوگوں کی خوش نیتی کا باعث ہے کہ اُنھوں نے اپنی دماغی فتوحات کی حفاظت کے لیے استعداد بھی کی، تو مادرِ گیتی سے کہ وہ آج تک گرم و سرد زمانہ سے محفوظ ہے بقولِ شاعر ؎

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اِک تارِ کفن بگڑا

برخلاف اُسکے اس زمانے میں گو ہمارا ذخیرۂ معلومات بہت کچھ بڑھ گیا ہے اور لطافت اور نزاکت میں ترقی تمدن کے ساتھ ہم کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں۔ لیکن ہمکو بلا تامل اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اگر ہماری کتابوں کے ساتھ بھی زمانہ ویسا ہی سلوک کرے جیساکہ اہل اسیریا کی انگڑو بگلی کتابوں کے ساتھ کیا تو اُن کا صدیوں تو کیا دہ سال بھی ٹھہرنا مشکل ہے۔

اب اگر ان جواہر بے بہا پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح تغلت پلیسر ثالث کے تاریخی مذاق نے اس کتب خانے کی بُنیاد ڈالی تھی اُسیطرح اُس کے جانشینوں نے بھی فنِ تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی، اور ہزاروں تختیاں آج تک شاہانِ اسیریا کی فتوحات، اُلوالعزمی، دینداری اور سرپرستی علم و ہُنر کی شہادت دینے کے لئے موجود ہیں۔ ان تختیوں میں سے بعض پر قدیم سلاطین کے کتبوں کی نقول ہیں، جو اُن کے حالات پر گہری روشنی ڈالتی ہیں۔ اور بعض پر عہدناموں، فرمانوں اور احکامِ شاہی کی نقول ثبت ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صرف تحریرات سرکاری ہی کی حفاظت کی طرف توجہ نہیں کی گئی، بلکہ رعایا کے عرائض اور لوگوں کے باہمی خانگی خط وکتابت کا بھی بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا، جس سے اُس زمانے کی معاشرت اور تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

جغرافیہ بھی اُس زمانے میں ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کرچکا تھا

اور اس شاخ میں اگر کسی تختی پر شہروں، قصبوں، دریاؤں، پہاڑوں کی فہرستیں درج تھیں، تو کسی پر مختلف مقامات کے موقع اور خصوصیات اور پیداوار وغیرہ کے حالات ثبت تھے۔

کتب خانے کی ایک بڑی شاخ قوانین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں بعض تختیوں پر قوانین نافذہ کی نقول تھیں اور بعض مقامات خانگی مثلاً بیعنامے، دستاویزات قرضہ کفالت نامجات وغیرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس زمانے کے لوگوں کو یہ سنکر بڑی حیرت ہوگی کہ اُس قدیم زمانے میں بھی مقدمات کے فیصلے محفوظ کیئے جاتے تھے، تاکہ آیندہ بطور نظائر کے کام آئیں یا قوانین موجودہ کی ترمیم اور جدید قوانین کی وضع کا ذریعہ بنیں۔

ایک اہم صیغہ روایات مذہبی سے متعلق تھا، جنمیں سے بہت سی روایتیں دوسری قوموں سے لیگئی تھیں۔ ان روایات میں سب سے زیادہ ذکر کے قابل گلگامیس کا قصہ ہے: جو غالباً حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے دو ہزار سال قبل مرتب ہوا تھا۔ یہ قصہ بارہ جلدوں میں تھا اور ہر جلد کا نام کسی ایک نہ ایک برج پر رکھا گیا تھا اور گیارہویں جلد میں، جسکا نام ڈلو تھا، طوفانِ نوح کے متعلق وہ روایت درج تھی، جو اہالیِ بابل میں مشہور تھی، جس سے طوفان نوح کے اُس قصے کی، جو عہدِ قدیم میں درج ہے، پوری تصدیق ہوتی ہے، گلگامیس غالباً وہی شخص ہے، جسکا ذکر نمرود کے نام سے عہدِ قدیم میں آیا ہے، اسی طرح بہت سی تختیوں پر مختلف قسم کی روایتیں اور حکایتیں درج تھیں اور بعض پر بھوت پلیدوں کے قطعے اور اُنکے اُتارنے کے منتر

ثبت تھے۔

ایک شاخ دیوتاؤں سے تعلق رکھتی تھی اور اُس میں جو تختیاں تھیں اُن پر دیوتاؤں کی فہرستیں اور اُن کے اسما و صفات اور مندروں کی تفصیل مندرج تھی، اور بعض تختیوں پر مختلف دیوتاؤں کی شان میں مناجاتیں اور وہ دُعائیں جو مختلف درجہ اور طبقہ کے لوگوں کو خاص خاص حالتوں میں مثلاً جبکہ کوئی مُصیبت نازل ہو، یا جنگ میں شریک ہونا پڑے، مانگنی چاہئیں، منقوش تھیں۔

اہلِ اسیریا کا علمی تجسُّس زمین ہی تک محدود نہ رہا، بلکہ اُن کی فکرِ بلند پرواز نے آسمان تک بھی رسائی پیدا کی تھی، چنانچہ اُن کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ علمِ ہیئت سے متعلق تھا، جنمیں اجرامِ فلکی کی اشکال اور گردشوں کی کیفیت تحریر تھی اور مختلف آثار و مناظرِ فلکی کی بھی توضیح کی گئی تھی۔ شاہانِ اسیریا نے اُس عظیم الشان قدیم تصنیف کا بھی ترجمہ اپنی زبان میں کرایا تھا، جو توریبل کے نام سے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے سارگون شاہ بابل کے زمانے میں (۷۲) جلدوں میں تصنیف ہوئی تھی اس کتاب کا ترجمہ یُونانی زبان میں بھی مؤرخ بروسس نے کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ آج نہ اصل کتاب باقی ہے اور نہ یونانی ترجمہ، لیکن خوش قسمتی سے اسیری ترجمہ کی فہرست کا ایک حصہ موجود ہے جسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں سورج اور چاند کے قران اور مریخ اور زہرہ کی گردشوں اور دُمدار ستاروں پر جن کی توضیح ان الفاظ میں کیگئی تھی "وہ ستارے جو پیش پُشت دُم اور پیشانی پر تاج رکھتے ہیں،" مکمل رسالے تھے چونکہ جوتش نجوم بھی علم ہیئت کی

کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی، اسلئے اُسکے متعلق بھی بہت سی تختیاں تھیں جنمیں ثوابت اور سیاروں کی تاثیرات پر بحث کی گئی تھی۔

ایک نہایت دلچسپ صیغہ حیوانات و نباتات و معدنیات سے متعلق تھا، جسمیں چوپایوں، پرندوں، حشرات الارض، گھاسوں اور پتھروں وغیرہ کی فہرستیں اُن کے اقسام و انواع کے لحاظ سے ضبطِ تحریر میں لائی گئی تھیں۔ دھاتوں کی فہرستیں بھی بعض تختیوں پر اس تفصیل کیساتھ وہ کس کام میں آتی ہیں لکھی گئی تھیں، اور بعض پر مختلف قسم کی کھانے پینے کی چیزوں کی فہرستیں درج تھیں۔

ایک چھوٹی سی شاخ ریاضی و حساب سے تعلق رکھتی تھی اور اُس میں بعض گلی رسالے ایسے بھی تھے، جنمیں جذر مربع و مکعب نکالنے اور پیچیدہ سوالات کے حل کرنیکا طریقہ بتایا گیا تھا مختلف اعداد کے مربعوں اور مکعبوں کی جدولیں آج تک موجود ہیں۔

یہ گلی کتب خانہ جن علوم و فنون پر حاوی تھا، وہ زیادہ تر کلدانیوں اور بابلیوں کی جولانی طبع کا نتیجہ تھے۔ اور چونکہ وہ پہلے سے ایک اجنبی زبان اور غیر مانوس خط میں قلمبند تھے، اسلئے شاہانِ اسیریا کو اُنھیں اپنی زبان میں لانے کے لیئے ترجمہ کا بھی بڑا اہتمام کرنا پڑا اور اکثر کتابوں کے نہ صرف ترجمے کرائے گئے، بلکہ بہ لحاظ دقتِ مضامین اُن پر مبسوط شرحیں بھی لکھی گئیں چنانچہ اسی ضرورت سے علم صرف و نحو بھی مدون ہوا اور لغات کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، جس میں بابلی اور آسیرین دونوں زبانوں کی خصوصیات پر بحث تھی۔

یہ گلی تختیاں بڑی چھوٹی سب قسم کی ہوتی تھیں، یعنی اگر کوئی

طول میں ایک فٹ ہوتی تھی، تو کوئی ایک ہی انچ اور اُن کے چاروں طرف خشک ہونے سے پہلے لوہے یا پیتل سے نوکدار قلم سے لکھتے تھے اور خشک ہونے کے بعد اُن کو آوے میں پکا لیتے تھے حروف بعض اوقات اسقدر باریک ہوتے تھے کہ کلان بیں سے بھی مشکل سے نظر آسکتے ہیں اور خط وہی قدیم پیکانی تھا، جو زمانہ قدیم کلدانیا اور بابل اور ایران میں مروّج تھا اور جسکو یہ نام حروف ابجد کے تیر نما ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے، اس قسم کی تیس ۳۰ ہزار سے بھی زیادہ تختیاں نینوا کے کُتب خانہ میں جمع کیگئی تھیں اور خوشی کی بات ہے کہ اُن میں سے بہت سی برٹش میوزیم اور یورپ و امریکا کے دوسرے ملکوں کے عجائب خانوں میں آج تک دُنیا کے قدیم تمدن پر گہری روشنی ڈالنے کے لئے موجود ہیں ◆

خورشید مرزا [illegible]

ناظرین براہ کرم خط و کتابت کے وقت نمبر

خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔

مینیجر

اخلاق اور قانون

انسان کو عقل راہنمائی کے لئے عطا ہوئی ہے، لیکن انسانی عقل کے مراتب مختلف ہیں، اور ہر شخص کی عقل اسقدر کامل نہیں ہے کہ وہ ہر انسان کو برائیوں سے بالکل بچا سکے۔ بلکہ اکثر انسان سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں، جو اسکی ذات یا سوسائٹی کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ جب انسان اپنی عقل سے کام لیتا ہے، تو بہت مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک خاص مذہب کی پابندی کرتا ہے۔ خدائے عزّ وجل کی پرستش کرتا اور اپنے تئیں عابد سمجھتا ہے۔ علم و فن میں ترقی کرنا، اور طرح طرح کی دستکاریاں کرتا ہے۔ تمدّن و معاشرت میں اصلاح کرتا اور امن و رفاہ عام کے قیام و ثبات میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح شہر والے بن کر رہنا، دوسروں کے ساتھ مشارکت اور مخالطت اختیار کرنا، ایک طاقت بہم پہونچانا اور سلطنت قائم کرنا۔ مال و دولت جمع کرنا، اور ہر شخص کی علٰحدہ ملک قرار دینا، اپنی اپنی چیزوں سے حظ اٹھانا، ایک حالت سے دوسری حالت میں ترقی کرنا، نئی معلومات بہم پہونچانا، نئی اشیا یا اشیا کے خواص یا قدرت کے قانون دریافت کرنا، اہم مسائل میں غور و فکر کرنا انسان کے ایسے کام ہیں، جو اسکو عروج اور ترقی کی طرف مائل کرتے اور اسکا رتبہ بلند کرسکتے ہیں۔ اور یہی انسان کا کمال ہے۔ یہ انسان کی ضروریات: ارادہ، دانش اور استعداد کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جب انسان پر حیوانیت کا غلبہ ہوتا ہے، تو یہی انسان

لوگوں کو قتل کرتا، عمارتوں کو ڈھاتا، کھیتوں کو مسمار کرتا، شہروں کو ویران کرتا، معابد و مساجد توڑتا، صنعت و کمال کے نمونوں کو مٹاتا، کتبخانوں کو جلاتا، لوٹ مار کرتا اور ہر طرف بربادی پھیلاتا ہے، اِس حالت میں اُس کی رُوح تنزل کی طرف مائل ہوتی ہے، اور وُہ انسانیت سے دُور ہوجاتا ہے۔

انسان قدرت کے منشار کے مطابق اپنی عقل اور ارادہ پر کاربند ہوتا، اور اپنی سمجھ کے مطابق ہر کام کرنا چاہتا ہے، لیکن اُسکی ناقص عقلی اور غلط رائے اُسے بُرائی کی طرف مائل کرتے ہیں اور انسان کو ضرورت پڑتی ہے کہ وُہ یہ جانے کہ مجھے کس طرح عمل پیرا ہونا اور اپنے چال چلن کو کتنا اُصول کا پابند رکھنا یا اپنی طبیعت پر کس طرح قابو رکھنا چاہیئے یہ علم اُسے "اخلاق" کے جاننے سے حاصل ہوتا ہے، لیکن انسان کی جہالت اور بعض اوقات باوجودِ علم اُسکی طبیعت کا ضُعف اُسے قوانینِ اخلاق پر کاربند نہیں رکھتا، اور اس سبب سے تمدّن میں خرابی اور امنِ عامہ میں خلل پڑتا ہے۔ اور تمام گروہ کی آسایش اور حفاظت کے لئے یہ ضرورت پڑتی ہے کہ جو لوگ عمدًا یا احیانًا قانونِ عدالت کی خلاف ورزی کرنی چاہیں اُنکو بہ جبر و بہ زور عدالت پر قائم رکھا جائے۔ اور اگر کبھی اُسکے خلاف کریں تو سزا دیجائے۔ تاکہ لوگوں کے گروہ دنیا میں امن و ترتیب قائم رہے۔ چونکہ ہر سوسائٹی میں گورنمنٹ اِسی منشار کے واسطے قائم ہوتی ہے، لہذا یہ اختیار گورنمنٹ کو دیا گیا ہے، اور جو ضوابط کہ گورنمنٹ لوگوں کے افعال میں حد قائم کرنے کے لئے جاری کرتی ہے "قانون"

کہلاتے ہیں۔

قانون وہ قواعد ہیں، جو ایک سلطنت اپنی رعایا کے معاملات اور ایسے افعال کی درستی کے لئے مقرر کرے، جو تمدن سے تعلق رکھتے ہیں اور جنکی رُو سے اُنکے باہمی مقدمات کا انفصال کیا جائے۔

تمدنی حالت میں جبکہ انسان کے گروہ ملکر رہیں، دو چیزیں انسان کو ٹھیک رکھ سکتی ہیں اور اُسکے دستِ تغلّب اور جبر کو روک سکتی ہیں، ایک اخلاق دوسرے قانون۔ تمدنی حالت میں جسقدر ترقی ہوتی جاتی ہے اور ہر ایک انسان کے عام خیالات یا اُس کے پیشے جسقدر بڑہتے جاتے ہیں، اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے خانگی یا منزلی خیالات، طبعی تحریکیں، شوق، دلچسپیاں، اُسکے اخلاق پر اثر ڈالتی ہیں، اور ان سب میں وہ قانون کے خوف کے خوف کے مارے کچھ نہ کچھ عدالت کا خیال رکھتا ہے۔ قانون خاندان کیواسطے ضابطہ بناتا ہے اور فیصلہ کر دیتا ہے کہ خاندان کے ہر ممبر کی کیا حیثیت اور اُسکے کیا حقوق ہیں، اسیطرح تمام گروہ میں ہر شخص کی ملک اور اُسکے حقوق کی نگہبانی قانون کرتا ہے۔ قانون کاروبار اور معاملات دُنیا میں ہر امر کی تحقیق اور تشریح کرتا ہے اور پھر اُن میں ہر شخص کے فرائض معین کرتا ہے قانون معاملات میں صداقت رکھنے اور حقوق کی نگہداشت پر مجبور کرتا ہے اور عدالت کو نہایت استواری اور استحکام سے قائم کرتا ہے۔ لیکن قانون کے حدود کے اندر بھی ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام ہیں، جن کا اثر

تقویت اور فائدے، راحت اور تکلیف پہونچانے میں بہت قوی ہے، اور قانون کا اُن پر بس نہیں چلتا، ایک شخص ایک بُرا خاوند اور ایک بُرا باپ ایک بُرا سرپرست ہوسکتا ہے لیکن قانون کی حد میں نہیں آتا. ممکن ہے کہ ایک شخص جابر زمیندار ہو اور اجارہ داروں پر جبر و تعدّی کرتا ہو یا اجارہ دار ہو لیکن پیدا وار زمین برباد کرتا اور منافع تلف کرتا ہو۔ سوداگر ہو لیکن بے اعتبار ہو۔ اور مُلک کا قانون اُسے دُرست نہ کرسکے. ممکن ہے کہ ایک شخص اعلےٰ درجہ کا چال باز۔ فتنہ پرداز۔ خیرہ سر ہو۔ لیکن مطمئن ہو کہ قانون اُسپر کوئی دعوٰے نہیں کرسکتا. لیکن باوجود ان اُنتقام کے بھی قانون قومی اور مُلکی فلاح اور امن کے لئے ضروری اور لابدی ہے۔

انسان اپنی بنی نوع کے ساتھ قاعدہ عدالت کی دو سبب سے رعایت کرتا ہے یا تو اُسکو یہ خوف ہو کہ اگر بے ایمانی اور دغا کرونگا تو بُرے نتائج مجھے بھگتنے پڑینگے، یا جس کام کو وہ واجب اور فرض سمجھتا ہو طبعًا اُسکے پُورا کرنے کی طرف راغب ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاق کی تمام تحریکیں اُمید و بیم سے پیدا ہوتی ہیں، بعض کہتے ہیں کہ تمام انسانوں میں اخلاقی اثر عقل حیوانی کی طرح قدرتی اور فطرتی ہوتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اخلاقی اثر کچھہ تو طبعی اور جبلّی ہوتا ہے اور کچھہ تمدنی حالت یا سوسائٹی کے اثر یا زندگی کے تجربوں سے اُسپر رنگ چڑھتا ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جو خیالات عام طور پر قوم میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور جنکا اثر قوم کی ہر فرد میں اسطرح ساری ہوتا ہے کہ اُن سے نیک و بد کی تمیز اُن ہی خیالات پر مبنی ہوجاتی ہے

اور وُہ انسان کی طبیعت میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتے ہیں کہ اُن کا اثر وراثتاً دوسری نسل میں پہونچتا ہے اور اُن سے جبلی کیفیت کی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اُن لوگوں کے اعتقادات کے موافق اُصولِ اخلاق کسی فرقہ میں رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہیں۔ اور قوم کے عام طریقے اور رویہ کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِس عام اخلاق کا اثر انسان کی زندگی کے ہر حِصّے، ہر جذبہ، اور ہر فعل سے ظاہر ہوتا ہے اور تبادلہ خیالات کی وجہ سے اُن میں نئے نئے انشقاق ہوتے جاتے ہیں یا اُن میں زیادتی اور کثرت پیدا ہوتی جاتی ہے اور یہی قومی اخلاق کی ترقی یا تنزّل کا باعث ہے۔

اخلاق اور قانون میں یہ فرق ہے کہ اخلاق میں اگرچہ افعال کو بھی لیا جاتا ہے لیکن زیادہ انسان کے خیالات اور دلی جذبات سے بحث کی جاتی ہے اور قانون میں صرف افعال کو دیکھا جاتا ہے اور اگر خیالات اور میلان کا ذکر ہوتا ہے تو اسیقدر کہ انسان کے افعال کے حالات کے معلوم کرنے میں مَدَد مِل سکے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قانون کی ساری قوت سزا کے خوف میں ہے لیکن اخلاق انسان کو مائل کرتا ہی کہ ایسے اعمالِ حَسَنہ کا پابند ہو جن کا رُتبہ اُن اعمال سے بہت بلند ہے جن پر قانون مجبور کرسکتا ہے۔ اسلیئے قانون فطرتاً خوف پیدا کرتا ہے اور اخلاق انسان کو جری بے خوف اور دلیر بناتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ قانون کی پابندی میں بھی اُصولِ اخلاق پر چلنے کی فرصت اور آزادی حاصل ہے اور اسی سبب سے دلیری اور جرأت پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ جرأت قانون میں اخلاقی حصّے کا نتیجہ ہے نہ قانون کا۔ اور جب

قانون کے بنانے میں ذرا غلطی ہوجاتی ہے تو یہ اثر فوراً جاتا رہتا ہے۔

لیکن باوجود ان نقائص کے دُنیا میں قانون کی بہت حاجت ہے کیونکہ قانون اگرچہ بلاواسطہ اخلاق پر اثر نہیں ڈالتا۔ لیکن بالواسطہ اخلاق کی بہت مدد کرتا ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ اپنے اغراض اور اپنے فوائد عزیز ہوتے ہیں اور اُن کے اصول کے پیچھے وہ دوسروں کی فلاح اور اغراض کا بہت کم خیال رکھتا ہے، لیکن قانون تمام لوگوں کے اغراض اور مقاصد پر نظر رکھتا ہے اور سب لوگوں کے مال و اسباب کو تغلب اور تصرف سے بچاتا ہے۔ اسیطرح بعض سادہ دل اور بھولے آدمی یا کمزور طبیعت اشخاص رضامند ہوجاتے ہیں کہ اپنی آزادی کے حقوق سے دست بردار ہوجائیں۔ اور اپنے تئیں ظالموں کی مرضی کے حوالہ کردیں۔ لیکن قانون اُن کی حمایت کرتا ہے۔ اُن کو سہارا دیتا ہے اور اُنھیں اُن کے حقوق یاد دلاتا ہے۔ اور ظالموں کو تنبیہ کرتا ہے کہ ان کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھنا۔ اسلئے قانون انسان کی اخلاقی فطرت کی تکمیل میں مدد دیتا ہے، اور سب لوگوں کو انسانیت کے احکام کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔

کسی ناجائز کام کے ارتکاب سے انسان کو تین قسم کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ مذہبی، اخلاقی، اور جسمانی۔ مذہبی تکالیف کا انحصار کسی مذہب پر یقین رکھنے اور معصیت پر سزا ملنے کی اعتقاد پر منحصر ہے۔ اخلاقی تکالیف طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ پشیمانی، غم، افسوس، شرم، وغیرہ۔ جسمانی تکالیف بیماری، موت وغیرہ ہیں۔ قانون جو سزائیں دیتا ہے وہ جسمانی ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کا اثر رُوحانی قویٰ پر بھی پڑتا ہے۔ انسان اپنے

اعضاء کا استعمال خاطر خواہ نہیں کرسکتا۔ اور جن جسمانی کاموں میں لذت وفرحت حاصل ہوتی ہے اُن سے بالکل روک دیتا ہے، اپنی جائداد او املاک سے محروم ہوجاتا ہے اُسکے حقوق چھن جاتے ہیں، اُسکی آزادی مٹ جاتی ہے، اور وُہ ہمیشہ کے لئے یا کچھ عرصے کے لئے ابنا جنس کی سوسائٹی سے علیحدہ کردیا جاتا ہے، جو اُسکی روحانی تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور جو ذلت کہ اُسکو قانونی سزائیں سہنی پڑتی ہے وُہ اُسے غم، غصہ اور شرم میں مُبتلا کرتی ہے۔ قانونی سزا انسان کی مذہبی اور اخلاقی سزا کو کم نہیں کرتی، بلکہ اُس کے اثر کو اور تیز کردیتی ہے۔ غرض تمام سزاؤں کی بُنیاد خوف پر ہے، اور قانون اِس خوف کو زیادہ کرتا اور پھیلاتا ہے۔

انسان بہت سے کام صرف اس خوف سے کرتا ہے یا بہت سے کاموں سے صرف اِس سبب سے پرہیز کرتا ہے کہ اُن کے ترک یا ارتکاب سے کسی تکلیف کے سہنے کا خوف ہوتا ہے۔ خوف کے اثر میں اسقدر جلدی تغیر نہیں آتا جیسا کہ دوسرے جذبات میں آتا ہے بلکہ خوف کا اثر اِسقدر قوی ہوتا ہے کہ جہاں کہیں نتیجہ مُشتبہ یا اُس میں کسی قسم کی بھلائی کی اُمید بھی ہو تو بھی کسی بُرائی یا تکلیف کا شبہ انسان کو محتاط رکھتا ہے۔ بلکہ مُلک کا قانون اخلاق کے قانون کا ضمیمہ یا اُسکی شرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اخلاقی قانون تمام بنی نوع انسان کے لیے یکساں ہے لیکن مُلک کا قانون بلحاظِ مصلحتِ مُلک و مُعاشرت فردی اُمور میں مختلف ہوتا ہے۔

مُلک کے قانون کے خلاف کرنے میں جُرمانہ، قید، موت وغیرہ سزاؤں کی دھمکی ضرور ہے، ورنہ مُلک کے قانون کا اثر بالکل زائل ہوجاتا ہے

اور کسی کو اُسپر کاربند ہونے کی پروا نہیں رہتی۔ اخلاق کے قانون کی یہ حالت نہیں وہ بے اختیار شرم، غصّہ، رنج، ندامت اور اکثر بیماری کی سزائیں دیتا ہے۔ اخلاق کے خلاف کرنے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ انسان اُس کی سزا بھگتے۔ مُلک کا قانون طبعًا یہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔ اسلئے جسمانی سزاؤں سے کام نکالتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا قانون اُس کے اپنے رویہ کی درستی کا ایک ضابطہ ہے اور انسان کا رویہ یا اُس کے اعمال اُس کمال کا زینہ ہیں، جس پر پہونچنے کی اُسکو خواہش ہے۔

سجّاد مرزا بیگ

زمانہ بدل گیا

کیا ذکر غیر خویش و بیگانہ بدل گیا
ایسی ہوا چلی کہ زمانہ بدل گیا

دل کو ہٹا کے خوب جگر سامنے ہُوا
تیر نگہ کا آج نشانہ بدل گیا

خالِ سیہ پہ مر کے یہ غمخوار ہو گیا
مرغِ دلِ اسیر کا دانہ بدل گیا

خلوت سے اب بدل گئی جلوت کی انجمن
آہ و فغاں سے جشن شبانہ بدل گیا

سوز نہاں نے خاک میں مجھکو ملا دیا
اب عاجزی سے فرِ شہانہ بدل گیا

سوز و گداز عشق کے لب پہ ہیں ترے
عیش و طرب کا اب وہ فسانہ بدل گیا

اے دل کہاں سخن میں ظرافت کی چاشنی
باسط مرغ فغاں کا ترانہ بدل گیا

باسط۔ بسوانی۔

نورِ مہر کو تاریکیٔ شب سے دست و گریبان ہوتے دیکھ سہمی ہوئی شبنم نے غبار آلود آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں اور پرواز کا قصد کیا۔ کہ فرہاد کی آنکھ اس پر پڑی۔

فرہاد۔ اے شبنم آمیں تجھے سنگ مرمر میں چھپالوں۔

شبنم۔ بلند سے مجھے کوئی سورج کی کرنوں سے بچالو۔

فرہاد۔ اے رشک بوئے یاسمن خوف نہ لا۔ میں خود شعاع مہر عالمتاب کو تیرے قدموں میں لا ڈالوں گا۔

* * * * * * * * * *

ایک جانب فرہاد سنگ مرمر کی ایک چٹان پر آب تیشہ بہا رہا ہے۔ اور باقی اور ہر طرف پتھر کے تراشے ہوئے زنانے اور مردانے سر اور جسم۔ نصف اور سالم۔ ملبوس اور برہنہ۔ سنگ مرمر اور لیغب کے سنگ سیاہ اور خارا کے ڈھیرے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں انسانی بت ہیں تو خیالی حور و غلمان بھی۔ بھر و جن ہیں تو شیطان بھی۔ ہر بت کی رگ رگ پے سچی اور اصلی معلوم ہوتے ہیں صرف بولنے کی دیر ہے۔ اگر بعض چہرے غصہ و غضب کا نمونہ ہیں تو بعض شادمانی اور طرب کا۔ اس جبین برجبیں ہے تو وہ غور و خوض میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ آنکھ پارسائی اور پاکبازی کا پتہ دیتی ہے تو وہ عیاری و رعنائی کا ان لبوں پر عیش پسندی اور سہل انکاری برستی ہے تو ان پر کج نفسی اور مکاری۔ الغرض اس استاد

مسلّم ہے کہ ہر نمونۂ صنعت سے یہ ٹپکتا ہے کہ اس نے قدرت کی صناعی کا ہو بہو خاکہ اُڑایا ہے۔ اور ہُنر سنگ تراشی کو بدرجۂ کمال پہونچایا ہے۔

جہاں اور بُت ہیں وہیں ایک نازنیں پابرہنہ بت بھی ہے۔ ہر عضو جسم سنگ تراش کے کمال کا نمونہ ہے اور اس کے تیشہ کی باریکی طرز کی داد دیتا ہے۔ بس کمی ہے تو روح کی۔ چہرہ سہم کا مرقع ہے۔ اور دونوں ہاتھ سوئے چرخ دراز ہیں۔ اور قدموں پر ایک نکیلا نوجوان جھکا ہوا ہے۔
دریہی ہے شبنم و شعاع کا بُت"

دونوں وقت مِل رہے ہیں۔ شب کی تاریکی لحظہ بلحظہ مغلوب آفتاب کی دھیمی کرنوں پر حاوی ہوتی جاتی ہے پرندے بھی اپنی اپنی داستان ختم کرکے اب نیند کے آغوش میں پہونچ سلئے ہیں۔ فرہاد کے کمرہ میں کافوری شمعیں روشن کی جاچکی ہیں کہ خود فرہاد بھی آپہونچا۔ ایک قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر ذرہ اپنے آپکو سر سے پاؤں تک دیکھا اور آہِ سرد کھینچکر کہنے لگا "دے فانوسِ خیال اگر تجھ میں شمع کافوری کی جگہ برقی بقعۂ نور ہوتا تو میری صنعت کا پیمانہ آج شہرت سے چھلکتا نظر آتا۔ مگر اس خاصیت کافور کا کیا علاج۔ ادہر دماغ میں خیال کا گذر ہوا اور ادھر وہ کافور ہوا" یہ کہکے ساغر و صراحی اُٹھائی اور ایک نگاہ پھر آئینہ کی طرف کرکے کہا "اگر اس شعلۂ خیال پر روغن خونِ جگر نہ چھڑکتا ہوں تو کہاں فرہاد اور کیسی صنعت فرہاد۔

اِدھر مئی ناب حلق سے اُتری اور اُدھر فرہاد نے اصفہان کی مینا بازار کا رخ کیا

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

"اے ماہوش تیرا نام ؟"

"جناب مجھے شیریں کہتے ہیں"

"شیریں"

"جی ہاں شیریں"

فرہاد محو تماشائے حسن اس گلفروشہ کو دیکھ رہا تھا کہ جس نے اپنا نام شیریں بتایا تھا۔ اور اسکا خاوند خسرو میلے کچیلے کپڑے پہنے شراب کے نشہ میں مبہوت پیچ سڑک میں لوٹ رہا تھا۔ مگر شیریں کے اعضا کا نقش سے معرا تناسب اسکی نستعلیق اور شستہ خط و خال اسکی رشک نغمہ آواز غرضیکہ ہر شے سے اسکی شان کبریائی ٹپکتی تھی اور اسکی ہر اَدا ایسی دلاویز واقع ہوئی تھی کہ فرہاد ہی نہیں بلکہ آدمیوں کا ایک ٹھٹھ کا ٹھٹھ خسرو کے بہانے شیریں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور ہر فرد بشر کی گرسنہ نظریں اس کے چہرہ کے صدقہ ہو رہی تھیں۔ جب خاوند کا نام خسرو سُنا اور خسرو کو نشہ کا شکار اور خاک میں لوٹتا ہوا بیقرار پایا تو فرہاد نے محویت سے چونک لوگوں کے جم غفیر کو شیریں کے گرد پایا اور کچھ سوچ کر شیریں سے کہنے لگا "اے نیکبخت تیرے خاوند کو تو اب برقنداز شب بھر کے لئے لے جائیں گی اگر تجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو چل میں تجھے ترے گھر تک پہونچا آؤں۔ شیریں نے فرہاد کی ہمراہی غنیمت تصور کی اور لوگوں کی جھمگٹے سے نکلکر اس نے دم لیا۔

"تم کون ہو صاحب"

"فرہاد"

"فرہاد سنگ تراش؟"

"ہوں تو سنگ تراش ہی۔ مگر تجھے میرا نام کیونکر معلوم ہوا"

"اے واہ۔ فرہاد کا نام کون نہیں جانتا۔ مگر تجھے یہ میرا گھر آگیا۔ یہ نیچے میرے ہی ہیں!"

فرہاد شیریں کے گھر کے سامنے ٹھٹکا اور ایک نگاہ شیریں پر ڈالکر بیساختہ کہنے لگا۔ "تجھے یہ تو معلوم ہے کہ میں سنگ تراش ہوں میرا پیشہ بُت تراشنا ہے۔ اگر تو منظور کرے تو میں تیرا بُت بناؤں"

"مجھے اس سے کیا انکار ہے۔ مگر میرا خاوند نہ مانیگا۔

"میں ترے خاوند کو معقول معاوضہ دونگا کیا وہ پچاس اشرفیوں پر رضامند ہو جائے گا؟"

"میں دریافت کر کے کہوں گی"

"اے نیکبخت۔ وہ خدا جانے کب ہوش میں آوے اور کب جواب دے۔ اور مجھے تضیع اوقات مقصود نہیں۔ اگر تجھے انکار ہے تو مجھے اصرار نہیں۔ اور تجھے اعتراض نہیں تو ترے خاوند کی رضامندی ایسی کوئی ناممکن نہیں"

"بھلا مجھے کب انکار ہو سکتا ہے۔ فرہاد کے کہے کو میں کب ٹال سکتی ہوں"

+ + + + + + + + +

فرہاد کی آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے کہ صبح کا سہانا سماں ہے۔ سورج کی سنہری کرنیں عرفہ میں سے چھن چھن کر آرہی ہیں۔ کروٹ بدلی۔ آنکھیں ملیں جمائیاں تھیں کہ وار نہ لیتی تھیں۔ خمار اور پھر خمار کا خمیازہ۔ "اگر خواب تھا

توحیرت اور واقعہ تھا تو اس سے زیادہ تعجب۔ اور مزہ یہ ہے کہ شیریں کا نقش ونگار اس دم تک میرے دماغ میں صاف موجود ہے۔ وہ تمام سماں میرے نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور پھر حیرت یہ ہے کہ اگر خواب نہ تھا تو یہ کیوں نہیں یاد کہ شیریں کو گھر پہونچا کے میں کہاں گیا اور گھر کب آیا" بار بار آنکھیں ملیں۔ صبوحی پی۔ اور بالآخر ایک گہرے غوطہ میں گیا۔ بڑی دیر کے استغراق کے بعد تکیہ سے سر اٹھایا۔ آفتاب کے پیامبروں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ فرہاد نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور مسہری سے اٹھ قد آدم آئینہ کے سامنے گیا اور کہنے لگا۔

"اے مایۂ نازِ قدرت شیریں۔ اگر عالم رویائے میں تو خیال کی نازک کلی ہو کر چٹکی تو عالم بیداری میں تو پھول ہو کر کھلے گی۔ اگر خوابستان میں مثل بوئے یاسمن اڑ گئی تو چمنستان میں تو رنگ گل ہو کر کھلے گی اگر دنیائے خیال میں تیری زندگی چند لمحہ کے لئے مستعار تھی تو اس جہان حقیقت میں تو حیات ابدی حاصل کرے گی۔

اگر وہمستان میں تجھے شبنم سان طلوع مہر منیر تک جگہ ملی تھی تو مرستان میں تو روز وشب ہستی لازوال پائے گی۔ اگر تیرے حسن کا نغمہ میرے گوش تصور میں چند لمحوں تک رہا تو وہ دنیا کے پردے پر تا حشر باقی رہیگا۔ انسانی ہستی آفرینش وموت کے خطوط وحدانی میں بند ہے مگر تیری ہستی حدودِ حال واستقبال سے مبرا رہیگی۔ نظام عالم کا ثبات شیریں کا ثبات ہوگا اور اجرام فلکی کی ہستی سے شیریں کی ہستی وابستہ ہوگی۔ نہ تجھپر عمر کا جادو کارگر ہوگا نہ انقلاب زمانہ تجھے تسخیر میں لاسکیگا۔ اے شیریں تیرا عاشق۔ تیرا بندہ۔ تیرا خالق فرہاد تجھے ثبات

ابدی بخشیگا۔ تیرا نام بیاض حسن کے پہلے صفحہ پر مزین ہوگا اور تیرے
حسن کی شمع کا بزم دنیا میں تا سحر قیامت اُجالا رہیگا"

+ + + + + + + + + +

فرہاد نے شیریں کا ایک بے مثال سنگ مرمر کا بُت تیار کیا
جس کے ہر عضو میں سوائے روح کے اور سب کچھ تھا۔ اور وہ
بت حقیقت میں حسن و خوبصورتی کا ایک اعلےٰ ترین نمونہ تھا جس
محنت و جانفشانی سے تیار ہوا تھا واقعی اس کے مقتضی تھے کہ
صناع اسے اگر اپنی روح اور اپنی قوت تخیلہ کا پتلا کہتا اور اپنی خون جگر
سے تیار کی ہوئی مورت تصور کرتا تو بجا ہوتا۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ
جس شئے کو انسان ایسی عرقریزی اور تندہی سے تیار کرے کہ جیسے
فرہاد نے شیریں کے بت کو کیا تو حقیقت میں وہ بنانے والے کا
ایک حصہ ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام گویّ کا راگ۔ بین اور طبلہ نواز
اور رقاص کی گتیں۔ نیز مصور کی مرقعے اور انشا پرداز کی عبارت آرائی
یہ سب وہی حیثیت رکھتی ہیں جیسے فرہاد کی شیریں۔ مگر جس یکسوئی
اور یک نظری سے فرہاد نے شیریں کو بنایا تھا اس نے پردۂ دوئی
کو اسی طرح اُٹھا دیا کہ جیسے طلوع مہر روز و شب کے درمیان جو پردہ
ہوتا ہے اسے چاک کر دیتا ہے۔ حقیقت میں روز و شب ایک
ہی ہیں۔ صرف دیکھنے کا فرق ہے مہر منیر انسان کو چشم بینا دیتا
ہے اور اسیطرح فرہاد کے دیرینہ عشق نے اسی چشم بینا عطا کی اور جب
شیریں کا بت تیار ہو گیا تو اسے اس میں اور خود میں "من و تو" کی
تمیز باقی نہ رہی۔

ظلمت خیال کے پردہ سے شیریں نے فرہاد کے افق صناعی پر طلوع کیا۔ پو پھٹتے ہی فرہاد آنکھ کھولکر جو دیکھتا ہے تو پھول ڈالی کا عکس آئینہ دل میں صاف نظر آرہا ہے صبح صادق ہوتے ہی تصویر یار خیال سے محو ہونی شروع ہوئی۔

ہر چند خیال کو دوڑاتا ہے۔ تصور کو آگے بڑہاتا ہے مگر شیریں ماہ چہاردہم کی چاندنی کی طرح سورج کی کرنوں کے نمودار ہوتے ہی مفقود ہوگئی صرف ایک وہم سا باقی رہگیا اور وہ تکلیف دہ۔ جب ساغر تصور میں مئے حسن ہی نہیں رہی تو سرور عشق کیسا۔ وہاں تو صراحی بھی اب خالی تھی۔

فرہاد نے اپنی سفینہ حیات کو تیشہ کی دھار پر ڈالدیا اور ایام بے لگام کی موجوں سے ہم بغل ہوتا قلزم ابدی میں جا پہونچا۔

جزیرۂ مرمرستان میں حسن وعشق کی کہانی اور شیریں فرہاد کا واقعہ بچہ بچہ جانتا ہے *

"آصف علی"

ناظرین براہ کرم خط وکتابت میں نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

پیغامِ حیات

نگاہیں پڑ رہی تھیں بادلوں کے کھیت پر جن کی
کہ سیلابِ گہر اُٹھیگا اُن سے آج دُنیا میں

مگر اُن کی حیاتِ مضطرب کا دیکھکر نقشہ
جھلک آئے ہیں اشکِ خوں مری چشمِ تمنا میں

نگارستانِ عالم کی تھی زینت جن سے وابستہ
تڑپتے تھے ہزاروں جن کے جلوے کو تکنے کو آنکھوں میں

مگر لائے تھے وُہ دنیا میں اتنی مختصر ہستی
کہ یہ محفل کی محفل اُٹھ گئی اِک دو پیالوں میں

اُداسی چھائی ہے اسوقت اُن ناشاد کلیوں پر
کہ جن پر ناچتی پھرتی تھی خوشبو صبحدم کیا کیا

بہارِ رفتہ نے اُن کو اوڑھایا ہے کفن لیا
کہ جس سے چھا رہا ہے اک دلِ عالم پہ غم کیا کیا

حیاتِ مختصر، سمجھے ہوئے ہیں جس کو، وہ دُنیا
ہمارے واسطے لائی ہے اِک پیغامِ روحانی

ہر اک تارِ نفس سے ہے نغمہ ریزِ جذبِ پوشیدہ
نمایاں ہو رہا ہے مدتوں کا دردِ انسانی

ہمارا ہر نفس ہو شورشِ ہستی کی ہم صورت
ہمارے خوں کا ہر قطرہ فضاءِ انقلابی ہو

ہماری آفرینش ہی سے گر دُنیا ہے وابستہ
تو پھر کیونکر نہ ہر اک شے میں ہمکو کامیابی ہو

ہماری موت وجہِ ظلمتِ دُنیا ہے بُن لکھو
بہت تاریخِ عالم رو دیگی ہم کو زمانے تک

بہت دُہرائیں گی قومیں ہمارے کارناموں کو
مگر مٹ جائیگا خود ہی جہاں ہم کو مٹانے تک

سکوتِ مُردہ تا کے، لب پہ مُہرِ خلشی تا کے،
سکوں آموز ہو گی جنبشِ خوں تا کجے تن میں

نہ اُٹھیں نغمۂ بیتاب کیوں اِس جسمِ مُردہ سے
رہیگی روح کب تک دفن اِس بوسیدہ مدفن میں

اگر رہنا ہے دنیا میں، تو دنیا کو کرو روشن
رہے بھی تو رہے کیا اس عفونت خیز ظلمت میں

دلِ بیتاب ہو پہلو میں جب سے لطف جینے کا
بسر کیجے جہاں میں رہ کے اک بے چین راحت میں

اگر ہم خواستگارِ ہستیِ شاداب ہیں قیصر
اگر ہم چاہتے ہیں خود کو دیکھیں بزمِ امکاں میں

تو تحریکاتِ عالم کو نظامِ زندگی سمجھیں
نئی اِک روح پھونکیں قالبِ ایامِ بیجاں میں

قیصر (بھوپال)

زبردست کی رضا سر پر

یہ مضمون صرف مسلمانوں سے متعلق ہے دیگر مذاہب سے چنداں بحث نہیں

دُنیا میں انسان کی دو ہی جنسیں ہیں۔ مرد اور عورت یا یُوں سمجھئے کہ دُنیا کا قیام ان ہی دو جنسوں پر منحصر ہے۔ انسان ہی کیا جانوروں کے وجود اور بقائے نسل کا بھی یہی راز ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مردوں کو عورتوں پر ترجیح کیوں۔ حالانکہ غور کامل کے بعد یہہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ عورت تنِ تنہا اپنی زندگی کی ضرورتوں کو بہم پہونچا سکتی اور عصمت کے ساتھ بسر کر سکتی ہے اور مرد بغیر عورت کی مدد کے اپنی احتیاجات کو پُورا کرنے میں بسا اوقات معذور ہوتا ہے۔ تارک الدنیا۔ اور اولیاء اللہ کا یہاں ذکر نہیں۔ کوئی صاحب ان کو میری منشا کے خلاف ثبوت میں نہ پیش کریں۔ میری مُراد عام مردوں اور عورتوں سے ہے۔ نہ کہ خاص خاص سے۔ اور اس بحث کو میں نے شکایت کی غرض سے پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ عام عورتوں کی جانب سے وکیلانہ عام مردوں کی خدمت میں جائز حقوق کی درخواست کی ہے۔ میں اپنی تحریر میں اگرچہ اصلیت اور صداقت کی راہ سے باہر قدم نہ رکھوں گی۔ مگر ممکن ہے کہ اس مشہور کہاوت کے موافق کہ "سچی بات کڑوی معلوم ہوتی ہے" میرے بیان میں بعض ناگوار صورتیں نظر آ جائیں۔ لہٰذا میں قبل از بیان ہی مخالفین سے معافی مانگتی ہوں۔ اور مرد میدان بنکر بات کا تبنگڑ بنانا نہیں چاہتی خانہ داری کے تمام کاروبار صرف ایک عورت کی ذات سے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔

جس گھر میں عورت نہیں اوسکا مالک باوجود دولتمند ہونے کے طرح طرح

کی فکروں اور تکلیفوں میں مبتلا رہتا ہے۔ یہہ ایک ایسی بات ہے کہ اسکی زیادہ تشریح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اور غالباً کسی کو اس بات سے مان لینے میں عذر بھی نہ ہوگا۔ کسی کا مقولہ "ہر کہ زن ندارد آرام تن ندارد" بہت صحیح اور بجا ہے۔ مرد صرف ایک ہی کام پر یعنی روزی کی تلاش میں شبانہ روز مصروف رہتا ہے اور بیچاری عورت کے ذمہ شوہر کی خدمت۔ بچوں کی پرورش اور گھر کا انتظام وغیرہ بہت سے کام ہوتے ہیں وُہ یک سرو ہزار سودے کی سچی مثال ہوتی ہے۔ گھر گرہستی کے انتظام کو تھوڑی دیر کے لئے ایک گاڑی فرض کر لیجئے تو مرد و عورت یعنی شوہر و زن بیشک اوس گاڑی کے دو پہئے ماننے پڑینگے۔ کوئی گاڑی بغیر پہئے کے نہیں چلتی۔ اس طرح گھر کا انتظام زن و شوہر کی باہمی شرکت و مدد کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر دو پہئے والی گاڑی کا ایک پہیہ نہ ہو تو کیا وہ چل سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ پھر چلتی ہوئی گاڑی میں روڑا اٹکانا کون عقلمندی کی بات ہے میرے اس بیان سے غالباً یہہ تو ناظرین پر واضح ہوگیا ہوگا کہ دونوں جنسوں کو ایک دوسرے کے اتفاق اور اتحاد یا یُوں کہئے کہ کامل مدد اور شرکت کی ضرورت ہے۔ اور جب ایسا ہے تو پھر کیا وجہ کہ عورتوں کو آزادی اور مختاری کے مساوی حقوق نہیں دیے جاتے۔ بلکہ مرد آقا۔ اور عورت خادمہ۔ بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی کمتر سمجھی جاتی ہے یہاں پر بھی میں اُن خاص مردوں کا ذکر نہیں کرتی جو اس امر سے مستثنےٰ ہیں بلکہ میری تحریر کثیر التعداد اور عام مردوں کے برتاؤ سے متعلق ہے۔ عورت کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ شوہر اپنی خدمت

مقررہ کو انجام دیکر اب آتا ہوگا لہذا اُس کے واسطے یہہ یہہ آرام اور
راحت کی چیزیں درست اور تیار کر رکھیں اور جہاں مرد نے گھر میں قدم
رکھا کہ وہ اوس کی خدمت کو تیار ہو جاتی ہے عورت کے خاوند ہوتے
ہیں کچھہ شک نہیں نہ اس میں اوسکی کوئی بے عزتی ہے مگر مقتضائے
انسانیت۔ ہمدردی۔ انصاف اور محبت یہ ہے کہ شوہر بھی اپنے
آپ کو عورت کا خادم نہ سہی ہم پلہ اور برابر کا حقدار سمجھے۔ میں دیکھتی ہوں
کہ مرد کے آرام و آسائش کا جتنا خیال عورت کو ہوتا ہے مرد کو عورت
کا اوسکا چوتھائی بھی نہیں ہوتا مرد نے اگر کسی طریق سے روزی حاصل کرنے
میں گھر سے باہر محنت اُٹھائی ہے تو عورت بھی اپنے شوہر کی حیثیت کے
موافق راحت پہونچانے کے سامان فراہم کرنے میں گھر کی چار دیواری
کے اندر پریشان ماری ماری پھرتی ہے۔ شوہر کو اسکا مطلق خیال بھی
نہیں ہوتا کہ عورت نے ہماری راحت رسانی کے واسطے آگ اور
دھوپ کی گرمی میں اپنا خون پانی کر دیا یعنی پسینہ کر کے بہا دیا ہے
بلکہ بعض اوقات طرہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز اپنی مرضی کے موافق
نہ پائی یا اتفاق سے کسی سامان کی تیاری میں کچھہ دیر ہوگئی۔ تو آپ ایسے
ناراض ہیں کہ بات کرنا دوبھر ہے۔ ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا گویا شوہر کو
اختیار حاصل ہے کہ وہ جا و بیجا حق ناحق جس طرح چاہے زبان سے
گل افشانی کرے۔ مگر کیا مجال کہ عورت زبان سے معذرت اور بریت
کے الفاظ بھی نکال سکے۔ ان باتوں کو بھی جانے دیجئے ہم روزمرہ دیکھتے
اور سُنتے ہیں کہ فلاں مرد نے کوئی ناجائز تعلق پیدا کر لیا۔ اور اپنی بیوی
سے بے توجہی برت رہا ہے مگر بیوی ہے کہ حرف شکایت زبان پر نہیں

لاسکتی یا نہیں لاتی۔ حالانکہ عورت کے لیئے اس سے زیادہ کوئی غم نہیں
شوہر صاف علانیہ فخر کے طور پر رنڈی بازی کریں کچہہ عیب نہیں۔ عورت
کی کیا طاقت کہ شوہر سے اس بارہ میں مواخذہ کر سکے۔ برخلاف اس
کے عورت اگر اپنے کسی عزیز سے بہی ذرا زیادہ محبت کے ساتھہ ملے
جُلے اور ہنسی بولی کہ شوہر کو اس ناکردہ گناہ اور بے بس کے حق میں بد
گمانی پیدا ہو گئی۔ اور پھر اوس کو طرح طرح کی تکالیف پہونچانے کا بیڑہ
اُٹھایا۔ کیا خدا کے یہاں بہی یہی انصاف ہے۔ نہیں وہاں مرد اور
عورت دونوں کے واسطے یکساں تعزیر ہے۔ مرد تھوڑی دیر کے
لیئے ہٹ دہری کو چھوڑ کر ذرا انصاف سے کام لیں تو اونکو میرے
بیان کے راستی و دروغگوئی کا حال معلوم ہو جائیگا۔ ناجایز تعلق نہ
سہی۔ ایک اور صورت بہی اسی کے ہم قریب نظر آتی ہے وہ یہہ کہ اگر
عورت اتفاق سے بدصورت ہے۔ تو شوہر کو اوسکے ساتھہ محبت نہیں
ہوتی اور وہ پہلے ہی دن سے اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ دوسرا عقد
کرنا چاہیئے۔ پھر بیچاری عورت کتنی ہی نیک کیوں نہو۔ اور شوہر کی خدمت
میں اپنے آپ کو مٹا ہی کیوں نہ دے مگر اوس بیچاری کی کوئی اچھی بات
اُسے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ یہہ ایک بات مانی ہوئی ہے جس سے
محبت ہوتی ہے اوسکی ہر ایک بُری بات بہی اچھی نظر آتی ہے۔ اور جس
سے محبت نہیں دِل ہٹا ہوا ہے۔ اوس کی اچھی بات بہی بُری دکھائی دیتی
ہے یہہ صورت یعنی عقد ثانی عورت کی بدشکلی ہی پر منحصر نہیں بلکہ اور بہی سبب
سے بیہودہ سبب اس کے محرک ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت کے دو تین
بچے پیدا ہو گئے۔ عورت میں آثار ضعیفی نمایاں ہونے لگے وغیرہ وغیرہ۔

یہہ انصاف کا خون کرنیوالے ایسی حالتوں میں اکثر سنت اور شریعت کو اپنی پشت پناہ ۔ سپر اور آڑ بناتے ہیں اور اصل یہہ ہے کہ شریعت کو بدنام کرتے ہیں۔ یہہ فقرہ اونکے نوک زبان رہتا ہے کہ دوسرا عقد کرنا منع نہیں عین خدا و رسول کے حکم کے موافق ہے پھر کوئی ایسا کرے تو کیا قباحت یہہ تو وہ مثل ہوئی۔ کہ میٹھا میٹھا ہپ ۔ کڑوا کڑوا تھو۔ اپنی مطلب کی بات کے لیئے تو قرآن اور حدیث سے سند لینے لگے اور دوسرے کے لیئے گویا خدا و رسول کے احکام سے واقف ہی نہیں بیشک دوسرا عقد کرنا درست ہے قرآن و حدیث کے موافق ہے۔ امنا و صدقنا۔ مگر کوئی ان نام کے پیروان شریعت سے یہہ تو پوچھے کہ خدا نے دوسرا تیسرا عقد کرنیکے لیئے کوئی شرط ہی لگا دی ہے یا نہیں۔ عدالت اور مساوات پر تو۔ خوشی سے دوسرا عقد ہی کر لو۔ لیکن قہر تو یہہ ہے کہ وہ ایک شئے کو جو اپنی خواہش کے مطابق ہے اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری کی پروا نہیں کرتے حالانکہ شرط کے پورا ہونے کی حالت میں مشروط ناجائز ہو جاتا ہے ۔ اگر دونوں بیویوں کے درمیان عدالت اور مساوات نہ برتی جائے تو ہرگز دوسرا عقد جائز نہیں۔ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ مسخرہ پن یا حماقت سے کلام مجید کی آیت شریف کا ایک جزو لا تقربو الصلوۃ کو ہنسی خوشی لوگوں کو سناتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ نے اپنے کلام پاک میں خود فرمایا ہے کہ "نماز کے پاس نہ جاؤ" توبہ توبہ نعوذ باللہ۔ ان بھلے آدمیوں سے یہہ تو دریافت کرو کہ انتم سکاری کس آیت کا جزو ہے اور اس کے کیا معنے ہیں۔ اللہ نے نماز سے کس حالت میں منع فرمایا ہے۔ جبکہ تم نشہ میں ہو۔ نشہ سے مست ہونا یہہ

نہیں کہ نماز سے ہی قطعاً منع فرما دیا ہے اصل تو یہہ ہے کہ اللہ ہی ہمارے ان مالکوں کو توفیق نیک عطا فرمائے تو یہہ راہ راست پر آسکتے ہیں ورنہ ہمارا رونا چیخنا۔ کچھہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ ان کو خود غرضی نے ایسا بنا لیا ہے۔ کہ ہماری کوئی دلیل۔ ہماری کوئی گزارش ہمارا کوئی ثبوت اور کسی قسم کی فریاد ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگنے دیتی۔ دنیا میں اچھے اور برے دونوں جنسوں میں ہوتے ہیں میں یہہ نہیں کہتی کہ تمام مردوں میں یہہ اوصاف بالا موجود ہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بہت سے خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو بدشکل۔ بدتمیز اور بے ہنر عورتوں کو بھی نہایت خوبی کے ساتھ نباہتے ہیں۔ خود اپنی جان پر تکلیف اُٹھاتے ہیں مگر بیوی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ اور اوسکی دلشکنی کو جائز نہیں رکھتے مگر بات یہہ ہے کہ ہمیشہ حکم کثرت پر دیا جاتا ہے۔ قلت پر نہیں۔ چونکہ زیادہ حصہ مردوں کا انہی اوصاف سے آراستہ ہے جسکا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اسلئے میں نے یہ مضمون صرف دو غرضوں سے لکھا ہے اور دو باتیں اس سے مقصود ہیں ایک یہہ کہ شاید میری ناچیز تحریر کا کچھہ اثر اس جنس پر ہو اور وہ اپنی بے بس اور وفادار خادمہ کو مستحق عنایت سمجھے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ میری بہنیں اس زہریلی اور ناقص ہوا سے عام مالکوں کو متاثر جانکر اونکی بے اعتنائیوں۔ کج خلقیوں۔ اور نا انصافیوں کی کچھہ پروا نہ کرکے یہہ سمجھ لیں کہ ہم دنیا میں زبردست کی رضا سر پر دل و جان سے ماننے نیز اپنے شوہر کی حکومتوں کی برداشت کرنی اور اونکی خدمت و اطاعت ہی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ شوہر سے عنایت و محبت سے

پیش آئے۔ یا قہر و سختی سے ہم کو ہر وقت اوس کی دلجوئی اور آرام و راحت رسانی کی فکر میں دُنیا و مافیہا کو بھول جانا چاہیئے۔

بہنو۔ یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا و رسول بھی خوش ہوگا دنیا کے حق پسند بھی خوشش ہونگے اور چار ناچار شوہر بھی سچے دل سے اگر خوش نہ ہوگا تو ظاہر میں ہی رعایت و عنایت برتنے پر مجبور ہوگا دنیا کی زندگی چند روزہ ہے ہم کو اسکی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اوس عالم کی ہر وقت فکر رکھنا چاہیئے۔ جہاں اس عالم سے روپوش ہونے کے بعد ہمیشہ رہنا ہے اور وہاں خوش و خرّم رہنے کے لئے ہمارے واسطے اطاعت والدین اور فرمانبرداری شوہر سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے عمل کا بدلہ ضرور دیتا ہے۔ لہٰذا ہمکو حسن عمل کا پابند ہونا نہایت ضروری ہے اور ظاہری رنجوں کو اپنے پاس نہ آنے دینا اور یہ سمجھنا کہ اے شمع تری عمر طبعی ہے ایک رات۔ ہنسکر گزار یا اسے روکر گزار دے۔ مقتضائے دانشمندی اور کامیابی کی لازمی ذلیل ہے۔ گو مرد کو اپنی چستی۔ چالاکی۔ طاقت۔ زبردستی سے اس بات کا کامل یقین ہوتا ہے کہ میں عورت سے دُنیا کی کشمکش میں مُفید ثابت ہوں گا کہ قوت فیصلہ۔ ضبط۔ نفاست۔ مذاق۔ رائے کی صحت میں کامیاب ہوتا ہے یعنی مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ مگر جذبات اور احساس میں عورت مرد پر غالب ہے۔ مثلاً بھوک کا تحمل مرد سے بوجہ اس کے کہ اوس کے اعضاء زیادہ وسیع ہیں اور تغذیہ کا تقاضہ بڑی شدت سے کرتے ہیں نہیں ہوسکتا۔ لیکن عورت تحمل کرلیتی ہے۔ امور خانہ داری کی مثال ایسی ہے کہ یہ بوجھ مرد نہیں جھیل سکتا۔ ذرّہ میں گھبرا جاتا ہے۔ کیا بات ہے۔

یہی بات ہے کہ عورت کا احساس تحمل مرد سے بہت تیز ہوتا ہے اس لیئے عورت سہار لیتی ہے ویسے خدا نے مرد کو ہی عورت پر ہر طرح سے غالب بنایا ہے کہ دماغی۔ علمی۔ جسمانی اور دینی دنیوی حالتوں کو انجام دیتے ہیں۔

خداوند کریم نے جس کی ذات تمام دینی اور دنیاوی مصلحتوں کا سرچشمہ ہے۔ عورت کو ہلکے۔ کام کے واسطے پیدا کیا ہے۔ مرد کو مشکل کام کے واسطے خواہ وہ کام جسمانی ہو یا دماغی۔ اسلیئے مرد کو عورت کے ساتھ اسی اندازہ سے پیش آنا چاہیئے۔ بلکہ قدر کرنی چاہیئے کہ خدا نے جس چیز کو کمزور بنایا ہے وُہ کن کن مصائب اور سامنوں کو کس کس تحمل سے سہتی ہے اور ساتھ دیتی ہے دیکھو انسان کے مزاج کا چار چیزوں سے تعلق ہے۔ اوّل (خون) سے دوّم (صفرا) سے سوم (سودا) سے چہارم (بلغم) سے۔

یہہ قول میں نے اطبار یونانی سے نہیں لیا۔ بلکہ جرمنی کے ایک مشہور محقق لالٹری سے لیا ہے۔

(۱) جنکا مزاج خون سے تعلق رکھتا ہے وہ لوگ اکثر بچوں سے اپنی حرکات میں مشابہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اکثر خوش رہنا۔ طبیعت میں استغراق کا ہونا۔ اور رنگوں کا موجود ہونا۔ دوستی دشمنی کا چند روز قائم رکھنا جلدی سے مایوس ہوجانا۔ اور مایوسی سے بہت بیدل نہونا۔ خیالات کا دوڑانا اپنی مرضی کا تتبع کرنا۔ چلبلے پن کا ہونا۔ ہمت کا ہونا۔

(۲) جن کے مزاج میں صفرا غالب ہوتا ہے اون پر امید اور یاس کا اثر دیرپا اگرچہ ہلکا ہوتا ہے۔ ارادے میں بالخصوص جب کسی غرض سے

تعلق رکھتا ہو استحکام اور تیزی ہوتی ہے۔ یہہ مزاج خالص مردانہ مزاج ہے اور جوانی اور تندرستی کی حالت میں اسکا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) بلغمی مزاج اکثر سست ہوتے ہیں اور اوسے دیر میں پیدا ہوتے ہیں اور اونپر دیر میں عمل ہوتا ہے غرض ہر ایک قوت دیر میں عمل کرتی ہے یہہ مزاج خونی مزاج کی ضد ہے۔ سستی۔ کاہلی۔ بدقسمتی کی دلیل بین ہے۔

(۴) سوداوی مزاج میں۔ افسردگی زیادہ ہوتی ہے۔ متخیلہ قوی ہوتی ہے تحمل کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ میلان طبع کو مرض پر ترجیح ہوتی ہے محبت سے طبیعت نفور رہتی ہے۔ نفاست اعتدال سے زیادہ ہوتی ہے داہمہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ مراقیت۔ مالیخولیا۔ غیض و غضب دیر پا ہوتا ہے۔

لو بیویوں خوش ہو جاؤ تمہارا مزاج پہلی قسم کا مزاج ہے جسکو خون سے تعلق ہوتا ہے۔ اے مردو عورتوں کی عزت کیا کرو۔ انمیں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی یہہ رکھی گئی ہے۔ کہ زندگی کے انقلابات کو بہت اچھی طرح نہ صرف یہہ سہارلیتی ہیں بلکہ اپنی گذران اپنا میلان طبع اپنے مشغلات کو اوس انقلاب کے موافق بنالیتی ہیں ضرورت پڑنے پر مرد بھی اس سے عاری نہیں مگر عورت کو اسکا تحمل آسانی سے ہوتا ہے مرد کو مشکل سے۔ بیاہی بیٹیاں بہت جلد اور بہت خفیف سی دقت یا بعض صورتوں میں بلا دقت اپنی سسرال کی خو۔ بو۔ رسم۔ رواج۔ طرز معاشرت وغیرہ اختیار کرلیتی ہیں۔ مرد گھر داماد بنکر بھی مشکل سے کرسکتے ہیں۔ وجہ اوسکی یہہ ہے کہ مرد کی طبیعت تشریح طلب اور خردبین ہوتی ہے۔ مرد کو جو کچھہ دنیا میں

دکھائی دیتا ہے اوسکو وہ ایک اصول کے ماتحت لانا چاہتا ہے۔ عورت اسکے برخلاف اپنے اصول کو اوسکے ماتحت کردیتی ہے جو اوسکے سامنے ہو رہا ہے۔ اور اس ذریعہ کمزور مخلوق کی زندگی ہر ملک میں مرد کی نسبت آسانی سے گزر سکتی ہے۔

دوسری خوبی عورت میں فطرت کاملہ میں یہہ رکھی ہے کہ نیکی کا مذاق جس کو حسنِ اخلاقی کہنا چاہئے عورت میں بہت زیادہ ہے اسلئے کہ عمل کے احاطہ کے اندر ہے۔ اخلاق یعنی بلندی کا نمونہ جو مرد کے تخیلہ میں پیدا ہوتا ہے وہ عورت کے خواب میں بھی نہیں آتا لیکن عورت کے دماغ میں جو نیکبختی کا نمونہ ہے وہ ایسا ہے کہ اوسکی تتبع پر شریف عورتیں (ہندوستان کی) تقریباً سب کی سب قادر ہیں۔

اِس مضمون کے پڑھنے والوں پر یہہ بات پوشیدہ نہیں اور ہر ایک اپنی واقفیت کے دائرے پر نظر ڈالکر دیکھ سکتا ہے کہ مرد اخلاقی حیثیت سے زیادہ کمزور ہیں۔ کیونکہ بعض کا آئڈیل نمونہ بہت بلند ہے اور بعض سرے سے کوئی آئڈیل ہی نہیں رکھتے اسوجہ سے اخلاقی جنون میں مبتلا ہیں۔ مگر عورتیں۔ (اللہ انکو خوش رکھے) اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی بچے پالتی ہیں کپڑے سیتی ہیں گھر کا دھندھا کرتی ہیں۔ اونکی دُنیا اوسنکے خاوند ہیں اون کی فرحت گاہیں اوسنکے بچے ہیں بری ترغیبوں سے مامون دُنیا کی کشمکش سے محفوظ۔ آپ بھلی اپنا گھر بھلا۔ زبانِ حال سے یہ شعر پڑھا کرتی ہیں۔ ؎

چگونہ شکر ایں نعمت گزارم
کہ زورِ مردم آزاری ندارم

لہٰذا اب میں اپنے مضمون کو اس دعا پر ختم کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مری بہنوں کو اپنے شوہروں کی اطاعت اور فرمانبرداری۔ اور ان کے شوہروں کو دلداری اور دلجوئی کی توفیق عطا فرمادے آمین فقط

والدہ مرزا مصطفیٰ اشرف گورگانی

تنازع البقا

چشمہ جو یہ بہہ رہا ہے کہتا ہے اپنی رو میں
دریائے زندگانی میری طرح رواں ہے
عمدہ سُریں گاتا طے کر رہا ہوں وادی
گہ سبزہ زار گلبن میرے سبنے ہیں مسکن
گہ جھاڑیوں میں اپنا ڈیرا ہے میں نے ڈالا
پستی ہو یا بلندی ہر جا پہ میں رواں ہوں
گو ٹھوکریں بہت سی ہوں ہر قدم پہ کھاتا
زیر و زبر ہر ایک کو میں نے یہاں کیا ہے
میری مخالفت میں جس نے قدم بڑھایا
موجوں کی کشمکش میں ہستی کو اپنی اُس نے
ناچیز خس کی مانند بحر عدم میں پایا
جو زیر ہو یہاں پر وہ کب بھلا بڑھا ہے
دریائے زندگانی گو پُر ہے مشکلوں سے
اُس کا عبور کرنا مشکل نہیں۔ مگر ہاں!
اپنی بقا جو چاہے بڑھنے نہ دے کسی کو
جس طرح ایک پودا بڑھنے نہیں ہے دیتا
کمزور اُس سے جو ہو پاس اُس کے جو اُگا ہو

[illegible] حسن بہاری

ہندوستان کی حسین لڑکی اور اسکی ہنسی

دل کو لبھا رہا ہے انداز اس ہنسی کا
پیشِ نظر ہے نقشہ کھلتی ہوئی کلی کا

یہ دانت صاف اسکے یہ ہونٹھ لال اسکے
دو نیم رنگ گل ہیں چہرے میں گال اسکے

قدرت نے ان لبوں کو کیا لال کر دیا ہے
دو حرف لکھ کے گویا شنجرف بھر دیا ہے

چمکے وُہ دانت اسکے رنگیں دہن میں دیکھو
ہیروں کی کان نکلی ملک یمن میں دیکھو

دونوں لبوں کو دیکھو۔ رُخ دیکھکر دہن میں
جوڑا یہ لال کا ہی رہتا ہے جو چمن میں

اپنی ہنسی کی شاید اسکو خبر نہیں ہے
کیا پھول کھل رہے ہیں اس پر نظر نہیں ہے

واقف نہیں کہ کتنا زیبا ہی حسن اس پر
واقف نہیں کہ اس نے بجلی گرائی کس پر

خود حسن کو سمجھتی تو شرم اُس کو آتی
ہونٹوں کو بند کرتی دانتوں کو یہ چھپاتی

گالوں میں پڑ گئی ہی کچھ کچھ شکن ہنسی سے
چمکا ہی حسنِ فطرت اس حسنِ عارضی سے

دانتوں کے نور سے دل دارفتہ ہی ہنسی پر
کی ہی جلا ہنسی نے اس حسنِ قدرتی پر

چشمے میں مُنہ کو دھونا اور بار بار ہنسنا
کیا لطف دے رہا ہی بے اختیار ہنسنا

پانی میں دیکھتی ہے رُخ اپنا پیارا پیارا
خوش کر رہا ہے اسکو شاید وُہی نظارا

جنبش میں عکسِ رُخ کو ہنس ہنس کے دیکھتی ہے
لہروں سے کھیلنے کا شاید سبب یہی ہے

مُنہ دھو رہی ہی جس جا ہیں مچھلیاں بھی اس جا
شاید ہنسا رہا ہو نظارہ مچھلیوں کا

مچھلی پکڑ رہی ہی چلّو میں دل لگی سے
ملتی نہیں وہ اس کو ہنستی ہی یا اسی سے

ہنسنے کا جو سبب ہے وُہ اب سمجھ گئے ہم
دانتوں کے کھولنے کا مطلب سمجھ گئے ہم

آئینہ ہی نہ اس دم پاس اس کے آرسی ہی
دانتوں کو مانجھ کر یہ پانی میں دیکھتی ہے

پانی میں صورت اپنی اس نے جو دیکھ پائی
سمجھی کہ اور کوئی اس کے مقابل آئی

واقف نہیں کہ ہی یہ اپنا ہی عکس پیدا — یہ راز ہو نہ یا رب اُس پر کبھی ہویدا
سمجھیگی عکس اپنا تو جھیپ جائیگی یہ — ہنس ہنس کے بھولے پن سے کیوں منہ چڑھائیگی یہ
کانوں میں سبز بُندے کیا لطف دے رہے ہیں — ہل ہل کے خوب بوسے گالوں کے لے رہے ہیں
ہلنے سے ان کے شاید کچھ لطف آ رہا ہو — بُندوں کا گُدگُدانا اس کو ہنسا رہا ہو
چھوٹی سی شاخِ گل کو کرتے میں رکھ لیا ہی — کانٹے نے چبھ کے شاید اُسکو ہنسا دیا ہے
پیڑوں کو دیکھ کر یہ ہنستی ہی کس اَدا سے — خوش کر رہی ہیں چڑیاں آواز نغمہ زا سے
پانی میں گر پڑی یہ پھر بھی ہنسی نہ چھوڑی — اُٹھتے ہی پھول اُٹھایا اور اوڑھنی نچوڑی
نازک ہیں ہاتھ اسکے پانی نچوڑ سکے کیا — کاش اوڑھنی یہ دیتی اور میں نچوڑ دیتا
چھٹکا رہی ہی دیکھو ہنس ہنس کے بال اپنے — آنچل سے پونچھتی ہے ہر بار گال اپنے
آنچل تو خود ہی تر ہی گال اس سے خشک ہوں کب — دھوپ اور ہوا سے پانی ہو جلد جذب یا رب
کیا کھِلکھلا رہی ہی اسکی ہنسی تو دیکھو — رُخ پر لٹیں پڑی ہیں دارستگی تو دیکھو
قدرت کا ہر کرشمہ اسکو ہنسا رہا ہی — اِک کھیل بن کے اسکی نظروں میں آ رہا ہی
ظاہر ہی بھولے پن سے قدرت کی کارسازی — خوبی کو ناز اس پر خود اسکو بے نیازی
کیا لطف ہو جو یہ لب باتوں سے آشنا ہوں — گو اب بھی خوش ادا ہیں تب اور خوش ادا ہوں
چھیڑوں میں اسکو لیکن چھپتے تو منہ چڑائے — چل دے تو لطف میرا حسرت کا داغ کھائے
غم سے کبھی نہ یا رب اسکی ہنسی ہو زائل — رکھے لڑکپن اس کا۔ اسکو ہنسی پہ مائل
یہ گل رہے شگفتہ یونہی ہنسی کے مارے — بُرجِ دہن سے یونہی چمکا کریں ستارے
حاصل نہ ہو مسی سے دانتوں کو روسیاہی — پانوں کا رنگ ان پر ڈوڑے نہ یا الٰہی

کیا چیز ہے لڑکپن۔ پروا نہیں کسی کا
اے شوق عمرِ طفلی ہے جانِ زندگی کی

احمد علی شوق قدوائی لکھنوی

حصار فاختہ

اس قسم کے عنوان اکثر دواؤں کے اشتہاروں میں نظر آتے
ہیں مضمون کو عنوان سے کچھ تعلق نہ واسطہ دو چار بے جوڑ مگر نظر فریب
الفاظ موٹی قلم سے لکھدیئے کہ نہ آدمی پڑھتا ہو تو پڑھے۔ یہاں وہ
مقصد نہیں بلکہ ایک سچا دلچسپ لطیفہ ہے۔ حصار سے مراد نہ سفوف
ہے نہ عرق نہ معجون نہ جوہر نہ کشتہ نہ ہانسی حصار نہ گورونکا قلعہ۔ اسے
بھی حصار کہتے ہیں کہ کوئی عمل دعا درود یا قرآن شریف کی چند
آیتیں پڑھ کے کسی شے یا مقام کی طرف پھونک دیا یا انگلی کے اشارے
سے ایک خیالی خط اوسکے گرد کھینچدیا گویا ایک فصیل بنگئی جو نظر تو نہیں
آتی لیکن کسی موذی کا گذر اسکے اندر نہیں ہوسکتا۔ علی ہذالقیاس فاختہ
بھی کسی نایاب شے یا عجیب الخواص جڑی بوٹی کا نام نہیں ہے نہ اوس
فاختہ سے مراد ہے جو موسم خزاں کی سفاکی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہے
جا بجا سوکھے ہوئے کھیتوں کے آس پاس کیکر کے درخت پر بیٹھی
کل من علیھا فان کا دم بھرتی ہے۔ کبھی کسی چٹیل میدان میں اکیلے ڈھاک
کے درخت پر پتوں میں چھپی ہوئی حق تو ای دوست کو کی فریاد سے
دردمند مسافر کا کلیجہ اڑاتی ہے۔ وہ فاختہ نہیں جو تا لہائے آتش فشاں
سے نسیم سحری کو سموم صحرائی بناتی ہے وہ فاختہ نہیں جس کے سچے
سارنگ نے دیپک کے ساتھ ققنس کو بھی دنیا سے اٹھا دیا نہ وہ
فاختہ جو کبھی کبھار دو منزلے کی کنگنی پر آبیٹھتی ہے اور اپنی غیر حاضری کا

عذر بچوں کو سنا جاتی ہے کو ٹوں تھی! پیسوں تھی الہ یہاں ذکر اوس شہ
فاختہ کا ہے جسے ٹوٹرو کہتے ہیں سنتا ہے اس بیچاری کو
کثرت کار و قلت روزگار کی شکایت رہتی ہے۔ جانوروں کی بولی
ہی خوب سمجھتے ہیں یا بعض خوش اعتقاد عورتیں بھی پہونچ جاتی ہیں
ان ہی لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ فاختہ کہتی ہے "دو ا سے اللہ میں کیا
کیا کروں"

اس میں شک نہیں کہ بہت ہی بھولا اور مسکین جانور ہے سو دو دمہ
انڈے بچے اوسکے نیچے سے نکال لو پھر کھدر نہ دیتے ہیں عذر نہ
لینے سے انکار چکی اپنی جگہ بیٹھی رہتی ہے گویا گھر والوں کو اپنے انڈے
بچوں سے کھیلنے کا حقدار سمجھتی ہے چڑیا چڑے کی طرح ظالم اور انکھل کھری
نہیں ہے کہ ذرا کسی نے انڈوں کو چھیڑ دیا تو اونھیں سینا منع ذرا بچے کو
ہاتھ لگا دیا تو پھر اٹھانا حرام ہوگیا۔ آمدم بر سر مطلب ؎

جس محلے میں تھا ہمارا گھر
وہیں رہتے تھے ایک سوداگر

اونکی بیوی نہایت نیک بخت نمازی پرہیزگار میاں سے بھی ایک درجہ زیادہ
تھیں خدا کے نام پر جان حاضر بندوں سے دکھ درد میں ہاتھ پاؤں
سے شریک۔ ہنرمند سلیقہ شعار۔ مکان دیکھو تو چندے آنکھ نہیں میل اوس
میں میل نہیں۔ اللہ نے سب ہی خوبیاں دی تھیں اور سب سے بڑھ کر رحم کی
صفت۔ محلے میں کوئی بیمار ہے تو سو سو دفعہ پوچھوانا۔ کہیں سے
کسی کے مرنے کی خبر سن لی تو اوس روز فاقہ۔ عزیز و اقارب کا کیا ذکر
ماما روٹی پکار ہی ہے تو اوس کی بچی کو خود بہلا رہی ہیں۔ چڑیا کا بچہ

گھونسلے سی کر پڑا تو او نکو خاص فکر ہو گئی۔ شاید اس کا یہہ سبب ہو کہ
اللہ نے اونکو اولاد نہیں دی تھی۔ اور بالوں کی سفیدی سے اُمید کی
کھیتی پر بھی پالا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اونکی انگنائی میں ایک پرانا گوندنی کا
درخت تھا جا بجا اوس میں چھینکے لٹکے ہوئے کسی کونڈی میں پانی ہے
کسی میں باجرہ کسی میں روٹی کے ٹکڑے یا باسی کھچڑی کے دانے۔
اوس درخت پر کہیں ایک فاختہ کا جوڑا آن بسا۔ وہیں اونکے انڈے
بچے ہوئے۔ اونکی حفاظت گویا خدا کی طرف سے انکے سپرد ہوئی
ذرا مُنڈیر پر کوا آ کے بیٹھا اور انکا دم سلب ہوا تسبیح پڑھنے میں بول
تو سکتی نہیں۔ ہُوں ہُوں کر رہی ہیں اور ہاتھ کے اشارے سے ماما کو بتا
رہی ہیں کہ کوا بیٹھا ہے اسے اُڑا دو۔ چیل کی آواز کہیں دور سے آگئی تو
انکے اوسان گئے۔

ماما سے گھبرا کر۔ اچھی ذرا دیکھنا چیل کہاں بول رہی ہے۔

ماما۔ بیوی تمھیں تو وہم ہے۔

بیوی۔ میرے کانوں سے سُنو۔ چھوڑ دو جھاڑو۔

ماما۔ دالگنائی میں نکل کے) کہاں ہے! یہاں تو کوسوں پتہ نہیں۔ وہ
دور مٹی پر کالا کالا دھبہ سا البتہ نظر آتا ہے۔

بیوی۔ غنیمت ہے نیکبخت! چیل اسی کو کہتے ہیں۔

ماما۔ تو بیوی اتنی دور سے نگوڑی کو سوجھتا کیا خاک ہوگا۔

بیوی۔ جی ہاں۔ جبھی تو چیل کی آنکھ مشہور ہے۔ اچھا جوتی دکھانا
اُلٹی کر کے (چیل اُڑ گئی) دیکھا۔ اپنی سی آنکھ سب کی نہ سمجھا کرو
دن کا تو یہہ حال ہوا۔ رات کو تخیل و توہم کا میدان زیادہ وسیع ہو جاتا

سب ہے۔ شام ہوئی اور گھر کی بلی کو تو اُنہوں نے مونڈھے کے نیچے بند کیا اوپر سے سل رکھی محلے کی بلیوں کی آمد و رفت کیونکر بند ہو۔ اسکے واسطے اُنھوں نے یہہ ورد کیا کہ نماز عشا سے فارغ ہوئیں اور آیۃ الکرسی چاروں قل پڑھے اور فاختہ کے گھونسلے کے گرد حصار کھینچ دیا۔

اللہ بخشے ایک تو یہہ بیوی تھیں جن سے حصار فاختہ کی ایجاد سے ایک وہ اللہ کے بندے ہیں جو شکار فاختہ کے شائق ہوتے ہیں اللہ اونکو بھی بخشے۔

ایک جگہ یہہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ ایک شخص کے ایک ہاتھ پر شکرہ بیٹھا ہوا تھا دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں ایک مینا۔ ایک مینا کہاں تھی کوئی آدھی پونی ہوگی ایک بازو تو جڑ سے ندارد ہے دوسرا لٹکا ہوا ہے اور پیٹ پر پروں کی بجائے پسلیاں نظر آرہی ہیں۔ اوسکو کنکر پتھر کی طرح دو تین قدم کے فاصلے پر پھینک دیتا ہے۔ بیچاری سنبھل کے بیٹھنے بھی نہیں پاتی کہ دوسری طرف سے شکرہ اُڑ کے پھر آن دباتا ہے۔ شکاری اپنی چٹکی سے اوس مینا کا گوشت ذرا سا نوچ کے شکرے کی چونچ میں دیدیتا ہے اور دونوں کو الگ کر دیتا ہے اس جلادی کو دیکھ کر مجھے نہایت اذیت ہوئی۔ اگر خدا اختیار دیتا تو دو تین شکاری گنے ہیں اوس شکاری پر چھوڑ دیتا یا کم از کم اوس شکرے کے پر نوچ کے اوسکے آگے ڈالدیتا۔ اچھا ہی ہوا جو اختیار نہ ہوا ورنہ میری حرکت کیا اوس شکاری سے کم ہوتی ؎

اِس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

آخر ضبط نہو سکا اور میں نے ذرا غصے کی آواز سے کہا یہہ کیا ظلم کر رہے ہو۔ وہ بھلا مانس ظلم کو کوئی اعلےٰ صفت انسانی اور شجاعت وغیرہ کا مرادف سمجھا یا یہہ خیال کیا کہ ناواقف آدمی ہیں اس مشغلے کا نام پوچھنا چاہتے ہیں۔ بے اتفاقی سے جواب دیا۔ "دشکرے کو باؤلی دے رہا ہوں" میں نے کہا "اُس بیناکے حال پر تم کو ذرا رحم نہیں آتا" وہ اس جملے کو بھی استفسار مزید سمجھا اور کہنے لگا "جناب باز بہری کا بنانا پھر آسان ہے شکرے کا کھیل پانی بہت دور ہے۔ اٹھوا ڑے لگ جاتے ہیں شکرہ آنکھ بھی نہیں ملاتا۔ یہاں کلہم چار دن ہوئے پکڑے ہوئے۔ پرسوں صافہ دیا کل سے اس مینا پر لگا دیا۔ آپ کی دُعا سے دوسری مینا ختم نہ ہوگی کہ چھٹنے لگیگا"
میں نے اپنے دل میں کہا "ہاں بھائی میری دعا سے" اور چپکا وہاں سے روانہ ہوا۔ خدا کے کارخانے ہیں وہ حصار فاختہ والی بھی انسان تھیں اور یہہ باؤلی والا بھی انسان ہی تھا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اشرف حسین

ناظرین براہ کرم خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور تحریر کریں۔

منیجر

شمع اور پروانہ

شمع سوزاں ایک محفل میں تھی ایسی جل رہی
ہر طرف پھیلی تھی جس کی جگمگاتی روشنی

دیکھتا تھا اک پتنگا شوق سے اسکی بہار
دل ہی دل میں کر رہا تھا جان و دل اسپر نثار

لو لگا رکھی تھی اس نے اپنے دلمیں شمع سے
کر رہا تھا صدقہ اور قرباں جاؤں میں ترے

حق نے بخشی ہے تجھے کیا روشنی اور آب تاب
ہیچ ہیں بس تیرے آگے آفتاب و ماہتاب

اتنے میں اک مکھی آئی بھنبھناتی اس کے پاس
اور یوں کہنے لگی تو ٹھیک کر اپنے حواس

اے پتنگے کس پہ شیدا کس پہ دیوانہ ہے تو؟
شمع سوزاں ہے یہ غافل جسکا پروانہ ہے تو

یہ جلا دیگی تجھے گر پاس اسکے جائے گا
جل کے مر جائیگا ناداں دیکھ تو پچھتائیگا

سن کے پروانہ یہ بولا ہے غلط تیرا کہا
ہے یہ ناممکن کہ مجھکو پھونک دے یہ خوشنما

بولی مکھی خوشنما بیشک ہے اسمیں شک نہیں
پھونک دیتی ہے مگر ہر ایک کو یہ کر یقیں

میں بھی نادانی سے اسکے پاس غش ہو گئی
جل ہی جاتی سوز سے۔ باقی تھی لیکن زندگی

طعن سے اسکو دیا پروانے نے پھر یہ جواب
آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں ہے غلط یہ آنجناب

ایسی اچھی روشنی نقصان دے سکتی نہیں
مجھکو آئیگا نہیں بن امتحاں ہرگز یقیں

مکھی بولی دیکھ غافل اچھی صورت پہ نجا
ظاہری صورت میں اکثر پائی جاتی ہے دغا

پر یقیں آیا نہ پروانے کو اسکی بات کا
شمع کی جانب اسے شوق اسکا آخر لیگیا

جوں ہی پہنچا پاس اسکے جل گئے سب بال و پر
مردہ سا نیچے گرا وہ سوختہ تن آنکر

شمع کے شیدا نے دیدی جاں تڑپ کر خاک پر
شمع بھی رو دیا کی نادانی پہ اس کی رات بھر

مان لو تم ناصح مشفق کہا مان لو ٭
اپنی ہٹ دھرمی سے تم نقصان اپنا نہ کرو

[illegible]

پان

ایشیا کی مہمان نوازی کا پلڑ یورپ سے ہمیشہ بھاری رہا ہے، یورپ میں اگر تواضعاً تمباکو اور چائے پیش کی جاتی ہے تو ایشیا میں علاوہ اِن کے عطر اور پان بھی پیش کیا جاتا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اچھی چیزیں ہیں اور مفید۔

یوں تو عالم نباتات میں اچھے اچھے خوشنما پتے ہیں مگر جو فروغ پان کے پتّے کو حاصل ہے اور کسی پتّے کو حاصل نہیں ہوا۔ سبز نازک بندوری پتلا اور کرارا ایک دُنیا ہے کہ پان پر جان دے دیتی ہے۔ طب کی رُو سے دیکھئے تو پان کو مقوی دل و دماغ و معدہ مصفی خون مخرج رطوبات مانا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ اِن امور کی تصدیق کرتے ہیں کھانا کھانے کے بعد لازمی طور پر گلے میں چکناہٹ رہجاتی ہے جسکا دفعیہ کوئی خشک چیز کھانے سے بھی نہیں ہوتا۔ اِسکے علاوہ کھانے کا مزا اور کچھ کچھ بقیہ زبان اور دانتوں میں لگا رہجاتا ہے۔ جسکے لئے پان سے بہتر شاید ہی اور کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ پان کھانے سے مُنہ ستھرا۔ دانت صاف۔ طبیعت بشاش اور معدہ صحیح رہتا ہے۔ مگر یہ کب۔ جب پان سے جائز حدود کے اندر فائدہ اُٹھایا جائے۔ ورنہ یہی پان زیادتی کے باعث بجائے معدہ کو تقویت پہنچانے کے مضعف معدہ ہو جاتا ہے۔ دانتوں کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے اور صفائی سے غفلت کی جائے تو مسوڑوں دانتوں کی چمک کو مٹا کر دانتوں کا ستیاناس کر دیتا ہے۔

یہ تھا طبی پہلو پان کے فوائد کا حسن پرستی کی نظر سے دیکھیئے تو پان میں اور بھی دلفریبی اور دلربائی کی ادائیں موجود ملیں گی کسی حسین بالخصوص صبیح حسین کی بانزتیب سفید براق بتیسی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر پان جو قیامت کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا بیان الفاظ میں مشکل ہے۔
ذرا لبوں پر مسکراہٹ آئی اور ایسا معلوم ہوا گویا شفق میں بجلی کوندگئی۔

پان بنانے اور پیش کرنے کے بہت سے طریقہ ہیں کہیں اسکی مثلث نما گلوریاں بنائی جاتی ہیں۔ کہیں مستطیل کہیں مخروطی شکل کی۔ ان میں سے ہر ایک انداز بجائے خود قابل قدر ہے۔ کسی سلیقہ شعار حسین کے نازک نازک ہاتھوں کی بنی ہوئی گلوریاں طشتری یا خاصدان میں رکھی ہوئی ملاحظہ کیجئے۔ مگا گلوری لینے کو جی نچا ہے تو ہمارا ذمہ۔ ہندوستان کے خاص خاص رنگین شہروں میں پان اور پان کی فروخت سے وہ فائدہ اُٹھایا جاتا ہے جو یورپ میں ہوٹلوں کی مدارات سے۔ حسینوں طرحداروں کے ہاتھ کی گلوریاں ان مقامات میں تجارتی اشیاء کا ایک جزو عظیم ہوتی ہیں۔ رات کو کسی شوقین دکاندار کی دوکان پر عجیب بہار ہوتی ہے۔ تماشائی جوق جوق جمع ہیں۔ پیسے پر پیسہ پڑ رہا ہے۔ پان دیئے جارہے ہیں۔ پھبتیاں اُڑ رہی ہیں۔ جگت بازی ہو رہی ہے۔ ایک دل لگی کا سامان ہے۔ شوقین ہیں کہ کبھی اس دکان پر ٹھہرے دو دو مُنہ ہنس بول لئے کبھی اُس دوکان پر کھڑے ہو گئے اور مذاق کرنے لگے۔ سیر کی سیر تفریح کی تفریح۔

پان کے لوازمات میں الایچی تو ایک معمولی بات ہے زیادہ تکلف مقصود ہو تو کتھے کو عطر میں بسایا جاتا ہے۔ زعفران مشک جاوتری ڈالی جاتی ہے اور اسمیں کچھ بھی شک نہیں کہ تکلف کا بنا ہوا پان نہایت مفرح ہوتا ہے۔ سید نذیر حسین"

سلاجقہ روم کے نقرئی سکہ جات

سلجوق کی اولاد نے مغربی ایشیا میں جو عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، وہ سو برس کے اندر اندر متعدد حصوں میں منقسم ہوگئی۔ جلال الدین ملکشاہ سنہ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء سنہ ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء کے انتقال پر محمد اور برکیارق میں جب خانہ جنگیاں شروع ہوئیں تو سلطنت کو روز بروز انحطاط ہونے لگا جس سے فائدہ اٹھا کر چند سلجوقی شہزادوں نے کرمان عراق شام روم وغیرہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرلیں جو سلطان معز الدین سنجر سنہ ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء سنہ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء کے مرنے تک مطیع و منقاد رہیں پھر انہوں نے خودسری اختیار کرلی۔

رومی شاخ کا سلسلہ سلجوق کے بیٹے اسرائیل تک پہنچتا ہے۔ سنہ ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں جب الپ ارسلان تخت نشین ہوا تو قتلمش نے اسکی مخالفت کی اور ترکمانوں سے امداد حاصل کرکے بہت سے علاقوں پر قابض ہوگیا۔ الپ ارسلان کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس بغاوت کا انسداد کرنا چاہا اور کثیر التعداد سپاہی ہمراہ لیکر لشکر کشی کردی دامغان کے پاس مقابلہ ہوا عین معرکہ میں قتلمش کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ ایک چٹان پر گر پڑا جس کے صدمہ سے دماغ پاش پاش ہوگیا اور روح پرواز کرگئی اس کے بعد الپ ارسلان نے اس کے اہل و عیال کو قتل کرنا چاہا۔ مگر جب نظام الملک طوسی نے سفارش کی تو بادشاہ نے نہ صرف اپنا ارادہ فسخ کردیا بلکہ سلیمان بن قتلمش کو شام کی سپہ سالاری بھی دیدی۔ سلیمان نے شام میں پہنچ کر اپنے علاقہ کو وسیع کرنے کا ارادہ کیا۔ اور قرب و جوار کے شہروں پر یورشیں شروع کیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں حلب و انطاکیہ فتح ہوگئے ان فتوحات سے برہم ہوکر تاج الدولہ تتش بن الپ ارسلان

سنہ ۴۸۷ھ - سنہ ۴۸۸ھ (۱۰۹۴ء - ۱۰۹۵ء) نے سلیمان کے مقبوضات پر حملہ کر دیا۔ سلیمان نے پریشان ہو کر خودکشی کر لی۔ اور تمام علاقہ تتش کے قبضہ میں آگیا۔ ملکشاہ نے ان واقعات کو سنکر اپنی ناراضگی ظاہر کی اور سلیمان کے بیٹے داؤد کو تمام ملک واپس دلا دیا۔ اس کے بعد یہاں کی حکومت اس خاندان میں موروثی ہو گئی داؤد کے انتقال پر ملکشاہ اور مسعود نے یکے بعد دیگرے ۵۱ سال حکمرانی کی اور اپنی زندگی میں سلاجقہ اعظم کے زیر فرمان رہے سنہ میں جب قلج ارسلان برسر حکومت ہوا تو اس نے آزادی حاصل کر لی اور سب سے پہلے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔

یہ سلطنت سنہ ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) سے لیکر سنہ ۷۰۰ھ (۱۳۰۰ء) تک تقریباً ۳ سو برس تک قائم رہی اور ۱۶ بادشاہ برسر حکومت ہوئے جنکے سنین جلوس اور شجرۂ نسب ذیل میں درج ہیں۔

سنین جلوس

۱ سلیمان اول بن قتلمش سنہ ۴۷۰ھ سنہ ۴۷۹ھ سنہ ۱۰۷۷ء سنہ ۱۰۸۶ء۔

وقفہ (وہ زمانہ جبکہ تاج الدولہ تتش کا قبضہ رہا) سنہ ۴۷۹ھ سنہ ۴۸۵ھ سنہ ۱۰۸۶ء سنہ ۱۰۹۲ء

۲ داؤد قلج ارسلان سنہ ۴۸۵ھ سنہ ۵۰۰ھ سنہ ۱۰۹۲ء سنہ ۱۱۰۶ء۔

۳ ملک شاہ اول سنہ ۵۰۰ھ سنہ ۵۱۰ھ سنہ ۱۱۰۶ء سنہ ۱۱۱۶ء۔

۴ مسعود اول سنہ ۵۱۰ھ سنہ ۵۵۱ھ سنہ ۱۱۱۶ء سنہ ۱۱۵۶ء

۵ عز الدین قلج ارسلان ثانی سنہ ۵۵۱ھ سنہ ۵۸۴ھ سنہ ۱۱۵۶ء سنہ ۱۱۸۸ء

۶ قطب الدین ملکشاہ ثانی سنہ ۵۸۴ھ سنہ ۵۸۸ھ سنہ ۱۱۸۸ء سنہ ۱۱۹۲ء

۷ غیاث الدین کیخسرو اول سنہ ۵۸۸ھ سنہ ۵۹۷ھ سنہ ۱۱۹۲ء سنہ ۱۲۰۰ء

۸ رکن الدین سلیمان ثانی سنہ ۵۹۷ھ سنہ ۶۰۰ھ سنہ ۱۲۰۰ء سنہ ۱۲۰۳ء

۹ قلج ارسلان ثالث سنہ ۶۰۰ھ سنہ ۶۰۱ھ سنہ ۱۲۰۳ء سنہ ۱۲۰۴ء

کیخسرو اول (مکرر) سنہ ۶۰۱ھ سنہ ۶۰۷ھ سنہ ۱۲۰۴ء سنہ ۱۲۱۰ء

۱۰	اعزالدین کیکاؤس اول	سنہ ۶۰۷ھ	سنہ ۶۱۶ھ	سنہ ۱۲۱۰ء	سنہ ۱۲۱۹ء
۱۱	علاؤالدین کیقباد اول	سنہ ۶۱۶ھ	سنہ ۶۳۴ھ	سنہ ۱۲۱۹ء	سنہ ۱۲۳۶ء
۱۲	غیاث الدین کیخسرو ثانی	سنہ ۶۳۴ھ	سنہ ۶۴۳ھ	سنہ ۱۲۳۶ء	سنہ ۱۲۴۵ء
۱۳	اعزالدین کیکاؤس ثانی	سنہ ۶۴۳ھ	سنہ ۶۵۵ھ	سنہ ۱۲۴۵ء	سنہ ۱۲۵۷ء
۱۴	رکن الدین قلیج ارسلان رابع	سنہ ۶۵۵ھ	سنہ ۶۶۶ھ	سنہ ۱۲۵۷ء	سنہ ۱۲۶۷ء
۱۵	غیاث الدین کیخسرو ثالث	سنہ ۶۶۶ھ	سنہ ۶۸۲ھ	سنہ ۱۲۶۷ء	سنہ ۱۲۸۳ء
۱۶	غیاث الدین مسعود ثانی	سنہ ۶۸۲ھ	سنہ ۶۹۶ھ	سنہ ۱۲۸۳ء	سنہ ۱۲۹۶ء
۱۷	علاؤالدین کیقباد ثانی	سنہ ۶۹۶ھ	سنہ ۷۰۰ھ	سنہ ۱۲۹۶ء	سنہ ۱۳۰۰ء

شجرۂ نسب

قتلمش

(۱) سلیمان

(۲) داؤد قلیج ارسلان

(۳) ملکشاہ اول — (۴) مسعود اول

(۵) قلیج ارسلان ثانی

(۶) ملکشاہ ثانی — (۷) کیخسرو اول — (۸) سلیمان ثانی

(۱۰) کیکاؤس اول — (۱۱) کیقباد اول — (۹) قلیج ارسلان ثالث

(۱۲) کیخسرو ثانی

(۱۳) کیکاؤس ثانی — (۱۴) قلیج ارسلان رابع — (۱۷) کیقباد ثانی

(۱۶) مسعود — (۱۵) کیخسرو ثالث

تفصیل سکہ جات

(۵) قلیج ارسلان

۱۔ دارالضرب۔ قونیہ۔ تاریخ ۔ ۵۸۲ھ ہجری

رخ اول لاالہ الااللہ وحدہٗ لاشریک لہ الناصرلدین اللہ امیرالمومنین

حاشیہ ضرب ہذا الدینار بقونیتہ

رخ دوم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ السلطان المعظم۔ قلج ارسلان۔

حاشیہ سنتہ ثنتین وثمنین وخمس مائتہ

(۷) کیخسرو اول

۲۔ دارالضرب قونیہ۔ تاریخ۔ ۵۹۲ھ

رخ اول لاالہ الااللہ وحدہٗ لاشریک لہ الناصرلدین اللہ امیرالمومنین

حاشیہ ضرب ہذا الدرہم بقونیہ

رخ دوم محمد رسول اللہ۔ السلطان المعظم کیخسرو بن۔ قلج ارسلان

حاشیہ سنتہ اثنین وتسعین وخمس مائتہ

(۸) سلیمان دوم

۳۔ دارالضرب۔ قیصریہ تاریخ ۔ ۵۹۷ھ ہجری

رخ اول گھوڑا سوار

حاشیہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ الناصرلدین اللہ امیرالمومنین

رخ دوم السلطان القاہر ابوالفتح سلیمان بن قلج ارسلان ناصر امیرالمومنین

حاشیہ ارسلہ بالہدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ضرب بمدینہ قیصریہ سبع وتسعین خمس مائتہ

(۱۰) کیکاؤس اول

۴۔ دارالضرب۔ قونیہ تاریخ ۶۱۰ھ ہجری۔

رخ اول الامام الناصر لدین اللہ امیرالمؤمنین

حاشیہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ

رخ دوم السلطان الغالب۔ عز الدنیا والدین۔ کیکاؤس بن کیخسرو۔
حاشیہ ضرب ہذا۔ الدرہم۔ بقونیۃ۔ سنتہ عشرۃ وستمائۃ
ن اسی قسم کے سکہ جات سیواس میں بھی مضروب ہوئے ہیں۔

(۱۱) کیقباد اول

۵۔ دار الضرب۔ قونیہ تاریخ ۶۱۷ھ ہجری
رخ اول السلطان المعظم۔ علاء الدنیا والدین کیقباد بن کیخسرو۔ حاشیہ ضرب ہذا۔ الدرہم بقونیۃ
رخ دوم الامام۔ الناصر لدین اللہ۔ امیر المومنین۔ حاشیہ سنتہ سبع عشرو ستمائۃ۔
۶۔ دار الضرب۔ سیواس تاریخ ۶۱۶ھ ہجری
رخ اول السلطان المعظم کیقباد بن کیخسرو۔ حاشیہ ضرب۔ ہذا۔ الدرہم۔ بسیواس
رخ دوم المومنین۔ الامام الناصر۔ لدین اللہ امیر۔ حاشیہ سنتہ ست عشرۃ۔ وستمائۃ

(۱۱) کیخسرو دوم

۷۔ دار الضرب۔ سیواس تاریخ۔ ۶۳۴ھ ہجری
رخ اول السلطان الاعظم۔ کیخسرو۔ بن کیقباد۔ حاشیہ ضرب ہذا۔ الدرہم بسیواس
رخ دوم الامام۔ المستنصر۔ باللہ امیر المومنین۔ حاشیہ سنتہ اربع ثلثین وستمائۃ
۸۔ دار الضرب سیواس۔ تاریخ ۶۳۷ھ ہجری
رخ اول الامام۔ المستنصر۔ باللہ امیر المومنین۔ حاشیہ سنتہ سبع ثلثین وستمائۃ
رخ دوم السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین۔ کیخسرو بن کیقباد۔ حاشیہ ضرب ہذا۔ الدرہم بسیواس
۹۔ دار الضرب قونیہ تاریخ۔ ۶۴۴ھ ہجری۔
رخ اول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ الامام المستعصم۔ باللہ امیر المومنین
حاشیہ فی سنتہ۔ اربع۔ اربعین۔ وستمائۃ۔
رخ دوم السلطان الاعظم ظل اللہ فی العالم غیاث الدنیا والدین۔ کیخسرو بن کیقباد۔

قسیم امیر المومنین۔ حاشیہ ضرب ہذا الدرہم بمدینۃ قونیہ۔

ن۔ اس قسم کے قیصریہ میں بھی مضروب ہوئے ہیں۔ مگر ان کا سنہ نہیں پڑھا گیا۔

(۱۳) کیکاؤس دوم

۱۰۔ دار الضرب سیواس۔ تاریخ سنہ ۶۴۴ ہجری

رخ اول الامام المستعصم باللہ۔ امیر المومنین۔ حاشیہ سنتہ اربعۃ واربعین وستمائۃ

رخ دوم السلطان المعظم عز الدنیا والدین ابو الفتح کیکاؤس بن کیخسرو حاشیہ ضرب ہذا الدرہم سیواس

۱۱۔ دار الضرب سیواس۔ تاریخ سنہ ۶۴۴ ہجری۔

رخ اول السلطان الاعظم ظل اللہ فی العالم۔ عز الدنیا والدین کیکاؤس بن کیخسرو۔

حاشیہ ضرب ہذا الدرہم سیواس۔

رخ دوم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ الامام المستعصم باللہ امیر المومنین حاشیہ سنتہ اربعۃ واربعین وستمائۃ

۱۲۔ دار الضرب۔ قونیہ تاریخ سنہ ۶۴۵ ہجری

رخ اول السلطان المعظم عز الدنیا والدین ابو الفتح کیکاؤس بن کیخسرو۔

حاشیہ ضرب ہذا الدرہم بقونیتہ سنتہ خمس واربعین وستمائۃ۔

رخ دوم لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ محمد رسول اللہ۔ حاشیہ الامام المستعصم باللہ امیر المومنین

(۱۴) قلج ارسلان رابع

۱۳۔ دار الضرب سیواس تاریخ سنہ ۶۴۶ ہجری

رخ اول گھوڑا سوار۔ حاشیہ السلطان الاعظم رکن الدنیا والدین قلج ارسلان بن کیخسرو

رخ دوم قسیم امیر المومنین۔ الامام المستعصم باللہ امیر المومنین حاشیہ ضرب ہذا الدرہم بسیواس فی سنتہ ست واربعین وستمائۃ۔ ۱۴۔ دار الضرب۔ معدن تاریخ سنہ ۶۵۵ ہجری

رخ اول ضرب بمعدن الامام المستعصم۔ باللہ امیر المومنین سنتہ خمس وخمسین وستمائۃ

رخ دوم السلطان الاعظم۔ رکن الدنیا والدین۔ قلج ارسلان بن کیخسرو۔ برہان امیر المومنین

اعزالدین کیکاؤس رکن الدین قلیج ارسلان علاؤالدین کیقباد

۱۵- دارالضرب سیواس تاریخ ۶۵۳ہجری۔

رخ اول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ الامام المستعصم باللہ امیر المومنین ضرب بسیواس سنتہ ثلثہ خمسین وستمائۃ

رخ دوم السلاطین الاعاظم۔ عز الدنیا والدین کیکاؤس۔ ورکن الدنیا والدین قلیج ارسلان وعلاء الدنیا والدین کیقباد بنو کیخسرو براہین امیر المومنین۔

(۱۵) کیخسرو ثالث

۱۶- دارالضرب بسیواس تاریخ ۶۶۳ہجری

رخ اول الملک للہ۔ حاشیہ ضرب بسیواس سنتہ ثلث وستین وستمائۃ۔

رخ دوم السلطان الاعظم۔ غیاث الدنیا والدین۔ کیخسرو بن قلیج ارسلان۔

۱۷- دارالضرب ارزنجان تاریخ ۶۷۱ہجری

رخ اول سنتہ ۶۷۱۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ الامام المستعصم امیر المومنین وستمائۃ۔

رخ دوم ضرب بارزنجان السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین کیخسرو بن قلیج ارسلان۔ ہا امیر المومنین

(۱۶) مسعود دوم

۱۸- دارالضرب سیواس تاریخ ۶۸۱ہجری

رخ اول لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ۔ حاشیہ ضرب بسیواس سنتہ احدثمانین وستمائۃ۔

رخ دوم العظمۃ للہ السلطان الاعظم۔ غیاث الدنیا والدین ابو الفتح مسعود بن کیکاؤس

۱۹- دارالضرب۔ لاحمو تاریخ ۶۰۰ہجری۔

رخ اول لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ ضرب بمدینۃ لاحموفی ستمائۃ

رخ دوم السلطان الاعظم۔ غیاث الدنیا والدین۔ ابو الفتح مسعود۔ بن کیکاؤس۔

ن رائل نومسیٹک سوسائٹی کے رسالوں اور نیز مسٹر اسٹنلی لین پول کی بعض تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قونیہ۔ سیواس مدینہ ارزنجان۔ مدینہ لولو سینٹ پیٹرزبرگ وغیرہ کے عجائب خانوں میں ابتک موجود ہیں + حکیم سید شمس اللہ قادری

معدن بازرنج، سار دس، قیصریہ میں علاءالدین کیقباد کے دارالضرب واقع تھے چنانچہ ان مقامات کے مضروبہ سکے عجائب خانہ لندن، پیرس، برلن، وانا

مبارک ہو

امہات الامہ

مولانا مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مغفور جو بعض کوتاہ بیں علماء کے تعصب سے
پردۂ دنیا سے نابود ہو چکی تھی اور جسکی مطالعہ کا شوق لوگوں کو مضطرب کیے ہوئے تھا۔
جسکی ایک ایک جلد سو سو دو دو سو روپیہ شائقین قیمت دیکر تیار تھے اس کا حصہ
اول طبع ہو کر غیر مسلم اقوام کو مفت تقسیم ہو رہا ہے چونکہ اسکی اشاعت کی غرض
زیادہ تر یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام میں بکثرت تقسیم ہو تا کہ تعدد ازدواج رسول
مقبول پر جو اعتراضات ہیں انکی اصلاح ہو اور اسلام کی حقانیت انکی ذہن
نشین ہو اس لیے مسلمانوں سے توقع کیگئی ہے کہ وہ اسکو خرید کر اس کے حصہ
دوم و ترجمہ انگریزی کو مدد دیں تا کہ وہ بھی چھپکر بکثرت تقسیم ہو سکے کتاب کی
عمدگی کی نسبت کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں صرف مولانائی مرحوم
کا نام کافی ہے کہ وہ کس درجہ کی ہو گی حصہ دوم زیر اہتمام ہے اور ترجمہ ڈاکٹر
مشرف الحق صاحب کے ہاتھوں میں اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے
کہ اسکی تکمیل جسقدر چاہیں جلد ہو سکتی ہے قیمت بارہ آنہ (۱۲/)
منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجیے

نمبر (۱) بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۵ع جلد (۳)

تمدن

رجسٹرڈ ایل نمبر ([illegible])

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹران شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا ۔ محمد عبد الراشد الخیری

(فہرست مضامین)

باہتمام مولوی محمد عبد الراشد الخیری

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ قسم اول ؏ ۔ (کالیجاں برس ہیں) ۔ قیمت فی پرچہ ۴/ر

کتب خانہ اسلامیہ دہلی

عصمت

دہلی

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کنواری لڑکیوں کیواسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا نا ممکن ہے عصمت اُن کو بتائیگا۔ کہ کنوار پنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب۔ بہن بھائیوں کی خدمت بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت انکا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اس کیلئے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف با اطمینان بسر کرانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں دو بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُن پر کیا کیا ہیں کیا طریقہ ہیں جن سے وہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور بہتر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے خاندان کیساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کی سچ مچ کی بیگم بنائے گا۔

ٹائٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بٹھانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہو رہا ہے (۶۴) صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول ہوتی ہیں سالانہ قیمت (۲ روپیے)

منیجر عصمت، و تمدن، دہلی

مطرب آخریں کا نغمہ

اسکاٹ کی ایک مشہور تصنیف ہے قرونِ متوسط میں انگلینڈ و اسکاٹ لینڈ کی سرحدی حالت نہایت ابتر تھی کبھی یہہ اُن پر چڑہائی کرتے تھے اور کبھی وہ اِن پر غرض اگر شام اطمینان سے ہوجاتی تھی تو صبح کا ٹھیک تھا اگر صبح امن و سکون سے ہوتی تو شام کا خدا حافظ تہا۔ اسی کیفیت کو اسکاٹ نے اپنی اس کتاب میں ایک مطرب کی زبانی نہایت خوبی سے ادا کیا ہے لیکن چونکہ محبت گوشۂ امن و عافیت و میدانِ کارزار پر یکساں حکمراں ہے یہہ کتاب بھی واردات محبت کے تذکرہ سے خالی نہیں ورستے نبی حصہ کو ہم چھپی کر رہے ہیں

جناب "عبدالجلیل" صاحب متعلم ایم اے او کالج علیگڈہ

باب ثانی

قطعہ ۲۵ - جسوقت کہ آفتاب نے خاکی شبوٹے اور دامن کار بڑ کو چمکایا اور فوراً برنکیسم کے برج اور ٹیوٹیت کی لہریں چڑہتے ہوئے دن میں منعتی ہوئی

معلوم ہونے لگیں۔

اور جسوقت جنگلی چڑیوں نے چہچہا چہچہا کے اپنی کہانی کہنی شروع کی، اور ہر پھول کھلنے والا جاگ اُٹھا زرد گل بنفشہ نے سر نکالا اور پہاڑی گلاب نے اپنا سینہ کھولا سرخ گلاب سے زیادہ دلفریب اور زرد بنفشہ سے زیادہ زرد وادی ٹیوٹ کی سب سے زیادہ حسین دوشیزہ نے اپنا بستر بیخواب وقت سے پہلے چھوڑ دیا۔

قطعہ ۲۶۔ حسین مارگیرٹ اتنا پہلے کیوں جاگ اُٹھی ہے اور اسقدر عجلت میں کیوں برقعہ پوش ہوگئی؟ اسکی نازک انگلیاں ریشمی گرہ دینے میں جنکو وہ عجلت میں دینا چاہتی تھی کیوں کانپتی ہیں؟ جب وہ مخفی زینہ سے آہستہ آہستہ اُترتی ہے تو بار بار اِدھر اُدھر کیوں دیکھتی ہے اور کیوں رک جاتی ہے؟ اور جب بڑے بالوں والا کتا اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے تو وہ اسکو کیوں پیار کرتی ہے؟ اور حالانکہ وہ چور دروازہ سے تنہا نکل رہی تھی لیکن پہرہ والے کا بگل کیوں نہیں بجتا؟

قطعہ ۲۷۔ اسکا ہر قدم اس خوف ورشک سے پڑتا ہے کہ کہیں اسکی باخبر ماں آہٹ نہ پا جائے، وہ وحشی و خونخوار کتے کو پیار کرتی ہے کہیں اسکی آواز سے محل میں تمام لوگ بیدار نہو جائیں۔ پہرہ والے کے بگل نہ بجانیکی وجہ یہ تھی کہ وہ اسکا رضاعی بھائی تھا۔ وہ طلوع روشنی کے وقت چپکے چپکے سبز کنج سے ہوکر بیرن ہنری سے جو اسکا سچا جانباز ہے ملنے جاتی ہے۔

قطعہ ۲۸۔ سبز باتہار کے شاخوں کے نیچے اس بہادر جانباز اور اس حسین خاتون کا یکجا بیٹھنا ایک ایسا منظر تھا جو آنکھوں کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ ہنری ایک شاندار نوجوان اور دراز قامت شخص تھا جنگ میں وہ خوفناک تھا

اور گھر میں محبوب۔

مارگیرٹ کی فرط محبت سے جسکو نہ وہ بالکل ہی پوشیدہ رکھ سکتی تھی اور جسکا اظہار ہی کر سکتی تھی یہ حالت تھی کہ اسکے رخساروں پر عجیب خوشگوار سُرخی چھا گئی تھی۔ نیم آہ سرد نے اسکے متلاطم و موجزن سینہ کو ریشمین سینہ بند تک پہونچا دیا تھا۔ نیلگوں آنکھیں باوجود اس کے کہ اسپر سُنہرے بالوں کا سایہ پڑتا تھا اپنا راز فاش کرتی تھیں۔ ایسا حُسن بے نظیر جو مارگیرٹ سے مقابلہ کر سکے کہاں ملے گا۔

قطعہ ۲۹ اے حسین لڑکیوں میں خیال کرتا ہوں کہ تم میرا نغمہ سُننے میں ہمہ تن مصروف ہو اپنے لہراتے ہوئے بال تم پیچھے پھینکتی ہو اور اپنی برف کے مانند گوری گردن اِدھر اُدھر جھکاتی ہو۔ تم دو سچے عاشقوں کی جو وادی میں ملے تھے کہانی سُننا چاہتی ہو۔

غالباً تم سُننے کی خواہشمند ہو کہ اس جانباز نے اپنے باوفا جذبہ کی تصویر کھینچنے کی کس طرح کوشش کی اور قسم کھائی کہ وہ اس کے قدموں پہ جان دینا گوارا کریگا مگر محبت سے باز نہ آئیگا۔

یہ سُنکر مارگیرٹ کس قدر شرمائی اور سُننے کیسے آہ کی اور نیم راضی و نیم منکر ہوکر اُس سے کہا وہ میں تو کنواری ہی مرجاؤں گی، لیکن اگر نزاع خونی میں سکون ہو جائے تو مارگیرٹ کا انتخاب ہنری کرلنسوں، اور صرف وہی ہوگا۔

مگر آہ، اے خوبصورت نازنینوں تمہارا یہ انتظار عبث ہے کیونکہ میرے باجے کا وہ سحر پرور اور دلکش راگ کھو گیا۔ میرے بال سفید ہوگئے، میرے اعضا ضعیف اور دل مُردہ ہوگیا اور میری رگیں سرد ہو چکیں محبت کا ترانہ اب میرے عمر کے شایانِ حال نہیں رہا ✠

مژدہ ہو کہ بیمار کو عیسیٰ نہیں ملتا

(از مولانا آزاد سبحانی)

اے سینۂ خالی دلِ بینا نہیں ملتا ۔ اس گھر کا جو سرمایۂ کُل تھا نہیں ملتا

بیکار پڑا ہے ترا سامانِ تجلّی ۔ اے وادیِ ایمن کوئی موسیٰ نہیں ملتا

جو رونق کاشانۂ جسم و دل و جاں تھا ۔ حسنِ ازل افروز وہ جلوا نہیں ملتا

اس عالم امکاں میں وسعت نہیں ملتا ۔ جولانیِ دل کو کوئی صحرا نہیں ملتا

خود تشنگیِ لب سے شناسا نہیں خواہش ۔ پھر اس پہ شکایت ہے کہ دریا نہیں ملتا

دل کیفیتِ ذوقِ تمنا سے ہے خالی ۔ ساغر کو کنارِ لب مینا نہیں ملتا

خورشید تو ہر ذرہ میں ہے محو نمائش ۔ مشکل یہ کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا

عالم میں کسی سے تری صورت نہیں ملتی ۔ ملتے ہیں بہت پر کوئی تجھ سا نہیں ملتا

اک کشمکشِ وہم حقیقت کو ہے حایل ۔ موجیں ہیں پریشان، کنارا نہیں ملتا

طوفانِ حقیقت میں ہے گم قطرۂ ہستی ۔ ہنگامۂ سیلاب میں تنکا نہیں ملتا

اک موجِ تخیل سے زیادہ نہیں عالم ۔ جز وہم کہیں ہم کو سہارا نہیں ملتا

بندوں کو خدا! تیرے نہ ملنے کی شکایت ۔ تجھ کو یہ شکایت کوئی بندا نہیں ملتا

دونوں ہیں بجا شکوے مگر کچھ یہ سوا ہے ۔ مجبور کو مختار سراپا نہیں ملتا

صحرا میں کنول کھل کے یہ کرتا ہے اشارہ ۔ گھر بیٹھنے والوں کو تماشا نہیں ملتا

اپنی بھی کلی کھلنے کو آمادہ ہے پر حیف ۔ اے بادِ سحر تیرا اشارا نہیں ملتا

آخر کو نظر بازوں سے سب کھل گئے پردے ۔ چھپنے کو انھیں اب کوئی پردا نہیں ملتا

خود لیلیٰ محمل بھی ہوئی قیس بیاباں ۔ ڈھونڈھ سکے کہیں محمل لیلیٰ نہیں ملتا

صد طرفہ صنمخانۂ دہر آج ہے ویراں ۔ سنگِ درِ بت کو کوئی سجدہ نہیں ملتا

محروم اجل ہے مرض زیست یہ شاید ✦ آغاز کو انجام کا نقشہ نہیں ملتا ✦ آزاد محبت نہیں منت کش چارہ ✦ "مژدہ ہو کہ بیمار کو عیسےٰ نہیں ملتا" ✦

عشق

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اے **عشق**! تیرے ہی دم سے ہماری ابدی حیات وابستہ ہے، اس لیئے ہمیں اپنا ذکر کرنے دے اور ہمیں اپنے نام پر مٹنے دے۔ آفتاب کی ضو میں، چراغ کی لو میں، تو رقص کرتا ہے۔ پروانہ کے پر میں بلبل کے سر میں، تری تڑپ نمایاں ہے۔ تیری دوری سے سمندر پٹکتا ہے تیری ہجوری میں دل اٹکتا ہے، ہمکو بھی اپنی چادر میں جگہ دے، اور اپنے نور عالم افروز سے جگمگا دے۔

تیرے طلسماتی حرفوں نے موجودات عالم پر اپنا اسقدر گہرا رنگ چڑھا دیا ہے کہ ہر وجود بجائے خود ایک عاشق یا معشوق ہے۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے، جو دوسری کسی چیز کی طالب یا مطلوب نہو۔ بلبل کے گلشن میں، شہید کے مدفن میں، تو سیماب کی طرح جا ہوا بیقراری کی شان دکھاتا ہے۔ موجودات کی خلقت میں کائنات کی خطرت میں تری بیتابی کا سماں نظر آتا ہے کسی نے تجھے فطرت بنایا، کسی نے تجھے مذہب بتایا، بنی آدم نے اپنی بساط کے موجب عقل کے ناخن کے لیئے خواب ہستی کی تعبیریں بتائیں نیستی کی تصویریں کھینچیں کسی نے کچھ جانا کسی نے کچھ سمجھا، صوفیوں نے ایک حد تک تیری کنہ حقیقت میں ہو حق کی آواز بلند کی۔ درویشی لباس پہنکر عشق اللہ فقر اللہ کا سلام تراشا۔ سننے والوں نے بھی سدا را عشق کہہ کے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ابھی بہت کچھ ہونا ہے عقل کی کیا مجال جو تیرے

آگے دم مارے۔ بقول مولانا شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔ سے

چو عشق آمد از عقل دیگر مگوئی   کہ در دست چوگاں اسیرست گوئی

ہاں ہاں، تیرے ع (عین) سے عین عقل کی نفی مقصود ہے۔ تیرے ش (شین) سے شین شرک کی معدومیت مراد ہے۔ تیرے ق (قاف) سے قاف قالب کی نیستی متصور ہے۔ تیرا مرتبہ اون با برکت لوگوں پر اچھی طرح ظاہر ہو چکا ہے جنھوں نے تیری سرکار سے اپنی خدمات لائقہ کی صلہ میں عاشقی کا خلعت فاخرہ زیب تن کیا۔ تیرے ایوان عالی کا پہلا طبقہ شریعت ہے یہ درجہ اوسوقت طے ہوتا ہے جب عاشق جمال محبوب کی صفت گوش زد کرکے وصال محبوب کی آرزو پیدا کرے۔ دوسرا طبقہ طریقت یعنے طلب محبوب ہے اس درجہ پر وہی فائز ہوتا ہے جو راہ محبوب میں راسخ القدم رہے تیسرا طبقہ حقیقت ہے اس درجہ پر وہی پہنچتا ہے جو حضور محبوب میں رہ کر حسن محبوبی پر پیوستہ نگاہیں ڈالے۔ چوتھا طبقہ معرفت ہے یہ اوسکو میسر ہوتا ہے جو مراد محبوب میں اپنی مراد کو محو و فنا کر دے۔ پانچواں طبقہ وحدت ہے جو نہایت ہی اعلیٰ ہے اور اوسیکو حاصل ہوتا ہے جو اپنے وجود فانی کو تمامتر شکستہ و ریختہ کرکے محبوب کو موجود مطلق سمجھے اور دیکھے۔ جہاں اتنی منزلیں طے ہو جاتی ہیں سب کچھ جاتا رہتا ہے بجز شوق و عشق باقی رہ جاتے ہیں۔ اب کیا ہے عاشق و معشوق دونوں دریائے عشق میں غوطہ زنی کرنے لگے۔ بقول بزرگے الوجود بین العشقین کالطہر بین الدمین یعنے وجود درمیان دو عشقوں کے ایسا ہے جسطرح عورت کی پاکی درمیان دو خونوں سے یعنے اول بھی عشق تھا آخر بھی عشق رہا۔ سے

رفتم بہ بحر دریا دیدم عجب تماشا   دریا درون کشتی کشتی درون دریا

چونکہ کوئی وجود عشق سے باہر نہیں ہے نہ بغیر عشق کے قایم رہ سکتا ہے
اول و آخر ظاہر و باطن تحت و فوق پس و پیش عشق ہی عشق ہے۔ بہی قول ہے

چیست آدم چیست حوا عشق بس گرچہ آمد صد ہزاران پیش و پس

ابہی اس چیستانِ عشق کا حل باقی ہے سمجھانے والے کی طرح سمجھنے والا بہی عاشق ہوتو کچہ سبجھے۔ عشق حقیقت میں تخم ہے ایک درخت کا اور وہ درخت درخت وجود ہے جس کو عرف میں قالب، جسم، تن وغیرہ بہی کہتے ہیں یہ درخت ظاہر باطن اندر باہر ہر سمت میں پہیلا ہوا ہے چونکہ درخت بغیر بیج یا جڑ کے قایم نہیں رہتا۔ درخت وجود کا بہی چند بیجوں پر قایم ہونا لابُدی ہے اوس کی بیجیں عقل، وہم، روح، علم، جان، ہیں اوسکی ہر بیج کو جداگانہ حقیقت کہتے ہیں اوسکی ہر ایک بیج سے شاخیں پیدا ہوئیں بیج عقل میں شاخ بینائی لگی، بیج وہم میں شاخ شنوائی پیدا ہوئی، بیج روح میں شاخ بویائی نے نمو پایا، بیج علم سے شاخ گویائی نے سر نکالا بیج جان میں شاخ توانائی نے ظہور کیا بالآخر بڑہتے بڑہتے یہ شاخیں برگ و بار لائیں بینائی سے حرص ظاہر ہوئی شنوائی سے کینہ پیدا ہوا۔ گویائی سے غصہ نکلا بویائی سے حسد نے خروج کیا توانائی سے غرور نے سر اوٹہایا انہیں شاخوں کا نام دل ہے جو مرتبہ ذات میں سب ایک ہیں اور اس سے شریعت عبارت ہے۔ ہے

نفس و روح و عقل و دل جملہ یکیست مرد معنے را دریں جا کے شکیست

بیج شاخدار اور شاخ بابرگ کی تشریح ہو چکی ہے۔ اب گل بامیوہ اور میوہ باتخم سے بودمزہ لینا چاہیئے اس درخت میں جو پہول لگے ہیں اون کی طرف بہی نظر دوڑاؤ کیسے خوشنما ہیں۔ طاعت۔ زہد۔ قناعت۔ سخاوت۔ اِس گلدستہ کا نام طریقت ہے۔ ان پہولوں میں باریک نظر سے دیکھو میوے بہی پنہاں ہیں۔ شفقت محبت

رحمت۔ برکت۔ اِن کا مجموعہ معنے عشق میں ایک ہے اور وہ معرفت ہے ہر میوہ میں جو تخم ہے اوسکو تخم وحدت بولتے ہیں کیونکہ یہی تخم اول ہے جس کا نام عشق ہے۔ العشق ہو اللہ۔ کہ اوس سے سب کچھہ ظاہر ہوا۔ بلکہ وہی ہے جسنے خود کو خود بخود جلوہ گر کیا وہ اُسیطرح دائم و قائم ہے۔ جس طرح بیج کے ساتھہ شاخ۔ شاخ کے ساتھہ پہول۔ پہول کے ساتھہ میوہ اور میوہ کے ساتھہ تخم۔ اب یہ بہی جاننا چاہیئے کہ اس درخت کی نشو و نما کیونکر ہوئی۔ حرارت رطوبت برودت یبوست کے عناصر اربعہ نے بلکہ اسکی باغبانی کی بازی و شہوت کی ہواؤں نے جہونکے دیکر اوس میں جنبش پیدا کی خیال وحال نے اوسکو استوار و مضبوط کیا۔ بیداری و ہوش نے اوسکو حیات بخشی۔ خواب و فراموشی نے موت بنکر اوس کا کام تمام کر دیا اوسکی بقا کو وجہہ اللہ ذات اللہ کہتے ہیں مصداق ویبقی وجہہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ الغرض ؎

معشوق و عشق و عاشق و سہر یکی است اینجا
تو خود بخود نگنجی ہجران چہ کار دارد

اے عشق۔ تیرے چمن سے میں نے حتے المقدور خوشہ چینی کی لیکن جوں گلوں سے تیرے عاشقوں کے دامن مالا مال ہیں۔ اون کی خوشبو سے میرا دل و دماغ معطر بنا جن میووں سے تیرے طالبوں کے لب و کام آشنا ہو چکے ہیں اونکی لذت سے میرے کاسہ گدائی کو مشرف فرما۔ بمصداق ؎

گل پہینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بہی
اے خانہ برانداز چمن کچہہ تو ادہر بہی

بشیر الدین احمد نقوی حسینی قادری چشتی عفی عنہ (از نظام المشائخ)

ایجاد تہجی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ایجادِ تہجی کی نسبت۔ مذہب و فلسفہ کا اختلاف

ایجادِ تہجی کے بارے میں علمائے مذہب اور حکمائے فلاسفہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اوّل الذکر فرقہ کا یہ قول ہے کہ ابتدا از عالم ارواح میں ابوالبشر آدم علیہ السلام کی روح پر فتوح یا اُن کی وسعتِ معلومات کو ہر ایک علم و فن اور صنعت و ہنر کا علمی مادہ الہام۔ بانی کے ذریعے سے سپرد ہوا تھا۔ اسی کا ظہور بہ وقتِ ضرورت کسی مقدس بزرگ کے توسط سے ہوتا گیا، ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہیگا۔ چنانچہ تہجی کی ایجاد بھی حضرت شیث علیہ السلام کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور بعض محققین اس ہنر کا موجد حضرت ادریس علیہ السلام کو ٹھیراتے ہیں۔ یہ فرقہ نصوص قرآنی۔ احادیث نبوی اور دیگر روایات مذہبی سے استدلال کرتا ہے۔

ثانی الذکر گروہ یعنی حکمائے فلسفہ کو یہ دعوے ہے کہ ضرورتِ انسانی ساری ایجادوں کی جڑ ہے، انسان کو جیسے جیسے حاجت و ضرورت محسوس ہوئی، رفع حاجت اور ضرورت کے لئے وقتاً فوقتاً نئے نئے علوم، فنون، صنعت، حرفت اور ہنر ایجاد کرتا گیا، اور ایجاد کردہ علم و ہنر میں بتدریج ترمیم، ترقی اور اصلاح کی۔ اسی قاعدے سے مدعا گزاری اور تدوینِ خیالات کے وسائل بھی ایجاد ہوئے، پہلے ناقص طور

پر ہوئی تھی اور بعد ازاں اُن میں اصلاح ہوئی اور ہوتی جاتی ہے۔ یہ گروہ اپنے دعوے کے ثبوت میں، آثار قدیمہ کی بناپر دلائل بدیہیہ پیش کرتا ہے۔

بنظرِ غور دیکھا جائے تو صرف اختلاف ہی اختلاف ہے۔ ورنہ اس سے اصل مطلب میں کچھ نقصان وارد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اختلاف تو صرف ذرائعِ تجسس و تلاش میں ہے۔ اور مراد و مقصد دونوں گروہوں کا ایک ہی ہے۔

علمائے مذہب الہامی اور دینی طریقے سے گویا اصل مقصد و مراد کو پاگئے ہیں، اور حکمائے فلسفہ آثار قدیمہ سے مراد و مطلب کا سراغ لگانے میں سرگرداں ہیں۔ میرے نزدیک یہ اختلاف اسی وقت تک قائم ہے جبتک کہ فلسفہ کی بزمِ راز تک رسائی نہیں ہے۔

ایجادِ تہمی کے اسباب

بالغرض اگر آدمی سے ساری بری اور بھلی صفتیں اور سب قسم کے قویٰ الگ کرلئے جائیں، تو خارج میں اسکا وجود سوائے مفہوم محض کے اور کیا باقی رہیگا؟ غالباً اس سوال کا جواب یہی ہوگا کہ "کچھ نہیں"، پس انسان گویا جملہ اوصاف حمیدہ و رذیلہ اور قوائے روحانی اور دیگر قوائے ظاہری و باطنی کا مجموعہ ہے۔ ان اوصاف و قویٰ میں سے بعض بعض صفتیں اور قوتیں تو خاص کر انسان ہی کو عطا ہوئی ہیں، اور دوسری مخلوقات ان میں شریک نہیں ہیں مثلاً قوتِ ناطقہ جس کو بالفاظ دیگر قوتِ روحانی۔ اور بعض بعض اوصاف و قویٰ میں گو دیگر مخلوقات کی بھی شرکت ہے۔ لیکن

انسان کو اُن میں نمایاں طور پر امتیاز حاصل ہے :- جیسے محبتِ اولاد،
ہوسِ نام و نمود، دُور بینی، مآل اندیشی اور دیگر قوای عقلیہ وغیرہ وغیرہ۔
خصائلِ انسانی پر بغور لحاظ کرنے سے یہ بات بھی خاصی طرح سمجھ میں آتی
ہے کہ آدمی کی فطرت میں اور دیگر اوصاف حمیدہ کے علاوہ مفصلۂ ذیل
تین صفتیں بھی بڑی پُر زور اور مؤثر ہیں۔ یعنی :-

محبتِ اولاد باہمی ہمدردی شوقِ نام آوری

اِن ہی اوصاف کے اقتضاء سے انسان کے دل میں یہ خواہش
پیدا ہوئی کہ اپنے پسندیدہ خیالات اور برگزیدہ طبعی واردات کو خوب
پھیلائے، اور وسعت دے اور اپنے اہم وعمدہ کارناموں کو ہمیشہ
کے لئے بطورِ یادگار قائم اور محفوظ رکھے، تاکہ معاصرین اُس کے سُودمند
اور فیض رساں خیالات سے فائدے اُٹھائیں۔ آئندہ نسلیں اُس کے
عظیم کارناموں سے اپنی ترقی و بہتریِ کا سبق حاصل کریں، اور باہمی
جلسوں میں اپنے باپ دادوں کے کارہائے نمایاں کو فخریہ بیان کریں۔
اس دلی خواہش کے پُورا کرنے کی تدبیریں مختلف زمانوں میں مختلف
طور پر سوچی گئیں۔ اور اُن میں وقتاً فوقتاً ترقی و ترمیم ہوتی رہی۔ جیساکہ
بیانِ ذیل سے واضح ہے۔

مُدّعا نگاری کا ابتدائی ناقص طریقہ

حکمائے محققین نے جو کارخانۂ عالم کو غور کی نگاہ سے دیکھتے اور
خاص کر خصائصِ انسانی پر ہمیشہ گہری نظر ڈالتے ہیں، مختلف ملکوں کے

نہایت قدیم معبدوں، ٹوٹی پھوٹی عمارتوں، مٹی مٹائی سلطنتوں کے ویرانوں اور ویران شدہ شہروں کے کھنڈروں سے بڑی تلاش و تجسس اور بڑی چھان بین کے بعد اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ اوائل میں جب انسانی تمدن کا آغاز تھا۔ بڑے بڑے واقعات اور سوانحات کی نامکمل، ناقص اور ادھوری تصویریں، یا کنایہ نما نقوش و علامتیں، پتھر وغیرہ دھات کی پائدار چیزوں پر کھود کر محفوظ کر لی جاتی تھیں، اور اُن یادداشتوں کے صریحی یا کنایتی معنی لگا کر بانیانِ یادگار کے مقاصد اور ارادے کسی طرح معلوم کر لئے جاتے تھے۔ چنانچہ ملکِ فارس میں بیستون پہاڑ اور تختِ جمشید کی سیڑھیوں پر (جو استخر قدیم دار السلطنتِ ایران میں شاہنشاہِ جمشید کے وقت کی ایک پرانی عمارت ہے) اس طرح کی پیکاں نما تصویریں بنی ہوئی ہنوز موجود ہیں۔

مصریانِ قدیم اپنے بزرگوں کی لاشوں، بلکہ بلی، خرگوش، مگر، لومڑی وغیرہ، اپنے معبودوں کی لاشوں کو بھی کسی قسم کا مصالحہ لگا کر مندروں میں تبرکاً رکھ چھوڑتے تھے، جن پر کنایہ نما نقوش یا تصویروں میں کچھ یادداشتیں بھی منقش ہوتی تھیں چنانچہ ایک آدمی کی لاش پر مفصلۂ ذیل تصویروں اور نقوش میں اسکا نام منقش تھا۔
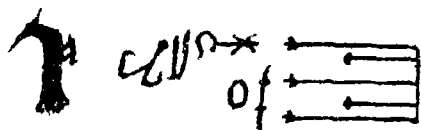
عرب، مصر اور امریکہ کے قدیم باشندوں میں حروفِ تشبیہی رائج تھے یعنی وہ لوگ حرفوں کی جگہ خاص خاص جانوروں اور اشیاء کی تصویریں

استعمال کرتے تھے۔

عرب میں وادی المکاتیب نام ایک جنگل ہے، وہاں ڈیڑھ کوس تک پتھر کی چٹانوں پر حروف تشبیہی یا تصویریں کندہ ہیں۔

حروفِ تہجّی کی ایجاد

جب آدمی کی تہذیب اور تمدن کو روز افزوں ترقی ہونے اور اس سبب سے قابلِ یادگار واقعات کی تعداد بڑھنے لگی، اور تصویروں کے ذریعے سے اُن متعدد واقعات کا محفوظ رکھنا اور اُن تصویروں سے بانیانِ یادگار کے اصل مطلب کو سمجھنا مشکل بلکہ محال ہوگیا، تو لا محالہ مقصد گزاری کی اور اور ترکیبیں سوچیں جانے لگیں۔ حروف تہجّی کی بنیاد یہی سوچ اور فکر معلوم ہوتی ہے۔ مناسب سمجھا گیا کہ ایسے ایسے نقوش و علامتیں ایجاد کی جائیں۔ جن کے وسیلے سے صوتِ نطقی یعنی حرکاتِ زبان یا الفاظ کی پوری پوری تصویریں اُتر آئیں، یعنی اُن اُن نقوش یا حروف میں آدمی کی بات چیت (جو اُس کے خیالاتِ طبعی کا آئینہ ہے) بجنسہٖ قلمبند ہوسکے۔ اب تمدنِ انسانی بہت کچھ ترقی کرگیا تھا، اور زمین کے کثیر التعداد حصے ایک دوسرے سے دور و دراز فاصلہ پر مختلف قوموں سے آباد ہوگئے تھے۔ یہ قومیں اگرچہ قومی اور ملکی خصوصیات میں باہم مختلف تھیں مگر بایں ہمہ محبتِ اولاد، باہمی ہمدردی، اور شوقِ ناموری، کی فطرتی اوصاف میں متحد و مشترک تھیں۔ علاوہ اس کے اوائل میں جو وسائل توسیعِ خیالات اور بقای نام و نمود کے اختیار کیے گئے تھے وہ بھی متحد تھے، اسلئے ان ہی اتحاد اور اشتراک کی وجہ سے مقصد گزاری اور مطلب

نگاری کے جو ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ ذریعے دوبارہ سوچے گئے، اُن میں بھی ایک حد تک مشابہت اور بعض بعض خصوصیات میں مشارکت پائی جاتی ہے، گو اختلافِ سرزمین، اختلافِ آب وہوا، اختلافِ قومیت، اختلافِ خیالات اور اختلافِ زبان کے سبب سے اُن نقوش، علامات یا حروف کی صورتوں میں اور اُن کے تلفظ میں فرق ہے۔

یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ سب قومیں حروفِ تہجی کی موجد نہیں ہوئیں، بلکہ بیشتر قوموں نے اس مفید ہُنر کو غیر اقوام سے ہی سیکھا، اور حسبِ ضرورت اُس میں کوئی جدّت، اضافہ، یا ترمیم و اصلاح کر کے اُن کو اپنے اپنے کام کا بنا لیا۔

اِس صنعت کو دُنیا کی بعض بعض ہُنرمند اور فیاض قوموں کی محنت و دماغ سوزی کی برکت سے حیرت انگیز ترقی نصیب ہوئی، اور برابر ہوتی جاتی ہے، چنانچہ ٹیلیگراف وغیرہ، اِسی ہُنر کی شاخیں، اور اُنھیں خیر مجسّم قوموں کے علمی و عملی کرشمے ہیں۔

اَب ایک ایسی کل بھی ایجاد ہوگئی ہے، جس میں انسان کی آواز بجنسہٖ بند کر لی جاتی ہے اور بوقتِ ضرورت قید سے رہائی دیکر اُس سے گذشتہ یادداشتوں کا کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ موجودہ وسائلِ مدّعا گزاری میں باوجود ترمیم و اصلاح کے چند طرح کی دقّتیں ہنوز باقی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک تو یہی ہے کہ انسان کے خیالات کو دماغ سے اُترنے، اور لوازماتِ تحریر کے ذریعے سے اُن کو کاغذی جامہ پہنانے میں بے شک ایک توقف ہوتا ہے، جو بعض موقعوں پر سخت مضرت کا باعث ہوتا ہے، علاوہ اس کے کاغذاتِ یادداشت کا مدّت مدید تک آفاتِ ناگہانی اور

اور اُن تحریرات کا تحریفاتِ اتفاقی سے قائم و محفوظ رہنا، اگر محال نہیں تو نہایت مشکل ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں، اِس بات کا فیصلہ کرنا نہایت مشکل بلکہ محال ہے کہ کون کون تو ہیں حروفِ تہجی کی موجد ہوئیں، اور کون کون مقلد۔ بہرحال اوّل اوّل تین قسم کے حرف ایجاد کیے گئے۔ اور دُنیا کے سب قسم کے حروفِ تہجی اِن ہی تین قسموں میں داخل ہیں۔

پہلی قسم میں وہ حرف شامل ہیں، جنکا ہر ایک حرف پُورے لفظ کے لئے کافی ہوتا ہے مثلاً چینی زبان کے حرف، کہ اُس زبان میں ہر ایک لفظ کے لئے جُداگانہ ایک ایک حرف مقرر ہے۔ دوسری قسم کے وُہ حرف ہیں، جنسے لفظوں کے اجزائے قریب بولے اور لکھے جاتے ہیں، اور اجزائے قریب سے لفظوں کے ایسے ٹکڑے مُراد ہیں، جو زبان کی ایک ہی حرکت سے بولے جاسکیں۔ ایسے اجزائے الفاظ کو انگریزی میں سیلیبل کہتے ہیں اور اُردو میں بند کلمہ کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کے حرف جزائرِ جاپان اور اُس کے آس پاس کے جزیروں میں مروّج ہیں، تیسری قسم میں ایسے ایسے حرف شامل ہیں، جن میں الفاظ کے اجزائے بسیط یعنی ٹکڑوں کے ٹکڑے قلمبند کیے جاتے ہیں۔ یعنی الفاظ کے ٹکڑے سیلیبل ہوتے ہیں۔ اور سیلیبل کے ٹکڑے تیسری قسم کے حرف۔ اِس قسم میں عربی، سنسکرت، انگریزی، وغیرہ وغیرہ ایشیا اور یورپ کی قریب قریب کُل زبانیں شامل ہیں۔ شجرۂ ذیل سے واضح ہوگی بابت زیادہ

[illegible]

وسیلۂ مدعا گزاری
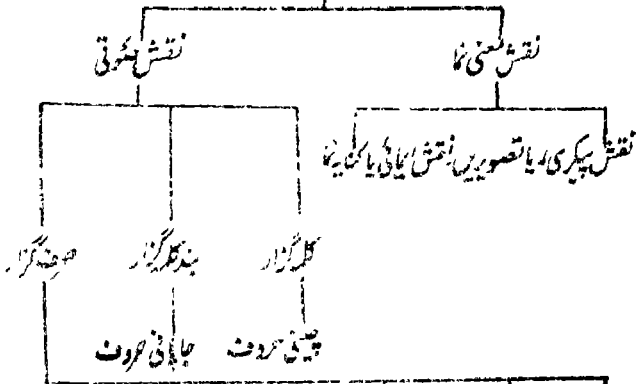
- نقش معنی نما
  - نقش پیکری یا تصویری
  - نقش ایمائی یا کنایہ
- نقش صوتی
  - کلمہ گزار
    - چینی حروف
  - بندکلمہ گزار
    - جاپانی حروف
  - حرف گزار
    - عربی
    - سنسکرت
    - قدیم پارسی
    - انگریزی
    - لاطینی وغیرہ وغیرہ

میرا خیال ہے کہ مذکورۂ بالا تینوں قسم کے حروف ذیل کی ایک فرضی مثال سے بآسانی سمجھ میں آ جائینگے۔

گیا۔ وقت۔ پھر۔ ہاتھ۔ آتا۔ نہیں

اس مصرعہ میں چھ لفظ ہیں، جو الگ الگ لکھے گئے ہیں۔ اور چھوں پر ہندسے بھی دیئے ہوئے ہیں۔ پس اول قسم کے چھ ہی حرف اس مصرع کی پوری تحریر کے لئے کافی ہونگے۔ دوسری قسم میں الفاظ مصرعہ کے اجزائے قریب کے لکھنے کے لیئے ہم سے زیادہ حرف درکار ہونگے اور انکے ٹکڑے حسب ذیل ہو جائیں گے۔

گ۔ یا۔ وقت۔ پھر۔ ہاتھ۔ آ۔ تا۔ نہ۔ ہیں

دیکھو! دوسری قسم کی تہجی میں چھ لفظوں کے نو سلیبل ہو گئے۔ اس لیے نو حرف اس کی تحریر کے لیے درکار ہونگے۔

لیکن تیسری قسم کے حرفوں میں اس مصرعہ کے اجزا بہت بڑھ جائینگے اسلیے ہر سلیبل کے ٹکڑوں کے لئے جداگانہ حرفوں کی ضرورت ہوگی، جو نیچے لکھے جاتے ہیں۔

گہ - یہ - آ - و - ؤ - سٹ - پھ - ر - ۰ - ا - تھ - ا - تہ - ا - تہ - ہیہ

یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہر لفظ کے لئے جدا جدا۔ پھر ہر ایک بند کلمہ یعنی سلیبل کے لئے الگ الگ۔ اور اخیر میں بند کلمہ کے ٹکڑوں کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ حرف ایجاد کیے گئے۔

چونکہ چینیوں کو غیر اقوام سے ہمیشہ سے نفرت رہی اسلئے باوجود فطرتی دانشمندی اور ذہانت کے [illegible] اس ہنر میں کچھ ترمیم و ترقی نہ کرسکے اور اُن کے حروف تہجی پہلی ہی حالت میں غیر متبدل رہے۔

جاپانیوں نے کچھ آگے قدم بڑھایا، اور ہمسایہ قوموں کی پیروی سے [illegible] اپنے وسیلہ مطلب گزاری کو ایک حد تک وسعت دی۔ لیکن یورپ اور ایشیا کی دیگر قوموں نے باہمی میل جول سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔ اور اپنی تہجیوں کو بہت درست کردیا۔ اور خاطرخواہ ترقی دی۔

چینی حروف بہت مشکل ہیں

ابتدا میں یہ خیال ہوتا ہے کہ چینی تہجی آسان اور مختصر ہوگی کیونکہ اس میں ایک ایک حرف ایک ایک لفظ کے لئے کافی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی غور سے [illegible] یہ خیال دور ہو جاتا ہے [illegible] طرح کی مشکلات پیش نظر ہوتی ہیں۔ چونکہ دوسری زبانوں کی طرح چینی زبان میں بھی علاوہ موجودہ لفظوں کے

بہت سے نئے نئے لفظ داخل ہوتے جاتے ہونگے۔ پس اُن پُرانوں اور نئے لفظوں کے لیے موجودہ کثیر التعداد حرفوں کے سوا بہت سے نئے نئے حروف ایجاد کرنے پڑتے ہونگے۔ چنانچہ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ چینی حرفوں کی تعداد ستر اسی ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ یہ تو تعدادی مشکلات ہیں، تحریری دُشواریوں کا یہ حال ہے کہ اکثر حرفوں کے لکھنے میں مُصور کی سی دیدہ ریزی نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بعض حرفوں کی لکھاوٹ میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر کششیں قلم کی صرف ہوتی ہیں۔

جب ان تحریری اور شماری دُشواریوں کو خیال کیا جاتا ہے تو طبیعت کو وحشت اور متخیلہ کو پریشانی ہوتی ہے۔ اور چینیوں کی بے پروائی اور غفلت پر افسوس آتا ہے کہ انھوں نے باوجود حکیمانہ دانشمندی کے اس خصوص میں کوئی ترقی نہ کی۔ غالباً طلبہ کی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی ابتدائی تعلیم، یعنی ہجی آموزی اور املا نویسی ہی میں صرف ہو جاتا ہوگا۔ جو بیز بان بچوں کے لئے بڑے افسوس کی بات ہے، کیونکہ اس قسم کی ابتدائی تعلیم اور اور ضروری و مفید علوم و فنون کی تحصیل کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس اس تعلیم کو ایسا آسان و سہل ہونا چاہیئے کہ طلبہ کو اس میں جلد تر مہارت پیدا کرکے دوسرے دوسرے مفید اور بکار آمد علموں میں لیاقت اور کامیابی حاصل کرنے کا کافی وقت اور موقع مل سکے۔

دیکھو! معراج کمال کو پہنچی ہوئی قوموں نے اپنی طرز تحریر کو کس قدر سہل و آسان کر رکھا ہے کہ ہر ایک صاحب ذوقِ سلیم و ذہن مستقیم کو اُن کی زبان اور دیوانات زبان کے سیکھنے میں زیادہ محنت و مشقت اُٹھانی

نہیں پڑتی۔ اُن کی فیاضی، اُن کی کشادہ دلی، اُن کی بلند حوصلگی، اُن کی عالی
منشی، اور اُن کی انسانی ہمدردی، اُنھیں اجازت نہیں دیتی کہ علم و ہنر سے
نادر و نایاب نکتے (جو اُن کی دماغ سوزیوں، جانکاہیوں اور دل گدازیوں کے
نتیجے ہوتے ہیں) اُنھیں تک یا اُن کی قوم ہی تک محدود رہیں اور غیر قوموں کو
اُن سے مستفیض ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ بلکہ وہ بہ دل چاہتے ہیں کہ
سارے ابنائے جنس اُن کی جدت پسندی اور معنی آفرینی سے فیض
پائیں۔

یورپ میں مختصر نویسی کے ذریعے سے ممبرانِ پارلیمنٹ کی مطوّل گفتگو
اور لمبی لمبی اسپیچوں کو بحث کرنیوالوں اور لیکچراروں کی زبان سے نکلتے ہی
قلمبند کر لیا جاتا ہے۔ اور رات ہی کیوقت اخباروں میں چھپوایا جاتا ہے۔
اس آسان ترکیب سے ناظرینِ اخبارات کو رات کی تقریریں علی الصباح معلوم
ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم یعنی جاپانی حرفوں کی نسبت میری واقفیت
قیاسی رائے زنی کے لئے بھی کافی نہیں ہے۔ اب ہندوستان اور جاپان
سے راہ و رسم پیدا ہونے لگی ہے۔ اس سے اُمید پڑتی ہے کہ اب جاپانی
زبان اور اُس کے حروفِ تہجی سے زیادہ تر واقفیت پیدا کرنے کا موقع
حاصل ہوگا۔ دو ایک نوجوان وہاں سے تعلیم پاکر آ بھی گئے ہیں۔

تیسری قسم میں ایشیا اور یورپ کے قریب قریب کل حروفِ تہجی داخل
ہیں۔ اور اسی قسم میں ہماری اُردو تہجی بھی شامل ہے۔ جیسا کہ اوپر کہہ آئے ہیں اگر
فرصت ملی تو اُردو تہجی کا مفصل بیان آئندہ کیا جائیگا۔

دُنیا کی زبانوں کی اصلیت

واضح ہو کہ محققانِ علم اللسان و ماہرانِ لسان نے بڑی تحقیق و تدقیق سے

بعد کل اقوام دُنیا اور اُنکی مختلف زبانوں کی اصلیت صرف دو ماخذوں کو قرار دیا ہے۔ **اوّل** سیمیا طیقی اور **دوم** آریوی اور کہتے ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں اور اُن کی مختلف زبانیں اِن ہی دو بڑے خاندانوں کی اولاد اور اولادوں کی اولاد ہیں۔ چنانچہ سیمیا طیقی خاندان سے چھ زبانیں پیدا ہوئیں، یعنی :- عربی، عبرانی، سُریانی، آسیری، کلدی، فینیقی، ان میں سے عربی زبان بڑی کثیر الاولاد ہوئی، اور اس کو اپنی عبرانی بہن کے ساتھ اکثر خط و خال میں بہت مشابہت ہے۔ جو نسبت عربی کو سیمیا طیقی سے ساتھ ہے، بجنسہٖ وہی نسبت سنسکرت کو آریوی سے ساتھ ہے، سنسکرت بھی دُنیا کی متعدد زبانوں کی اور ہندوستان کی قریب قریب سب زبانوں کی ماں مانی گئی ہے۔ ہماری اُردو زبان کو عربی اور سنسکرت دونوں زبانوں سے تعلق ہے۔ اوّل الذکر سے بیشتر، اور آخر الذکر سے کمتر۔ بیشتر اس لئے کہ عربی الفاظ کثرت سے اُردو میں آتے ہیں اور اُسکا نوشتخواند بھی عربی حرفوں ہی میں ہوتا ہے، اور کمتر اسواسطے کہ اُردو میں سنسکرت کے شبد بہت تھوڑے آتے ہیں اور اُردو کو سنسکرت برتن مالا سے کوئی تعلق نہیں +

راقم جوئندہ حقیقت۔

خواجہ حالی علیہ الرحمۃ کا پرسا اور باہمی تعلقات کا قابل ذکر تذکرہ

حیران ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

تاریخ اسلام کے **دل** مولانا **شبلی** کو روئے ہوئے ڈھائی مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کہ ہمارے سعدیٔ ہند اُردو زبان اور علم اخلاق کے **جگر** مولانا خواجہ **حالی** علیہ الرحمۃ کا پیٹنا پڑگیا وہ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۱۴ء یوم یکشنبہ کو پیش خیمہ بنکر جنت کو سدھارے تو یہ ۳۱؍ دسمبر سنہ مذکور روز پنجشنبہ کو داخل خلد بریں ہوئے۔

مُنہ اُٹھا کر یہ کہدینا کہ **آفتاب و مہتاب** ہند۔ دُنیا سے اُٹھ گئے۔ اسلامی آسمان کے سب سے بڑے تارے بچھڑ گئے۔ دائمی کسوف وخسوف نے اِنھیں ہمیشہ کو دُنیا سے چھُپا دیا۔ سرتاسر ہماری غلط فہمی اور پست خیالی ہے۔ کیونکہ اِن واجب التعظیم بزرگواروں کی تصانیف نے تاقیامت زندہ رکھنے کا پٹہ لکھدیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اُنکی صورتوں کو ترسینگے۔ بلاواسطہ غدب البیانی کو پھڑکینگے۔ قوم کے ایک ایک گلی کوچہ میں گھر بہ گھر ڈھونڈتے پھرینگے۔ مگر یہ نورانی صورتیں اپنا مبارک چہرہ ہمارے سامنے نہ آنے دینگے۔ زیارت کو مضطرب۔ دیدار کو بیقرار رہینگے۔ اگر مزار مبارک پر جائینگے تو وہاں بھی خاک کے ڈھیر کے

سوا کچھ نہ پا سینگے۔ تو ڈھوسے آنکھیں سینکیں گے۔ دل ٹھنڈا کرنا چاہینگے تو وُہ بھی دلکو ٹھکانے نہیں لگا ئیگا۔ نہ مُنہ سے بولیگا نہ سر سے کھیلیگا۔ بیچ وبیچ دکھا کر عالم خموشی کا نقشہ جما دیگا۔

دراصل ہم اِن نفوس قدسیہ کو نہیں روتے۔ قوم کی بد اقبالی۔ قوم کے ادبار۔ اُسکی ناپرساں حالی کو روتے ہیں۔ اُردو زبان کے دو پیغمبر پیدا ہوئے اور دونوں کے دونوں ایک ہی سال کے اندر اُٹھ گئے قوم کی حالت پر روتے ہوئے گئے مگر آیندہ ہدایت کے واسطے بہتیرے صحیفے چھوڑ گئے۔

حضرت شبلی نعمانی کی نسبت سے جو کچھ لکھا وُہ اخباروں[1] اور رسالوں میں چھپ گیا۔ مگر خواجہ **حالی** کے واسطے ابھی تک دل قابو میں نہ تھا کہ چار آنسو بہا کر آتش فراق کو بجھائیں۔ اِس دلی صدمہ کو بتائیں۔ قلم سے جب جو کچھ نکلتا ہے کہ پہلے دل سے اُسکا دھواں اُٹھکر زبان سے بوسیلۂ قلم قرطاس پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

آج بیٹھے بیٹھے خواجہ صاحب کی دلی ہمدردیاں۔ ذاتی مہربانیاں۔ فیض صحبت کی نشانیاں۔ مسکراتے ہوئے ہونٹوں کی خوش کلامیاں منکسرانہ فروتنیاں۔ خاص خاص دردمندیاں یاد آئیں۔ اِس احسان فراموشی نے دل میں زور زور سے چٹکیاں بھریں۔ اُسے دوسرا اور کچھ لکھوا کر ہی چھوڑا۔ گو میں **فرہنگ آصفیہ** کے دیباچہ میں جہاں ہندی الفاظ کی خوبی اور اُنکے زندہ آثار کے متعلق بحث آپڑی ہے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے ہم خیال ہم عمل یعنی "زمانہ موجودہ میں ایک سچا حال کھولنے والے **حالی** مدظلہ العالی نے ہندی کے میٹھے میٹھے رس بھرے بولوں کی داد دی اور

سلہ [1] دیکھو روزانہ پیسہ اخبار ۱۹ جنوری ۱۹۱۵ء نیز رسالہ [illegible] حیدرآباد [illegible]

اپنے کلام میں مقصد اسے شائع کرنے کی شان کی جس سے انکی اپنی زبان ایک صاحب تاثیر زبان بنگئی۔ پتھر کے کلیجے والے موم دل ہوکر حال کھیلنے لگے سنگین دل۔ ماہی بے آب کی طرح لوٹنے لگے۔ **بیوہ کی مناجات** نے سہاگنوں کے دلوں میں یہ ارمان پیدا کر دیا کہ کاش ہم بھی انھیں دکھیاریوں میں شریک ہوکر ایسے نرم نرم۔ رقت انگیز۔ درد بھرے الفاظ کے مستحق ہوتے **شکوۂ ہند** نے سرزمین ہند کی بے وفائی کا گہرا صدمہ دیا۔ لیکن صبر نے دل تھام لیا۔ ہمت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ علےٰ ہذا اپنے **دیوان** کا دیباچہ بھی وہ لکھا کہ اہلِ تحقیق کے قلم توڑ دیے۔ جس ذکر کی طرف قلم اُٹھایا اُس میں نئی روح پھونک دی **مدوجزر اسلام** نے اُترے ہوئے سمندر کو چڑھا دیا۔ باسی کڑہی میں وہ اُبال آیا کہ سوتوں کو چونکا دیا۔

خواجہ حالی کی بہت سی تصنیف ہماری نظر سے گذری ہے۔ سب سے پہلے **مجالس النسار** پر نظر پڑی تھی جس میں عورتوں کے توہمات۔ اُنکے جاہلانہ خیالات کو شربت اصلاح کے میٹھے میٹھے گھونٹ پلا کر شیشے میں اُتارا تھا لیکن **مسدس حالی** نے تو غضب ہی ڈھا دیا۔ پہلے تو بزرگانِ اسلام۔ شاہان غیور کے تاریخی واقعات۔ اخلاقی اوصاف دکھا کر ہمیں آسمان پر چڑھا دیا اپنے آبا و اجداد پر گھمنڈ کرنے کا نسخہ بتا دیا۔ مگر ساتھ ہی دلوں پر ایک ایسا دھموکا لگایا اور وہ کوڑا پھٹکارا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ سسکیوں کا تار لگ گیا۔ آنسوؤں کی جھڑی نے ساون بھادوں کا رنگ جما دیا۔ زار وقطار رونے کو یار بنایا۔ غبار دل کا دل بادل پھٹ پڑا۔ ایسی غیرت و شرم دلائی کہ اپنے گریبان میں آپ مُنہ ڈالنا پڑا۔ زمانۂ جاہلیت اور موجودہ حالت کا وہ نقشہ کھینچا کہ یا بد و شاید۔ روحی فداک حضرت رسالت مآب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ

وسلم کی ولادت باسعادت سے وقت وفات تک کے واقعات جن میں
اُمت کی نجات کے واسطے اخیر دم تک تگ و دو رہی الم نشرح کر دئے۔
ذکر توحید سے اُس یگانۂ آفاق کی یکتائی ثابت کر دکھائی۔

اعرابیوں کی بیدردی کو ہمدردی سے بدل دیا۔ خلافتوں کا حال ؟ آل
آئینہ کر دیا۔ جب دیکھا کہ ہم سب رو پیٹ چکے اور ہمارے دلوں میں حمیتِ
اسلام نے کچھ اپنا گھر کر لیا تو جس اُمید پر دُنیا قائم ہے اُسکا رستہ دکھا کر حصولِ
اقبال کی چوٹی قوم کے ہاتھ میں دیدی۔ کاہلی کا چھلپائی کو چٹیا پکڑ کر نکال دیا۔
تعلیم کے بھگوڑوں کو ایک دفعہ ہی علم پرست۔ علم دوست بتفقہ کو نشش
کا ثمردار درخت لگا دیا۔ اوّل اوّل نیچرل شاعری کی بُنیاد ڈالی۔ پھر قومی
مرثیہ خوانی کا وظیفہ اختیار کیا۔ زوال رسیدہ کمال کو معراج ترقی کا رستہ
بتا کر از سرِ نو عروج کا منتر سکھا دیا۔

اُردو زبان کے مُردے کو جلایا۔ جس برج بھاکا کے الفاظ کو لوگ
حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اُنکا بینا کر معنی المعنوں کو موافق کر دکھایا۔ حضرت
عیسٰے نے اُن مُردوں کو زندہ کیا تھا جن سے آگے کچھ کام نہ چلا۔ حالی نے
اپنی مسیحائی سے **سعدی** علیہ الرحمۃ کو **سرسید** کو حضرت **غالب**
کو ایسا زندہ کیا کر دہ اور اُنکے کارنامے ہر وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ گویا اِن
سبکو زندۂ جاوید بنا دیئے۔

خواجہ حالی کے دل میں ایک درد تھا اور درد میں ایک تڑپ تھی جو اُنھیں
کسی کا دکھ درد سُنتے ہی تڑپا دیتی تھی۔ آہ سرد سے بھی یہ آگ نہیں بجھتی تھی
[illegible] سنہ ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ میرے [illegible] رات کو آگ لگ گئی جب سارا
گھر جل گیا اور آگ [illegible] مرکل کی [illegible] وقت [illegible] اُنکو

معمول سے زیادہ گرمی محسوس ہوئی۔ آنکھ کھولکر جو دیکھا تو سارا گھر آتشکدہ بنا ہوا ہے۔ دیوار توڑ کر بال بچوں کو نکالا۔ مگر پھر بھی ایک معصوم بچی کی جان جاکر رہی۔ تمام اثاث البیت۔ تمام کتب خانہ۔ تمام غیر مطبوعہ مسودے فرہنگ آصفیہ کی تین ہزار مطبوعہ جلدیں جلکر خاکستر ہوگئیں۔ چوتھی جلد کی مقابلہ شدہ کاپیاں بھی نہ بچیں سبکی سب چُرمُر ہوکر رہگئیں۔ رہنے کو مکان رہا نہ بیٹھنے کو ٹھیک تن ڈھانکنے کو کپڑے اوڑھنے کو لحاف تک نہ بچا۔ رشتہ داروں کے گھر جاکر پڑے۔ جبتک کپڑے نہ سلے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ زیور گہنا پاتا۔ ظروف مسی و چینی یہانتک کہ نیچے کے کبوتر بھی جل بھنکر کباب ہو گئے۔

میں نے خواجہ حالی کو کچھ نہ لکھا۔ مگر اُنھوں نے اپنے ایک دوست سے خبر پاکر جو ارقام فرمایا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیسا درد ٹپکتا کیسا دلگداز سماں بندھتا ہے اور پھر ڈھارس بھی کس مزے سے بندھاتے ہیں کہ وہ سارا صدمہ اور سارا غم غلط ہوکر صبر سا آجاتا ہے۔ چنانچہ اسجگہ اُسکی نقل خالی از لطف نہیں وھو ھذا۔

پانی پت۔ ۲۷ر فروری سنہ ۱۹۱۲ء

جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم۔ تسلیم۔ اسوقت آپکا کارڈ موسومہ مولوی سید عبدالعلی صاحب کے کارڈ کے جواب میں میری نظر سے گذرا۔ اُسے پڑھکر جو کیفیت دلپر گذری ہے۔ اُسکے ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ مجھے کارڈ اول سے آخر تک پڑھنا مشکل ہوگیا۔ لیکن الحمدللہ کہ آپکے صبر و استقلال میں کچھ تسزلزل واقع نہیں ہوا۔ آپکے اسی حادثہ کے قریب قریب انگلستان کے ایک مشہور مصنف ڈاکٹر لیبن پر جو آپ ہی کی طرح ڈکشنری لکھ رہا

یعنی عربی کی مبسوط ڈکشنری **مدالقاموس** کا جامع تھا۔ یہی آتشزدگی کا واقعہ گذرا تھا۔ اُسکی تقریباً بیس برس کی محنت دم کے دم میں برباد ہوگئی تھی اور کتاب کے شائع ہونے سے پہلے تمام مطبوعہ اور زیر طبع کتابیں جلکر خاکستر ہوگئی تھیں۔ مگر واہ رے استقلال کہ اُسکی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ نئے سرے سے پھر مسودہ تیار کیا جو آخر کو دس یا پندرہ ضخیم جلدوں میں چھپکر شائع ہوا ہے اگرچہ وہ حادثہ آپکے حادثہ سے بہت بڑا تھا مگر اس لحاظ سے کہ آپ کی دوست کی نو دس برس کی لڑکی اس حادثے میں ضایع ہوگئی یہ حادثہ بھی اُس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یقین ہے کہ آپ اپنے استقلال پر بدستور قایم رہینگے۔ اور مصنف مدالقاموس کی ایک دوسری نظیر ہندوستان میں قایم کرینگے اُمید ہے کہ آپ مزید تفصیل سے خاکسار کو بھی مطلع فرمائینگے۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

درحقیقت خواجہ صاحب نے خاکساری۔ انکساری۔ فروتنی کو اپنا عملی اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ آپکی فرشتہ صفت۔ رحیمانہ طبیعت پر ہر شخص کے صدمے کا بہت جلد اور بڑا اثر ہوتا تھا۔ لوگوں نے مسدس کے جواب میں مسدس لکھکر مُنہ چڑایا۔ مگر آپ کی تیوری پر ذرا بل نہ آیا۔ ہنسے اور ہنسکر فرمایا کہ جو کچھ فرماتے ہیں اس سے اپنا جی تو خوش کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے لوگوں کے خوش کرنے کو ہم ورکیا رکھا تھا۔ جس سے ہم یہ ثواب حاصل کرتے ان باتوں سے ہمارا دل دکھتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے سہ

دل بدست آور کہ حج اکبر است

نیک دل اور صالح بھی ایسے صالح کہ بہتیرے طلبا انہیں دیکھ دیکھ کر جوانِ صالح بن گئے۔ ہر شخص کی بھلائی اور بہبودی کے واسطے قلم اُٹھا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ میری اِسی آتشزدگی کے متعلق اپنے گہرے اور جگری دوست جناب نواب عماد الملک بہادر بالقابہٗ کو لکھتے ہیں:۔

پانی پت ضلع کرنال ۱۴ اکتوبر ۱۲ ۱۹ء۔

والا جناب۔ التسلیم۔ ادب بالتقدیم۔ تمہیداتِ لاطائل کو چھوڑ کر اصل مطلب عرض کرتا ہوں۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلفِ فرہنگ آصفیہ کی تباہی و بربادی کا حال غالباً اُن کی اور اخبارات کی تحریر سے جناب کو معلوم ہوا ہوگا۔ اُنکے گھر میں آگ لگنے کا حادثہ بلا تصنع اِس شعر کا مصداق ہے۔

دِل میں شوقِ وصل و یادِ دوست تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

جو درخواست اُنھوں نے بامید اعانت و ترحم پیشگار عالی میں گذرانی ہے۔ اُمید ہے کہ وہ جناب کی نظر سے بھی گذری ہوگی۔ چونکہ سرکارِ عالی میں اُنکی تقریب کرنے والے اور اُنکی تالیف کو فروغ دینے والے آپ ہی کے معزز خاندان کے ایک رکن رکین تھے۔ اسلئے اُنکو جناب کی دستگیری و بذلِ توجہات کی بہت کچھ اُمید ہے۔ آتشزدگی کے صدمے نے اُنھیں بے دست و پا کر دیا۔ نہ فرہنگ کی کوئی جلد باقی رہی جسے فروخت کر کے وہ اپنا معمولی گذارہ کریں۔ اور نہ اسقدر سرمایہ کہ فرہنگ کو از سرِ نو چھپوائیں۔ اِس سے زیادہ عرض کرنے

کی ضرورت نہیں ہے کہ **خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند** اُمید ہے کہ جناب باہمہ وجوہ خیریت سے ہونگے فقط

خاکسار حالی

گو دیکھنے میں سیدھے سادے۔ باتوں میں بھولے بھالے ہر دلعزیز اور جگت پیارے تھے۔ مگر روشن دماغی میں بھی عرش کے تارے تھے۔ صاف گوئی کا یہ عالم تھا کہ فرہنگ آصفیہ پر آزادانہ دائے[1] لکھکر ہمارے حریفوں کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اہلِ مشرق کی حاسدانہ چوٹوں اور خود غرضانہ باتوں کی ذرا پروا نہ کی۔ جو کچھ لکھا حق لکھا۔ مؤلف کی خداداد تحقیق اُس کے قومی زبان میں انہماک کی ہمت بڑھا کر اُس سے زبانِ اُردو کے متعلق بہت سے کام لیے۔

استغنا اور قدر دانی کی یہ کیفیت تھی کہ کسی مصنف کی کتاب بلا قیمت لینا گویا اُس پر نہ حد ظلم و ستم کرنا سمجھتے تھے چنانچہ میرے ساتھ بھی بارہا یہی کیفیت گذری۔ ہر چند بطریق ہدیہ کوئی کتاب دینی چاہی مگر اس خدا کے بندے نے بلا قیمت لینی تھی نہ لی۔ اور فرمایا کہ بھائی جیسی محنت سے کوئی کتاب لکھتا اور اُسکے اخراجات برداشت کرتا ہے اس کی حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے۔ میں امیر نہیں ہوں کہ یہ نذرانہ لیکر گرہ سے کوڑی نہ نکالوں اور واہ واہ کرکے زبانی جمع خرچ کردوں۔ جسے تم باعث فخر سمجھو۔

جسوقت آپ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کی نائب مترجمی چھوڑکر مسائل لکھنے کے واسطے دہلی چلے آئے تو ایک روز مولوی مرزا اشرف بیگ

---

[1] یہ ہمارے یعنی تقریظ فرہنگ آصفیہ اسکی جلد چہارم کے اخیر میں چھپ گئی ہے

خاں صاحب مرحوم سے کہکر مجھے بُلوایا اور ترجمۂ دربار قیصری میں سے
لارڈ لٹن کی اسپیچ کے چند فقرے دیکر فرمایا کہ ذرا ان فقروں کو سُلجھا کر
عام فہم اور چھوٹے چھوٹے فقرے بنا دو یعنی ٹھیٹ اُردو زبان میں
لکھ دو۔ چنانچہ میں نے اپنی زبان کے موافق اُنھیں لکھ دیا۔ چند روز کے
بعد معلوم ہوا کہ آپ نے امتحان لیکر اپنی اسامی پر میرے لئے سفارش کی ہے
رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کیوریٹر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کا
ایکدفعہ ہی محبت آمیز والانامہ آن کودا۔ کہ اب دلّی کی محبت چھوڑیے
اور لاہور کی سیر فرمایئے۔ چُونکہ آپ فیلن ڈکشنری کے کام سے اب فارغ
ہو گئے ہیں۔ ذرا تامّل نہ کیجئے کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر
سررشتہ تعلیم پنجاب نے تمیں تعلیمی کتابوں کے انگریزی ترجمے کی اُردو
عبارت درست کرنے کے واسطے ماسٹر چندو لال صاحب انگریزی
مترجم کا نائب مقرر فرمایا ہے اور یہ قاعدہ جاری کیا ہے کہ جو شخص انگریزی
نہ جانتا ہو وُہی اس ترجمے کو اپنی بول چال کے موافق درست کر دیا کرے۔
یہ ۱۸۷۸ء کے آغاز کا ذکر ہے اور اسوقت میں فیلن صاحب کی ہندُستانی
انگلش ڈکشنری ختم کرکے اُسکا تحریری شکریہ حاصل کر چکا ہوں۔ میں نے
غنیمت سمجھکر جھٹ وہاں کی ملازمت منظور کر لی۔ ہنوز دلی سے روانہ نہیں
ہوا تھا کہ خواجہ حالی کو ریاست الور نے مہاراؤ راجہ منگل سنگھ صاحب کا
سفرنامہ لکھدینے کی غرض سے طلب فرمایا۔ چونکہ حضرت اندنوں میں مسدس
کی تیاری میں مشغول تھے اور اِسی وجہ سے لاہور کی ملازمت سے قطع تعلق
کر کے دلی چلے آئے تھے اپنی مجبوری جتا کر صاف انکار کر دیا۔ اور ساتھ
ہی میرا بھی ذکر چھیڑ دیا۔ اس وقت لالہ سریرام صاحب ایم اے دیوان ریاست

تھے۔ جن کی خدمت میں مجھے بھی نیاز حاصل تھا۔ میں لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دفعتہً دیوان صاحب کا والا نامہ آیا جس میں لکھا تھا کہ آپ مہاراج کا سفرنامہ لکھنے یہاں آجائیں پیش قرار تنخواہ کے علاوہ خاتمہ پر انعام بالفعل رسد۔ سواری۔ مکان۔ خدمتی۔ وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا ہے عجب نہیں جو اختتام کے موقع پر تحصیلداری ملجائے۔ اگرچہ میرے مُنہ میں پانی بھر آیا مگر میں نے سرکاری ملازمت کو ترجیح دی اور اپنے ملازم ہوجانے کا عذر پیش کر دیا۔ اُنھوں نے مہاراج کی طرف سے ڈائرکٹر صاحب بہادر کو لکھکر اوّل دو ماہ پھر چار ماہ کی اجازت دلوادی۔ اس عرصے میں مولوی سیف الحق صاحب ادیب میری جگہ کام کرتے رہے۔ یہ سفرنامہ سنہ ۱۸۸۰ء کے اخبارات مثلاً اخبار انجمن پنجاب۔ کوہ نور لاہور۔ اکمل الاخبار دہلی۔ اودھ پنچ لکھنؤ وغیرہ میں برابر چھپتا رہا۔ ہر موقع کا سماں دیکھکر لوگ راجہ صاحب کی محققانہ وفلسفانہ تحریر کو دیکھکر نظر غائر کی نہایت تعریف کرتے تھے۔ میں سفرنامہ پورا کرکے لاہور چلاگیا اور اپنے کام کا چارج سنہ ۱۸۸۰ء کے اخیر میں لاہور جا رہا۔

ایک میرے ساتھ کیا خواجہ حالی کا ہر ایک ادنےٰ و اعلےٰ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ تھا ظرافت پسند تھے مگر متانت کے ساتھ۔ درد کے پُتلے تھے مگر ذرا ضبط کے ساتھ گو حافظ تھے مگر اب حافظہ کے شاکی بنگئے تھے۔ خدا رہتی دُنیا تک سلامت رکھے **دولت آصفیہ** اور اُس کے فیاض و دریا دل بادشاہ کو۔ خواجہ حالی بھی ہماری طرح اِس ریاست کے وظیفہ خوار تھے۔ دعاگوئی۔ صداقت سے بھری ہوئی تعریف اُنکا وظیفہ تھا جب کبھی اثنائے گفتگو میں ذکر آجاتا۔ ہزاروں دعائیں دیتے۔

مرنے سے کوئی دو یا تین مہینے بیشتر دہلی میں تشریف لائے منشی کرم اللہ خانصاحب کے مکان پر فروکش ہوئے اِس وقت دہلی میں تشریف لانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ منشی **محمد دین** صاحب سرتاج خوشنویسان ہند کے خط اور اُنکی اغلاط سے پاک کتابت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ منشی محمد دین درحقیقت ایک نستعلیق اور زود فہم آدمی ہیں۔ دیوان کا جدید اڈیشن لکھوا چکے تھے مگر سابقہ کلام و دیگر مضامین کا بھی جلد چھپوا دینا منظور خاطر تھا۔ گویا موت کی خبر لگا چکے تھے۔ اِسی وجہ سے اپنے معتقدوں کو اِس نعمت سے محفوظ رکھنا مناسب نہ جانا۔ میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ اپنی ایک عینک جو اُنھیں بہت پسند تھی اُسکی ایک خوشوضع جوڑی ٹوٹ جانے کے باعث مکدر رہتے تھے۔ پانی پت میں کوئی درست نہ کرسکا۔ مجھسے ارشاد ہوا کہ کوئی ایسا شخص ہے جو میل میں میل ملا کر بہت جلد تیار کردے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے واقفکاروں میں ایک ایسا کاریگر ہے جو اِسکا بخوبی تال میل ملا دیگا۔ چنانچہ میں وہ عینک لیگیا اور دو تین گھنٹے کے عرصے میں تیار کرا کر اُنکے پاس بھیج دی اِس سے بہت ہی خوش ہوئے اور اِسقدر احسان مانا کہ جیسے کوئی بہت ہی بڑے کام کا شکرگزار ہوتا ہے۔ اُنکی عادت تھی کہ اوّل تو کسی سے اپنا کام ہی نہیں لیتے تھے بلکہ خود اُسکا کام کردیتے تھے اور اگر کبھی کسی نے ذرا سا کام بھی کردیا تو اُسکا نہایت ہی احسان مانا۔ اور تو اور اگر کوئی بُرائی کرتا تو اُسکا بھی احسان مانتے اور فرماتے ؎

اُتارا تو نے سرِ تن سے اِس ثِقلت کے لانے کا
اسے احسان مانوں سر سے میں منکا اتنے کا

ایک روز میرے مزاج کی کیفیت پوچھی میں نے عرض کیا کہ سر بھاری رہتا

اور چکر آآ کر غشی کی نوبت بہنچ جاتی ہے۔ ایک ہاتھ بھی اچھی طرح کام نہیں دیتا۔ فرمایا کہ اِسی کمبخت مرض نے مجھے بھی ستا رکھا ہے۔ بھائی اِس کے علاج سے غافل نہ رہنا۔ خدا نہ کرے کہ فالج سے پالا پڑ جاسے یہ اُسی کا مقدمہ ہے۔ ابھی تمہیں اور جینا چاہیئے کیونکہ جو کام تم نے اختیار کر رکھے ہیں یہ آج ہی سمٹ جانے والے نہیں ہیں ؎

اے بیخبر در ہر چہ باشی زود باش

مَیں نے کہا دام دمڑے کہاں سے لاؤں اگر کچھ لکھا اور اکی طرح آگ میں وُہ بھی جلگیا یا نا اہلوں کے ہاتھ جا پڑا تو اور بھی اسکی مٹی پلید ہو جائیگی دُعا کیجئے کہ خدا تعالےٰ کوئی ایسا سبب پیدا کر دے کہ میں اپنی نشستگاہ بنوا کر اِسکام کے سر ہو جاؤں۔ جواب دیا ؎

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را۔ ہونے والا ہو کر رہے گا۔

میرے حال پر کچھ ابتدا ہی سے نظرِ عنایت تھی۔ جب میں ۱۸۹۰ء میں اوّل مرتبہ دکن گیا تو آپنے اُسوقت نواب محسن الملک اور نواب انتصار جنگ یعنی نواب وقار الملک بہادر کے نام ایک ایک رقعہ لکھدیا۔ مگر میں مولوی ہدایت اللہ خانصاحب انسپکٹر مدارس کے مکان پر جا اُترا۔ کیونکہ اُنھیں خبر کر دی تھی اور وہ از راہِ مہربانی اسٹیشن پر لینے آگئے تھے۔ جب نواب انتصار جنگ صاحب کو یہ خبر لگی تو آپنے مولوی ہدایت اللہ خانصاحب کو یہ فقرہ لکھا کہ۔ کیوں صاحب آپنے ہمارے مہمان کو رستے ہی سے اُچک لیا یہ بات آپکی شان سے بعید ہے آپ اُنھیں یہاں پہنچا دیجئے۔ دوسرے دن اُونکے ساتھ حاضرِ خدمت ہوا تو نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور مولوی سید عبد المجید صاحب دہلوی کے مکان پر

ٹھیرایا۔ یہ صاحب آجکل مددگار ہوم سکریٹری ہیں۔ آٹھ سو روپیہ
ماہوار تنخواہ پارہے ہیں۔ بڑے لائق۔ عالی دماغ [illegible]
[illegible] آدمی ہیں۔ اُس زمانے میں نواب انتصار جنگ بہادر کے معتمد
اور ایڈی کانگ تھے۔ ایسے رازدار بہی دنیا میں کم ہوتے ہیں۔

جب زمانے میں بمقام الہ آباد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا
تو ہم۔ خواجہ حالی اور مولوی بشیر الدین صاحب مالک البشیر اٹاوہ ایک
خیمے میں قیام پذیر ہوئے۔ مولوی بشیر الدین صاحب [illegible]
تھے۔ ہمنے مذاق سے آپس میں انکا نام بحر العلوم رکھدیا۔ خواجہ صاحب
اِس لقب سے ہنس پڑے اور فرمایا کہ آپنے اِنکی علمیت اور آگندہ گوشتی
کا خوب لحاظ رکھا۔ جس سے از روے تلفظ اپنا دوسرا مطلب بھی نکال
لیا۔ ہماری عادت تھی اور اب بھی ہے کہ ہم بروقت سفر ہر ایک ضروری
چیز اپنے ساتھ رکھا کرتے ہیں یہانتک کہ روشنی کا سامان۔ ادویات کا
مختصر ذخیرہ۔ اور ہر قسم کی خوردنی اشیاء کا توشہ بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے۔
اتفاق سے خواجہ صاحب کو بعض چیزوں کی ضرورت پیش آئی اور وہ
سب ہمارے پاس موجود نکلیں فرمایا کہ ہمیں اس سفر میں آپسے بہت
آرام اور مدد ملی۔ آپ کا بیگ کیا ہے عمر عیار کی زنبیل ہے۔ جو چاہو سو
موجود اور جو کچھ ٹٹولو سو حاضر۔

جب دہلی میں تشریف لاتے تو میر افضل علی صاحب عرف میر نصاحب
سے جنکا ذکر اردوے معلےٰ میں حضرت غالب نے اکثر جگہ کیا ہے [illegible]
ضرور ملتے۔ ایک مرتبہ جب [illegible] سابقہ مکان یعنی [illegible]
زمانہ سے آراستہ اور نہایت دلچسپ دلآویز بنا ہوا تھا۔ آپ [illegible]

تشریف لائے۔ اسوقت دو چار احباب اور بھی موجود تھے۔ دعوت کا سامان ہو رہا تھا اس تصنیف گڈھ کی بیرونی حیثیت معمولی تھی۔ آپ نے فرمایا سید صاحب سعدی نے شاید اسی مکان کی تعریف یہ پیشین گوئی فرمائی ہے ؎

چو بیت المقدس دروں پر زتاب
رہا کردہ دیوار بیروں خراب

سب احباب یہ شعر سنکر ہنس پڑے۔

جب کبھی میرے دل میں زیارت کی اُمنگ اُٹھتی تو میں پانی پت جاکر آپکے دیدار فیض آثار سے مستفیض ہوتا۔ خواجہ صاحب کے عزیزوں میں سے ایک داروغہ صاحب جنکا نام نامی اسوقت ذہن سے اُتر گیا ہے قریب ہی رہتے تھے اُنکے ہاں شب کو اور خاص نشستگاہ میں دن کو رہتا۔ دیکھتا کہ اکثر کاغذ تتر بتر پڑے رہتے گو وہ جواہر کے ٹکڑے اور جگر گوشے ہوتے مگر آپ اسکی پروا نہ کرتے جب لکھنے بیٹھتے از خود سارا سامان موجود ہو جاتا یعنی اِدھر اُدھر سے اُٹھا کر پاس رکھ لیتے۔ شام کے وقت مجھے اپنے ساتھ لیکر کبھی مولانا غوث علی مرحوم کے مزار مقدس پر لے جاتے۔ کبھی شاہ ولایت کے مقبرے پر۔ کبھی حضرت شرف الدین بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی تربت بابرکت پر۔ وہاں جاکر وہ کوٹھڑی دکھاتے جس میں مولانا غوث علی صاحب رہا کرتے اور یارانِ جلسہ کو اپنی ظریفانہ گفتگو سے خوش کیا کرتے تھے۔

جسوقت کتاب سا جن موہنی یعنی تسخیر شوہر آپ کی نظر مبارک سے گزری تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تمنے یہ کتاب لکھکر قوم کے مردوں اور اُن کی عورتوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے اسکی قیمت گھٹا دو تاکہ کوئی گھر

سکے فیض سے خالی نہ رہے چنانچہ میں نے قبل از آتشزدگی ایسا ہی کیا لیکن کتاب نہ بچی تو پھر دی اصلی قیمت کردی۔ اسپر تقریظ بھی بڑے مزہ دار لکھی تھی جو آتشزدگی کی نذر ہوئی۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی اسکی بہت قدر کی سرڈین صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اس کے متعلق دو چٹھیاں بھیجیں ایک میں تو لکھا کہ میں اسے خود پڑھونگا۔ دوسری میں تحریر فرمایا کہ میں نے از اوّل تا آخر نہایت شوق سے پڑھا۔ درحقیقت بڑی مفید کتاب ہے خدا تعالیٰ تمھیں اس ارادے میں کامیاب کرے۔ ساتھ ہی دو سو روپے کا انعام بھی ڈائرکٹر صاحب بہادر سرشتہ تعلیم کی معرفت مرحمت فرمایا غرض ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں

غالبا برس روز سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ خواجہ حالی صاحب اپنے بھتیجے خواجہ تصدق حسین صاحب کے مکان پر دہلی میں درود فرماتھے۔ میں بھی حسب اتفاق جا نکلا۔ دیکھا کہ رسالہ زبان جس کے اڈیٹر مولوی فتح محمد خانصاحب مصنف مصباح القواعد ہیں آپکے دستِ مبارک میں ہے۔ مولوی سید ممتاز علی صاحب مالک تہذیب نسواں نے جو اسپر کچھ اعتراض کیے ہیں اُنکا جواب دیکھ رہے ہیں۔ مجھے وہ تمام جواب مع اعتراض خود پڑھکر سُنایا۔ کہنے لگے کہ بھئی جواب تو دیا ہے مگر اس جواب سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ بہرحال اِنکا دم غنیمت ہے۔ کچھ نہ کچھ زبان کی خدمت کیے جاتے ہیں۔ آگے کو ایسے لوگ بھی نہیں ملینگے۔

دُنیا میں کوئی بشر ایسا نہیں جسے کچھ نہ کچھ اپنی عمر میں رنج یا صدمہ گزرا ہو پس آپ کو بھی اوّل اپنی اہلیہ محترمہ کا پھر برادر معظّم کا صدمہ انتقال

پیش آیا۔ اس کے بعد بینائی نے دغا دینی شروع کر دی۔ پٹیالے گئے آنکھیں بنوائیں کسیقدر افاقہ ہوا مگر وہ کامل بصارت نہ رہی اسکا بھی آپ نے چنداں افسوس نہ کیا لیکن سب سے بڑا افسوس جو مرتے دم تک ساتھ رہا وہ یہ تھا کہ آپکے نوجوان پیارے نواسے کو مرگی کا آزار ہو گیا تھا اسکا علاج کرانے میں کوئی ڈاکٹر کوئی حکیم کوئی دقیقہ نہ چھوڑا آپ کو اس سے اسقدر محبت تھی رہتا تھا دم بھر جدا نہ رکھتے یہاں تک کہ اسی رنج میں مضمحل ہوتے گئے بیماری زور پکڑتی گئی اور آخر خود بھی چل بسے۔

عالی جناب نواب احمد سعید خاں صاحب طالب تلمیذ غالب آپکے شاگردانِ رشید میں سے قابل یادگار شاگرد ہیں منشی بہاری لال صاحب مشتاق جب تک اپنا کلام خواجہ صاحب کو نہ دکھا لیتے دوسرے شخص کو نہیں سناتے۔ مولوی عبدالرحیم خاں صاحب بیدل۔ منشی کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں صاحب شیدا نے بھی آپ ہی کو اپنا مشیر کلام بنا رکھا تھا گو مجھے شاعری سے چنداں مناسبت نہیں مگر میں بھی جب کبھی طبیعت گدگداتی دل میں ابھر اٹھتی اور کچھ کہتا تو دکھا لیتا۔ دقیق اور عمیق نکتوں سے اعتراض کرنے کی ہدایت فرماتے اور کبھی کسی کام سے انکار نکرتے زیر بحث مسائل ان کوئی ہوا سکی فہمائش بھی کیا لیتے۔

اسوقت ہماری قوم کو جگانے والے اسکے مدہوشوں کو ہوش میں لانے والے۔ خواجہ حالی کا ماتم تازہ ہو رہا ہے۔ چونکہ آپ نہایت [illegible] مزاج۔ صوفی مسلک۔ صاف باطن۔ فرشتہ سیرت [illegible] خدا ترس [illegible]
فائق تھے [illegible]

کے ساتھ چرچا ہے اور جا بجا ماتمی جلسے ہو رہے ہیں اگر ہر شخص جس کے ساتھ جیسا معاملہ پڑا ہے ہماری طرح اپنا برتاؤ لکھکر چھپوا دے اور غالب کی اردو سے معلیٰ کی طرز پر آپکے خطوط جمع کرا دے تو اخلاق حسنہ اور راست معاملگی میں بہت بڑی مدد ملے بلکہ ایک عمدہ لائیف تیار ہو جائے ہمیں اُمید ہے کہ مولوی وحید الدین صاحب وحید اس طرف ضرور توجہ فرمائینگے اور انکے خلف الصدق خواجہ سجاد حسین صاحب اس میں وحید صاحب کا ہاتھہ بٹائینگے۔

اگرچہ ابھی تک اس ذکر سے طبیعت نہیں بھری مگر بخوف طوالت ان چند فقروں پر اپنی تحریر کو ختم کیے دیتا ہوں۔

ہائے **حالی**! قوم کا نوحہ کرنے والے حالی! تمنے اپنی جگہ تو خالی کر دی مگر اسکا نعم البدل کچھ نہ چھوڑا۔ اب اس طبیعت کے لوگ کہاں پیدا ہیں جو تعلیم یافتہ سات جنم لیکر بھی اس اخلاق اور ان عادات کو نہیں پہنچ سکتے۔ جسوقت بات کرتے تھے مُنہ سے پھول جھڑتے تھے [illegible] سے دل کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے [illegible] بات میں ایک نہ ایک نکتہ ہوتا اور ہر نکتے میں سیکڑوں راز کی باتیں [illegible] حل ہو جاتے تھے۔ ہائے اب وہ صحبت کہاں وہ طبیعت کہاں۔ آپ گئے مگر کبھی آپکے [illegible] آپ کو تو ایک جہان سے دیا گر ماتم کون [illegible] نظیر [illegible] شعر [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہمیں بڑا رونا اپنے ہونہار بچے کی تعلیم اور اُس کی پرورش کا تھا سو خدا ہمیشہ قائم و برقرار رکھے عالیجناب نواب میر محمد عثمان علی خان بہادر بالقابہ۔ قدر افزائے علم و فن سُلطان دکن خلد اللہ ملکہ کی ذات والا والا صفات کو کہ آپ نے از راہ رحم دلی میرے وظیفہ کو منصب سے تبدیل فرما کر میرے بچے کے واسطے منظور فرمایا۔ تا حیات میرے واسطے پچاس روپیہ ماہوار کا دوسرا وظیفہ جاری کر دیا۔ اور میری زندگی میں میری تمنا کو پُورا کر دکھایا اب میری کوئی آرزو باقی نہ رہی چین سے قبر میں پاؤں پھیلا کر سوؤنگا۔ میری روح درگاہ رب العزت میں ہمیشہ آپکی سلامتی و ترقی کے واسطے دُعا خیر کرتی رہیگی۔

رہا فرہنگ آصفیہ کا دوبارہ چھپنا اور ارزاں نرخ پر شائقین کے ہاتھ آنا۔ شیدایانِ اُردو کو فیض پہنچنا سو اسکی بھی کوئی نہ کوئی صُورت نکل آئے گی۔ فقط

خواجہ عالی کا ماتم نگار، بندۂ دلفگار، سید احمد دہلوی،
مؤلف فرہنگ آصفیہ

دروز

خلفاء فاطمیہ کا چھٹا خلیفہ حاکم بامر اللہ جو ۹۹۶ء میں مصر میں خلیفہ تھا اس فرقہ کا بانی ہے۔ اسکو یہہ یقین تھا کہ "میں خدا سے باتیں کرتا ہوں اور نیز یہ کہ خدا کا اوتار ہوں۔ یہہ خیال اس کے دماغ میں عرصہ تک پکتا رہا اور آخر ۱۰۱۶ء میں جامع قاہرہ میں اسنے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور اسماعیل دارازی نے اسکو سب سے پہلے مانا مگر لوگوں نے سخت مخالفت کی چونکہ اسمٰعیل کوئی بڑا آدمی نہ تھا اس وجہ سے اسکو بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑی اور وہ لنبان کے پہاڑی علاقوں میں چلا گیا جو شہر بیروت اور دمشق کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں اَن پڑھ جاہل لوگ بکثرت تھے جنھوں نے اسمٰعیل کا خیر مقدم کیا اور ڈھائی تین برس کی کوشش میں یعنی ۱۰۱۹ء میں ایک بڑی تعداد اسکے شایع کردہ مذہب قبول کیا اور اسی کے نام سے دروز کہلانے لگے۔

ادھر حاکم بھی غافل نہ تھا اور نئے مذہب کی اشاعت کی کوشش کر رہا تھا ۱۰۱۷ء میں اسکو ایک حواری حمزہ ابن علی ابن احمد مل گیا۔ یہہ شخص ایک معمولی ایرانی تھا اور کمبل بیچا کرتا تھا۔ حاکم نے اسکو اپنا وزیر بنالیا۔ حمزہ نے اپنی لیاقت سے لوگوں کو ایسا رنگا کہ تھوڑے عرصہ میں بہت سے لوگ اس مذہب کے پیرو ہو گئے۔ مگر خدا کو منظور نہ تھا کہ یہہ مذہب زیادہ ترقی کرے۔ ۱۰۲۰ء میں حاکم کی بہن ست الملک نے حاکم کو مار ڈالا۔ مگر حمزہ کو اس واقعہ کا حال فوراً معلوم ہو گیا اور اسنے خفیہ طور

پر تجہیز وغیرہ کر کے لوگوں میں مشہور کیا کہ حاکم کچھ عرصہ کے واسطے لوگوں سے غائب ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس فرقے کے پیرو اب تک اس کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں [illegible] سمجھتے ہیں کہ یہہ قدرت صرف عالم [illegible] جب وہ واپس آئیگا تو کل دنیا دروزی ہو جائیگی۔

ادھر تو حمزہ نے یہہ کارروائی کی ادھر دارازی نے اسمٰعیل سے بھی لوگوں کو برگشتہ کیا [illegible] الزام لگا کر اسکو مروا ڈالا اور اس طرح اسکا زور بالکل توڑ دیا۔ گو تمام لوگ آجتک اسمٰعیل سے بدظن ہیں مگر فرقہ اصلی کے نام سے موسوم ہے اسکی وجہ تسمیہ کی بابت بعضوں کا یہ خیال ہے کہ لفظ دروز کا ماخذ دارس ہے جو لفظ عربی ہے اور جس کے معنی ہیں پڑھنے والے۔ یا درس ہے جسکے معنی صادق کے ہیں یا دری سے ہے یعنی ہوشیار یا ذہین۔ مگر زیادہ تر اسی پر متفق ہیں کہ یہہ فرقہ اسمٰعیل دارازی ہی کے نام سے موسوم ہے۔

یہہ لوگ سب سے زیادہ سلطنت ترکی میں آباد ہیں اور وہاں انکے مقامات حسب ذیل ہیں:- مگر اصل میں یہہ لوگ وسط سوریا کے باشندے ہیں۔

(۱) جبل حوران میں سب سے زیادہ آباد ہیں (۲) لبنان میں حوران سے کسیقدر کم ہیں۔ زیادہ تر آبادی یکجائی انکی انہی کے مقامات پر ہے اور انٹی لبنان، ہرمان، وادی العجم، حمص، حمیدیہ، سلیمیہ وغیرہ میں قریب پینتالیس ہزار کے آباد ہیں۔

نہایت سرکش ہیں ایک عرصہ تک عثمانی سلطنت ترکی سے برسرجنگ رہے اور اپنے ایک شخص کو جسکو قائد کہتے تھے ماتحتی میں علیحدہ سلطنت قائم

کر رکھی تھی گو ہر مرتبہ انکو شکست ہوتی تھی مگر تھوڑی دنوں کے بعد پھر سرکشی پر آمادہ ہوجاتے تھے آخرش سنہ ۱۸۵۹ء میں حکومت نے ایک لشکر بسرکردگی طاہر پاشا انکی سرکوبی کو روانہ کیا جب جاکر یہہ لوگ قابو میں آسکے اور ٹیکس کی ادائیگی اور سرحد کی حفاظت منظور کی۔ اسوقت سے اپنے اقرار پر قائم ہیں۔

سنہ ۱۸۶۱ء میں انھی لوگوں نے زنمارسلے کا کشت وخون کیا تھا جسکی وجہ سے اکثر دول کی فوجیں بیروت پر خشکی پر اتر پڑی تھیں اور جب لبنان میں عاملی ایک عیسائی گورنر کے ماتحت گورنمنٹ ہوگئی جب واپس ہوئیں۔

یہہ لوگ علی العموم میانہ قد اور گٹھیلے بدن کے ہوتے ہیں جیسا کہ ایک پہاڑی قوم کو ہونا چاہیے۔

اب ہم انکے عقائد جو ہمکو کتابوں سے اور اکثر بزمانہ قیام بیروت دریافت سے معلوم ہوئے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں امید ہے خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔

انکا عقیدہ ہے کہ خدا نے وقتاً فوقتاً اوتاروں کی شکل اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کیا اور آخری اوتار حاکم بامر اللہ ہے۔ حاکم کے وزیر حمزہ کو عقل کل مانتے ہیں اور اسکے بعد چار فرشتے روح جسکا اوتار اسمٰعیل دارازی۔ حکمۃ جسکا اوتار محمد ابن وہاب۔ دائیں جسکا اوتار سلامہ ابن الوحل اور بائیں جسکا اوتار بہاء الدین مانتے ہیں۔

آواگون پر اعتقاد ہے۔ انجیل اور قرآن کو کتب وحی تسلیم کرتے ہیں مگر قابل عمل نہیں سمجھتے۔ صحایف دروزیہ پر عمل کرتے ہیں۔

انکے عقیدہ میں بزمانہ حاکم ۲۶ سال تک دروازہ رحمت کھلا رہا اب کوئی شخص تاوقتیکہ حاکم کا ظہور نہ ہو اس فرقہ میں داخل نہیں ہوسکتا

بعد از ظہور کل دنیا میں مذہب اختیار کریگی۔ حاکم اسکے مکہ مکرمہ معظمہ وغیرہ کو فتح کریگا۔

تقیہ بھی جائز اور ہمنے انکو اکثر مسلمانوں کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

حمزہ یعنی عقل کل کے سات احکام کی تعمیل لازمی اور فرض ہے احکام یہ ہیں۔

(۱) دروز کو دروز سے سچ بولنا چاہیئے۔ (۲) برادری کی اعانت اور ہمدردی ہمیشہ کرنی چاہیئے۔ (۳) تمام مذہبوں سے قطعی علیحدگی رکھنی چاہیئے (۴) جو غلطی پر ہوں اُنسے احتراز کرنا چاہیئے (۵) ہر زمانہ میں توحید خدا پر ایمان رکھنا چاہیئے (۶) ارادہ الٰہی پر تسلیم کلی۔ (۷) احکام الٰہی کی پوری اطاعت۔

یہہ لوگ نماز کو خدا کی جناب میں بے ادبی گستاخی اور دخل در معقولات سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خدا کو ان باتوں سے تکلیف ہوتی ہے اور غصہ آتا ہے۔

عملی ایمان دروزیہ کا علم ایک خاص فریق تک محدود رہتا ہے جسکو عاقل کہتے ہیں اور باقی کل دروز جاہل کہلاتے ہیں خواہ امیر ہوں یا غریب ہوں عاقل کی شناخت یہہ ہے کہ وہ ٹوپی کے گرد ایک سفید یا ریشمی کام کا عمامہ سا باندھتا ہے جسکو سوائے گروہ عقلا کے اور کوئی نہیں باندہ سکتا یہہ لوگ پندرہ فیصدی کی نسبت رکھتے ہیں۔ ہر جمعرات کی شام کو انکا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں صحائف پڑھے جاتے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی امور پر بحث اور مشورہ ہوتے ہیں جن مکانوں میں یہہ جلسہ ہوتے ہیں ان کو

خلواص کہتے ہیں جو نہایت سیدھے سادھے طریق پر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ انکے متعلق جائداد بھی ہوتی ہے جس سے غربا و مساکین کی مدد کی جاتی ہے اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں خرچ کی جاتی ہے۔

عاقل اور جاہل میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ جاہل صحیفے نہیں دیکھ سکتا نہ اسکو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان میں کیا ہے اور نہ مذہبی جلسوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ باقی اور تمام امور میں سب برابر ہیں بلکہ جو لائق اور خوش اخلاق ہیں وہی بہتر سمجھے جاتے ہیں اور جو لوگ تجرد کی زندگی [illegible] وہ قابل عزت شمار کیے جاتے ہیں حالانکہ ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔

تمباکو اور شراب نوشی ممنوع ہے مگر اب کچھ کچھ تمباکو یعنی سگرٹ کا رواج ہوتا چلا ہے۔ عورتوں کے واسطے بھی سونا ریشم چاندی اطلس اور اسی قسم کی دیگر قیمتی اور فوق البھڑک چیزیں ممنوع ہیں مگر اب ان باتوں پر لحاظ کم ہوتا ہے گو سادگی کا لحاظ اب بھی کیا جاتا ہے۔

صحیفوں کا حال تو سوائے عقلا کے نہ جہلا کو معلوم ہے اور نہ کسی اور کو۔ نہایت احتیاط سے سربستہ رکھا جاتا ہے گویا وہ صحیفے صرف معدودے چند لوگوں کے واسطے ہیں جنکو انکے اصطلاح میں عاقل کہتے ہیں اور کسی کو نہ [illegible] واسطہ نہ انکو کسی سے تعلق۔

سمجھ میں نہیں آتا آجکل کے زمانہ میں ایسا مذہب کس طرح چل رہا ہے کہ جسکی حالت اسکے پیروں کو بھی معلوم نہیں [illegible] عاقل یا جاہل [illegible] کوئی [illegible] ہر چیز [illegible] جاتا ہے ✤

[illegible]

صمد آلہ آبادی

ہم نہایت شکرگزاری کے ساتھ اس مضمون کو درج کرتے ہیں اور تمدن کے صفحات مرحوم صمد کے کلام و حالات کے لئے ہر وقت حاضر ہیں (اڈیٹر)

یورپ کی ترقی کے جہاں اور بہت سے راز ہیں منجملہ انکے کمال و اہل کمال کے قدر اور مشاہیر پرستی بھی ایک بڑا سبب ہے انکے یہاں کوئی ایسا شخص جو کسی فن میں کامل ہو ممکن ہی نہیں کہ وہ گمنامی کے عالم میں پڑا رہے اول تو خود اسکی زندگی میں اسکی قدر افزائی کی جاتی ہے جس سے اسکا دل بڑھتا ہے اور تکمیل کمال میں وہ بدل و جان کی کرتا ہے اور بعد مرنے کے تو اسقدر اسکی عزت افزائی ہوتی ہے کہ پرستش تک نوبت پہونچ جاتی ہے شیکسپیر وغیرہ کی زندہ مثالیں موجود ہیں ایک ہماری حالت ہے کہ زندگی کا کیا ذکر ہے اس عالم میں تو کوئی اسکا پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا مرنے کے بعد بھی وہ غریب اور اس کے کمالات ہمیشہ کے لئے مغز گمنامی میں دفن کر دئے جاتے ہیں اسکی نہ اسکے کمالات کی کوئی قدر ہوتی ہے نہ قیمت پھر آیندہ نسلوں کو کیا خاک اُمنگ ہوگی کہ وہ کسی فن میں کمال حاصل کریں جبکہ کمالات کی یہ کساد بازاری ہے قاعدہ ہے کہ ہمیشہ اُمنگیں اسباب ترغیب و تشویق کے ماتحت پیدا ہوتی ہیں جب اس قسم کے اسباب ہی پیدا نہونگے تو اُمنگیں بھی پیدا نہونگی تو صاحبانِ کمال کا پیدا ہونا بھی موقوف غرضکہ ترقی کا ایک راز مشاہیر و کمال پرستی ہے اور افسوس کہ ہم اس سے قطعاً غافل ہیں

صمد الہ آبادی جن کے چند اشعار آج ناظرین تمدن کے لیے پیش کرتے ہیں انھیں باکمال شعرا میں سے ہیں جنکے کمالات پر ملک نے بالکل توجہ نہ کی اور وہ ہمیشہ کے لئے گمنامی کے عالم میں چلے گئے حکیم عبد الصمد خان نام صمد تخلص الہ آباد وطن ذوق کے شاگرد رشید اور داغ کے معاصر و ہم پایہ حضرت صمد گو ذوق کے شاگرد تھے مگر ذوق کی طرح بد مذاق نہ تھے نہایت پاکیزہ مذاق تھا اور بہت صاف سلجھے ہوئے شعر کہتے تھے انکے کلام میں سوقیت و سخافت داغ کی طرح زیادہ نہیں پائی جاتی اعلے مضامین پاکیزہ جذبات صاف و سلیس اردو میں ادا کرتے تھے آنکی طبیعت میں فطرت نے سوز و گداز بہت زیادہ ودیعت کیا تھا اسپر خارجی اسباب نے اور بھی بلا کر دی اور قلب کو آتشکدہ بنا دیا یہی وجہ ہے کہ انکے اکثر اشعار حسن اثر کی دولت سے مالامال ہیں اور نشتر کی طرح دل و جگر میں اتر جاتے ہیں انکو شعر کے پڑھنے میں خاص ملکہ تھا ایک ایک شعر کو کئی کئی طرح ادا کرتے تھے اور محض لب و لہجہ اور انداز بیان سے مختلف معانی شعر میں پیدا کر دیتے تھے جس سے شعر میں جان پڑ جاتی اور اسکا حسن دوبالا ہو جاتا جب کوئی پُر درد شعر پڑھتے تو سامعین کی عجیب کیفیت ہو جاتی تھی ساری مجلس سوز و گداز درد و اضطراب کا مرقع بنجاتی تھی کچھ تو طبیعت کا فطری سوز و گداز کچھ خارجی اسباب و علایق کے تاثیرات درد آگین اور کچھ پڑھنے کا مؤثر انداز بیان سب مل ملا کر شعر کو سحر بنا دیا کرتے تھے اور سننے والے پر بجلی کا سا اثر کرتے تھے۔ آخر عمر میں بھی مہندو گیہ الہ دلیل راہ بنگیا اور تصوف کی طرف طبیعت مائل ہوگئی چنانچہ مولانا محمد حسین صاحب قدس سرہ سے بیعت

کرلی اور صرف نعت کہنے پر اکتفا کرلی آخر انکی شیفتگی حضور نبوی میں عشق کے درجہ پر پہونچ گئی تھی جب کبھی کوئی شعر نعت میں فرماتے اور لوگوں کو سناتے تو خود انکی جو حالت ہوتی تھی وہ حیز تحریر سے باہر ہے۔ چنانچہ ایک شعر نعت کا مجھکو یاد ہے۔

او، مدینے میں خدائی کے بلانیوالے
منتظر اور بھی دو چار ہیں آنے والے

جسوقت اِس شعر کو مخصوص انداز سے پُرنم آنکھوں کو مترحم بنا کے انھوں نے پڑھا باور کیجئے کہ سامعین کے قلوب قابو میں نہ تھے بہت سی سنگین آنکھیں پُرنم ہوگئیں ہر شخص پر ایک کیف طاری ہوگیا تا جدار مدینہ کی آرزوئے زیارت سے دل بیتاب ہوگئے اور کیا عجب ہے کہ یہ آرزو سے آنکھوں میں نمی اختیار کرلی ہو ہمیں چند غزلوں کے چار چار تین تین شعر ملگئے ہیں انکو پیش کرتے ہیں۔

ہمیں تو گھر میں نہ چین آیا کہ آہ کرتے اِدھر سے نکلے
تمہارا آرام کس نے کھویا کہ ہوکے بیتاب گھر سے نکلے

کھڑے ستے تم آپ عاشقوں میں یہ چال تھی جو ہمیں سنائی
کہ لوگ روکے کھڑے ہیں رستہ بتاؤ کوئی کدھر سے نکلے

ہمیں تو اس بات کا ہے رونا، عدو کے مرنے پہ رو رہے ہیں
اور اُسپہ تاکید ہو رہی ہے جنازہ اسکا اِدھر سے نکلے

نہ زر دیا اور نہ کی خوشامد نہ سحر و جادو کے ہم ہیں قائل
صمد ہمارے تو کام اکثر ہمارے دل کے اثر سے نکلے

مقطع کی تعریف محتاج بیان نہیں [illegible]

شعر کے ٹھاٹھ دیکھئے پھر اثر آہ ملاحظہ کیجئے کہ کسی کو بیتابانہ گھر سے باہر لاکر کھڑا کر دیا شاعر نے اپنی کوچہ گردی کی تاویل تو اپنی بےچینی سے کر دی کہ میں تو مجبور تھا اور اس طرح بیان کیا گویا اسکو کوئی اہمیت نہیں لیکن تمھیں کیا ہوگیا تمہارے آرام میں کس نے خلل ڈالدیا کہ یوں بیتاب ہو کر گھر سے نکل پڑے غریب کو تعجب ہے گویا اسکو یہ نہیں معلوم کہ میری ہی آہ کا اثر ہے باوجود اس کے کہ اپنے کو لاعلم ظاہر کرتا ہے اور دریافت کر رہا ہے کہ بیتابانہ گھر سے نکل آنے کا کیا سبب ہے لیکن اس لاعلمی ہی میں خدا معلوم کتنی واقفیتیں پنہاں ہیں اور اس لاعلمی ہی میں محبوب کو یقین دلا رہا ہے کہ صرف مری آہ کا اثر ہے کہ آپ یوں بیتاب ہو کر نکل آئے انداز بیان کسقدر پاکیزہ اور دل میں گھر کر لینے والا ہے مطلع کے علاوہ اور اشعار بھی اپنے اپنے رنگ میں اچھے ہیں۔

صمد کے کلام میں یہ خاص خصوصیت ہے کہ وہ اس انداز سے شعر کہتے تھے کہ پڑھنے سے اس میں اور زیادہ حسن پیدا ہو جائے چنانچہ اس غزل کو اس طرح سے پڑھتے تھے کہ تصویر سامنے آجاتی تھی۔

مجھکو دیکھا تو کہا آئے ستانے والے
حال دل کہہ کے مرے دل کے دکھانیوالے

بظاہر تو صرف گلہ مند شعر ہے کہ صورت دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میرے ستانے اور دل کے دکھانے والے آگئے مگر خالی شکایت ہی نہیں ہے بلکہ اسی شکایت میں اعتراف محبت بھی پنہاں ہے اور نہ صرف اسکی محبت کا اعتراف بلکہ اپنی محبت کا بھی اقرار ہے ورنہ کسیکا حال دل سنکر متاثر کیوں ہوئے اور کسی کے خستہ حالی سے

بچائیں اور انکو ادبی رسائل کے ذریعہ سے پبلک میں پیش کردیں مرحوم کو دُنیا سے گئے ہوئے بہت دن نہیں گذرے اسلئے ارباب وطن کو انکا مفصل حال اور انکا کلام دستیاب ہوسکتا ہے کیا مرنے والے کا اتنا بھی حق نہیں کہ یاران وطن اسکے اولاد معنوی کو فنا ہونے سے بچالے۔ مجھکو معلوم ہے کہ الہ آباد کے اکثر حضرات اسکے حالات سے واقف اور اسکے کلام کے حافظ ہیں مگر افسوس چند دن بعد یہ لوگ بھی نہونگے اور پھر صمد ہمیشہ کے لئے مرجائیگا حالانکہ اسکو نہ مرنا چاہئے۔

ایک کافر پر طبیعت آگئی　　پارسائی پر قیامت آگئی

یاد کرکے تمکو یاں رو دئے　　سامنے جب اچھی صورت آگئی

چُپکے چُپکے رو رہے ہو کیوں صمد　　سچ کہو کس پر طبیعت آگئی

گو سب شعر اچھے اور حسن و عشق کے جذبات عالی سے لبریز ہیں مگر دوسرا شعر (یاد کرکے الخ) تو قیامت کا ہے خدا معلوم ان سادے الفاظ میں کونسی چیز پوشیدہ ہے کہ قلب و روح میں ایک تلاطم بپا ہوجاتا ہے سہل ممتنع کی اگر کوئی سچی مثال مل سکتی ہے تو شاید اس سے بڑھکر نہ مل سکے۔ اگر صمد اپنی تمام عمر میں صرف یہی ایک شعر کہتے تو وہ اسکے کافی تھا اور یقیناً وہ زبردست شاعر کہلانے کے مستحق تھے کیا یورپ میں صرف ایک مُسافر کی نظم پر ایک شخص ہمیشہ کے لئے مشہور نہیں ہوگیا۔

میرے ایک محبوب اور سلیم المذاق دوست مسٹر عبد الرؤف جب اس شعر کو مجھسے سنتے اور وہ اکثر سنتے تھے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص کی کیا حالت ہوجاتی ہے اس سے یہہ غرض ہے کہ اس شعر کی خوبی صرف ذوق صحیح پر منحصر ہے اس لطافت کا کچھہ وہی حضرات

اچھی طرح سے اندازہ کر سکتے ہیں جو قدرت کی طرف سے مذاق سلیم لیکر پیدا ہوئے ہیں۔

ہم پھر وہ ان حضرات کو توجہ دلاتے ہیں جو صمد کے حالات و کلام سے واقفیت رکھتے ہیں خدارا اب زیادہ استغنا نہ برتیں وہ ملک پر احسان کرینگے اگر صمد کا کلام قوم و ملک کے سامنے پیش کر دیں گے ؁

عارف ہسوی فتحپوری
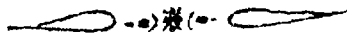
خدا آباد رکھے ہمصفیرانِ گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

عدو صیاد و گلچیں کیوں ہوں میرے نشیمن کے
یہ تنکے بھی تو اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں

خود انکا حسن میری داد خواہی لُٹنے کرتا ہے
وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں
اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر

میری طرح ہے حال مرا انکا خیر خواہ
عاشق ہے انکی نیند مری داستان پر

آزار عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل
آنے لگیں ہیں یاس کی باتیں زبان پر

قابو میں دل نہو تو غزل کیا کہے کوئی
فرمائشیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

صدائیں دیکے ہم نے ایک دنیا آزما دیکھی
یہی سنتے چلے آئے بڑھو آگے یہاں کیا ہے

قفس مجھکو نشیمن ہو گیا خوف اسیری سے
کوئی پتا کھڑکتا ہے تو پھیروں دل دھڑکتا ہے

مرزا ثاقب لکھنوی

درسِ وفا

(۱)

غافل مرو، کہ تا درِ بیت الحرامِ عشق صد منزل است و منزلِ اول قیامت است

معصوم اور پڑھی لکھی تسنیم کا وہ سترھواں سال تھا۔ جو حسن و عشق کی فرسودہ کہانیوں کو محض اوقات گذاریوں کا ایک دل خوش کن مشغلہ، اور دل کے لگاؤ، خلش عشق، زخم محبت، کی داستانوں کو دور از واقعہ افسانہ ہی سمجھتے سمجھتے ختم ہوا تھا، اگرچہ حیاتِ شباب نے مجھے اضطراب مجسم بنا دیا تھا مگر عشق کو تو میں شعبدہ خیال کرتی تھی۔

آپ یقین کیجئے آغازِ سن شعور میں جب میں نے ناول پڑھے اور بالخصوص اُن کے وہ مخصوص پلوٹ جن میں ہیرو ہیروئن جدا جدا محبت کی تلخیوں اور مہمل بیتابیوں کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اشتیاقِ وصل و قرب کے لیے ناموس و حیا چھوڑ بیٹھتے ہیں تو میں ان عبارتوں اور ایسے تخیلات پر تنقید ہی کیا کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی بارہا سوچا کرتی کہ ان قصوں کی غرض کیا ہے؟ ———

مجھے کوئی شک نہیں ناولوں کو مخرب الاخلاق جاننا، اور ہمیشہ بزرگوں کی نصیحتوں کو نبھایا کیا اور ناول خوانی شغل مذموم سمجھی، اب چاہئے مسلسل مطالعہ کی چاٹ کہیے اور چاہے کچھ اور ——— لیکن اس حقیقت کے اظہار سے انکار نہیں ہو سکتا کہ چودہ برس کے بعد کی عمر سے مجھے ناولوں سے اک گونہ اُنس ہو گیا، و مجھے بارہا محسوس ہوتا

تھا کہ جذبات نگاری کی جا رہی ہے، اور یہی خیال رفتہ رفتہ بڑھا اور تدریجاً اس نے میرے تخیلات میں مختلف الوان رنگینیاں پیدا کر دیں، اور مجھے اپنی سادی و صاف زندگی اک خلش مبہم، اور اک خراش نامعلوم سے معمور نظر آنے لگی، مجھے تلاش ہوئی کہ حقیقت میں محبت کیا چیز ہے؟ مجھے فکر سی رہی کہ لگاؤ خاطر کس شے کا نام ہے، اور اسمیں کچھ نہ معلوم ہو کر اکثر اداس اور غمگین ہو جاتی تھی!۔

بہر حال خیالات نے ترقی کی اور میں کچھ سمجھنے لگی، حسن، جسکو صحیفۂ حیات محبت کا درس اولین کہتے ہیں میرے پاس ہے، اور میرے پاس تھا، لیکن میں کن لفظوں میں ظاہر کروں کہ مجھے اور کیا وہ آرزو و خاموش و متفکر، اور مدعا نا آشنا خلش، تھی جس کے لئے میں نہیں میری روح بیتاب تھی۔

میں چاہتی تھی کوئی میرا ندیم صحبت ہو جو میرے داعیات روحی گوش گذار فرمائے، میرا آہ کوئی ہمراز ہو جو میرے محسوسات دلی کو سمجھے، مجھے میری شعلہ آرائیوں، اور آتش طرازیوں نے پھونک رکھا تھا اور آہستہ آہستہ بھڑک زیادہ ہو رہی تھی!۔

لیکن اسکے ساتھ ہی سترھویں برس تک پہنچتے اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھا اور میرے خیالات کا زیادہ حصہ صاف اور غیر مشتبہ [illegible] اور محبت سے ناآشنا رہا محض۔ بارہا تخلیہ میں بیٹھ کر سوچا کرتا تھا اور [illegible] سے زیادہ کچھ نہ سمجھی تھی کہ وفور شوق، اور فروغ انس، اضطراب فکر، اور رنگینیٔ تخیل ہی عشق کا عرفی نام ہے! اور جب اس سے بھی تشفی نہ ہوتی تو زندگی کے آنے والے مرحلوں پر اسکی تفہیم چھوڑ کر چپ ہو رہتی۔ اور

فکر و کاوش میرے دلکو یہہ کہہ کر منا لیتی کہ وہ ذمہ دار زندگی جو کل نصیب ہونے والی ہے، اوسمیں بھی شوق و اُنس بڑھا کر دیکھوں گی ——

اوسمیں میں بھی اضطراب و بے چینی پیدا کرونگی —— میں ابھی اِک حیات آرزو ہوں کل کچھ پاؤں گی تو سمجھونگی —— !!

بہر حال مخمور دنیم خبری کے اٹھارہویں سال کے شروع میں حسن کا پیوند عشق سے ہوگیا کیسے مزے کی بات ہے ہم جولیوں سے رخصت ہوتے وقت پہلا جو خیال میرے دل نشین تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کرے ،، میری زندگی شوق بھی ناوکوں کی حیاتِ محبت ، بن جائے ،، اور نیاز اصغر مجسمۂ عشق اور تسنیم پیکرِ حسن ثابت ہو ؛

یہہ اِک جذبہ تھا جس نے مجھے حد سے زیادہ خوش وشادماں بنا رکھا تھا اور دوسری طرف اِک کاوش بھی تھی کہ دیکھئے کیا ہو ؛

فکر تھی کہ دستور انتخاب کو دربارِ حسن وعشق میں بڑا رسوخ ہے مگر میرے غرورِ شباب نے اوسکو ذرا وزن نہ دیا اور مقابلہ تمکنت کے لئے آمادہ کر دیا تھا ! -

آہ ہزاروں ولولوں اور ارمانوں اور لاکھوں اُمیدوں و خوش خیالیوں کے ساتھ وہ زندگی جو ابتک نہایت اطمینان و بے فکری اور غایت آرام و آسائش سے بسر ہوئی تھی اس آنے والی زندگی پر قربان کر ڈالی —— !

(۲)

پہلے ہی اپنی کونسی تھی قدر و منزلت

پر دل کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی !

حُسن وعشق سے معمور زندگی ، زندگی کیا ہے اِک جبلتہ جو رہ ہے کہ

پڑی تڑپتی ہے اور کوئی پُرسانِ حال نہیں ۔ بسا اوقات یہی ہوتا ہے کہ محبت اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر آئی ہے، اور شوق و تجسس آمیز نگاہوں میں دلفریب سمجھی گئی، مگر ہائے اُس تلخیٔ ندامت و مجبوری، اوس لذتِ الم و مایوسی کو نہ پوچھیے جبکہ نقاب کی دلفریبی پر محمول کرکے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو ۔

محبت کی پہلی غلطی ہی ایسی غلطی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناسور بن کر دردناک ثابت ہوتی ہے آہ نیاز اصغر کے اوس پیغامِ محبت کو جو حیاتِ عشق کے عہدِ اول میں پیش کیا گیا تھا بھولی و ناسمجھ تسنیم اپنی پہلی غلطی سے قبول کر بیٹھی ! ۔ ۔

اوس عہدِ وفا کو جو حضورِ حسن میں با عظمت طریق سے درحلفِ عشق کے ساتھ بیان کیا تھا تسنیم یقین کر بیٹھی :

دیوتائے عشق و محبت کی دِل سے سوگند کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ یہ تو کبھی ممکن نہیں جو محبت میں ارزانی جائز ہو ۔ انتخاب اول ۔ عہد ایمانی ہے جو جان کے ساتھ رہنے کے لئے ہے ۔ مجھے محبت کا ہاتھ دیکر ۔ مجھے عشق کا پیام دیکر دوسرے سے محبت کیونکر جائز ہوئی ، اور کیونکر جائز ہو سکتی ہے ! ،

آہ محبت تو فقط ایک سے اور صرف ایک سے ہو سکتی ہے ! جذبات زخمی ہو جاتے ہیں جب محبت اور رنگِ ہرجائی یک ساں نظر آئے ۔ نیاز اصغر تم تو میرے تھے ۔ اور میرے لئے تھے ! وہ عہدِ محبت یاد کرو جو میری زلفوں کے اک بوسہ صداقت سے مضبوط کیا گیا تھا ! وہ وعدہ جو ہمارے درمیان [illegible] عمر کی درازیوں کی دعا سے ختم کیا تھا ، آہ میں

مہجور ہوں مگر اب بھی شیدائی! آہ میں دُور ہوں مگر اب بھی فدائی تم نہ بولو۔ تم نہ ہنسو۔ تم مجھے نہ چھیڑو۔ سب منظور لیکن خدارا "قطع" کے دل دہلانے اور روح زخمی کر دینے والے صدمہ سے بچالو۔

ضرورت سے زیادہ مجھ سے دور اور گھر سے باہر رہنا ——— تمہاری مصروفیت سمجھی۔ اور دلِ اضطراب پسند کو اب آئے۔ اب آئے کے راگ سُنا سُنا کر بہلایا، مگر آہ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ نا خداترس ابھی فائق آ ہستی "مس شمشاد" میرے متاعِ روح کی مالک ہے۔ میرے اضطرابِ بیہم کا باعث ہے۔ ہمیشہ کی دُوریاں اور وہ سمجھ میں نہ آنے والے اجتنابِ مبہم جایزہ خواہی کے لئے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے!۔

آہ عہدِ عروسی، اور موسمِ برشگال، اُف اندھیری و تاریک رات کا وہ اشتیاق آمیز اضطراب کھیں یاد ہے؟ وہ اُس دن جبکہ شام کی دھواں دھار بارش نے، بجلی کی چمک اور کڑک نے تیچھلے پہر تک دم نہ توڑا تھا میں ۳ بجے شب تک۔ ایک معمولی کمبل میں ملفوف کمرہ کے برانڈے میں تمہارے انتظار میں کھڑی تھی! آہ تم آئے! اور میری معصومیت سے متاثر ہوئے ہوگے مگر اپنے گناہ روح کا خیال نہ کر کے مجھے لپٹ پڑے اور دوستوں کی دعوت و بزم سرود کا بہانہ کر دیا۔ میں نے یقین کر لیا نیاز اصغر وہ سب کچھ اب سامنے ہے اور میں شرمندہ ہوں اور غصہ میں۔ آہ میں مجسم اظہارِ محبت تھی اور تم سراپا ردِ عمل؟ آہ وہ ولولہ ہائے شوق اور ادعائے محبت۔ جنکو میں اپنے لئے سمجھا کی غلط ثابت ہوئے!

ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

بزم اشتیاق کی اک وہ صحبت جبکہ یہہ شعر تمنے پڑھکر مجھسے داد و تشریح چاہی تو میں اپنی تعریف سمجھکر " وہ سب جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں،، کے جذبۂ غیر شریف سے متاثر ہوئی اور للچا کر خموش ہوگئی آہ کوئی جواب نہ تھا، اِس شعر کے ا دا شناس مصنّف سے کوئی اعتراض نہ تھا لیکن آج جبکہ مس شمشاد سے تمہاری موانست کی خبر ہے۔ اِس شعر کی شرح ذہن میں آگئی! سارا شعر میری نظر میں توسوقیت و عمومیت کا ڈھیر بنگیا، آہ او ا دا نہ شناس شاعری سادگی و بے باکی پر جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ او فطرت لطیف سے بے خبر شاعورت، اسکے جذبات کا مطالعہ کرنا پھر اوس عورت کا جو مس شمشاد کی طرح رقاصہ و مغنیہ تو نہ ہو!

جنس لطیف کا ہر فرد کانوں پر ہاتھ دھرے گا اس حیا سوز آئین سے بیزار ہوگا۔ اور کبھی صاد نہ کرے گا کہ " وہ سب جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں،، حسن جو تصنع و تزئین سے پاک ہے خود اک ناز مجسم ہے عشوہ و غمزہ۔ خدا کی قسم حیا کو تو گردش نگاہ بھی بار ہے چہ جائیکہ حسن نظارگی کے لئے کوئی اہتمام دار و گیر اس طبقہ کے لئے مرزا غالب خوب کہہ گئے ہیں

مت پوچھ رسوائے، انداز ہ استغنائے حسن

دست مرہونِ حنا رخسارہ رہنِ غازہ تھا

کیا پیارے نیاز اصغر یہہ حسن ہرجائی قابل پرستش ہے اکیا مس شمشاد ارزان فروش حسن میرے مقابلہ میں گرانمایہ ہے! آہ وہ زلفیں ابریشم کی رسیاں ہیں جو ناگ بنکر ڈس لینگی! آہ وہ آنکھیں زہر بجھے خنجر ہیں، جو جگر تک کاٹ دینگی!۔ آہ وہ رخسارے کالی حیا سنگ مرمر ہے جسپر نظر پھسل کے قعر ذلت میں پھینک دینگے، پیارے نیاز، اصغر بھاگ اِن مصیبتوں سے

بھاگ آ۔ آ۔ آ پیارے نیاز اصغر آ میں تری روح کی تھکن جو قریب معصیت سے چُور ہو چکی ہے اپنے مور مرغولہ کی شمیم سُنگھا کر تازہ کر دوں۔

آ پیارے آ ترا دل زہر بنے مجھے خنجر سے زخمی ہو گیا ہے۔ تسنیم اپنی مقدس نرگسیوں میں سبھے تجھے شراب محبت پلا کر حقیقی خوشی و مسرت عطا کرے۔ آ۔ اور میرے متاع حیا سے محروم طبقہ میں اھینس جانیوالے نیاز اصغر آ۔ تجھے اس شعر کے عیوض کہ

نازسے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

دوسرا مضمونِ محبّت سُناؤں۔ پڑھ۔

دِل می بُرد از ما چہ صباحت چہ ملاحت
در عشق نہ در نیم سیاہی و سپیدی

اِن خلش و آزار بھری تنہائیوں میں۔ آہ کوئی نہیں وہ جو میرے غم و بے چینی کا شریک ہو اب شب غم تُو ہی بتا میں کیا کروں؟ چُپ رہوں؟۔

آہ کس کو خبر ہے! عورت جب مغموم و خاموش ہوتی ہے تو اُسکا دل کیا سونچا کرتا ہے؟

(۳)

بتُوں کی دید کو جاتا ہوں، دَیر میں قایم!
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں۔ خدا نہ کرے!

پیاری تسنیم بدخواہوں نے تمہارے کان بھر دئے میں اتنا خراب کدہ، نہیں ہوں! لِلّٰہ یقین کیجئے! نیاز اصغر تمہارا ہے اور محض تمہارا! سیئنے یا ۔ نیاز کیا یہہ الفاظ تمہارے مُنہ سے نکلے ہوئے نہیں اچھا

خیالات میں ابھی کشمکش تھی، اور ذہن میں بیدادگری کے لئے تصفیہ نہ ہوا! میرے اظہار اضطراب و منت پر، کچھ جھنجلاہٹ اور کچھ پیار بھرے لہجہ سے تم نے ہاں تم نے یہہ کہا تھا! آج بھی گذارش درد اور التجا سے رحم پر یہہ تحکمانہ جواب ہے۔

بتوں کی دید کو جاتا ہوں، دیر میں — مجھے کچھ اور ارادہ ہے؟ خدا نہ کرے!

خدا کرے، یا نہ کرے میری یہ تمنا نہیں میں خدا ہی جانے تم سے اور کیوں صرف تم سے اپنے زخموں پر نمک پاشی کی ہی خواہشمند ہوں، میں کب کہتی ہوں بیداد نہیں، مہر ہی کیجئے۔ میں نہیں چاہتی وفا۔ آپ جفائیں ہی کیجئے۔ اے اللہ مگر صرف مجھپر اور میرے دل پر ستم ڈھائیے! مجھے سوز دردِ نگ سے بچالو!

تم اپنی تسنیم کے جذباتِ محبت سے آگاہ ہولو، وہ ایک شریف عورت ہے جسکو خدا نے محبت کرنے کا سلیقہ اور وفا کا وافر حصہ عطا فرمایا۔

آہ لوگ سب کہتے ہیں، اور سچ کہتے ہیں کہ عشق اک مصیبت ہے! اور محبت بلائے بے درماں۔

لیکن ہائے میں تو ان باتوں سے بھی متفق نہیں، سب کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں مگر دلِ آفت پسند کو جب ٹٹولا تو تسنیم ان مصیبتوں کو سہتے رہنے اور سہہ لینے کو فخرِ محبت جانتی ہے، اور ان بلاؤں میں گھر جانے، اور ان تکلیفوں کو گوارا کر لینے پر رضامند پائی جائیگی!، کوئی دلیل نہیں مگر دل ان زخموں سے چور رہنا پسند کرتا ہے۔ کوئی سند نہیں پھر بھی جان ان خلشوں میں الجھنا بھلا خیال کرتی ہے۔

تسنیم تو یہ سمجھتی ہے کہ محبت عالم انسانیت کی تمام نیکیوں، اور نوع

انسان کے مقدس ترین جذبات، اور فطرتِ بشری کی تمام قابلِ عظمت خواہشات کا اک ایسا محور ہے کہ جس کے دائرہ سے موجودات کی کوئی شے باہر نہیں!!۔

محبت اور درد آشنا دل ہی اِس لذت سے کچھ خوب واقف ہوگا کہ محبت جب کسی محبت بھرے مقصود کے لیئے خود کو منزلِ مشقت و کلفت میں ڈالتی ہے، تو اُوسکا منتہائے مقصد، او مدعائے دلی، اور مطمحِ نظر کیا ہوتا ہے؟

آہ بس اک محبت پاش جنبشِ نگاہ، ایک مستقر محبت، اور حقیقی محبت کی تلاش۔ اچھا کیا دُنیا میں کوئی ایسا نفع ہے جو بلا دغدغہ زیان ہمیں نصیب ہوسکے؟ یقیناً نہیں بس تو زیان، نفع کی اُمید ہے، اور نقصان، سود کی توقع! پہلے میر اُٹھنا، پہلے تسنیم کا برباد ہونا، دلیل ہے ذوقِ غالب کی اور بہہ زیاں کاری و سود فراموشی حضورِ عشق میں مقبول ہوگی اور حُسن عجز کے صلے میں خلعتِ محبت ہوتا ہے!

ارضِ عشق نفع سود کی زراعت گاہ نہیں ہے۔ خاکِ محبت میں تو نقصان و زیان کے ہی بیج پھوٹتے ہیں یہاں کے ثمر شیریں نہیں تلخیاں ہی اک لذت ہیں جو دلِ محبت چشیدہ کے سلئے ہیں!۔

یہی پامالیاں ہیں جو شاداب منظری حیاتِ محبت میں پیدا کر دیتی ہیں؛ یہی وہ ٹھوکریں ہیں جو استقامت و استحکام کا درسِ اوّلین کہی جاتی ہیں! یہی ہیں وہ ناکامیاں جو کامرانی کا پیام زریں لاتی ہیں۔

آہ — میں کہاں سے کہاں نکل آئی، دلِ بیتاب کو کہاں تک سمجھاؤں گی اعتمادِ محبت کے دلولے اوس سے سانہ باز رکھتے ہیں تسنیم تو اِس طرح جی چکی۔

کم ہیں وہ مایوسیاں جن کی تاریکی میں طلوعِ صبحِ اُمید کی توقع ہو، آہ زیادہ غمگین و افسردہ ہیں غربت و حسرت کی وہ خون آشام شامیں جن میں سلسلۂ تخیل کامرانی درہم برہم ہوکر مجھے دوسرے عالم کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیتا ہے!

اِس محبت آباد، اِس معمورۂ عشق میں کیا تسنیم ہی ہے وہ جو زخمِ فراق سے چُور بسترِ غم پر کروٹیں لے؟ میری درد بھری چیخیں، اور اضطراب بھری کراہٹیں، اور موت و ہلاکت آمیز خون باریاں۔ بیکار گئیں؟

کیا اس بیداد آبادِ ارضی میں جہاں محبت فروشیاں کی جاتی ہیں۔جہاں دھوکے اور فریب سے رائے وفا کو زخمی کیا جاتا ہو۔ جہاں تلاشِ سود و عشق کی کشمکش نے اِک شورش بہیمی بپا کر رکھی ہو!

ہے کوئی سامعۂ عبرت اور گوشِ سماعت، جو رات کے سکونِ روحانی، اور اس پچھلے پہر کی خاموشِ فضاء لاہوتی میں، اِک ملکوتی برق پاش ہستی کی اِک شعلۂ محبت قدسی کی صدائے زخمی و مہجور سُنے؟ اور یہ ہے جو مجھ سے پوچھے اِن تنہا بے چینیوں کو میں کیونکر گذارتی ہوں۔ اور مغموم بیٹھی کیا کرتی ہوں؟

(۴)

ہاں —— اوس وقت میں کیا کرتی ہوں؟

آ۔ آ او بیدرد شاعر کی روح آ۔ میں تجھکو سُناؤں، میں تجھ کو بتاؤں کہ تنہا و طویل راتوں کو اون مسلسل بیداریوں جبکہ ملکۂ خواب سارے عالم کو اپنی ترنم ریز لوریاں سُنا سُنا کر اپنی حسین و حنائی انگلیوں سے تھپک تھپک کر اپنے گیسوئے عنبریں کی شمیم سونگھا سونگھا کر، سلا دیتی ہے! ——

—— اسوقت میں کیا کیا کرتی ہوں؟

ساکن و معصوم رات کے اوس پچھلے حصہ میں جبکہ دربار تخیل کی اضطراب نوازیاں خاص ہوتی ہیں۔ تو اک آرزو، گویا، اور میں اک مدعائے خموش بنے بیٹھے ہوتے ہیں! آہ جبکہ تو حسن و عشق کی کہانیوں اور ماجرا طرازیوں میں محو، ہوتا ہے۔ آہ جبکہ تو اوہام تخیل، اور ابہام مدعا میں گم ہوتا ہے ہاں جبکہ تو تصنع و مبالغہ آمیزی اور تنوعات سطحی کو سونچتا ہے، جبکہ تو رعایت لفظی اور عبارت آرائی، اور تجنیس کے گورکھ دھندے بناتا ہے۔

مجھسے پوچھ اوس گھڑی میں کیا کرتی ہوں؟

بس زلفوں کی تاریکی آئینہ پیشانی، شمشیر ابرو، چشم بیمار، فتنہ مژگانی، تابانی دنداں چاہ زنخداں، خدا جانے کیا کیا، ان کو لکھ چکا اب میرا میرے جذبات کا ماجرا لکھ۔ میری آشفتہ سری کو لکھ، میری مجبوریاں دیکھ اور لکھ۔ اگرچہ ابتک نہ لکھا نہ سہی۔

عورت کو جب محبت ہو جاتی ہے تو اک آتش قیامت ہے، جو وہ پہلو میں چھپائے پھرتی ہے عورت اک زندہ سبق ہے محبت کا، پڑھنے والے کم ہیں۔ پڑھ اس درس محبت کو پڑھ۔ نکات عشق، اگر حل ہو سکتے ہیں تو فقط اسی مکتب ادب میں!——

محبت و پیار کے وہ میٹھے چشمے جو حیات انسانی کے لئے آب حیات ہیں وہ اسی کے اندر سے نکلتے ہیں——

خوشنا پھول اکثر خوشبودار نہیں ہوتے۔ مگر اسکا روئے خنداں شگفتہ پھول ہے پھر بوئے وفا، سے معطر بھی!——

کاشانہ عشق کی نیرنگیاں اسی شمع جمال افروز سے ہیں!—— عالم خیالستان کی رونق دفزا اسی تنہا ملکہ کی حکمرانی میں ہے!

ہاں پھر کہانتک لکھاؤں لکھتے جا—— محبت۔ رحم۔ آنسو۔
آنسو۔ رحم۔ محبت۔ یہہ ساری تکرار مجھے پسند ہے اس لئے
کہ اس سے عورت ہی تعبیر کی جاتی ہے،
لکھ۔ نکہت۔ لطافت۔ جوہر رنگ۔ پھر لکھ اس لئے کہ اس کا پتہ
مجھ سے ہی ملیگا،
لکھ معنیٰ۔ انکشاف روح، مدعائے رواں۔ انکو بوجھ، انکی شرح کو
تجھے دنیا والے کیا سے کیا سمجھنے لگیں گے تو پھر شاعر ہوجائیگا،
لکھ شراب۔ بے چینی۔ خواب۔ تو خود سارے مضمون مہمل سمجھیگا
آہ پھر جو تھک جائے تو بحث کی خاتمہ پر لکھ دے اس سے زیادہ زور
عبارت میں پیدا نہ ہوسکیگا۔

درسِ وفا۔ تعلیم محبت
عورت———عورت

خلیقی دھلوی

مری داستان غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انہی کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

کوئی بات ہی جو دلمیں ترا تیر جم کے بیٹھا
نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا

وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے
جنھیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے اور فنکی خاطر چھوڑے جاتا ہوں لیے عبرت
مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا

بھری تھیں سرد آہیں دوستوں نے مجھکو غش پا کے
مناسب تھا تمھیں بھی اپنے دامن کی ہوا دینا

مرا دل محرمِ اسرارِ حسن و عشق تھا ثاقب
قرینِ مصلحت تھا مجھکو دیوانہ بنا دینا

نتیجۂ فکر جناب ثاقب لکھنوی

گرہ دار چھڑی

ایک نے پوچھا ازراہِ التفات — آپ کے دستِ مبارک میں چھڑی
کیوں ہے کیا مطلب ہے کچھ فرمائیے — اس میں گرہیں کیوں ہیں اتنی آ پڑی
اوّلاً میں نے کہا میں پیر ہوں — ہے عصائے پیری یہ میری چھڑی
یہ چھڑی تکیہ سہارا ہے مرا — قد میں چھوٹی اور کام آئی بڑی
بولے تکیہ چاہیے اللہ پر — تکیہ اس ناچیز کا کیا ہے گھڑی
مدعا یہ تھا کہ ہیں صوفی منش — ہے چڑھی کچھ گھڑے کی ہر گھڑی
الحق الحق یوں ہی ہے میں نے کہا — لیکن اے حضرت یہ منزل ہی کڑی
تکیہ گاہِ دل ہے وہ ربِّ غفور — ہات کا تکیہ سہارا ہے چھڑی
ثانیاً کہتے یہاں ہیں بے شما — اس سے گرماتی ہے اُن کی کھوپڑی
مدعا یہ تھا کہ بس چُپ بھی رہو — تم کو کیا اتنی چھڑی کی ہے پڑی
اپنے حملے سے نہ باز آئے مگر — دانت کھٹے تھے زباں ہی چل پڑی
فخر سے بولے مگر دب کر ذرا — زینۂ دوزخ[1] ہے طِلِسْ کی چھڑی
اور گرہوں کا نہیں ہوتا جواب — اس میں حضرت کی طبیعت کیا لڑی
عاجز آ کر یوں کیا میں نے خطاب — یہ نکالی بھی مگر کب کی گڑی
دوزخی کو زینۂ دوزخ ہے شر — کیوں بہشتی طبع ہو ایسی سڑی
ہمسفر ہمراہ ہمدم ہمرکاب — ہے رفیق و مونس و رہبر چھڑی
کیجئے گر اس کی گرہوں پر نظر — دل کی گرہوں کی ہے گویا پھلجھڑی

[1] واللہ اعلم طِلِسْ نے کس موقع پر کیا کہا ہے۔ میرے کرم فرمانے جس طرح کہا اس طرح باندھ گیا ۱۲

ہے سراپا دیدۂ عبرت نگر — آنکھیں ہی آنکھیں ہیں سرتا سر لڑی
آرزو کی شاخ بے نشو و نما — مُشتِ حسرت ہے سراپا یہ چھڑی

سُن کے یہ توجیہ کچھ راضی ہوئے — رُوحِ اِنشا بھی پکاری واچھڑی
دیکھتے جاتے بھی تھے میری طرف — تھیں نگاہیں بھی نگاہوں سے لڑی

سر گھٹا تھا اتفاقاً آپ کا — ایک چُرکی[1] بھی فقط پیچھے پڑی
مَیں نے پوچھا اگر اجازت ہو جناب — وُہ گرہ کھولوں جو دل میں ہی پڑی

ایک چٹکی یہ لگا رکھی ہے کیوں — اِس میں ہے کیا مصلحت ایسی بڑی
سٹپٹائے سُن کے یہ میرا سوال — رہ گئے مُنہ سی کے کچھ ایسی پڑی

جب نہ ہاتھ آئی کوئی معقول بات — اِک سوسائٹی[2] کی چھپائی جھوڑی
اُس میں دیکھی نہ جب جائے پناہ — دِل میں پھر پیدا ہوئی اِک ہڑبڑی

کیا بنائے سے کوئی بگڑی بنے — دے صدا کیا خاک پھوٹی تومڑی
ایک اشارہ کر کے اوپر کی طرف — بولے اِس سے یاد اُس کی ہر گھڑی

لیکن اے مشفق وُہیں میں نے کہا — یادِ حق کی قدر کی تم نے بڑی
کیوں پسِ پُشت اس کو ڈالا کہیے تو — کس لئے آگے سے پیچھے جا پڑی

سُن کے یہ کچھ ایسے کھسیائے سے گئے — یوں نہ بھولا ہو ہرن کی چوکڑی
دیکھ کر یہ حال دل میں تھا کہ بس — رکھ ہی دوں اِک پُشتِ کافر[3] پر چھڑی

غُل ہوا آزاد ہاں ہاں کیا مجال
شیر سے آنکھیں لڑائے لومڑی[4]

[1] چُرکی۔ سر کی بھونری کے بال جن کی لٹ بڑھانے اور ہلکی سی گرہ ڈال کر پیچھے چھوڑ دیتے ہیں ۱۲
[2] سوسائٹی کی تقلید کا عذر کیا۔ لیکن اندھی تقلید کو پھر چُٹیہ ہی کی ضرورت تھی۔ بہلاگئے ہیں۔
[3] کافر میاں اِک پیار کا خطاب ہے [4] لومڑی صرف برعایت قافیہ اور اسی کی رعایت کیلئے ورنہ شیر نہ لومڑی صرف چند بیس برائے یادگار ہیں۔ باقی ہوس آزاد ۱۲

مبارک ہو

امہات الامۃ

مولفہ مولانا مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مغفور جو بعض کوتاہ بیں علماء کے تعصب سے
پردۂ دنیا سے نابود ہو چکی تھی اور جسکی مطالعہ کا شوق لوگوںکو مضطرب کیے ہوئے تھا۔
جسکی ایک ایک جلد سو سو دو دو سو روپیہ شائقین قیمت دیکر تیار تھے اس کا حصہ
اول طبع ہوکر غیر مسلم اقوام کو مفت تقسیم ہو رہا ہے چونکہ اسکی اشاعت کی غرض
زیادہ تر یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام میں بکثرت تقسیم ہو تاکہ ازواج رسول
مقبول پر جو اعتراضات ہیں انکی اصلاح ہو اور اسلام کی حقانیت انکی ذہن
نشین ہو اسلیے مسلمانوں سے توقع کیگئی ہے کہ وہ اسکو خرید کر اس کے حصہ
دوم و ترجمہ انگریزی کو مدد دیں تاکہ وہ بھی چھپکر بکثرت تقسیم ہو سکے کتاب کی
عمدگی کی نسبت کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں صرف مولانائے مرحوم
کا نام کافی ہے کہ وہ کس درجہ کی ہوگی حصہ دوم زیر اہتمام ہے اور ترجمہ ڈاکٹر
مشرف الحق صاحب کے ہاتھوں میں اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے
کہ اسکی تکمیل جسقدر چاہیں جلد ہو سکتی ہے قیمت بارہ آنہ (۱۲/)
منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

جلد (۹) اپریل ۱۹۱۵ء نمبر (۱)

تمدن

رجسٹرڈ ایل نمبر (۸۵۸) ب

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹرز۔ شیخ محمد اکرام بیرسٹرایٹ لا۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الرافع الخیری

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ قسم اول ؎ — قیمت فی پرچہ ۸؍

کتب خانہ [illegible] اسلامیہ دہلی

"میمتھ" ایک خوفناک وحشی درندہ تھا، جو بہت قدیم زمانے میں روئے زمین پر موجود تھا، مگر اب اُسکی نسل دنیا سے ملیامیٹ ہوگئی ہے اُس کا پنجر زمین کے نہایت گہرے طبقات میں پایا جاتا ہے اور علمارِ ارضیات نے اُسکو زمین کے جوف سے نکالکر عجائب خانوں میں رکھا ہے۔

اب سے پچاس ہزار سال پہلے یہ درندہ شمال یورپ کی دلدلی زمینو میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔ اسکے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔ دانت بڑے بڑے اور نہایت تیز تھے۔ ہاتھی کی طرح ایک سونڈ آگے لٹکتی تھی اُس میں بلا کی طاقت تھی۔ یہ خوفناک وحشی درندہ جب اپنے شکار پر حملہ کرتا تھا، تو اُس کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی۔

دم بھر کے لئے اُس زمانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے لاؤ، جبکہ

اِن خوفناک درندوں کے غول سطحِ زمین پر پھرا کرتے تھے۔ وہ دیکھو سامنے ایک جھیل ہے، جس میں ایک وحشی انسان کمر کمر تک پانی میں کھڑا ہے۔ اُسکے سلبے سُرخ بال کمر تک لٹک رہے ہیں۔ اُسکے موٹے موٹے ہونٹ غصّے سے ہل رہے ہیں۔ آنکھیں سُرخ ہوگئی ہیں۔ وہ دیکھو دانت نکوستا ہے اور دایاں ہاتھ بائیں کندھے پر بار بار مارتا ہے۔

یہ کیوں ؟

یہ اسلئے کہ جھیل کی سطح پر مچھروں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں اور وہ بار بار اُسکے کندھوں اور جسم کے دیگر حصّوں پر بیٹھتے اور کاٹتے ہیں جب کوئی مچھر اُسکو کاٹنا چاہتا ہے، تو وہ تاک کر ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے کہ مچھر فوراً مر جاتا ہے۔

اگر تم حقیقت میں اُس زمانے میں ہوتے اور اُس زمانے کے سُرخ بالوں والے انسان اور خوفناک میمتھ اور مچھروں کو دیکھتے، تو اُس انسان سے خطاب کرکے ضرور یہ کہتے:۔

"میرے دوست! تم مچھر کو بہت آسانی سے مار سکتے ہو اور شاید کسی زمانے میں مچھروں کی نسل کو دنیا سے غارت کر دوگے، مگر خوفناک میمتھ کے پنجے سے نجات پانا مشکل ہے۔ اُسپر غالب آنا دشوار ہے۔ اگر تم نے فتح پائی بھی، تو اس کے سلئے ہزاروں سال درکار ہیں۔

مگر تم حیران ہوگے اور دیکھوگے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں تھا جو بات تم نے اُس زمانے کے وحشی انسان سے کہی تھی، وہ غلط تھی۔ میمتھ کی نسل دنیا سے معدوم ہوگئی اب ایک میمتھ بھی روئے زمین پر نہیں پایا جاتا۔ میمتھ کی طرح اُس زمانے میں اور بھی بہت سے خوفناک درندے تھے۔ اُن کی نسلیں

بھی غارت ہو گئیں۔ تند اور خونخوار تیندوے جو یورپ کے شمال میں پھرا کرتے تھے، اب ناپید ہو گئے۔ بھیڑیوں کے غول کے غول تھے، جو برفانی منطقے سے نیچے تمام جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔ اب اُنکا نام و نشان بھی نہیں رہا؟ مگر مچھر بدستور موجود ہیں۔ وہ اُسی جوش و خروش کے ساتھ یورپ کی دلدلی زمینوں پر حکمراں ہیں۔ اُنکی نسلیں بیشمار ہیں۔ اُنکی فوجیں نہایت آزادی سے جھیلوں کے کناروں اور درختوں کے جھنڈوں پر منڈلاتی پھرتی ہیں۔

یہی مچھر ہیں، جو وبائی بخار اور زرد بخار اور طاعون کے زہریلے مادّوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے ہیں اور اُن کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل کرتے ہیں کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انسان اُن تمام خوفناک درندوں پر غالب آگیا۔ جو کسی زمانے میں روئے زمین کے بہت بڑے حصے پر مسلط تھے۔ مگر وہ مچھر جیسی کمزور مخلوق کے مقابلے سے عاجز ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عقل انسانی اکثر بڑی بڑی پیچیدہ مشکلوں کو حل کر ڈالتی ہے، مگر بعض چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنے سے عاجز رہتی ہے؟

ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا کہ ہم مچھروں، بھڑوں، مکھیوں اور تمام چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور اُنکی نسلوں کو روئے زمین سے ملیامیٹ کر دینگے، پھر اُن موذی جانوروں کے قتل کرنے کے بعد، جو آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں، ہم اُن ظالم جانوروں کے ہلاک کے درپے ہونگے، جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے! مگر انسان کو سب سے زیادہ تکلیف اُنھیں سے پہنچتی ہے۔

بڑے بڑے خوفناک درندوں کو ہلاک کرنے کی کوشش ہماری پہلی جنگ تھی۔ اب دوسری جنگ اُن چھوٹے چھوٹے م

ہونے والی ہے، جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ پھر تیسری جنگ اُن خوردبینی جانوروں سے ہوگی، جو چپ چاپ ہمارے خون میں تیر جاتے ہیں اور ہماری زندگی کو غارت کر دیتے ہیں، یہ دو جنگیں بہت سخت ہونگی اور انکے لئے زمانہ دراز درکار ہوگا، مگر یہ [illegible] آدم کے لئے یقینی ہے۔

اسکے بعد ذرا اُن جنگوں کا تصور کرو جو ہم کو بڑے بڑے جرائم سے کرنی پڑتی ہیں۔ اخلاق کے لحاظ سے ہم ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہیں۔ قتل اور زنا اور چوری اور ڈاکہ زنی ایسے جرائم ہیں، جن کا ارتکاب برابر ہوتا رہتا ہے۔ ہم ان خوفناک جرائم سے آج جنگ کر رہے ہیں، جس طرح قدیم زمانے کے انسان میتھ وغیرہ جو خوفناک وحشی درندوں سے جنگ کرتے تھے۔ عنقریب ایسا زمانہ آئیگا کہ یہ بڑے بڑے انسانی جرائم معدوم ہو جائینگے۔ نہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرینگے۔ نہ عورتوں کی عفت و عصمت پر حملہ کیا جائیگا۔ نہ گھروں میں چوری ہوا کریگی نہ رہزنی اور ڈاکے کے ہولناک منظر دکھائی دینگے۔ اُس وقت کا انتظام تمدن مکمل ہوگا اسلئے نہ چوری اور ڈاکے کی ضرورت پیش آئیگی اور نہ قتل و غارت کی۔

مگر اسکے بعد ہی فوراً ہم اُن بُرائیوں سے جنگ کرنے پر کمربستہ ہونگے جو ظاہر میں نہایت حقیر اور چھوٹی نظر آتی ہیں، تاہم اُن سے خطرے بہت ہیں، مثلاً ریاکاری۔ غرور، حسد، تعصب وغیرہ۔

یہ اخلاقی جنگ پہلی اخلاقی جنگ سے بہت زیادہ سخت اور طویل ہوگی، مگر اُمید کامل ہے کہ جس طرح ہم چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں پر ایک دن غالب آئینگے، اُسی طرح ان چھوٹی خطرناک بُرائیوں پر بھی ضرور فتحیاب ہونگے۔

وحید الدین سلیم

لنڈن میں پرندوں کی نمائش

اس نمائش میں چار سو گیس ذات کے مرغ یا مرغیاں تھیں اور کل مرغ یا مرغیاں ملا کر ۴۷۴۰ تھیں۔ اِسی طرح زیادہ قیمتی مرغ یا مُرغی اس میں دو ہزار پونڈ یعنی تیس ہزار روپے کی تھی اس سے کم قیمت کی تو سینکڑوں تھیں۔ مگر دو پونڈ یعنی تیس روپیہ سے کم کوئی چڑیا نہیں تھی۔ ہمارے غریب ملک کے رہنے والے تیس ہزار روپیہ ایک مرغ کی قیمت سنکر بہت تعجب کرینگے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک مہربان نے ایک بٹیر کو لکھنؤ میں بسلغ ۵۰ روپیہ کو بیچا تھا تو لوگ سننے والے پر ہنستے تھے کہ آخر اس بٹیر میں کیا صفت ہے جو اسقدر روپے دیئے جائینگے۔ کیا یہ روز موتی اُگلیگا۔ مگر یہ سب دولت کے کھیل اور ہر جنس کی قدر افزائی کے شوق کے کرشمے ہیں کہ یہ مُرغ اور مُرغیاں نہ تو موتی اُگلتی ہیں اور نہ سونے کا انڈا دیتی ہیں (جیسا بچپن میں کہانیوں میں سُنا کرتے تھے) لیکن اُن میں ایسی صفتیں ہیں جن سے اتنی قیمت مانگی جاتی ہے۔ اور شوقین لوگ دیتے ہیں۔ اس نمائش کے چند مرغوں کی حالت لکھتا ہوں۔

نمبر ۶۶۴ نر ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا سپید چتیاں زیادہ ڈیڑھ گز لمبا ہے (سر سے لیکر پنجوں تک) وزن ۸ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۱۴۷۸ مادہ ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا سپید چتیاں زیادہ ہیں۔ وزن ۳ سیر قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۵۰۲ مادہ۔ مُرغی بابل۔ وزن ساڑھے پانچ سیر (ایک برس سے کم) قیمت ۲۵۰ پونڈ۔ میرے سامنے ایک لیڈی سو پونڈ دیتی تھی۔ مگر مالک نے نہیں بیچا۔

نمبر ۱۵۷ نر سپید بے داغ (جیسا اکثر پیرزادے نذر وغیرہ کے لیے

تلاش کیا کرتے تھے (قد اور وزن معمولی۔ قیمت ۲۰۰ پونڈ۔
جزائر سماٹرا کے بھی مرغ موجود تھے۔ جن کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی
جاپان کی مرغیاں بھی تھیں۔ اُن میں ایک خاص صنعت یہ تھی کہ دُم کے پر سمیٹ لیتی تھیں۔ قیمت ۵ پونڈ ۵ شلنگ تھی۔
ہمارے ہندوستان کے بھی مرغ تھے۔ جنکی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی (ہم کو اس بات سے یہ سبق ملتا ہے کہ وہی چیزیں جن کی ہم اپنے ہاں قدر نہیں کرتے ہیں۔ اُنکو لوگ یہاں لاکر تھوڑی سی محنت اور توجہ کے ذریعہ سے قدر کے قابل بنا لیتے ہیں)
ملایا کے مرغوں کی قیمت سب سے زیادہ ۲۰۰۰ پونڈ تھی۔ اور وزن میں سب سے زیادہ بھاری مرغ نمائش بھر میں وہیں کا تھا۔ جسکی تفصیل وزن و نرخ وغیرہ ذیل میں درج ہے۔
نمبر ۳۲۱۳ نر مرغ۔ دو گز لمبا۔ وزن ۷ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔
ہسپانیہ کے مرغ کی سب سے زیادہ قیمت پچاس پونڈ تھی۔
بط سب سے زیادہ قیمتی ہندوستان کی تھی۔ جسکی قیمت ایک سو پونڈ تھی اور جو سفید بیداغ تھی۔ معمولی قد کوئی اور صفت بظاہر اس میں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے اور عجیب عجیب مرغ اور مرغیاں تھیں۔ گو اُن کی قیمت کچھ ایسی زیادہ ان قیمتوں کے مقابلے میں نہیں تھی یعنی سو پونڈ سے لیکر پانچ یا چھ پونڈ تک تھیں۔ سفید مرغی کی ایک قسم تھی جس کے سر پر گوشت کا لبس بگردہ لیس بالکل پگڑی کی طرح کا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے طول کی پگڑی باندھ دی ہے ایک چھوٹی مرغی تھی۔ وزن بھی آدھ سیر اندر۔ بالکل تیتر کا رنگ تیتر ہی معلوم ہوتی تھی چند مرغ اور مرغیوں کی حلق پھولے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گھینگا نکل آیا ہے۔
اب کبوتروں کا حال سُنیں۔

سب سے قیمتی کبوتر نمائش میں ۵۰۰ پونڈ کا تھا۔
نمائش میں کل ۱۵۵ ذات کے کبوتر تھے ہمارے ہندوستان میں اس سے زیادہ قسام کے کبوتر نکلینگے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی قسم میں یکتا ہوگا التعداد میں ۴۱۷۳ کبوتر تھے
نمبر ۳۔ ایک سال کا پٹھا۔ ۳۰ انچ لنبا۔ پاموز۔ دو باز۔ آگے کا پوٹا پھولا ہوا ذات کا لقا نہیں ہے یعنی وہ خود نہیں تنتا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کبوتر کے گھینگا نکل آتا ہو پوٹا اس قدر پھولا ہوا ہے۔ کہ آگے سے منہ نہیں کھائی دیتا ہے۔ قیمت ۵۰۰ پونڈ (اس قسم کے کبوتر ہندوستان میں نہیں دیکھے)
نمبر ۲۰۔ صندلی نر ۱۹۰۴ء کا پٹھا۔ پوٹا اتنا بڑا ہے کہ آگے سے سر نہیں دکھائی دیتا۔ اس کا پوٹا سب سے زیادہ پھولا ہوا ہے۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ
نمبر ۱۹۰۔ سپید بے داغ لقا۔ اس قدر تنتا ہے کہ اس کے سینے پر لیمو رکھدو اور نہ گرے (جو کہ خاص لقا کی صفت ہے) حالانکہ پر نہیں سکٹے ہیں۔ ورنہ شاید بعض وقت اُلٹ جاتا۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔
نمبر ۲۱۲۔ مادہ سپید بے داغ لقا۔ بجائے اس کے کہ یہ کبوتری تنتی ہو اسکی دُم بہت اُٹھی ہوئی ہے۔ بالکل چھتری کی طرح سے سر پر پھیلی رہتی ہے۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔ اس کے علاوہ دوسرے رنگوں کے کبوتر موجود تھے۔ مثلاً ہرے زاغ۔ کھیارسے۔ صندلی۔ کاسنی۔ مکھی۔ سیاہ دوباز۔ موتی چور۔ چوٹی دار وغیرہ چوٹی دار کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی۔
نمبر ۲۸۸۔ کھیارا کیسی آنکھوں پر۔ خوردنکا۔ چونچ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتی ہے۔ چونچ پر کھال کا بہت بڑا گچھا ہے۔ قیمت ۲۵۰ پونڈ۔
نمبر ۵۰۰۔ سپید بے داغ۔ موتی چور۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔
ایک ذات کی کبوتری لقا بھی تھی جسکو یہاں اُلو کہتے ہیں۔ وہ خوردنکی ہوتی ہے۔

آنکھ کے پپوٹے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ صورت میں اُلّو سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ قیمتی ۱۰۰ پونڈ۔

جرمن کے بھی کچھ کبوتر نمائش میں تھے۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کے کبوتر نہیں تھے۔ حالانکہ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت نایاب کبوتر پائے جاتے ہیں۔ ایک خاص ذات جسکو میں یہاں نہیں پاتا ہوں۔ نہ کہیں نمائش میں دکھائی پڑی۔ ہمارے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ وہ لوٹن کبوتر ہیں جنکی میں نسبت خیال کرتا ہوں کہ یہاں بہت قدر ہوتی۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے اُڑان کے کبوتر اور گرہ باز کی تو یہاں قدر ہوہی نہیں سکتی۔ مگر لوٹن تو ایسی چیز ہے جو یہیں کے واسطے پیدا ہوا تھا۔ جو لوگ کبوتروں کا تماشہ آسمان پر دیکھنے سے محروم ہیں وہ اپنے کمرے میں بیٹھکر تماشا دیکھیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے اچھے لوٹن کبوتر یہاں بھیجے جائیں تو شاید اُن کی قیمت ۵۰۰ پونڈ سے زیادہ ملے۔ اور پھر قسلی لوٹن کی اور بھی زیادہ قدر ہو۔

گو یہ نمائش پرندوں کے لئے تھی۔ تاہم ایک گوشے میں کچھ چوہے اور خرگوش بھی دکھا دیئے گئے تھے۔ ہر رنگ کے چوہے موجود تھے۔ سفید، سیاہ صندلی، کاسنی، خاکی۔ اور ہر قد کے چھوٹے بڑے منجھولے۔ اس میں خرگوش بھی ہر ذات کے موجود تھے۔ ایک قسم خرگوش کی تھی جسکے چار کان تھے۔

یہ گراں قیمتیں جو ان مختلف جانوروں کی لکھی گئیں۔ یہ محض چڑیوں کی نہیں تھیں بلکہ انکے رکھنے والے اپنی محنت اور نگہداشت کی قیمت بھی لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے دریافت کیجئے تو ہر چڑیا کا نسب نامہ اُنکے پاس لکھا ہوا ہے کہ کس طرح سے اُن کی ماں اور باپ کی حفاظت کی گئی ہے۔ وہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اُن کو کیا کھانا دیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو اس ملک کے تمول کے ساتھ مدنظر رکھکر قیمتوں کی یہ گرانی اعلیٰ قابلیت رکھتی ہے۔

شمس الدین احمد (لندن)

ساحلِ جمن اور ہندو مذہب کی شعریت

یہ مضمون حقیقت میں ایک خط ہے جو مسٹر عبدالرؤف نے اپنے ایک دوست کو کنارِ جمن کی سیر کے بعد لکھا تھا ہم خوش ہیں کہ وہ ناظرین تمدن کے لئے باعث دلچسپی ہوگا اس سے زیادہ خوشی مجکو اس بات کی ہے کہ مسٹر موصوف "جو جذبات حسن و عشق کی ہمیشہ تحقیر کیا کرتے تھے" وہاں ایک دُجام میں سرشار ہو گئے اور انکی پارسائی پر قیامت آگئی دیکھئے آئندہ زمانہ ان کو کہاں سفر کرتا ہے یا شاعر اور رند شاہد باز۔

اول تو صبح کا سہانا وقت اور اسکی ٹھنڈی ہوا میں یوں ہی سینکڑوں رنگینیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہیں جس کے لئے مزید دلفریبیوں کی ضرورت نہیں، ایک سلیم المذاق وجود کی سرشاریت اور کیف پروری کے لئے یہی کافی ہے کہ اسکو صبح دریا کے کسی ساحل پر ہو لیکن اس صبح کا کیا پوچھنا جسکو حسنِ نسوانی وگلہائے پرستش کی نگہت باریاں معطر کر رہی ہوں۔

یہ رسم کہ صبح اُٹھکے حسن کی دیویاں اپنے ہاتھوں میں سامانِ پرستش لئے دریا کنارے جاتی ہیں خوب ہے، وہ جب پانی کے کنارے پہونچتی ہیں اور پانی اُنکے انتظار میں بیچین ہوتا ہے، اس میں کچھ پھول، نہیں پھول کی کچھ پنکھڑیاں ڈالتی ہیں۔ ایک عجیب پر کیف عالم ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ساری فطرت اسکی پذیرائی کے لئے مستعد و آمادہ ہے، پانی کی ایک ایک لہر بلکہ اسکا ایک ایک قطرہ فرط انبساط سے ایک لطف

اضطراب و بےچینی کے ساتھ اُن پنکھڑیوں کو لئے پھرتا ہے اور پھر ہمارے سپرد کر دیتا ہے۔ ہم نہ معلوم اسکو کیا سمجھکر اٹھا لیتے ہیں۔

افسوس ریاض تم نہ ہوئے، جمعہ کا دن تھا صبح کو ہم لوگ گھاٹ کی سیر کو، یا یوں سمجھئے کہ اپنی ہلاکت کی سامان اندوزی کے لئے روانہ ہوئے واللہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حسن آج نہانے کی رسم ادا کرنے جا رہا ہے دیکھئے انسان کو جس چیز سے نفرت ہوتی ہے اکثر قدرت اُسکو اُسی چیز کے ذریعہ سے شکست دیکر اپنی اہمیت و پسندیدگی کا اعتراف کرالیتی ہے، مجھکو مارواڑی عورتوں سے نفرت کلی ہے میں سمجھتا تھا کہ اس قوم کی طبقۂ اناث کو جنس لطیف میں شامل کرنا حقیقتاً جنس لطیف کی ایک افسوسناک بےحرمتی ہے۔ لیکن ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ حسن کسی قوم کا ورثہ نہیں اسکی لطف فرمائیاں عام ہیں جس طرح وہ عمران و بدنیت پر لطف فرما ہے اسیطرح غیر متمدن اقوام میں بھی اسکا نشیمن ہے اگر وہ اعلیٰ معاشرت ملکوں اور قوموں پر جلوہ فگن ہے تو بھدے گھونگھٹ کی اوٹ سے بھی برق پاشیاں کر سکتا ہے، میں اس سے بےخبر تھا کہ گردن کی جنبش اور اسکے ساتھ آنکھوں کا اشارہ انسان کو پامال کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے، مجھے علم نہ تھا کہ حسن ہر لباس و وضع میں اپنی شوخ اداؤں سے مسخر کر سکتا ہے، سولہ سترہ برس کی ایک نازک اندام مگر نیچی سی ہستی ذہن میں لائیے اور یوں تصور قایم کیجئے کہ وہ مصروف خرام ہے جمنا کے کنارہ سے پرستش کر کے واپس آرہی ہے، جسم کو کسی صورت قرار نہیں، اسکو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ میرے ساتھ ساتھ مگر مودب فاصلہ پر میرے گرفتار کیئے ہوئے لوگ کچھ اور بھی ہیں، وہ ایک دفعہ اپنے

گھونگھٹ کو ایک طرف کر لیتی ہے کہ بے پاشی کے لئے کوئی حجاب باقی نہ رہے، اور اپنی نازک گردن ایک طرف جھکا کر گوشۂ چشم سے ایک اور صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہے، صبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہتا ہے دیکھنے والا مسحور و بیخود ہو جاتا ہے، اعضا میں پر لطف تھکن دماغ میں ضعف اور اپنی رفتار میں مخموریت محسوس کرنے لگتا ہے۔ تھوڑا آگے چلنے کے بعد وہ پھر اسی انداز سے دیکھ لیتی ہے غریب انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ پھر نہ معلوم تمام دن ہمپر کیا گذری اور کس پر کیف بیکیفی میں جمعہ کی نماز پڑھی اور کہاں پڑھی سارا دن ایک عجیب مخموریت و سرشاریت میں گذر گئی۔

دوسرا دن عید کا تھا اوّل تو مسافر کی عید ہی کیا، پھر مسافر ہی کیسا۔ غرضکہ کیسا نہانا کیسا دھونا آفتاب ہمکو دریا کے کنارہ انہیں حسن کی دیویوں کے انتظار میں ملا۔ آہ یہ صبح تو نہ معلوم اپنے ساتھ کیسا سامانِ جراحت لائی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوز بیوگی عورت میں جو شان پیدا کر دیتا ہے وہ بات دوشیزگی میں نہیں، اس میں ایک قسم کی دیویت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں یہ بات نہیں، ایک عجیب اداسی ہوتی ہے۔ قیامت ہے وہ عالم کہ عورت ابھی حال ہی میں اپنے مایۂ نشاط محرم راز سے تمام عمر کے لئے جدا کر دی گئی ہو اسکا وہ مغموم مگر شگفتہ چہرہ نہ معلوم کیا غضب ڈھاتا ہے۔ آہ اسکو جب کبھی اپنا عیش جو اس سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا ہے یاد آجاتا ہے تو وہ صرف دانت سے اپنا نیچے کا نازک ہونٹ دبا لیتی ہے اور ایک پر سوز ناز کے ساتھ اپنے ہاتھ کی کلیاں لیکر مندر پر چڑھاتی

ہے لیکن حقیقتاً وہ ان کلیوں کو کہاں پہنچ سری ہے، آہ کیسے بیتی انکی گلابی ساری زیب
تن کیئے ہوئے، سُرخ مخمل کی نیم آستین، اسپر سُرخ کناری لگی ہوئی اسکی
لمبی اور نازک اُنگلیاں باہر نکلی ہوئیں اور سامان پرستش میں ہاتھ۔ ایک
عجیب کیفیت تھی جس سے حسن کا تقدس برستا تھا۔ افضال میں نہیں
سمجھتا کہ کس چیز سے اسکو تشبیہ دوں۔ بس یہ سمجھئے کہ حس وشعر، رنگ و
بُو اور موسیقی سے ترکیب پاکر اگر کوئی وجود ہوسکتا ہے تو وہ اُسی شیام رنگ
بیوہ کا تھا وہ ایک پھول تھی معطر، ایک حسن تھی معصوم، ایک شعر تھی
پرکیف، جس سے وہ ایک عالم کو مخمور و بیخود بنا سکتی تھی +

رؤف

اس درمیان میں ہمارے پاس اکثر کتب و رسائل بغرض ریویو آئے
ہیں مگر افسوس ہم ابتک انپر کوئی تنقیدی نگاہ نہیں ڈال سکے لیکن آج ہم
اس رسالہ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

القمر یہ ایک ماہوار صحیفہ ہے جو دہلی سے مولوی عبدالعزیز صاحب کے
زیر ادارہ شائع ہوتا ہے اسوقت تک اس کے تین نمبر ہماری نظر سے
گذرے ہیں، اوّل سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا پرچہ نمایاں امتیاز
کے ساتھ نکلا ہے جس سے معلوم ہوا کہ القمر ارتقائے تدریجی کے ماتحت روز
افزوں ترقی کر رہا ہے اور اُمید ہے کہ وہ ایک دن بدر کامل ہوکر افق دہلی
سے نکل کر اپنی ضیا بخشی سے سارے ہندوستان کو منور کر دے گا۔
حسن طباعت عمدگی کاغذ وغیرہ سے دیدہ زیبی کی پوری کوشش کی
جاتی ہے مضامین کی ترتیب و تہذیب میں بھی سلیقہ شعاری سے
کام لیا جاتا ہے اُمید ہے کہ مولانا آیندہ چلکر اس میں بھی اچھی طرح سے
کامیاب ہوجائینگے تنوع مضامین کے لحاظ سے اسکو عطر فتنہ کہنا چاہیے

چند دن بمبئی میں

چند دن بمبئی نقاد کے دو نمبروں میں شائع ہو چکے ہے اس کی تیسری قسط حضرت نیاز نے تمدن کے لئے عنایت فرمائی چونکہ سلسلے کے لئے نقاد کا حوالہ دینا ناظرین کرام کے لئے ایک قسم کی تکلیف بیجا تھی اسلئے ہم اسکو بھی نقاد سے نقل کرتے ہیں، جہاں سے نئی قسط شروع ہوگی ایک امتیازی خط کے ذریعہ اس جگہ کو نمایاں کرینگے۔ قارئین کرام کو کم خوشی نہوئی کہ حضرت مولانا نیاز کی توجہ پھر تمدن پر مبذول ہوئی ہے جو اس کے دیرینہ عنایت فرما ہیں۔

۲۰ مئی کی شام بھی کیسی منہمک شام تھی، جب میں نے بمبئی کے لئے اپنا اسباب سفر درست کرنا شروع کیا! میرا اسباب ہی کیا تھا کہ میں درست کرتا لیکن کسی محبوب مقام کی تیاریاں کرنا گویا تنہائی میں اُسکا ذکر کرنا ہے، اور میں چاہتا تھا کہ اس ذکر کی تکرار ہو، بستر لپیٹ رہا ہوں۔ اور ٹکٹ بھی لے رہا ہوں، کتابیں اپنے ساتھ لیجانے کے لئے چُن رہا ہوں، اور پلیٹ فارم پر ٹہل بھی رہا ہوں، ہوں ہانسی میں لیکن پھر رہا ہوں بمبئی میں، وقت واحد میں اختر منزل کے بالاخانے پر بھی ہوں اور ساحل اپالو پر بھی ——

اُف رے تخئیل تیری لطف پاشیاں!

"بہ حدِ شوق نفوذ تخئیل" ہمارا روز کا تجربہ ہے، لیکن ہماری یہ اشراقیت کہ کہیں کا نام سُنا اور فوراً اُسکے حدود پیش نظر ہوگئے، وہاں کی سڑکیں، وہاں کی گلیاں، وہاں کے مقاماتِ تفرج کی کیفیتیں، وہاں کے لوگوں کی صورتیں سامنے کھنچکر رہ گئیں۔ بسا اوقات زیادہ پُر لطف ثابت ہوتی ہے

اور جب اُس جگہ ہم پہونچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تخئیل کی وارفتگی خیال کی ربودگی کیسی پاکیزہ چیز تھی کہ جو "حضور گلشن بے اختیاری کردہ رنگینم" اور ہمارا العبتکدۂ دماغ جو "تخئیل" کی بت سازیوں کا کرشمہ تھا بہت زیادہ پرکیف مناظر سے معمور تھا۔ لکھنؤ، آگرہ، دلّی وغیرہ جانے سے قبل وہاں کا ذہنی جغرافیہ، وہاں کے مرقعے اپنے پاس تھے اور راتوں کی خلوت میں بارہا ہم وہاں کی گلیاں چھان چکے تھے۔ لیکن جب وہاں پہنچ گئے تو کیا ہوا! وہ جغرافیہ جس میں زمین کے بہترین مناظر کا حال درج تھا فراموش ہوگیا؛ وہ مرقعے جن کی ترکیب بہترین صور سے ہوئی تھی اور وہ ذراتِ حسن جو وہاں کی گلیوں میں نظر آتے تھے یکسر محو ہوگئے۔ افسوس ہُوا کہ ناحق زحمتِ سفر اختیار کی۔ پردۂ شب پر، اپنے تخئیل کی مصوّری ہی اس سے اچھی تھی لیکن صرف بمبئی ایک ایسا مقام نکلا جسکو دیکھکر میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا میرے تمام اگلے پچھلے قیاسات و تصوّرات نے جسم اختیار کرلیا ہے اور اوسکا نام بابمبے (Bombay) رکھدیا گیا ہے۔

ایک عرصہ سے وہاں جانے کی آرزو قلب میں پرورش پارہی تھی، لیکن اُس کے شباب کی رنگینیوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا جب میں نے مصمم ارادہ کرکے اُسے اپنے سارے خون میں دوڑا دیا۔

ٹھیک گیارہ بجے شب کو میں ہانسی سے سوار ہوا اور صبح کو دلّی پہنچکر شام کو ۵ بجے آگرہ اُتر پڑا، یہاں دلگیر ہوا خیال تھا کہ ایکدن یہاں ہونگا لیکن گرمی کی شدت نے اجازت نہ دی اور مجبوراً ۶-۷ گھنٹوں کے بعد ہی میں نے رات کی گاڑی سے آخر کار اپنا وہ سفر شروع کردیا جو اسوقت میرے تمام اعضا پر حکمراں تھا۔

بسم اللہ مجریہا و مرسیہا

ریل میں بیٹھئے اور سفر طویل ہو، تو سب سے پہلے لطف معیت کی جستجو ہوتی ہے۔ یعنی اگر تنہائی نصیب نہو، جو بہترین ندیم ہے، تو خیر وہاں کی ...... بیٹھنے والی صورتیں تو ایسی ہوں جنکو دیکھکر بینائی مجروح نہو، مگر یہ پہلا شگون نیک تہا کہ میرے ساتھہ کوئی نہ تہا اور اس لئے جلدی جلدی بستر کہولا اور کہڑکی میں سر ڈالکے اُن نقوش پر نظر ثانی کرنے لگا جو اُسوقت میرے دماغ کے تنہا مالک تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر میں اس لذت میں مستغرق رہا، کیونکہ جب میری آنکھ کہلی، تو ۲۲ مئی کا سورج بہت بلند ہو چکا تھا۔ اور ایک جوان فرنگن مجھے گہور گہور کر دیکھہ رہی تہی، یعنی مجھے ملامت کر رہی تہی کہ میں کیوں گہنٹوں قبل رات کو اس گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں صبح کو اُسے سوار ہونا تہا لیکن باوصف اِس تحقیر و تذلیل کے میں خوش تھا۔ میں کیا کرتا اگر وہ گہورنے والی آنکھیں کسی فرنگی کی ہوتیں اور وہ نکر پہنے ہوئے اپنے کہلے ہوئے چوڑے چکلے گہٹنے پر ہاکی کہیلنے کے ڈنڈے سے سگرٹ جلانے کے لئے دیا سلائی رگڑتا ہوتا۔ میں اُٹھا اور میں نے اوس برہم ملکہ سے معذرت کی کہ "اگر اس وقت تک میرے لیٹے رہنے سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں بہت نادم اور یہ سمجھئے اٹھا جاتا ہوں" خدا معلوم میرے انداز بیاں میں کونسی ایسی بات تہی جو اوسے بہلی معلوم ہوئی بہر حال وہ مسکرا پڑی اور اپنی "نہیں نہیں" سے اُسنے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر پہنچکر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر سے سرگوشیاں کرکے مجھے یہاں سے نکلوا دینے کی کوشش نہ کریگی۔ آگے چلکر دو چار مہذب وضع حضرات اور بہی

آکر بیٹھ گئے اور میں خوش ہوا کہ اگر نکالا ہی جاؤں گا تو میرے کرتے کا گریبان انکی قیصوں کے کالر سے پیچھے ہی رہیگا۔ مگر خیر یہ مصیبت جسکا بارہا مجکو تجربہ ہو چکا ہے اور جو حقیقتاً ہمارے لئے تازیانۂ عبرت ہے، پیش نہیں آئی اور وہ کسی اسٹیشن پر ۹-۱۰ بجے کے درمیان اُتر پڑی۔

میں سفر میں اِس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ کوئی مجھسے اسقدر بے تکلف ہو جائے کہ لا محالہ مجھے اسکے ہر سوال کا جواب دینا پڑے خیر یہاں تک تو کوئی ایسا حرج نہیں کہ "کہاں جائیگا"، لیکن اسکے بعد میں "کیوں"، نہیں سُن سکتا اور خاصکر پھر ایسے سفر میں جس کے متعلق اگر میں خود اپنے سے سوال کروں کہ "کیوں جا رہا ہوں"، تو کوئی جواب مجھے نہ ملے۔ چنانچہ ایک صاحب نے میری طرف سوال کرنیکو اپنا چہرہ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے کتاب اُٹھالی اور دیکھنا شروع کیا اور میں کھلی ہوئی اخلاق شکنی سے بچ گیا۔

کسی دور دراز کے مشہور مقام پر جانے والے مسافر سے سوال کیجئے تو وہ نہایت نخوت سے مختصر سا جواب دیتا ہے کہ "کلکتہ" یا "بمبئی" یعنی جس طرح ریل پر سوار ہونے والا پیدل چلنے والونکو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے تئیں بہت بالا و برتر سمجھتا ہے، اسیطرح ایک ہی گاڑی میں سفر کرنیوالے اظہار تفوق کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور پھر تماشہ یہ کہ جہاں کسی نے "کلکتہ"، "بمبئی" یا کسی دوسرے دولتمند شہر کا نام لے دیا تو قریب کے جانیوالے غریب کچھ ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ وہ اُس کے اندر شان امارت محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ یہ "شخص کیسا خوش قسمت و قابل رشک ہے!"

مجھ سے اگر کسی نے پوچھا بھی تو ہر آگے آنیوالے اسٹیشن کا نام لیکر کہدیا کہ اسطرف جاتا ہوں۔ میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ میں "بمبئی" کہکر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دوں اور وہ خواہ مخواہ سمجھنے لگے کہ میں اظہار فوقیت کر رہا ہوں ——— غرض دن بھر اسی لغویت میں گذرا کہ کون آتا ہے اور کون جا رہا ہے گرمی کا وُہ عالم تھا کہ تالو پیاس سے چٹکا جا رہا تھا اور ریلوے کی انتظام کی یہ حالت تھی کہ ...... ہر اسٹیشن پر غریب مسافر پروانوں کی طرح "دو ڈول والے" پر گرتے تھے اور وُہ سب کے سامنے ڈول کو اوندھا کرکے دکھا دیتا تھا کہ پانی نہیں ہے۔ شام ہوئی تو گرمی میں کچھ تخفیف ہوئی اور طبیعت کو کچھ سکون ہُوا۔ اب صرف ۱۲ گھنٹوں کا فصل تھا کہ ریل مسافروں کو بمبئی لیجا کر ڈالدیتی اور اس لئے دو ثلث مسافت طے ہو گئی تھی۔ میں لیٹ گیا اور کوشش کرکے سو گیا۔

۲۳ رجون کی صبح کو جو آنکھ کھلی تو سوادِ بمبئی شروع ہو گیا تھا اور سب سے پہلا منظر جو پیش نظر تھا کھجوروں کے درختوں کا تھا جو سبز و شاداب ٹیکروں اور پھیلے ہوئے قطعات آب سے ملکر آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے۔ راستہ کے خشک و گرم میدانوں کے دیکھنے کے بعد اچانک یہ سکون نظر خدا جانے کیسی نعمت تھا۔ میں اس منظر کی عزیمت سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا دشتِ نجد میں قیس اتفاقاً کہیں لیلیٰ کو پا گیا ہے اور صحرا کی وحشت و خشکی جو شاید اسی ملاقات کی منتظر تھی ایکبار گی رونق و سرسبزی خنکی اور تری میں تبدیل ہو گئی ہے!! وہ اِدھر اُدھر لا سبب کھڑے سبز کھجوروں کے جھنڈ، وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا زمردین سلسلہ، اور پھر اسپر قیامت چادر آب کی غیر متناہی شکنیں۔

ایک عرب خاتون، ایک مصری دوشیزہ کو ریل میں بٹھا کر اسطرف سے لیجاؤ، ممکن ہے وہ اپنے جذبات کو چہرہ سے ظاہر نہونے دے ممکن ہے کہ وہ اپنے سانسوں کے نظام میں کوئی فرق نہ آنے دے لیکن اسکی نازک کلائی پر ہاتھ رکھکر ضربات نبض کا شمار کرو تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ وہ یہاں عشق کرنا سیکھہ سکتی ہے، وہ یہاں اپنے اعضا میں خواہش سپردگی محسوس کرسکتی ہے، المختصر یہ کہ راستہ کی ساری خستگی کچھہ عجیب پرلطف انبساط ہوگئی اور سارے شدائد گرما محو ہوگئے کوئی آدہ گھنٹہ تک ریل انھیں قطعات عرب میں ہوتی ہوئی گذری، یہانتک کہ ساڑھے سات بجے آہستہ آہستہ ہوکر اُس سرزمین حسن وعشق، اُس بلدۂ شعر و موسیقی میں پہنچ گئی، جس کی تمنا میری ہستی کے اندر ایک الگ روح بنی ہوئی تھی، اور اس مقام کی وہی خصوصیت جس نے میرے دل کو تڑپا رکھا تھا آخر کار پیش نظر ہوگئی۔ پارسیوں کی صنف لطیف کا حُسن گو میرے لئے اجنبی تھا لیکن یہ خیال کہ "دبمبئی توان کا مسکن ہے" "دیہاں توان کی حکومت ہے" تصور کی ...... فراوانی سے تنگ آکر ہجوم حسن کا آرزومند تھا اور اس پرسش کا کس زبان سے شکریہ ادا کیا جائے کہ دادر اسٹیشن پر پہنچتے ہی اُس حسن کا ایک نہایت پاکیزہ و پرشباب نمونہ، میری بیخودی ووارفتگی کا ترانۂ خیر مقدم گا رہا تھا میں اس کو اپنا ہی خیر مقدم سمجھوں گا کیونکہ وہ میری گاڑی کے ٹھہرتے ہی اُٹھی اور میں اس کا وہ ترانہ ہی کہوں گا" کیونکہ اُترتے ہی میں نے اُس کی آواز قدم سُنی۔ آہ، کون جانتا ہے کہ حسن کی اگر کوئی زبان ہے تو صرف "موسیقی" ہے اور ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک

نطقِ موسیقی ہے جس کا سازِ نسائیت او رصرف "نسائیت" ہے وہ ہاتھ ہلاتی ہے گویا ہوا میں نقشِ ترنم بنا دیتی ہے چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشانِ موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔

آہ اے موجدِ عشق و محبت، صرف تیری ضرورت ہے، اڈیسن کا دماغ یہاں بیکار ہے۔ گرامو فون میں سونڈ بکس کی سوئی جب کارڈ کو چھوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارڈ نغمہ منجمد ہے۔۔۔۔۔۔
۔۔۔ آوازِ حسن کائنات کے ہر ہر ذرہ میں منقوش ہے، دل میں بجائے اُس سوئی کے اک پھانس ہو اور پھر وہ اُس ذرہ سے مس کرے، تو پتہ چلے کہ یہ تمثالِ نغمہ، یہ نقشِ بردارِ موسیقی اک محبت والے دل کا کس قدر محتاج ہے ـــــــــ اور اس لئے اے بمبئی میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے میرے خیر مقدم میں اپنے ہاں کے بہتر گیتوں میں سے اک گیت بھیجا۔

ضرورت تھی کہ اس وقت میں تنہا چھوڑ دیا جاتا اور بالکل آزاد، لیکن افسوس ہے کہ مجھے ابھی اور آگے جانا تھا اور یہاں گاڑی بدلنی تھی اسباب سنبھالنے میں مصروف ہوا، لیکن میں نے اپنے ایک دوست کو یہاں پہونچنے کی اطلاع اُسی وقت ایک کارڈ لکھکر دیدی۔ کہ ؎۔

اے رفیقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام

"دادر" بمبئی کا لوکل اسٹیشن ہے اور مجھے ماہم جانا تھا جو یہاں سے دو تین اسٹیشن اور آگے ہے خیر، اس دلنشین آفت، اس سکونِ جان قیامت کو جو پلیٹ فارم پر خراماں تھی "زندہ باد"، کہتے ہوئے رخصت ہوئے اور آدہ گھنٹہ میں ماہم پہونچگئے، جہاں مجسمۂ صدق و خلوص،

پیکرِ محبت و صفائی، مثیلِ حسنِ اخلاق مسٹر لطیف الدین احمد میری پذیرائی کے لئے موجود تھے۔

پانچ منٹ میں، ہم اُس جگہ پہونچگئے جہاں قیام کرنا تھا، افسوس ہے کہ مسٹر لطیف کی مشغول ومنہمک زندگی کو دیکھکر میں خوش نہ ہوا کیونکہ میری رائے میں حقیقتاً وہ اس کے لئے وضع نہیں ہوئے۔ لیکن ابھی اس تنقید کا موقع نہ تھا اور میں نے انکو اجازت دیدی کہ وہ جائیں اپنا کام کریں۔ اب مجھ سے اُنسے تین چار گھنٹہ کے بعد ملاقات ہوتی تھی۔ اسلئے میں بالکل تنہا رہ گیا اور لگا اطمینان سے بیٹھ کے یہ سوچنے کہ مدعی تو یہاں آکے بھی ویسا ہی زار و خراب رہا!!

یہ مکان اُس سلسلۂ آب کے کنارے ہے جو بمبئی کو جزیرہ بنا دیتا ہے اور اس لیئے یوں کہنا چاہئے کہ میں ساحل بحر پر تھا جہاں میری نگاہ کی پرواز کے لیئے ایک وسیع رقیق میدان موجود تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف بھی کھجوروں کے درخت کثرت سے موجود تھے اور وہی معصومیتِ منظر یہاں بھی پائی جاتی تھی۔

شام کو ہم اور مسٹر لطیف ریل میں بیٹھ کے چرچ گیٹ اسٹیشن گئے اور وکٹوریا میں بیٹھ کے اُس کارگاہِ حسن و جمال پر پہونچگئے جو ساحل اپالو کے نام سے مشہور ہے۔

ہاں، میں اُس کارگاہِ جمال و لطافت، اُس نزہت آبادِ حسن و نزاکت میں پہنچگیا جہاں مجھے اس سے بہت پہلے پہنچنا چاہیئے تھا۔

حسنِ عام اس سے کہ وہ ایک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور

اک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو، یا وہ نوع انسان کی ایک خاص جنس میں
پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے، فطرۃً اس امر کا مقتضی ہے
کہ حسن ہی اُس کا متلاشی ہو، جمال ہی اُس کی جستجو میں سرگرداں ہو جس طرح
نزاکت کا بار اُٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، بالکل
اسی طرح حسن کی معیت کے لئے حسن ہی پسندیدہ ہے۔ نازک پنکھڑیوں پر
ایک تیتری بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ایک حسین کی صبیح پیشانی پہ
صندل ہی کا قشقہ کچھ لطف دیتا ہے۔

معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کے خصوصیات مجھے بہت
پسند ہیں۔ وہ جاذب ہے اور یہ منجذب، وہ پسندیدۂ حسن ہے اور یہ
حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سنا ہے
کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی
گردن جھکاکے جھانک نہیں لیتی۔

بچہ اپنے لطف کے لئے بچوں ہی کا ساتھ ڈھونڈھتا ہے، کوئی
بوڑھا اُن میں بیٹھ ہی جائے تو کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ محفلِ رقص و سرود
میں مُغنیہ کی نگاہ وہیں پڑتی ہے جہاں نوجوانوں کا مجمع ہوتا ہے کوئی اُسی
کا ہمسن چھیڑ دے تو پھر دیکھئے کیسی مست ہو کر جواب دیتی ہے اور جہاں
کسی سن رسیدہ شخص نے کوئی بات کہی اور اُسکی طبیعت سرد ہوئی۔

حسن میں کشش ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر کھنچ جانیوالی چیز
مقبول بھی ہو سکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حسن کا مطلوب معنوی کون ہے،
کیونکہ حقیقتاً مطلوب حسن ہونے کی اہلیت رکھنا ہی وہ حسن ہے جو
ہماری رائے میں حسن اول کی معیت کا مستحق ہے موسم برشگال میں

افق کی سیاہی کا سریع نشوونما ہم بھی دیکھتے ہیں، چاروں طرف جوشِ سبزہ ہمیں بھی اچھا معلوم ہوتا ہے، باغوں کی فصیل پر طاؤس کا خرام ہمارے دل میں بھی گدگدی پیدا کرتا ہے، کویل کی مستیاں ہمارے دماغ پر بھی چھا جاتی ہیں، لیکن ایک رند سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ "میں تو بادل کا ایک ٹکڑا نظر نہ آئے ہمیشہ خشک سالی کے مصائب رفع کرنے کی کوششیں کیجاتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوگ شراب پینا شروع کر دیں کہ کبھی امساک باراں کی شکایت ہی نہ ہو" غرضکہ وہ اودی اودی گھٹاؤں کو دیکھکر بیتاب ہو جاتا ہے اور جب ہم مکان کی چھتیں دیکھا کرتے ہیں اُسیوقت وہ باہر جنگل میں سبزہ پر بیٹھکر جھوما کرتا ہے قطعاً وہ اس حُسنِ موسم کا مطلوب معنوی ہے اور وہی اُس سے لطف اُٹھانے کا اہل ہے، مظاہر قدرت کا محبوب اور حسن مناظر کے نزدیک حسین وہی ہے جو اپنے تئیں اُن میں محو کر سکے۔ کلی کے اگر زبان ہوتی تو وہ کہدیتی کہ "مجھے تو صرف ایک بھونرا چاہیئے جو ہر وقت مجھے لپٹا ئے رہے، مجھے پروا نہیں اگر وہ میرا سارا رس نکال لیتا ہے۔ ہرچند اسکا شوق اُسکے لیئے مایۂ حیات ہے لیکن میں خوش ہوں اگر میری بربادی اُس کی زندگی ہے کیونکہ اعترافِ محبت کا یہی ایک پسندیدہ طریقہ ہے"

اسی لیئے میں نے کہا کہ

یہاں میرا آنا بعد از وقت ہوا۔ دل میں ولولہ کی وہ فراوانی نہیں کہ حسن مناظر کے سامنے جی کھولکے اپنا وقت صرف کر سکوں، عنفوانِ شباب کی وہ رعنائی نہیں، حالانکہ غریب مرد کے صحیفۂ حیات میں یہی ایک تنہا عنوان تہدیہ Dedication عورت کے مطالعہ کے قابل ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں آنے کا مجھے بہت شوق تہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا پورا لطف اٹھانے کے لئے صرف اسقدر شوق کافی نہ تہا۔ حسن سے پوری طرح مستفید ہونیکے جذبات عرصہ ہوا کہ میں اپنی تمناؤں کے ساتھ سینہ میں دفن کر چکا ہوں اور اس لئے ضرورت تہی کہ حسیات بقیہ میں خاص تحریک پیدا کرنے کے لئے کسی محرک قابل کی شدید مواصلت نصیب ہوتی اور وہ کہاں ؟ لیکن پھر بہی باوصف ان تمام نقصانات طبیعت کے مجھے تباہ اور برباد کر دینا یہاں بہت آسان تہا، لیکن شکر ہے کہ مسٹر لطیف کی عدیم الفرصتی میری حیات کی ضامن ہو گئی اور میں زندہ وطن واپس آیا۔

جس وقت میں اپا کو پہنچا، تو میں متحیر تہا کہ کیا فی الحقیقۃ میں کسی ساحل بحر پر کہڑا ہوں ؟ یقین نہ ہوتا تہا کہ میں خشکی کا اسقدر حصہ طے کر کے یہاں آگیا ہوں جہاں سے قدرت کی یہ رقیق اعجوبہ نمائیاں شروع ہو کر دنیا کے تین چوتہائی حصوں پر قابض ہو گئی ہیں۔ ایک ہموار نگاہوں کے لئے ناقابل عبور سطح مواج ! یہ معلوم ہوتا تہا کہ فطرت کی وسعت تخیل نے ایک صورت اختیار کر لی ہے۔

میں سمجھتا تہا کہ اونچی اونچی لہروں کے ہیبت ناک غیر منقطع سلسلہ اور ایک سامعہ شکن شور کا نام سمندر ہے، لیکن میں یہ دیکھکر کیسا متحیر ہوا کہ وہ تو صرف ایک سکون ہے متحرک، ایک خموشی ہے متلاطم۔ ہاے وہ نرم نرم آواز ! یہ نہ پوچھو کہ ساحل کے لذایذ سرود میں بہی کیسی ڈوبی جاتی تہی۔ اُف وہ موجوں کی پرخم روانی ! ارے وقت وعارت جائے دیکھو اور سر دُھنو۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اور بعض بعض تو بالکل وہی ،، د ڈولت جائے،،

ایسی آزادی اور تیزی کیساتھ سمندر کے سینہ پر دوڑتی پھرتی تھیں کہ قوت بحر کی طرف سے اعتقاد دیکھ کر کمزور ہوتا نظر آتا تھا، لیکن جب ذرا فاصلہ پر ایک عظیم الشان جہاز سمندر کی ہر سانس کے ساتھ متحرک نظر آیا، اور اس سے اور دور روشنی کا مینار (بحری جگنو) اپنے ضیا کے قبض بسط سے نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا، تو سخت حیرت ہوئی کہ خدایا یہ قمار سکوں، یہ ذخار خموشی جو حقیقتاً پردۂ تلاطم، نقاب طوفان ہے کیونکر انسان کو ایسا جری و بیباک بنا سکی۔

جسوقت ہم ساحل پر پہنچے شام ہو چکی تھی۔ بجلی کی روشنی، جو صرف لب آب جگمگانے کے لئے وضع ہوئی ہے اور وہ لب آب جسپر اپالو اور چوپاٹی بجا طور سے فخر و ناز کر سکتے ہیں، سمندر میں پڑی تھرا رہی تھی اور تاج محل ہوٹل جو ہند کا بہترین نزل ہے معہ اپنی تمام روشنیوں و دلاویزیوں اور ارتفاع و شوکت کے پانی کے اندر ہچکولے کھاتا نظر آرہا تھا۔ کشتیوں پر کہیں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ کہیں ان سے اتر رہے دس جا رہی تھیں، تو بیس واپس آرہی تھیں۔ مختلف شکل و وضع کے لوگوں کا مجمع تھا، جن میں کوئی ٹہل رہا تھا، کوئی بیٹھا تھا۔ لیکن کیسی پُرلطف و تعجب انگیز بات تھی کہ اس مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کو جادۂ نظر دوسرے سے مختلف ہو، اک طوفانِ نظارہ تھا جو سطح آب پہ برپا تھا، اک سیلاب شوق تھا جو سمندر کی سیال خموشی کو محیط تھا۔

سُنا ہے کہ سمندر کی صبح و شام بہت پُرلطف ہوتی ہے، یعنی اگر صبح و شام کا اصلی حسن دیکھنا ہے تو آئینہ آب میں دیکھنا چاہیئے، اور اگر

سمندر کے مناظر سے حقیقی مسرت حاصل کرنا ہے تو وہ وقت تلاش
کرنا چاہئے جب آفتاب نہا کر نکل رہا ہو یا نہانے کے لئے اُس کے اندر
جا رہا ہو۔ چنانچہ نیچر نے اس کا انتظام یہاں اس طرح پر کیا ہے کہ وہ شاخ
بحر جو ساحلِ ریپالو بناتی [illegible] سے آفتاب کے غسل [illegible] کے لئے مخصوص
کر دی ہے اور ساحلِ چوپاٹی کے آغوش میں اسکا شام کا حمام بنا دیا گیا ہے
اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت میں ساحلِ ریپالو پر چل پھر رہا تھا،
آفتاب چوپاٹی میں نہا [illegible] جب یہاں کیا کر رہا تھا، ساری دُنیا یہاں کیا کر رہی
تھی؟ شاید آپ ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، [illegible] کہ [illegible]

جب سے شام کو ریپالو نہیں دیکھا، ماننے کے لئے تیار [illegible] حقیقت
سے انحراف کرونگا اگر اسکا اظہار نہ کروں کہ وہ شام جس کے مفہوم [illegible]
[illegible] تصورِ جزوِ اعظم ہے حقیقتاً یہاں آتی ہی نہیں، اور اگر آتی بھی [illegible]
تو صرف اس لئے کہ بجلی کی روشنیوں، حسن کی صباحتوں، [illegible] گوشے
مکھڑوں کے تبسموں، کھلی ہوئی بلوری گردنوں پر لٹکنے والے آویزوں کے
جھوٹے اور اسی قسم کی بہت سی نامعلوم یا سیمیں سپیدیوں میں اپنے تئیں
تحلیل کر دے۔ پھر اُردن کی روشنی میرے سامنے غایب ہو گئی تو میں
اُسے محسوس نہیں کر سکتا تھا کیونکہ حسن کی درخشانی نے اب اُس کی
جگہ لے لی تھی، اور اگر رات کی تاریکی شروع ہو گئی تھی تو مجھے اُسکا ہوش نہ
تھا کیونکہ الماس کے روشن ترین ٹکڑے کسی سینہ کے اُوپر سُرمئی دوپٹہ
کے نیچے اِس حُسن کے ساتھ میں جس حُسن کے ساتھ دوشیزہ لڑکیوں کی قطار
میں اس وقت آغوشِ شام میں جگمگا رہی تھیں۔ غرضکہ مجھے نہیں معلوم کہ
شام کب ہوئی اور اگر شام اُس کا نام ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ [illegible] شام

کی صبح سے آرزو کیونکر میرے دل میں جگہ پا سکتی ہے۔ بہرحال میرے لئے عجیب و غریب سامانِ حیرت و نشاط یہاں موجود تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس طرح اس منظر میں فنا ہو جاؤں —— وہی ہوا جو ابھی ابھی سینکڑوں زلفوں کے دوشیزہ نکہت کو چھو چکی ہے، مجھ تک بھی آرہی ہے! میرے لئے بھی مشام نواز ہے!! آہ، وہی بجلی کی روشنی جس میں حسن، ایسے حسن، اسقدر حسن کی جلوہ طرازیاں شامل ہیں، مجھ پر بھی پڑ رہی ہے، میرے رستہ عام پر بھی ضیا افگن ہے!! وہی زمین جس پر ایسے ایسے نازک پیروں کے نشانات دریں پرستش دے رہے ہیں، اُف، اُسی زمین پر میں بھی چل رہا ہوں۔ سر کے بل چلنا اک ناقص اظہارِ جذبات ہے اور خاک ہو کر وہی زمین میں مل رہنے کی تمنا تا ملک اعتراف یہ تخیل کر حیات، نفس حیات یعنی یہ زندگی، یہ متحرک حالت، ہمارے اُن کے درمیان اِک کیفیت مشترک ہے! آہ، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر اسکی قدر کی جائے، کس انداز سے اِس زندگی کا شکریہ ادا کیا جائے۔

ہر انسان اپنی جان کو عزیز سمجھتا ہے لیکن نہ اسقدر جتنا وہ انسان جو ساحلِ اپالو پر شام کو تفریح کے لئے نکل جاتا ہے یہاں سو کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہی جان جس کی طرف سے اسکو اِک نوع کا تغافل تھا، یہاں اِک مستقل حسن ہے، اِک نیرنگ ہے، مگر ہاں فرق یہ ہے کہ ہماری آنکھوں میں وہ صرف اشک ہے اور اُنکی آنکھوں میں اِک جنبشِ سحر انگیز، ہمارے سینوں میں وہ صرف آہ و فغاں ہے اور اُنکے سینوں میں شاہانہ غرور و تمکنت، ہمارے جسم میں وہ صرف عجز و فتادگی ہے اور اُنکے قدموں میں جمال رعنائی +

ناپائداریٔ دنیا

جہاں رباطِ خرابست برگذرگہ سیل

غنچہ و گل کھلا کر کھلانا، شبنم کا نمودار ہو کر غائب ہونا، بہار کا خزاں سے وابستہ رہنا، صبح ہو کر شام ہو جانا، چاند کا بڑھ کر گھٹ جانا، ہمیں اِس دہر ناپائدار کی اصلیت کو صاف بتا رہا ہے۔

اے گندم نما جو فروشس دُنیا! تیری خوش رنگا رنگینیاں، تیرے اشکالِ عجوبہ کی نو اظہاریاں، تیرے طلسماتِ جدیدہ کی سحر آفرینیاں، تیرے دلربا و دلجو شکن مناظر کی خوبیاں، تیرے پُرزور مقناطیسی اثرات، تیرے حسین وجودوں کی کششِ حسن و ادا، ایک عالم کو تیرے دام بلا میں پھنسانے کو کافی لیکن افسوس صد افسوس! تیری اصلیت فنائیت، تیرا وجود نابود، تیری ہستی نیستی، اور تیرا ہونا نہ ہونیکے برابر ہے۔ تیری ہر شے ہر کام بے اصل و ہیچ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تجھے بقا نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ تیری فنائیت کا راز پا کر بھی تیرے شیدائی، ظلم و تشدد کے نمونے۔ بیرحمی و سرکشی کے پتلے، حرص و ہوا کے متوالے ابدالآباد سمجھتے ہیں اور تجھ پر شیدا و مفتوں ہیں اور نہیں سمجھتے کہ۔

شکاریم یکسر ہمہ پیشِ مرگ

ہاں اسے بے وفا ناپائدار دُنیا ہماری چشم عبرت ہوشیار و خبردار ہے ہمارے گوش حسرت سُن چکے ہیں کہ تجھ میں بڑے بڑے شریف النفس، با وقار،

اولو العزم شہنشاہ ... ہزار ہا نازنینانِ جہاں حسرتِ فنا ہو جانے کو پیدا ہوئے اور ہمکو خوب معلوم ہے کہ ہزار ہا ہستیاں عالمِ ہیولانیت کی حسرت ہیں ، نیست و نابود ہو جانیکی منتظر ہیں۔ تیرا ہر ذرہ نیستی و فنائیت کی سیدھی راہ ہے۔

آہ! اگر تیری ہستی کا کچھ بھی قیام و اعتبار ہوتا تو آج بڑے بڑے شاہیر و ناموران زماں کا کچھ پتہ لگتا لیکن افسوس!

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

اے بیرحم و سنگدل دُنیا، تونے بڑے بڑے سیم تن، نازکبدن، خوش ادا باحیا و پاکباز حسینوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں پالا، پرورش کیا۔ اور پھر اپنے ہی نازپروردوں کو زمانے کے اُس شہ زور پنجہ تظلم و تشدد میں دے دیا کہ جنے اُن نازک تنوں کو خاک میں ملاکر چھوڑا اور آج خفتگانِ زیرِ زمین کا نام و نشان تک نہیں ملتا چشمِ عبرت اُن نازک بدن حسینوں کے مرقد و نیر چار آنسو بہانے کو ملیا ہے اور عبرت و تنبیہ زبانِ حال سے گویا ہے۔

خوشی سے دیکھیو حرکت میں آئیو نہ بہت
زمین تجھ میں ہزاروں حسین سوتے ہیں

چمنستانِ دہر میں کونسے پھول کھلے جو کمہلا نہ گئے، آہ! وہ ننھے ننھے پودے جو بہار کے زیرِ سایہ آغوشِ چمن میں، بادِ نسیم نرم نرم جھوکونسے بصد وقت و مشکلات پلکر بڑھے، افسوس کہ انقلابِ زمانہ کے ہاتھ سے رہائی نہ پا سکے، بادِ خزاں کے تھپیڑوں سے کے متحمل نہ ہوکر کمہلا گئے اور اُس چمن آباد کو جو فخرِ جناں تھا ویران و برباد بنا گئے۔

کدام بادِ بہاری وزید در آفاق ۔۔۔ کہ باز در پیش آفتِ خزانی نیست

حباب ہستی کو بحر جہاں میں فنائیت کے طوفان سے امن نہیں عالم ہیولا سے عالم وجود میں نمودار ہونا نیستی و فنائیت کے لیئے تیار ہوتا ہے۔ کاروانسرائے دُنیا میں قیام پذیری ملک عدم کو بسانے کی تیاری ہے۔

افسوس اِس ہستی و نیستی کی حقیقت، اِسکا مقصدِ اصلی، اِسکا رازِ مخفی باشندگان عالم بقاسے ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے شاید کہ رہروانِ ملک عدم ہی کچھہ بتا سکیں پس ملتجی ہیں کہ۔

دُنیا سے جانے والو کچھہ تم ہی بتاتے جاؤ
اِس دشتِ غم میں کس لئے آئے تھے کیوں چلے

آہ! معلوم ہُوا کہ اِس کاروانسرائے ہزاروں گھر بگڑ جانے کو بنے، ہزاروں خاندان مٹ جانے کو ہوئے، ہزاروں آبادیاں برباد ہونیکو ہُوئیں افسوس! اے دُنیائے فانی کوئی تجھہ میں پھول پھلکر نیست و نابود ہونے سے نہ بچ سکا، کوئی خوشی و راحت مبدل بہ رنج و کلفت ہونے سے نہ رُک سکی۔ تیری اصلیت دیکھلی، اے بے ثباتی دنیا تیرا انجام دیکھ لیا۔ اے ویرانہ آباد دنیا تجھہ میں نیستی و فنائیت کے سوا کچھہ نہیں **شعر**

بسی گورِ غریباں جب کسی کا گھر ہُوا ویراں
مسافر پڑ کے سوئے جاگ اُٹھی تقدیر منزل کی

نصیر الدین احمد

طبیب یہ رسالہ طبیب ہفتہ وار کا بدل ہے جو حکیم علی رضا کی ایڈیٹری سے شائع ہوتا ہے اسکی نسبت ہمکو کچھہ کہنے کی ضرورت نہیں ملک کو جسقدر اس قسم رسالوں کی احتیاج ہے وہ ناقابل اظہار ہے ہمیں مسرت ہوئی کہ طبیب پھر زندہ ہو گیا خدا کرے وہ مسیحا نفس ثابت ہو قیمت کے لحاظ سے لکھائی چھپائی اچھی ہے حکیم علی رضا کو چھپلان ملی سے

اعتزال

(از حضرت نیاز فتحپوری)

آج کل مسلمانوں میں جہاں اور بہت سی اعتقادی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، وہاں معلومات کی خامیاں بھی بہت ہیں، اور غالباً یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ معلومات کی کمی بڑا سبب اُن اعتقادی کمزوریوں کا ہے، بہت سے الفاظ ہم ایسے بولتے ہیں، جن کا مفہوم اپنے پندار میں صحیح سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مفہوم بالکل غلط ہے، اور اس لیئے اُس مفہوم کے لحاظ سے جو نتائج ہمنے نکالے ہیں، وہ بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہمارے اذہان ایک اضطراری صورت میں اُس لفظ کے نکلتے ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور ہم اُس تاثر کی وجہ سے جس کی علت ہی شروع سے بالکل بے بنیاد ہے، بعض دفعہ ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں، جو ہرگز ہمارے شایاں نہیں ہے، اور غالباً ہم اُسے نہ کرتے، اگر ہماری معلومات وسیع ہوتی، آجکل جبکہ مذہبی اعتقادات نے کچھ عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے، اور مذہب کو خدا معلوم کیا سمجھ رکھا ہے، بہت ضرورت اس امر کی ہے کہ بعض ایسے اُمور پر روشنی ڈالی جائے، جن سے وہ غلط فہمی دُور ہو، اور عام پبلک اس بات کے سمجھنے کا شعور پیدا کرے کہ جو کچھ مُنہ سے کہا جائے، پہلے اُس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے، مسلمانوں کے اُس طبقہ میں بھی جو معمولی پڑھا لکھا ہے غالباً کوئی فرد ایسا نہیں جو الفاظ اعتزال و معتزلی سے واقف نہ ہو، لیکن اگر کسی سے سوال کیجئے کہ اعتزال کیا ہے اور معتزلی کسے کہتے ہیں تو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکیگا کہ اعتزال دہریت کو کہتے ہیں۔ اور معتزلی دہریہ کو۔ پھر دہریت اور

دہریہ کی نسبت پوچھیے تو وہ جھنجلا کے نہایت صاف الفاظ میں کہہ دیگا کہ کیا بے دین آدمیوں کا ذکر کرتے ہو۔ غرضکہ اس نشر کرنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ معتزلی اُن کے پندار میں بے دین ہے اور اسلام سے خارج۔ لیکن اگر اُس شخص کو کسی طرح یقین دلا دیا جائے کہ جو کچھ وہ سمجھا ہے صحیح نہیں ہے۔ یا کسی معتزلی کو اسلام سے خارج کر دینا نا درست ہے تو اُسکو اپنے علم و یقین میں کس قدر محجوب ہونا پڑے گا۔

لہذا آج کی اشاعت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اعتزال کسے کہتے ہیں اور معتزلی کس چیز کا نام ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اعتزال کی بنیاد صحابۂ کرام کے اخیر زمانہ میں پڑی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے اُس کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ جس کی تصریح آگے آئے گی۔ اُسوقت تک کہ آنحضرت کی ذات مقدسہ اس عالم میں رہی۔ مذہب نہایت اجمالی اور سادہ حالت میں رہا۔ عقاید کی تنہا تعلیم کلمہ توحید کا پڑھا دینا تھا اور اعمال کی نسبت فرائض خمسہ سے آگاہ کر دینا بس کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد مبارک میں جبکہ مبتغ حقیقی موجود تھا۔ اِس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی اور نہ علایق کی وسعت نے اسلام کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مذہب کی نسبت کچھ جاننے یا جاننے کی کوشش کرے۔ آنحضرت کے بعد جب اسلام کا دوسرا دور شروع ہوا اوسوقت بھی مصروفیت کا وہی عالم تھا کیونکہ روم و فارس کے معرکے پیش نظر تھے۔ اور کوئی صورت نہ تھی کہ فرزندانِ عرب کے دماغی و عملی انہماک کا رجحان کسی دوسری طرف ہوتا۔ لیکن جب اسلام نے زیادہ وسعت اختیار کی اور دوسری قومیں اسمیں آآکر شامل ہونے لگیں تو وہ زمانہ آیا جب اعتقادات و اعمال کے متعلق نسبتاً کچھ زیادہ غور و تعمق کی ضرورت پڑی۔ اور یہی وہ ضرورت تھی جسنے ابتدائی تعلیم کی وہ سادگی چھین لی۔ اور مذہب میں عقل کا درخور شروع ہوا۔

چنانچہ صحابہؓ کے زمانہ تک اعتقادات میں جو اختلاف ہوئے اُنہیں سے چند یہ ہیں۔

(۱) اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قایل تھے۔ حضرت عایشہؓ کو اس سے انکار تھا

(۲) عبداللہ بن عباس کا یقین تھا کہ رسول اللہ نے خدا کو دیکھا۔ حضرت عایشہؓ کا عقیدہ اسکے خلاف تھا +

(۳) ابوہریرہؓ اس بات کے قایل تھے کہ رونے پیٹنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے حضرت عایشہؓ مخالف تھیں +

(۴) عبداللہ بن عمر سماع موتےٰ کے قایل تھے (یعنی اس بات کے کہ مُردہ سُنتا ہے) اور بعض صحابہ اس کے خلاف تھے +

اور پھر عقاید میں ہی نہیں۔ اعمال میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ چنانچہ وضو اور مسایل وضو میں مختلف صحابہ کے اقوال تھے۔ مگر ان جزئی اختلافات سے کوئی ایسی تفریق نہیں کی تھی۔ جس سے یہ حکم لگایا جاتا کہ مذہب کے دو یا زاید فرقے ہوگئے ہیں۔ سب مسلمان تھے اور مسلمان سمجھے جاتے تھے +

اب حضرت علیؓ کا آخر زمانہ آیا (شاید ۳۸ سنہ ہجری) جب انھوں نے حَکَم کے فیصلہ سے اتفاق کرکے امیر معاویہ سے صلح کر لی۔ لیکن خود انہیں کے بہت سے ساتھیوں نے اس صلح سے روگردانی اختیار کی۔ مذہب میں لا حکم الا اللہ حق و باطل کی تمیز میں ثالث کا فیصلہ کیا؟ چونکہ انھوں نے جمہور مسلمانان سے انحراف کیا۔ اسلیئے یہ لوگ حضرت علیؓ کے دایرہ سے خارج سمجھے گئے۔ اور اسطرح اسلام میں اول اول دو فرقے پیدا ہوگئے۔ یعنی وہ لوگ جو حضرت علی سے علیحدہ ہوگئے خارجی سمجھے گئے اور وہ جو اون کے ساتھ رہے شیعہ سمجھے گئے۔ اور حقیقتاً یہ وہ تفریق تھی جس کے اندر بالکل پالٹکس یا کلام [illegible]

اسکے بعد بنو امیہ کا زمانہ شروع ہوا۔ اور وہ وقت آیا جب مذہب کی آڑ میں حکمرانی کی ہوسیں پوری کی گئیں۔ اور استحکام سلطنت کے لیئے سخت خونریزیاں اور سفاکیاں ہونے لگیں۔ ہرچند عرب میں وہ آزادی تو باقی نہیں رہی تھی جو رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں تھی۔ تاہم اس قدر جرأت تھی کہ وہ افسرانِ سلطنت سے کبھی کبھی سوال کرتے تھے کہ "تم مسلمان ہو کر کیونکر یہ خونریزیاں روا رکھتے ہو" جسپر انھیں یہ جواب ملتا تھا کہ "ہم کچھ نہیں کرتے ہیں۔ جو کچھہ کرتا ہے خدا کرتا ہے" چنانچہ انھیں سوال کرنے والوں میں ایک شخص معبد جہنی بھی تھا۔ وہ حضرت حسن بصری کی خدمت میں گیا اور اس مسئلہ کی نسبت کہ کیا "القدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" کے یہی مطلب ہیں۔ اُن کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ "کذب اعداء اللہ" (خدا کے دشمن جھوٹے ہیں) یہ تھی اعتزال کی اصلی بنیاد۔ اور یہ تھا اُسکا مختصر سا فسانہ جس نے آگے چلکر دنیا میں بڑا اثر پیدا کیا۔ اور اک مستقل جدا مسلک ہو گیا +

چنانچہ سب سے پہلا مسئلہ اعتزال جس سے مذہب اعتزال کی تاریخ شروع ہوتی ہے یہی مسئلہ قدر ہے کہ "انسان جو برائیاں کرتا ہے وہ خود کرتا ہے، خدا نہیں کراتا"

اور اسی بنا پر معتزلین کو قدریہ بھی کہتے ہیں معبد جہنی نے سب سے پہلے اس مسئلہ کی اشاعت کی، اور اس فرقہ کا نام قدریہ رکھا، کیونکہ خدا کا عادل ماننا اسی اعتقاد پر مبنی ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار مانا جائے۔ چونکہ معبد جہنی حکومت بنی امیہ کا شدید مخالف تھا، اور اس مسئلہ کا تعلق بھی یک گونہ پالٹکس سے ہے اسلیئے عبدالملک بن مروان نے ۸۰ھ میں حجاج کے ہاتھ سے اُسکو قتل کرا دیا، اور اسطرح اس بانی اعتزال کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، لیکن ابھی تو اس

مذہب کو بہت ترقی کرنی تھی اس لیئے معبد کے بعد غیلان دمشقی نے جو قبطی النسل تھا۔ اس مسئلہ کو رواج دیا، اور اسکے ساتھ ہی ایک مسئلہ اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر کا شامل کر لیا، مگر یہ مسئلہ اور بھی حکومت کے خلاف تھا، اور یہ نہایت بے باکی سے اعلان کرتا تھا اسلیئے ہشام بن عبدالملک نے دمشق بلاکر اسے پھانسی دیدی۔ ہرچند معبد و غیلان بہت کم زندہ رہے لیکن اسی قلیل زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے یہ مذہب قبول کر لیا۔ اور اسکے اصول قلمبند ہوکر شائع کئے جانے لگے۔ ۔ ۔ ۔ قبل اسکے کہ ہم غیلان کے بعد کے حالات لکھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معبد جہنی کے اس پرجوش و سرگرم ارادتمند کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں تاکہ یہ آسانی سے معلوم ہو سکے کہ بانیان اعتزال کی اخلاقی حالت کیا تھی جو خلاصۂ تعلیم اسلام ہے۔ یہ ابھی ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ قبطی النسل تھا اور دمشق اسکا مسکن تھا۔ اس نے علم کلام تکمیل حسن بن محمد بن حنفیہ سے کی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کے ایسے مشہور علماء و اکابر حکماء میں سے تھا کہ حسن بصری جب اسکو دیکھتے تو کہتے کہ "اتورن ھذا دھو حجۃ اللہ علی اھل الشام"، یعنی یہ شخص اہل شام کے لیئے اللہ کی حجت ہے۔ پھر یہی نہیں کہ ظاہری علوم کا ماہر ہو، زہد و تقویٰ، اور اعلائے کلمۃ اللہ میں بھی ایسا بیباک و آزاد تھا کہ اُس زمانہ میں بھی اوس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ چنانچہ اوسکی وہ تحریر دیکھنے کے قابل ہے۔ جس میں اوس نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو لکھا ہے کہ:۔

"خدا نے اسلام کی امامت کی دو تقسیمیں کی ہیں یعنی بعض امام تو ایسے ہیں جن کی نسبت فرماتا ہے کہ "وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا"، اور بعض امام ایسے ہیں جن کی نسبت "وجعلنا ھم

ائمۃ یدعوت الی النار" فرماتا ہے، پس سمجھ لو کہ تم کس تقسیم میں ہو۔
اُمت تم سے نجات پانے والی ہے یا ہلاک ہونے والی"

پھر جس وقت عمر بن عبدالعزیز نے اُسے بلا کر کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نظام سلطنت میں میری مدد کرو اور کوئی خدمت قبول کرو، تو اوس نے صاف کہدیا کہ مجھے سارے توشہ خانے سپرد کر دیجیے، تاکہ جتنی فضول و نمایشی چیزیں ہیں اون کو بیچکر روپیہ لوگوں کو واپس دیدوں، یہ منظور کیا گیا، اور وہ مہتمم توشہ خانہ بنا دیا گیا۔ اُس نے اِس خدمت کو ہاتھ میں لیتے ہی وہی کرنا شروع کیا جو اُسنے کہا تھا۔ چنانچہ صرف ریشمین موزے جو اِس غرض سے باہر نکالکر رکھے گئے تھے۔ ان کی قیمت تیس ہزار درہم تھی۔ غیلان ایک ایک چیز کو اٹھاتا جاتا تھا۔ اور بآواز بلند کہتا جاتا تھا کہ:۔

"آؤ اُن کے مال پر جو خاین تھے، آؤ اُن کے مال پر جو ظالم و غاصب تھے، آؤ اُن کے مال پر جو رسول خدا کے بعد اُسکی سیرۃ و سنت کو بھلا بیٹھے، لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت و ایمان کے پیشوا اور دین و ملت کے امام تھے حالانکہ مسلمان اُن کے ظلم و ستم کی بدولت تنگدست و پریشان ہیں"

ھشام بن عبدالملک نے جب وہ تخت نشین ہوا۔ یہ سب باتیں سُنی اور ارادہ کر لیا کہ اِس شخص کو جو اُسکے اسلاف کے [illegible] سے پورا آدمی و دلیری سے بیان کرتا ہے، زندہ چھوڑنا قرین [illegible] نہیں ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ ایک دن جبکہ غیلان اپنے شاگرد صالح [illegible] کے ساتھ ملک آرمینیا جا رہا تھا ہشام کے سپاہیوں نے دونوں گرفتار کر لیا [illegible] قید میں رکھنے کے بعد اُس کے ہاتھ پاؤں کٹوا [illegible] کہ خون کے فوارے جاری تھے اور [illegible] تھا۔

"خدا انہیں ہلاک کرے، یہ وہ لوگ ہیں جو حق کو مردہ اور باطل کو زندہ کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو عزت دیتے ہیں اُن لوگوں کو جنکو اللہ نے ذلیل کیا، اور ذلیل کرتے ہیں اُن کو جنہیں خدا نے عزت دی"

ہشام سے ایک مصاحب نے کہا کہ اسکی فصاحت نے لوگوں کو رُلا رکھا ہے ضرورت تو زبان کاٹنے کی تہی۔ چنانچہ اوس کی زبان بہی کاٹ دی گئی اور وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بعد کو پھانسی کے ذریعہ سے اُسکی جان لی گئی۔

بہرحال اِس مختصر بیان سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ کتنا سچا مسلمان کیسا مستحکم عقیدہ رکہنے والا مومن تہا۔ حقیقت وخلافت کے اعلان میں کس عجب دلیر و بیباک اور پاکیزگی اخلاق کا کیسا اچھا نمونہ تھا۔

غرضکہ جب معبد و غیلان دونوں نہ رہے، تو خیال یہ تھا کہ اُن کی یادگار قایم رکھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ لیکن خدا کی شان اسی زمانہ میں دو شخص اور نمودار ہوگئے۔ جنہوں نے علم اعتزال کو اپنے ہاتھ میں لیکر اور زیادہ شہرت دی۔ یہ عمرو بن عبید اور واصل بن عطا تھے جو ایک ہی سنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا حال بہی ذرا تفصیل سے سننے کے قابل ہے +

(۱) عمرو بن عبید کی کنیت ابو عثمان تھی۔ اور اسکا باپ عبید بصرہ میں سپاہی تھا۔ عمرو کی طبیعت شروع ہی سے زہد و عبادت کی طرف راغب تھی حالانکہ اسکا باپ ایک رند مشرب سپاہی وضع آدمی تہا۔ جب باپ بیٹے دونوں باہر نکلتے تو لوگ کہتے "دیکھو کیا اللہ کی شان ہے، عبید سے جو شر الناس ہے۔ عمرو کو پیدا کیا جو خیر الناس ہے۔ عبید سُنتا تو کہتا "ہاں تم لوگ سچ کہتے ہو۔ یہ ابراہیم ہے اور میں آزر ہوں۔ جاحظ کا بیان ہے کہ عمرو نے چالیس برس تک صبح کی نماز

مغرب کے وضو سے پڑھی اور چالیس حج پیدل چلکر کیئے، وہ دنیا اور اہل دنیا سے بالکل مستغنی تہا، اور اسی بے نیازی کی وجہ سے وہ بڑا حق گو تہا، چنانچہ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر امیر عراق نے اپنے بصرہ کے عامل شبیب کو لکھا کہ اپنے شہر کی جماعت علمار کو میرے پاس بہیجو۔ جس میں عمر بن عبید کا ہونا ضروری ہے، شبیب نے بلا کر ان سے کہا کہ جائیے، انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ "تم جانتے ہو عبداللہ بن عمر کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ تمہارا حاکم کیسا ہے، اور تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری نسبت اُس کے جواب میں کیا کہوں گا،

ایک واقعہ اور خلیفہ منصور عباسی کے عہد کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کیسا عجیب و غریب شخص تہا۔ جب منصور تخت نشین ہوا تو عمر کو بلا کر اپنے برابر مسند پر بٹھانا چاہا، لیکن وہ نہیں بیٹھا اور جو نصیحت اُس نے کی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے،

"یہ حکومت جو آج تجھے نصیب ہے۔ تجھ سے پہلے کسی اور کے پاس تہی، یاد رکھ کہ اگر دولت و حکومت کسی کے ساتھ وفا کرتی تو تجھ تک نوبت نہ آتی۔ اسلیئے آج کی رات اُس دن سے ڈر جس کے بعد کوئی رات نہیں ہے"

جب عمر دربار سے اُٹھنے لگا تو منصور نے کہا میں نے آپکے لیئے دس ہزار درہم کا حکم دیا ہے۔ عمر نے جواب دیا مجھے اُسکی حاجت نہیں، منصور نے کہا "قسم خدا کی آپ کو یہ نذر قبول کرنا پڑے گی" عمر نے کہا "قسم خدا کی میں کبھی منظور نہیں کروں گا" یہ سُن کر منصور کا بیٹا مہدی بول اُٹھا کہ "افسوس تم امیر المومنین کی قسم پر قسم کھاتے ہو" عمر نے منصور سے پوچھا یہ کون ہے۔

اُس نے جواب دیا کہ یہ میرا بیٹا (ولی عہد) مہدی ہے۔ عمر نے کہا "واللہ تم نے اسکو وہ لباس پہنایا ہے جو شریفوں کا لباس نہیں ہے۔ اور ایسا نام رکھا ہے جسکے لائق وہ نہیں ہے پھر مہدی سے مخاطب ہوکر کہا کہ "یہ تیرا باپ قسم کا کفارہ ادا کرسکتا ہے۔ لیکن میں نہیں کرسکتا" اس کے بعد منصور نے پوچھا کہ کوئی حاجت تو فرمایئے۔ عمر نے جواب دیا کہ "بس اب آیندہ مجھے دربار میں بلانے کی زحمت نہ اُٹھائی جائے" منصور نے کہا تو اب میں آپ سے نہ مل سکونگا" عمر نے کہا "ہاں بس میری حاجت یہی ہے" اور یہ کہکر چلدیا۔

راستبازی میں وہ اس درجہ مشہور تھا کہ ملکی معاملات میں بھی نہایت خطرہ کیوقت اُس کی بات کا اعتبار کیا جاتا تھا، چنانچہ جب نفس ذکیہ نے منصور پر خروج کیا اور بصرہ آیا تو منصور کی خبر لگی اور سیدھا بصرہ جا پہنچا لیکن نفس ذکیہ چلا گیا تھا منصور کو سخت تشویش تھی کہ ٹھیک پتہ کیسے معلوم ہو اتفاق سے عمر کے دوست زبردستی گھسیٹ کے منصور کے پاس لے گئے۔

اُس نے فوراً عمر سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص بصرہ میں ایسا ہے جس سے ہماری حکومت خطرہ میں ہو۔ عمر نے کہا "نہیں" منصور یہ سنتے ہی نہایت اطمینان سے واپس چلا گیا۔

ایک شخص نے عمر سے مسئلہ قدر پر بحث کی۔ اُس نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں جو کچھ خدا نے فرمایا ہے وہ مسلمانوں کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔ خدا نے فرمایا ہے "فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ" یعنی ہم اُن سے اُن کاموں کا سوال کرینگے جو وہ کرتے تھے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ ہم نے ان کی تقدیر میں لکھدیا ہے اسکا سوال کرینگے، اور اس سے خدا کا عدل اور انسان کا اپنے افعال پر مختار ہونا ثابت ہوتا ہے مُلّے

کسی کی ملامت و تعریف کی بھی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ اُس سے ایک شخص نے کہا، مجھے تمپر رحم آتا ہے۔ جب لوگ تمہیں بُرا کہتے ہیں۔ عمرو نے کہا، کبھی تم نے میری زبان سے بھی ان کی نسبت سُنا ہے۔ جواب ملا "کبھی نہیں"، عمرو نے کہا پھر تمہیں اُن کی حالت پر رحم آنا چاہیئے نہ کہ مجھ پر۔ اِس نے چونسٹھ برس کی عمر پائی، اور بڑے بڑے نامور شاگرد جیسے خالد بن صفوان طلحہ بن زید، ابراہیم بن یحییٰ (جو امام شافعی کے اُستاد تھے) وغیرہ اپنے بعد چھوڑے، غالباً اِس کا حال بیان کرنے کے بعد ہمیں اسباب کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیسا شخص تھا۔ یا یہ کہ وہ مسلمان بھی تھا یا نہیں +

عمرو بن عبید کے ساتھیوں میں واصل بن عطا بھی تھا، یہ بھی اُسی سال پیدا ہوا تھا جس سال عمرو عالم وجود میں آیا۔ اِسکی کنیت ابو حذیفہ تھی اور لقب غزال۔ ہرچند اس کی پیدایش مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ لیکن تعلیم و تربیت بصرہ میں ہوئی اور وہیں یہ جوان ہوا۔ یہ اپنے زمانہ کا ایسا فاضل اجل تھا کہ سارے عرب میں اِس کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل تھی، وہ اتفاق سے الثغ تھا (یعنی حرف ر اُس سے ادا نہیں ہوسکتا تھا)، اور اسی لیئے اکثر خاموش رہتا تھا۔ مگر اُسکی قادر الکلامی اور ادبی مہارت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی مجالس و مجامع میں خطبہ دینے کھڑا ہو جاتا تھا تو باوصف اس کے وہ نہایت روانی و بیساختہ پن سے بولتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کہیں دوران تقریر میں حرف ر آجائے۔ چنانچہ ایک شخص نے اُس سے سوال کیا کہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ گھوڑے پر زین کسو تو "اسرج الفرس" کی جگہ تم کیا کہوگے۔ واصل نے فوراً کہا "البد الجواد"، پھر ایک شخص نے پوچھا کہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ "وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے نیزہ کو تانا"، تو "رکب فرسہ

وجوہ اس صحبت کی جگہ کیا کہو گے۔ اُس نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں کہونگا "استوی علی جوادہ وسحب عاملہ" اور یہ خصوصیت اس کی ایسی مشہور ہوگئی تھی کہ شعراء اپنے قصائد میں اسکا ذکر کرنے لگے، چنانچہ ابو محمد خازن نے اپنے ممدوح کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُسکا ایک شعر ہے کہ

نعم تجنب "لا" یوم العطاء کما
تجنب ابن عطاء لثغة الراء

(یعنی میرا ممدوح فیاضی کے دن "نہیں" کہنے سے ایسا ہی بچتا ہے، جیسا واصل بن عطا الثغ ہونے کی وجہ سے حرف ر سے بچتا تھا)

اس نے علم کلام ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ سے سیکھا تھا۔ چونکہ وہ اکثر خاموش رہا کرتا تھا۔ اسلیے لوگ گونگا سمجھنے لگے تھے، لیکن اُسکے علم و فضل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن عمرو بن عبید کے پاس جا نکلا۔ عمرو نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ "لوگ اُسے گونگا سمجھتے ہیں، حالانکہ شیعہ، خوارج، ملاحدہ، اور دہریہ وغیرہ کے مذہبی عقاید و اصول کا جاننے والا اور دلایل سے اُن کا رد کرنے والا شخص اگر کوئی دنیا میں ہے تو واصل بن عطا رہے"!

اس نے اپنے شاگردوں کو چاروں طرف خراسان و افریقہ، کوفہ، و آرمینا کی طرف بھیجا۔ اور مذہب اعتزال کو شہرت دی، تھوڑے ہی عرصہ میں اعتزال کا اثر ان تمام ممالک میں دوڑ گیا۔

واصل و عمرو دونوں حسن بصری کے حلقۂ درس میں بمقام بصرہ شریک ہوا کرتے تھے، وہ زمانہ وہ تھا جب خوارج کے اس مسئلہ کا کہ "گناہ کبیرہ کا

مرتکب کافر ہے،، بڑا زور شور تہا، حسن بصری کی مجلس میں جب اسکا ذکر آیا تو واصل نے کہا کہ میں تیسری شق اختیار کرتا ہوں یعنی ،، گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ مسلمان،، اسپر حسن بصری نے اظہار غصہ کیا اور یہ دونوں وہاں سے اٹھ آئے اور اسی مسجد میں اپنا دوسرا حلقۂ درس قایم کیا۔ حسن بصری کے حلقہ سے الگ دیکھ کر لوگوں نے انہیں معتزلہ کہنا شروع کیا اور اس لقب کے ایجاد کا یہ پہلا دن تہا، اسکا ایک مناظرہ عمر بن عبید سے بڑا پر لطف ہی:۔

،،ایک روز حسن بصری کے درس گاہ میں واصل و عمر دونوں موجود تھے واصل نے عمر سے کہا کہ تم گناہ کبیرہ کرنے والے مسلمان کو منافق کیوں کہتے ہو،،

عمر:۔ ،،اس لیئے کہ خدا فرماتا ہے ،، والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهدآء فاجلدوهم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا واولئك هم الفاسقون اور دوسری جگہ فرماتا ہے ان المنافقین هم الفاسقون اسلیئے ہر فاسق منافق ہے، کیونکہ فاسق پر الف لام تعریف کا داخل ہے،

واصل:۔ خدا تو یہ بھی فرماتا ہے کہ ،، ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون ۝ اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ صاحب کبیرہ کو ظالم کہہ سکتے ہیں۔ جیساکہ اُسے فاسق کہہ سکتے ہیں۔ پھر تم نے خدا کے اس قول سے کہ ،، الکافرون هم الظالمون صاحب کبیرہ کی تکفیر کیوں نہیں کی جبکہ یہاں بھی لفظ ظالم پر الف لام تعریف کا داخل ہے۔ پس جس طرح تم یہ نتیجہ نکالتے ہو کہ ہر فاسق منافق ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہو کہ ہر ظالم یعنی مرتکب کبایر کافر ہے، حالانکہ تمام علماء اسپر متفق ہیں کہ صاحب کبیرہ کافر نہیں ہے،،

عمرؔ یہ سُنکر چپ ہوگیا۔ پھر واصل نے کہا "اہل قبلہ کے مختلف گروہ جس بات پر متفق ہیں وہ قابل تسلیم ہے یا جس میں اُن کا اختلاف ہے"! عمرؔ نے جواب دیا کہ "وہی بات قابل تسلیم ہے جسپر سب کا اتفاق ہو" واصل نے کہا "تمام اہل قبلہ صاحب کبیرہ کو فاسق کہنے میں متفق ہیں، چنانچہ خوارج مرتکب کبیرہ کو فاسق مشرک کہتے ہیں بشیعہ فاسق کافر نعمت کہتے ہیں حسن بصری فاسق منافق کہتے ہیں اور مرجیہ فاسق مومن"، پس فاسق کہنے میں سب کا اتفاق ہے، اور باقی ناموں میں اختلاف ہے اسلیے متفق علیہ نام فاسق اختیار کرنا چاہیئے۔ پس صاحب کبیرہ کو نہ مومن کہہ سکتے ہیں نہ منافق۔ نہ مشرک نہ کافر۔ بلکہ صرف فاسق کہہ سکتے ہیں،

عمرؔ نے یہ سُنکر کہا کہ "میں حق کا دشمن نہیں ہوں۔ تمہارا قول صحیح ہے سب لوگ اسپر گواہ رہیں کہ میں واصل کے قول کو تسلیم کرتا ہوں"

عبداللہ بن حسن کے دونوں بیٹے محمدؔ و ابراہیم جو خاندان اہل بیت سے تھے مسئلہ قدر میں واصل کے پیرو تھے۔ ایکدفعہ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمدؔ سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمہاری تمام باتیں پسندیدہ ہیں مگر افسوس کہ تم مسئلہ قدر میں واصل کے پیرو تھے۔ ایکدفعہ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمدؔ سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمہاری تمام باتیں پسندیدہ ہیں مگر افسوس کہ تم مسئلہ قدر کو مانتے ہو، اور اوسپر اعتقاد رکھتے ہو۔ محمدؔ نے کہا "ابا جان میرا یہ عقیدہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو میں اسکے چھوڑ دینے پر قادر ہوں یا نہیں اگر قادر ہوں تو یہی میرا مذہب ہے۔ اور اگر قادر نہیں ہوں تو پھر ملامت بے کار ہے"! عبداللہ بن حسن نے کہا۔ "اب کبھی تم پر خفا نہ ہونگا"

غرضکہ علم کلام کا پہلا موجد یہی ہے اور پھر ایک علم کلام کیلئے اصول

فقہ کے مہات اصول اس نے بیان کئے۔ ملحدوں کا رد اول اسی نے کیا، مسایل فقہیہ کے چار ماخذ قرآن، حدیث، اجماع۔ قیاس، اول اسی نے قرار دئے یہ مسئلہ کہ "نسخ احکام میں ہوسکتا ہے نہ کہ اخبار میں"، اول اول اسی نے بیان کیا۔

غرضکہ عمر اور واصل فضل وکمال میں عدیم المثیل اور مذہب اعتزال کی بنا مستحکم کرنے والے تھے۔ اور پھر زہد و ورع کی یہ حالت کہ ایکدفعہ حسن بصری سے کسی شخص نے عمرو کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ "تم ایسے شخص کی نسبت کیا سوال کرتے ہو جس کو گویا فرشتوں نے ادب دیا ہے اور انبیاء نے اسکی تربیت کی ہے۔ میں نے اوس سے زاید کسی کے ظاہر و باطن کو یکساں نہیں پایا"

بہر حال ان دونوں کی نکتہ آفرینیوں سے مذہب اعتزال نے بہت وسعت اختیار کر لی اور بہت سے دقیق مسایل علاوہ مسئلہ قدر کے شامل ہو گئے رفتہ رفتہ دربار خلافت میں بھی اسکا ذکر ہونے لگا۔ اور آخر کار یزید بن ولید بن عبد الملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کر لیا۔ بنو امیہ میں یہ پہلا خلیفہ تھا، جس نے اعتزال کی حمایت کی۔ اسکے بعد ولید بھی معتزلی رہا۔ یہانتک کہ ۱۲۶ھ میں ولید مر گیا اور اس کے ۶ برس بعد ۱۳۲ھ میں دولت بنو امیہ کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

جب دولت بنو امیہ ختم ہو گئی، اور خاندان عباسیہ نے اُس کی جگہ لے لی، تو عقاید اعتزال جو بنو امیہ کے زمانہ میں ایسا مستحکم نشو و نما پا چکے تھے، اس قدر جلد فنا نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ اُن کا تعلق اگر ایک طرف بادشاہان بنی امیہ سے تھا، تو اُس سے زیادہ، دوسری طرف عام پبلک سے تھا، اور جیسا آگے چلکر معلوم ہوگا گو اس خاندان کے بعض بادشاہوں نے اعتزال کی بنیاد متزلزل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، لیکن خدا کی شان ہے، کہ بعض افراد

حکومت ایسے بہی پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اس نے انتہائی ترقی حاصل
کرلی اور کچہہ عرصہ تک State Religion (مذہب حکومت) اختیار رہا
دولت عباسیہ کا دوسرا زمانہ ہوا منصور، اگرچہ خود وہ اس بات کو پسند نہ کرتا
تہا کہ لوگ اُسے معتزلی سمجہیں یا اعتزال کی نسبت اُسکی طرف کریں، لیکن چونکہ
عمرو بن عبید (جسکا مفصل ذکر پچہلے صفحات میں ہو چکا ہے) سے اس کی بچپن
کی دوستی تہی اور دونوں نے مدت تک ایک ساتھ تحصیل علم کی تہی اور منصور
اس کے زہد و اتقار اور دیانت و خدا پرستی کا دل سے معترف تھا، اس
لیئے باوصف اس کے کہ وہ خود معتزلی نہ تہا، اسکے عہد میں اعتزال کو
بہت ترقی ہوئی، واصل بن عطا نے تمام اسلامی ممالک میں اپنے نقیب
بہیجدیے کہ مذہب اعتزال کی منادی کریں، عبداللہ بن الحارث کو مغرب بہیجا
اور بہت سے لوگوں نے اُسکے ہاتھ پر بیعت کرلی حفص بن سالم کو خراسان
روانہ کیا، وہاں جہم بن صفوان سے جو مذہب جہمیہ کا بانی تہا مناظرہ ہوا اور جہم
نے زک پائی، اس طرح ایوب کو الجزائر حسن بن زکوان کو کوفہ عثمان طویل کو آرمینیہ بہیجا
اور بہت سے لوگوں نے یہ مذہب قبول کرلیا،

کچہہ تو اسباب اشاعت اعتزال کی یہ تہی اور کچہہ یہ کہ جب منصور انتظام
سلطنت و استحکام حکومت کی طرف سے فارغ و مطمئن ہوکر بیٹھا، تو اُس نے
اپنی توجہ علوم و فنون کی اشاعت پر مبذول کی اور پہلوی، سریانی، یونانی،
ہندی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کرائیں، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ
ترجمے ملک میں بہت جلد پہیل گئے۔ اور ہر گوشہ سلطنت سے اظہار پسندیدگی
کیا جانے لگا، تمام ملک میں فلسفیانہ مذاق پہیل گیا، اور یہود عیسائی، پارسی
قوموں کو جو حکومت کی رعایا تہیں، اسطرف بہت توجہ ہوگئی، جب مذاق فلسفہ

اِس قدر بڑھ گیا، تو اسلام کے مسائل پر نکتہ چینیاں شروع ہوئیں اور منصور نے بزور شمشیر ان خیالات کو روکنا مناسب نہ سمجھ کر بحث و مباحثہ، تحقیق و تدقیق کی عام اجازت دے دی، غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں محدثین و فقہا اپنی روایات و منقولات لیکر آئے۔ لیکن وہاں اِن سے کیا کام چل سکتا تھا، لاچار معتزلہ کو میدان میں آنا پڑا، کیونکہ یہ مسایل مذہبیہ کو دلایل عقلی سے ثابت کرنے کے مدعی تھے، جب معتزلہ نے غیر مسلمین کے اعتراضات کو رفع کر دیا اور اسلام کے اوپر حملہ کرنے والی قومیں ساکت کر دی گئیں، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ حمایت اسلام کے لیئے مذہب اعتزال سے زیادہ موزوں مذہب دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، چنانچہ ملک کے تمام ممتاز دلوں میں اعتزال کی وقعت قایم ہوگئی، اور ہزاروں آدمی معتزلی بن گئے۔

منصور کے بعد مہدی کا زمانہ سلطنت شروع ہوا۔ اور اِس نے مذہبی آزادی کو بالکل روک دیا، مہدی کا بیٹا، ہارون الرشید جب تخت نشین ہوا تو وہ بھی حکمت و فلسفہ سے ناآشنا تھا، لیکن چونکہ اُس کے دربار میں خاندان برمکہ کو بہت در خور حاصل تھا اور وہ بڑے روشن خیال آزاد طبع اور علم دوست تھے اِس لیئے دہر چند اعتزال نے کوئی نمایاں ترقی تو نہیں کی لیکن اُسکا قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا، لیکن ہارون الرشید کے بعد جس نے مناظرہ کی مجلسیں حکماً بند کرا دیں، اور اسطرح گویا اعتزال کو سخت صدمہ پہنچایا مامون تخت نشین ہوا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ مامون کا زمانہ اعتزال کے لیئے بہترین عہد ثابت ہوا اور اُس کی ترقی اوجِ کمال پر پہونچ گئی، یہاں تک کہ خود مامون نے علانیہ اِس مذہب کو اختیار کیا اور تمام اکابر علمائے اعتزال سے دربار بھر گیا، ابوالہذیل علاف اور نظام، مامون الرشید کے

اُستاد تھے، اور مامون اُن کا بہت ادب کرتا تھا۔ اب چونکہ ابو الہذیل و نظام کا ذکر آگیا ہے اسلیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصراً اُن کا حال یہاں بیان کر دیا جائے:۔

ابو الہذیل علاف ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا، مامون کا استاد اور بصرہ کے علمائے اعتزال کا پیش رو تھا۔ علامہ احمد بن یحییٰ مرتضےٰ زیدی نے اُس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے،

"وکان نسیج وحدہ و عالم دھرہ ولم یتقدمہ احد من الموفقین لہٗ ولا من المخالفین" ابو الہذیل اپنے عہد کا بے مثل عالم تھا، اور اُس کے موافق و مخالف علماء میں کوئی اُس کا ہمسر نہ تھا، شروع ہی سے اُسکی طبیعت فلسفہ و علم کلام کی طرف راغب تھی، علم کلام اُس نے عثمان طویل سے حاصل کیا جو واصل بن عطا کا نامور شاگرد تھا اور فلسفہ کی دقیق و مشکل کتابیں اپنے مطالعہ سے حل کیں، ابو الہذیل کا ابھی عالم شباب ہی تھا کہ ایک یہودی عالم بصرہ میں آیا اور بڑے بڑے متکلمین کو مباحثہ میں عاجز کر دیا، ابو الہذیل نے یہ سُنکر اپنے چچا سے درخواست کی کہ "مجھے بھی اسکے پاس لے چلیے"، چچا نے کہا "کہ بڑے بڑے علمائے کلام کو اُس نے مباحثہ میں بند کر دیا ہے، تم اُس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکوگے"، مگر وہ نہیں مانا، اور آخر کار اُس کا چچا اپنے ساتھ لے گیا، جس وقت یہ دونوں پہونچے "موسیٰ کے مسئلہ نبوت پر بحث ہو رہی تھی، اور اُس یہودی نے سب کو اپنی زور تقریر سے خاموش کر دیا تھا۔

ابو الہذیل نے وہاں پہونچتے ہی اُس سے کہا کہ "آپ پہلے سوال کرنا مناسب سمجھتے ہیں، یا مجھے پہلے سوال کرنے کی اجازت دینگے"، یہودی نے

جواب دیا کہ "پہلے میں سوال کروں گا"، ابوالہذیل نے کہا کہ "اچھا دہ سوال کیا ہے"، یہودی نے پوچھا کہ "تم موسےٰ کی صداقت نبوت کو تسلیم کرتے ہو یا نہیں"؟ ابوالہذیل: "موسیٰ جن کی نسبت آپ پوچھتے ہیں اگر وہی نبی ہیں جنھوں نے ہمارے نبی کی بشارت دی اور ان کی رسالت کی تصدیق کی تو بیشک وہ سچے نبی ہیں اور اگر کوئی اور موسیٰ مراد ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا"

یہودی نے زک اٹھا کر دوسرا سوال کیا کہ "توراۃ کو تم سچی کتاب مانتے ہو یا نہیں"؟ ابوالہذیل نے اسکا بھی جواب ویسا ہی دیا کہ اگر توراۃ سے مراد آپ کی وہی توراۃ ہے جس میں ہمارے نبی کی بشارت موجود ہے تو بے شک ہم اُسے خدا کی کتاب مانتے ہیں اور اگر کوئی اور توراۃ ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے +

ابوالہذیل جب تحصیل فلسفہ و کلام سے فارغ ہوگیا تو اُس نے مخالفین اسلام سے مناظرہ و مباحثہ شروع کیا اور ایسی سرگرمی کے ساتھ اُسمیں مصروف ہوا کہ بہت تھوڑے زمانہ میں سارا ملک اُس کی فصاحت و خوش بیانی، کمالات علمی و فن مناظرہ کی خوبی کا قایل ہوگیا۔

ابوالعباس اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں نے ابوالہذیل و جاحظ سے زیادہ فصیح اللسان کسی کو نہیں دیکھا"، یزدان بخت رئیس مانویہ اور مشام بن حکم سے جو فرقۂ مجسمہ کا سرگروہ تہا، اِس نے مباحثے کیے، اور مجوس و ثنویہ فرقوں کے علمار کے ساتھ بھی بڑے بڑے معرکۃ الآرا مناظرے کئے، اور سب میں کامیاب رہا۔ اُسکی خصوصیت استدلال یہ تہی کہ ہمیشہ معترض کو نہایت مختصر جواب سے بند کردیا کرتا تھا، اور اُس کی قوت بیانی کا اثر تھا کہ تین ہزار سے زاید غیر مذہب کے لوگ مسلمان ہوگئے،۔

ایک دفعہ دورانِ گفتگو میں ابو الہذیل نے ایک فلسفی عالم سے، جو اعراض کے وجود مستقل کا منکر تھا، کہا خدا نے فرمایا ہے "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ"، یعنی زنا کرنے والے مرد و عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو تازیانوں کی سزا دو، اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ "والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ"، یعنے جو لوگ پاکدامنوں پر تہمت لگاتے ہیں، اور چار گواہ پیش نہیں کر سکتے اُن کے ۸۰ کوڑے مارو، اِن آیتوں میں زانی کی حد زیادہ ہے یا قاذف، (تہمت لگانے والے کی)۔

فلسفی "زانی کی حد زیادہ ہے"۔ ابو الہذیل "کتنی زیادہ ہے"؟ فلسفی "بقدر بیس کے"، ابو الہذیل "کیا لفظ جلدہ سے جلاد کا ہاتھ مراد ہے"؟ فلسفی "نہیں"، ابو الہذیل "کیا اِس سے کوڑا مراد ہے"، فلسفی "نہیں"، ابو الہذیل "کیا اس سے مجرم کی پشت مراد ہے"، فلسفی "نہیں"، ابو الہذیل "کیا اس سے وہ فاصلہ مراد ہے جو کوڑے اور پشت مجرم کے درمیان ہے"، فلسفی "نہیں"، ابو الہذیل "تو کیا تمہارے نزدیک ایک لا شئے سے بقدر بیس کے زیادہ ہو سکتی ہے؟"

ایک بار مجلس مناظرہ میں اُس نے ایک مجوسی سے پوچھا کہ "تمہارے نزدیک آگ کی حقیقت کیا ہے؟" مجوسی "آگ خدا کی بیٹی ہے"، ابو الہذیل "اور گائے کیا مرتبہ رکھتی ہے"۔ مجوسی، "گائے خدا کی فرشتہ ہیں جن کے بازو کٹ گئے ہیں"، ابو الہذیل "پانی کیا ہے"، مجوسی "خدا کا نور"، ابو الہذیل "بھوک اور پیاس کیا ہیں؟"، مجوسی "شیطان کا فقر و فاقہ"، ابو الہذیل "زمین کو کون اٹھائے ہوئے ہے"، مجوسی "بہمن فرشتہ"

ابوالہذیل "تو دنیا میں مجوسی سے زیادہ کون برا ہو سکتا ہے، جنہوں نے خدا کے فرشتوں کو پکڑ کر ذبح کیا۔ پھر خدا کے نور سے دھویا اور خدا کی بیٹی پر رکھ کر بھونا پھر اوسے شیطان کے فقر و فاقہ کے سپرد کیا اور اسکو بہمن فرشتہ کے سر سے جو خدا کے فرشتوں میں سب سے زیادہ معزز ہے اٹھایا اور اُسکی کھال کھینچ لی۔"

ایک بار حسن بن سہل کی مجلس میں جا نکلا، ایک نجومی امیر کی مسند کے پاس بیٹھا ہوا۔ ابوالہذیل نے پوچھا یہ کون جوان ہے جسکو امیر نے اس قدر عزت بخشی، امیر نے کہا کہ یہ نجومی ہے، ابوالہذیل "نجوم کا حساب جانتا ہے یا اُن کے احکام،" امیر "یہ نجوم کے احکام جانتا ہے،" ابوالہذیل "یہ علم تو بالکل جھوٹا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ اس سے پوچھوں" امیر "ہاں، ہاں ضرور سوال کیجئے،" ابوالہذیل نے ایک سیب ہاتھ میں لے لیا اور نجومی سے خطاب کرکے کہا کہ "آپ بتائیں میں اس سیب کو کھاؤنگا یا نہیں" نجومی نے حساب کرکے کہا کہ آپ اُسکو ضرور کھائیں گے" ابوالہذیل نے سیب کو ہاتھ سے رکھدیا اور کہا "کہ میں اسکو ہرگز ہرگز نہ کھاؤنگا نجومی نے کچھ سوچکر کہا کہ اچھا اب دوبارہ آپ سیب کو ہاتھ میں لیں، میں پھر غور کرتا ہوں، شاید کوئی غلطی رہ گئی ہو، ابوالہذیل نے ایک دوسرا سیب ہاتھ میں لیا، امیر نے کہا کہ "آپنے دوسرا سیب کیوں اٹھایا، ابوالہذیل" اسلیئے کہ اگر اسکے نجومی نے کہا نہیں کھاؤ گے تو میں اس سیب کو ضرور کھا جاؤں گا!" نجومی شرمندہ ہوکر مجلس سے اُٹھ گیا۔

ایک دفعہ بصرہ میں ایک نو وارد شخص اُسکے پاس آیا اور کہا کہ مجھے قرآن میں چند شبہات ہیں، میں نے بہت کوشش کی کہ وہ رفع ہو جائیں،

لیکن کسی طرح تشفی نہ ہوسکی مجھے چند احباب نے مشورہ دیا کہ آپ کے پاس جاؤں، اسلیئے آپ خدا کے لیئے میری تشفی کر دیجئے، ابوالہذیل " میں سنوں کہ وہ شبہات کیا ہیں،" نووارد " قرآن کی چند آیتوں میں مجھے تناقض معلوم ہوتا ہے، اور چند آیتیں ایسی ہیں جن میں زبان کی غلطی معلوم ہوتی ہے"

ابوالہذیل " آپ ایک ایک آیت پر الگ الگ اپنے شبہات بیان کرنا چاہتے ہیں یا اپنے تمام شکوک کا جواب ایک ہی دفعہ سُننا پسند کرتے ہیں،" نووارد " اگر ایک ہی دفعہ تمام شبہات کا جواب دینا ممکن ہے تو یہ اور بھی مناسب ہے"

ابوالہذیل " آپ کو معلوم ہے کہ محمد صلعم عرب کے شرفا میں سے تھے، اور اُن کی زبان مستند اور غیر مطعون تھی، اور وہ اپنی قوم کے نزدیک سب سے زیادہ عاقل تھے،" نووارد " بیشک وہ ایسے ہی تھے،" ابوالہذیل " آپ کو معلوم ہے کہ عرب کے لوگ نہایت تندخو اسرکش اور جھگڑالو تھے"

نووارد " یہ بھی سچ ہے،" ابوالہذیل " آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل عرب نے ہمارے پیغمبر کی تکذیب و مخالفت میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اٹھا رکھا" نووارد " بے شک یہ بھی صحیح ہے،" ابوالہذیل " آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے متناقض کلام یا غلط گوئی کا الزام ہمارے پیغمبر پر نہیں لگایا" نووارد " کبھی نہیں،" ابوالہذیل " تو اعراب کی شہادت چھوڑ کر جو اپنی زبان سے خوب ماہر تھے آپ کسی جاہل کی بات کا کیوں اعتبار کرتے ہیں،" نووارد یہ سُنکر مسلمان ہوگیا +

ابوالہذیل کو عربی اشعار کثرت سے یاد تھے، اور اکثر وہ اپنے کلام میں اُن سے استشہاد کرتا تھا ابو معن ثمامہ کہتے ہیں کہ ابوالہذیل جب مامون کے

دربار میں مجھ سے خطاب کرتا تو ہمیشہ میرا نام لیکر مجھ سے بات کرتا، اور ما مون ہمیشہ کنیت کے ساتھ یاد کرتا۔ مجھ کو کئی دفعہ اسپر غصہ آیا لیکن ادب مجلس کا خیال کرکے خاموش ہو ہو جاتا تہا، ایک بار ابو الہذیل نے مجلس مناظرہ میں اپنے کلام کی سند میں سات سَو اشعار پڑھے، یہ دیکھ کر میں دنگ ہو گیا، اور میں نے کہا کہ اب آپ کو اختیار ہے میرا نام لیکر مجھ سے بات کیجئے یا میری کنیت کے ساتھ خطاب کرکے"

ایک دفعہ ابو الہذیل، صالح بن عبد القدوس سے ملنے گیا جو ثنوی المذہب تہا، اسی زمانہ میں صالح کا جوان لڑکا مر چکا تھا۔ صالح کو رنجیدہ دیکھ کر ابو الہذیل نے کہا کہ "آپ تو انسان کو کھیتی کی طرح سمجھتے ہیں جو پہلتی پہولتی اور اپنے وقت پر کٹ جاتی ہیں پھر آپ کیوں غمگین ہیں" صالح "نہیں مجھے افسوس صرف اس وجہ سے ہے کہ اُس نے کتاب الشکوک نہیں پڑھی تہی" ابو الہذیل "وہ کیا کتاب ہے" صالح "وہ کتاب الشکوک میری ہی تصنیف ہے اور جو اُسکو پڑہتا ہے موجودات میں شک کرنے لگتا ہے کہ شاید وہ نہیں ہیں اور معدوم اشیار کی نسبت شک کرنے لگتا ہے کہ شاید وہ ہیں" ابو الہذیل "تو آپ اپنے بیٹے کی نسبت شک کریں اور یہی خیال کریں کہ وہ مرا نہیں ہے" اور اسی طرح آپ شک کریں کہ مرحوم نے کتاب الشکوک پڑھ لی ہے حالانکہ اس نے نہیں پڑھی ✦

ابو الہذیل سے ایک عالم نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ آپ عالم کا حادث ہونا ثابت کریں مگر بغیر اس کے کہ اس میں پہلے حرکت وسکون کا موجود ہونا تسلیم کیا جائے ابو الہذیل نے کہا "سبحان اللہ آپ کی مثال تو بالکل اُس آدمی کی سی ہے جو اپنے مدعی سے کہے کہ آؤ میرے ساتھ قاضی کے پاس چلو، لیکن دیکھو اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش کرنا"

اشخاص ثلاثہ

یورپ میں جب سے جنگ و جدل قتل و قتال کا بازار گرم ہوا ہے "اتحاد ثلاثہ" اور "ائتلاف ثلاثہ"، مرکب الفاظ نے اک عجیب قسم کی دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کے "اخبارات" و "رسالہ جات" میں "اتحاد ثلاثہ" اور "ائتلاف ثلاثہ"، کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ ہم سے بھی چند احباب متقاضی ہیں کہ ہم بھی اتحاد ثلاثہ اور "ائتلاف ثلاثہ" پر کچھ اپنے خیالات ظاہر کریں اور اگر "اتحاد ثلاثہ" "ائتلاف ثلاثہ" پر اظہار خیالات ؛ خلاف احتیاط سمجھیں تو کسی اور "ثلاثہ" پر کوئی مضمون لکھیں۔ ہمیں فرمائش احباب کی تعمیل میں تو کچھ عذر نہیں ہے۔ لیکن فی زمانہ مشکل اک بہت بڑی یہہ پیدا ہوگئی کہ اگر ہم کسی **سیاسی**!! مسئلہ پر کوئی مضمون لکھتے ہیں تو اس زمانہ کی نزاکت ہمیں اسکی اجازت نہیں دیتی اور اگر؟ کسی **اخلاقی** سبجکٹ پر قلم اُٹھاتے ہیں رفتار زمانہ سے اسکی مساعدت کی بھی توقع نہیں ہوتی کیونکہ بعض طبیعتیں آجکل "**اخلاق**" و "**سیاست**" جیسے متفرق و متباین الفاظ و خیالات کو بھی مترادف سمجھنے لگ گئیں ہیں۔ اس قسم کی خرابیوں کی وجہ سے یہہ زمانہ انڈیا بھر میں اس قسم کی مضامین نویسی کے واسطے خطرہ سے پاک نہیں ہے کیسی ہی طبیعت کی صفائی اور پاک بازی سے کوئی پولیٹیکل یا **سیاسی** یا **اخلاقی** مضمون لکھا جائے ممکن نہیں کہ دوست دشمن کی نشانہ بازی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ ایسے زمانہ میں مضمون نگاری کے واسطے حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے جب تک "حکومت"، اور اہل ملک کی طرف سے

پوری آزادی میسر نہ ہو کسی سمجھدار شخص کا کام نہیں ہے کہ وہ **پولیٹیکل اکانمی** بیان کرے یا امور **سیاست** کی گتھیاں سلجھانیکی کوشش کرے یا **اخلاق** اور فلسفہ **اخلاق** پر کوئی لکچر دے۔

خصوصاً مجھ جیسے کمزور طبیعت والے شخص کے لئے یہہ ہی اک مجبوری کیا کچھ کم ہے کہ زمانہ میں انقلاب عظیم پیدا ہو رہا ہے جو دوست تھے اونمیں دشمنی پیدا ہو رہی ہے اور جو دشمن تھے اونمیں دوستی اور اتفاق کا جوش سمندر موجزن ہو رہا ہے۔ ایسے نازک وقت میں ہمارے احباب کی فرمایش نے اک غلجان میں ڈال دیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا کروں کوئی مضمون لکھوں اور لکھوں تو کیا لکھوں۔

حالت دلِ مضطر لکھوں چھوٹا سا اک مضمون لکھوں
افسانۂ لیلیٰ لکھوں یا قصۂ مجنوں لکھوں

سب سے پہلے چاہتا ہوں کہ **مشاہیر ثلاثہ** جو اک تاریخی ناتمام مضمون جو رسالہ "بید بیضا" میں شائع ہوا تھا اُسے پورا کر ڈالوں مگر اوس زمانہ کا سا نہ طبیعت کا، جوش و خروش ہے نہ دل میں وہ اگلی سی امنگ کافی ہے لہذا یہہ ارادہ بھی نقشِ بر آب ثابت ہوتا ہے۔ پھر چاہتا ہوں کہ کسی یگانۂ روزگار شخص کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرکے کچھ فکر سخن ہی کروں اور اک ایسی ......

غزل لکھوں

اوستاد کو میدان میں آج ہمنے پچھاڑا چھاتی پہ چڑھے کو دکے ڈاڑھی کو اکھاڑا
اوستاد کے مصرعہ پہ لگاتے ہیں گرہ ہم شاعر ہمیں کردیجئے یا پیر بخارا
یہہ طرفہ غزل ہمنے کہی مولوی صاحب اصلاح سے دل کیجئے خورسند ہمارا

پہلی ہی غزل پر میں ہوا داد کا خواہاں — شاہا چہ عجب گر بنوازند گدا را

مگر جب یہ خیال دامنگیر ہوتا ہے کہ ۱۸۸۰ء کا زمانہ اب کہاں کہ ظریفانہ چاشنی کی قدر و منزلت ہوتی ہے ایک طرف لکھنؤ میں منشی سجاد حسین صاحب اخبار **اودھ پنچ** کے کالموں میں لطائف و ظرائف سے مضامین کا انبار لگاتے رہتے تھے اور دوسری طرف **میرٹھ** میں سید مرتضیٰ حسین صاحب **بیان و یزدانی** اخبار **طوطی ہند** میں پسند خاطر احباب کے لئے سامان عجیب کی فراہمی میں شب و روز ہمہ تن مصروف نظر آتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ خیال آرائی ۔۔۔ یا "مضمون نگاری" کا "شوق" یا بالفاظ دیگر "خبط" جو کچھ بھی کہئے اچھا خاصا مالیخولیا کا مرض ہے خیال پیدا ہوتے ہی ایک ادھیڑبن بھی شروع ہو جاتی ہے اب مجھے بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے کہ کئی شب و روز ہو گئے "غور" و "خوض" "تلاش و جستجو" سے کوئی اچھا عنوان مضمون نویسی کے واسطے نہ ملا۔

"الجھن" "کشمکش" اور "منغصات" کے ہجوم نے مبہوت سا بنا رکھا ہے خواہشات کا سلسلہ طول ہوتا گیا اگر کوئی موزوں عنوان ذہن نشین نہ ہوا مسلسل اور متواتر خواہشات کے طومار نے گھیر لیا اور پھر ہر بات مشکل و دشوار تر بقول شخصے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ غزل ملا دوپیازہ کے ایک شاگرد نے لکھی تھی جس پر انہوں نے یہ اصلاحی شعر لکھا تھا ؎

یہ طرفہ غزل لائے ہیں دستک لگا کے — صد لعنت و پھٹکار عنبر بر سر رسالہ

قصہ مختصر یہ کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور میں حضرت لسان الغیب

حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ کی طرف رجوع ہوا۔ دیوان نکالکر دیکھا تو اس شعر پر نظر پڑی۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

تھوڑی دیر تک میں اس شعر کے معنی اور مطالب پر غور کرتا رہا پھر طبیعت کی خواہش پر آہستہ آہستہ گنگناتا رہا اور یکایک "حسرت" "نیاز" دیگر اشخاص ثلاثہ کی وقعت اور عظمت نے دل میں گھر کر لیا اور تقاضائے طبیعت ہوا کہ ان "اشخاص ثلاثہ" پر ہی قلم فرسائی کرنی چاہیئے +

تجویز عنوان کی گتھی سلجھنی تھی کہ مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ آپ مشہور رسالہ "اردوئے معلےٰ" کے ایڈیٹر اور علیگڈھ کالج کے ممتاز تعلیم یافتوں میں سے ہیں۔ نثر و نظم دونوں خوب لکھتے ہیں علیگڈھ کے بی اے کلاس کا کوئی طالب علم شاعر نہیں کہلایا جاتا بجز حسرت کے اردو شاعری میں فی زمانہ جو نازک خیالی "لطافت" اور "سادگی" آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میر و مرزا کے کلام کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپکی زبان اس درجہ "شستہ" اور "پاکیزہ" ہے کہ اگر مولانا آزاد مرحوم کا تذکرہ آب حیات کہلایا جا سکتا ہے تو مولوی حسرت کا کلام نظم اور عبارت نثر آب مقطر کہلائے جانے کی ضرور مستحق ہے۔

اردوئے معلےٰ میں اک مرتبہ نزاکت پاکیزگی اور صفائی بیان کے سلسلہ میں مولانا حالی مرحوم مغفور اور ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں چند اعتراض ہوئے تھے اور اک دلچسپ بحث درستی زبان کے متعلق شروع ہوئی تھی مگر افسوس اسکا سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا اور

یہہ لٹریری قابل قدر خدمت پیدا ہوکر ناپید ہوگئی ۔ اور اب امید نہیں کہ کسیکو اس کا حوصلہ ہو اردوئے معلے اک بےنظیر ادبی رسالہ تہا اگر صرف علم ادب ہی کی ترقی سے متعلق اوسمیں ہنرمندی اور سلیقہ شعاری سے ساتہ کام کیا جاتا تو یقیناً ضروریات ملک کی اک بہترین خدمت انجام ہوتی رہتی مگر بدقسمتی سے اوس میں **سیاسی** مضامین بہی شامل کردئے گئے ۔

ادب و شاعری کے ساتہ **پولٹیکل** اور **سیاسی** بلند پرداری اک بےجوڑ بات تہی اگر "پولٹیکل" اور "سیاسی" مضامین کی اشاعت ضروری ہی خیال کی گئی تہی تو اس ضرورت کے واسطے علٰحدہ اک رسالہ ہونا چاہئے تہا جس میں باحتیاط تمام **سنجیدہ** اور **پرمغز** پولٹیکل مضامین کی میانہ روی کے ساتہ اشاعت کی جاتی تو ضرور مفید نتیجہ پیدا ہوتا اور رسالہ ہر قسم کے نقصان سے بہی محفوظ رہتا۔ مگر افسوس کہ مولانا حسرت پر کانگریسی رنگ زیادہ غالب ہوگیا اور انھوں نے اردوئے معلےٰ میں ادب و شاعری کے پہلو کو ضعیف کرکے "پولٹیکل" اور "سیاسی" مضامین کی چاشنی کو غالب کردیا جس کی وجہ سے خود اونکو بعض تکالیف کا سامنا ہوا اور اہل نظر کے نزدیک رسالہ بہی بےلطف سا ہوگیا۔ اسی غلطی کی وجہ سے اردوئے معلے گمنامی کے پردہ میں روپوش ہوکر گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے:۔

عنقا کی طرح گم ہو جو شہرت پسند ہو
پایا اسی نے نام کہ جو بےنشاں رہا

اور مولانا حسرت بہی گلہ مند نظر آتے ہیں جیسا کہ اونکے تازہ کلام سے مترشح ہوتا ہے

کلام حسرت

مر مٹیں گے جو غم ہجر کی بیداد ہے یہی
اک نہ اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی

آج اغیار ہیں جو یار تھے کل تک کیا خوب — آپ کے دامنِ انصاف پہ دھبا ہی یہی
ناگوارا ہے بہت تلخئ ہجران لیکن — تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم — یا مگر ان کی محبت کا نتیجہ ہے یہی
یہ جو اک دردِ محبت کی خلش ہے حسرت — مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

ہمیں مولانا حسرت کی خداداد قابلیت کا اعتراف ہے مگر ان کی "دم پالیسی" سے اختلاف ہے ہم تو یہ چاہتے ہیں۔

یار کا پاسِ نزاکت دل ناشاد رہے
نامہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

مولانا ئے موصوف کی اک غزل حال میں شائع ہوئی ہے جسے ہم خلش خار سے موسوم کرکے یہاں لکھتے ہیں ناظرین خیال فرمائیں کہ حسرت کے دل سوختہ میں کیسی کیسی دلدوز آہیں پوشیدہ ہیں۔

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھ تو لو — ناتواں کرتے ہیں دل تھام کر آہیں کیونکر

خلشِ خار

ہم سحر ہو سرِ دحق کا سرانجام کہاں — دیکھیں اِس صبح صداقت کی ہے تو شام کہاں
عشق میں صبر و سکوں اے دلِ ناکام کہاں — اِس دلآرام کی خواہش ہے تو آرام کہاں
خاص تعزیر کے لایق ہے گنہگاریٔ عشق — درخورِ جاں ہے تری سرزنشِ عام کہاں
پندِ ناصح وہ سُنے خوفِ ملامت ہو جسے — پاسِ ناموس کہاں عاشقِ بدنام کہاں
ترکِ آداب کا عشاق سے بیجا ہے گلہ — جب نہ ہو موردِ الزام تو الزام کہاں
کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اسمیں — نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

حسرت زار ہے اور کشمکش یاس و اُمید
اب وہ بالیدگیٔ شوق کا ہنگامہ کہاں

نیاز

ابوالمعانی جناب نیاز محمد خاں صاحب "نیاز" فتح پوری شاعری کی اسٹیج پر جب کبھی تشریف لاتے ہیں اور شاعرانہ کوئی پارٹ کرتے دکھائی دیتے ہیں تو ونس مور کا اک شور مچ جاتا ہے۔ آپ کے فیض کرم سے ہندوستان کے ممتاز اور قابل قدر رسالہ "ادیب" اور "پنجاب ریویو" سیراب ہو چکے ہیں اور اب موقت الشیوع پرچے بھی مستفیض ہو رہے ہیں آپ کے کلام میں وہ "قدرو" اور "اثر" ہے کہ داغ اور حالی جیسے سحر بیان شاعروں کی یاد تازہ رہنے کی کچھ امید ہے تو ایسی ہی شخص سے ہے جیسے حضرت نیاز ہیں۔ زمانہ حال میں جناب نیاز کے تازہ "افکار" میں "ہذیان" "محبت" اک ایسی نظم شایع ہوئی ہے کہ داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ع

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

ہذیانِ محبت

پھر سے مجھے طوق و سلاسل کا خیال آئیگا　　پھر مجھے مرغ حرم رہ رہ کے تڑپائیگا

پھر نمایاں ہو چلا دامن ترے ملبوس کا　　یعنی اشکوں میں مرے پھر رنگ گل آئیگا

سینۂ عریاں پہ چوٹیں پھر ابھر آنے لگیں　　پھر گریباں تک مرا دستِ جنوں جائیگا

پھر وہی ہے تاخت غم اور دل کی کاوشیں　　پھر مجھے درد نہاں کچھ آج تڑپائیگا

پھر بہار آئی چمن میں زخم دل آئے ہوئے
پھر مرے داغ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے

عقل کہتی ہر کسی کی پردہ داری چاہئے　　دل یہ کہتا ہے نمود بیقراری چاہئے

کسکو سمجھاؤں کہ تجدید وفا اک جرم ہے　　اس میں پہلے عہد کی ناستواری چاہئے

مصلحت غمازی زاہد زخم دل ظاہر نہو　　[illegible] یہ کہتا ہی نہیں خونابہ باری چاہئے

ہے سکون اک طرح کا خاموشیٔ زندان میں بھی — مجھکو لیکن خصلت فریاد و زاری چاہیے
جی مرا پھر بیٹھے بیٹھے آج گھبرانے لگا — یعنی دیواروں سے پھر میں سر کو ٹکرانے لگا

حضرت دلگیر

سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآباد کے ہیں آگرہ یا اکبرآباد عہد اسلامی کے دور عروج کی یادگار ہے اردو کی ترقی اور نشو و نما میں بھی حصہ دار ہے کیونکہ میرزا غالب کے مولد ہونے کا فخر اسکو حاصل ہے۔ اردو رسائل کی کساد بازاری کی حالت میں خیال ہوتا تھا کہ آگرہ سے بھی اردو زبان خدمت کا کچھ سلسلہ شروع ہو تو مناسب ہے۔ مسرت کا مقام ہے کہ حضرت دلگیر کے مذاق طبیعت نے اون کے "نقاد" جیسے اعلیٰ درجہ کے رسالہ کی ماہانہ اردو رسالوں میں ایک مفید اضافہ کرادیا دلگیر خود اک ذی اس اور سخن ور اور سخن شناس شخص ہیں اور اون کے احباب کا حلقہ بھی اچھا خاصا وسیع ہے جو ناظم بھی ہیں اور نثار بھی ہیں یہی وجہ ہے اس کے مضامین اچھے ہوتے ہیں اب تھوڑے عرصہ سے اس میں تصاویر کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا گیا ہے بہرحال اب یہہ پرچہ "ادیب" اور "مخزن"، کا قائم مقام خیال کیا جاتا ہے۔ قریب زمانہ میں مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم مغفور کی تاریخ وفات دلگیر کے قلم سے جو نکلی ہے بلحاظ سوز و گداز اپنا نظیر نہیں رکھتی دل چاہتا تھا کہ حالی کی وفات پر دو آنسو بہائے گو کچھ "آہ" و "بکا"، مناسب جانتے ہم ہیں کہ اون کی آہ شرر بار نے ہمارے دلِ سوختہ سے بھی چار آنسوؤں کا خراج وصول کر لیا +

تاریخ وفات مولانا حالی

نہ اب تبسم نہ خندۂ گل نہ نغمے اب شورِ بلبل
زبان سوسن ہے گنگ بالکل خموش صحرا ہے باغ دہلی

نہ کوئی ساقی نہ مے ہے باقی دگر ہی بزمِ داغ تک تھی
کہ جب سے کیسی شراب کیسی پڑا ہے خالی ایاغ دہلی

مگر تھی پھر بھی نمود کچھ کچھ کہ شمع دیتی تھی دکھ دکھ کچھ کچھ
اٹھے جو حالی صدا یہ آئی ہوا ہے گل چراغ دہلی

عزیز الحسن یاد سکندرآبادی بلند شہر

غزل

وہ نگاہیں کیا کہوں کیونکر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں

پھونک دی اک روح دیکھا زورِ اعجازِ جنوں
جتنی سانسیں سینے لیں تارِ گریباں ہو گئیں

چند تصویریں دی جو مختلف فتنوں کی تھیں
بعد میرے زینتِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

اڑ کے دل کی خاک کے ذرے گئے جس جس جگہ
رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں

بچ رہی تھیں جو اسیرانِ کہن کی ہڈیاں
رفتہ رفتہ صرف استحکامِ زنداں ہو گئیں

کس دلِ آوارہ کی میت گھر سے نکلی تھی عزیز
شہر کی آباد راہیں آج ویراں ہو گئیں

عزیز لکھنوی

رباعی

اسباب خور و نوش نہ جب تو نے دیئے
اے ربِ قدیر کوئی کس طرح جئے

ہم اسکو بھی رزق ہی سمجھتے لیکن
بھر پیٹ گناہ بھی تو ہم نے نہ کیے

نیاز فتحپوری

گل کی فریاد

اے! حضرتِ انسان تو اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی ہے میری دانست میں تو سخت خودغرض اور نفس پرور ہے اور میرے لحاظ سے تو تو سخت ظالم ہے۔ تجھ کو یہ غرّہ ہے کہ کائنات میں جو شئے موجود ہے وُہ سب تیری آسائش و استعمال کے لئے ہے۔ یہ خیال دراصل غلط ہے۔ فی الحقیقت نیچر میں ہر شئے کے لئے اپنا اپنا کام مقرر ہے اور اُس کی ہستی اپنے لئے ہے۔ زبردستی یا ظلم سے کسی کا استحقاق زائل کرنا اشرف المخلوق کے رُتبہ سے تجھے گرا دیتا ہے۔ میں بلبل کو تجھ سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دیکھ! وُہ میرے رنگ و بو پر کیسی دلدادہ ہے۔ صبح و شام میرے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ میری بہار حُسن سے اپنے دل و جان کو تازہ کرتی رہتی ہے فی الواقعہ وُہ اربابِ معنی سے ہے اس کی شرافت دیکھ کہ وُہ مجھے ٹہنی سے جُدا نہیں کرتی۔ میرا جو بن لوٹتی ہے لیکن کس خوش اسلوبی سے اُس حبشی کالے کلوٹے بھُنگے کو دیکھ جسے لوگ بھونرا کہتے ہیں۔ کس طرح وُہ میرے اردگرد دیوانہ وار گردش کرتا ہے۔ مجھے صانع قدرت کی ایک حسین مخلوق سمجھ کر میرے طواف میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی حالت میں مست ہے موسیقار کے مانند گنگناتا ہر وقت وجد میں رہتا ہے میری ایذا کے درپے ہونا تو درکنار میرے گُن گاتا رہتا ہے۔ اس سے ہی سبق سیکھ۔

او ظالم! نیچر نے تجھے جتلا دیا ہے کہ میرے خار میری حفاظت کیلئے بنائے گئے تھے تو اُنہیں بھی توڑ دیتا ہے۔ تیرا چاقو بیزبان جانوروں کی جان لینے سے نہ ٹلا تو میں کس گنتی میں ہوں۔ کیا یہ حظ تیرے لئے کافی نہیں کہ تو میری بو باس

سے فردوس داغ بنا میری خوش رنگی سے جنت نگاہ بنا لیکن مجھے ٹہنی سے جدا کر۔

او ظالم! میری شکایتیں بیشمار ہیں۔ کاش میری فریاد سننے والا کوئی ہوتا تو درد دل سناتا اور انصاف پاتا۔ تاہم تجھے ہی سناتا ہوں تاکہ شاید تیرا سنگین دل نرم ہو۔ ممکن ہے کہ تو اپنی زبردستی سے باز آجائے۔ آخر میری زندگی نہایت مختصر ہے عمر طبعی چند گھنٹے ہے۔ کاش تو مجھے چند گھنٹے جینے دے۔ اب میری فریاد سن۔

۱۔ جب تجھے کسی دیوتا۔ پیر فقیر مرقد سے التجا کرنی ہوتی ہے انکی خوشنودی مزاج مطلوب ہوتی ہے۔ مجھ غریب کی جان پر بن آتی ہے۔ میں چڑھاوے کا کام دیتا ہوں۔

۲۔ جب تجھے وارفتگان کی تربت پر جانے کا موقع ہوتا ہے مجھ بیکس کو مردوں کے سینہ پر چھوڑ آتا ہے میری ہی وہیں ہوائی تربت بنجاتی ہے۔

۳۔ جب تجھے کسی اپنے سے بزرگ بنی نوع انسان کی تکریم و تحسین منظور ہوتی ہے مجھ پر آفت آنے لگتی ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے جس طرح سے میرے سینے میں سوئیاں چبھو چبھو کر ہار بنائے جاتے ہیں۔ اور ظالمان درجہ اولیٰ کے زیب گلو ہوتے ہیں۔

۴۔ جب آدمی زاد بیاہ شادی کرتے ہیں تو باران گلاب و بارش گل شروع ہوجاتی ہے اور مجھ کس مپرس کی شامت آتی ہے۔ کہیں سہرے پر لٹکتا ہوں کہیں گجرے میں جکڑا ہوا ہوں کہیں سیج میں پامال ہوتا ہوں۔

۵۔ واہ رے تیری آسائش پسندی! تجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تو میرے پاس آکر میرے حسن و جمال سے حظ حاصل کرے۔ نہیں مجھے ٹہنی سے توڑ گلدستہ بنا گول کمروں اور کھانے کے کمروں میں رکھ دیتا ہے جہاں مجھے مرگ مفاجات جلد آجاتی ہے۔ تیری خود غرضی یہاں تک ہے کہ دستبو بنا کر مجھے بٹن ہول میں لگا کر مجھ نیم مردہ کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ واہ رے تیری فرط محبت!

۶۔ تو کن کن غیر جنسوں کے ساتھ مجھے ہم آغوش کرتا ہے کبھی تلوں میں مجھے ہم خواب کرتا ہے کبھی سرسوں سے میری صحبت ہوتی ہے۔ تاکہ میرے جوہر ان میں منتقل ہوں۔ میری روح اُن کے جسم میں داخل ہو۔ اور بقول تیرے "وہ بس" جائیں اور میں خانہ برباد ہو جاؤں۔

۷۔ کبھی تو مجھے روغنوں میں حل کرتا ہے۔ میرا رنگ زائل کر دیتا ہے بلبل کی بد دعائیں تجھ پر اثر نہیں کرتیں۔ میری روح تن سے جدا کر کے مجھے روغن میں مقید کر دیتا ہے۔ اِس قرطِ اُلفت کا نام تو نے عطر رکھ چھوڑا ہے۔

۸۔ کبھی تیری رحمدلی اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ مجھے قرع انبیق میں ڈال آتشِ سوزاں پر رکھ کر جوش دیتا ہے۔ اس پر بھی صبر نہیں۔ پھر دوآتشہ کرتا ہے۔ اِس پیار کے اظہار کا نام عرق ہے۔ او ظالم! تیری جبین پر کاش عرقِ انفعال آتا۔ مگر کہاں۔

۹۔ او ظالم! تو مجھے میری موت کے بعد بھی نہیں چھوڑتا۔ تجھے یقین نہیں آتا کہ میں کما حقہ مرا ہوں۔ میری پتیاں سکھاتا ہے۔ پھر مجھے منجنوں اور معجونوں میں ڈالتا ہے اور اُن معدوں کی امداد کرتا ہے جن میں تیرے خنجر نے اور دمی روح ہلاک کر کے داخل کئے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ او بے رحم آدمی زاد۔ تو تو انسان بھی کہلانے کا مستحق نہیں۔ اشرف المخلوق تو تیری لُغات میں نہ ہونا چاہئے۔ حق تو یہ ہے کہ تیرا کیا قصور ہے۔ یہ معمّا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں کسی اذیت میں دوسرے کا عیش ہو۔ اور مجھے تو ذوق کا یہ شعر پڑھنا کافی ہے۔

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑینگے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

غزلیں

ہجر میں اس بت سے تار الفت ٹوٹے نہیں | دم میں دم جب تک ہے دامان وفا چھوٹے نہیں
عہد پر قائم رہیں گے آپ کچھ نگران ہوا | کیا یہ پیمان وفا میرا ہے جو ٹوٹے نہیں
وہ تو سننے کے لئے تیار بیٹھے ہیں دل | کیا علاج اس کا کہ ہم ہی منہ سے کچھ پھوٹے نہیں
یاد رکھنا آگئی پیری تو پھر پچھتاؤ گے | گر جوانی میں جوانی کے مزے لوٹے نہیں
زندگی جب تک ہے یارب عیش دنیا کم نہ ہو | جام ہے منہ سے صراحی ہاتھ سے چھوٹے نہیں
نوچ ڈالے بلبل بے خانماں کے بال و پر | یا الٰہی ہاتھ کیوں صیاد کے ٹوٹے نہیں

رات دن اس فکر میں ہوں اے فصیح باوفا
رشتۂ الفت جہاں تک ہو سکے ٹوٹے نہیں

فصیح

چشمکیں سے رہے ہو تم دل میں | پیار کرے کوئی نہ محفل میں
درد ہو داغ ہو غرض کچھ ہو | اک تری آرزو نہ ہو دل میں
جیتے جی اے غبار ناکامی | ہو گئے دفن کوئے قاتل میں
تم نے ترکش میں اُن کو رکھا تھا | ہم نے تیروں کو دی جگہ دل میں
مے سے کر لے وضو تو چل زاہد | میرے پیر مغاں کی محفل میں
بسملوں کی دعا ہے اور بڑھے | باڑھ خنجر میں نوک قاتل میں
انتہا ہے یہ سوز الفت کی | خون کے بدلے آگ ہے دل میں
کیا بگڑتا ہے کیوں رسائی ہو | دُور بیٹھے رہیں گے محفل میں
تم نہا کر چلے جو دریا سے | اشک بھر آئے چشم ساحل میں

تم جگر صاف کر گزرتے ہو
ٹھان لیتے ہو بات جو دل میں

مبارک ہو

امہات الامہ

مولفہ مولانا مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مغفور جو بعض کوتاہ بین علماء کے تعصب سے
پردہ دنیا سے نابود ہو چکی تھی اور جسکی مطالعہ کا شوق لوگونکو مضطرب کئے ہوئے تھا۔
جسکی ایک ایک جلد سو سو دو دو سو روپیہ شائقین قیمت دیکر تیار تھے اس کا حصہ
اول طبع ہو کر غیر مسلم اقوام کو مفت تقسیم ہو رہا ہے چونکہ اسکی اشاعت کی غرض
زیادہ تر یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام میں بکثرت تقسیم ہو تاکہ تعداد ازدواج رسول
مقبول پر جو اعتراضات ہیں انکی اصلاح ہو اور اسلام کی حقانیت انکی ذہن
نشین ہو اسلئے مسلمانوں سے توقع کیگئی ہے کہ وہ اسکو خرید کر اس کے حصہ
دوم و ترجمہ انگریزی کو مدد دیں تاکہ وہ بھی چھپکر بکثرت تقسیم ہو سکے کتاب کی
عمدگی کی نسبت کچھ لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں صرف مولانائے مرحوم
کا نام کافی ہے کہ وہ کس درجہ کی ہوگی حصہ دوم زیر اہتمام ہے اور ترجمہ ڈاکٹر
مشرف الحق صاحب کے ہاتھوں میں اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے
کہ اسکی تکمیل جسقدر چاہیں جلد ہو سکتی ہے۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲/)

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

تمدن

نوشتہ تقدیر

"دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو فلسفہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئیں"

کہتے ہیں کہ شہر لکھنؤ میں ایک بڑا دانا پنڈت تھا۔ قدرت نے اسکو سوچنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں عطا کی تھیں۔ ایک روز شام کے وقت وہ تن تنہا دریا کے کنارے ایک دور اور غیر آباد مقام پر سیر کر رہا تھا کہ اسکی نگاہ ریت پر کسی آدمی دبی ہوئی چیز پر پڑی جو سورج کی مغربی شعاعوں میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ پاس جا کر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی مردے کی پیشانی کی ہڈی ہے۔ قریب تھا کہ گرا دے مگر یکایک اسکی نگاہ چند لکیروں پر پڑی جو اسپر کچھ بے قاعدہ سی کھنچی ہوئی تھیں اور چونٹیوں کی رفتار سے مشابہ تھیں۔ پنڈت بہت سے ایسے علموں سے ماہر تھا جن سے عوام الناس ناواقف ہیں اور ایسی پراسرار باتیں پڑھ سکتا تھا جن کا دوسروں کو علم نہیں اسنے مردے کی پیشانی کی تحریر کو بغور دیکھکر اُسکے نوشتہ تقدیر کو اپنے علم کی رو سے اسطرح پڑھا

"جہاں کہیں سے بن پڑے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پالو گلیوں اور کوچوں میں مارے مارے پھرو۔ کھیت اور میدان میں سو۔ دریا کے کنارے پر کتے کی موت مرو۔ پھر...... دیکھو ہوتا کیا ہے"

یہ الفاظ حیرت خیز اور تعجب انگیز تھے اور انکا مطلب اس سے بھی زیادہ

وحشت زا تھا مگر جس بات سے برہمن حیران تھا وہ یہ تھی کہ یہ تحریر اسوقت لکھی گئی تھی جب یہ شخص پیدا ہوا تھا اور خدا جانے کس کس مصیبت اور آفت سے اسنے زندگی کے دن پورے کئے ہونگے۔ اب موے پر سو درّے کی مثال وہ کیا ہے جو اِس غریب کو سہنا ہوگا اسے مرے ہوئے خدا معلوم کس قدر عرصہ ہوا ہے یہانتک کہ اسکے گوشت و پوست کا نشان بھی باقی نہیں رہا اور ہڈیاں گل سڑکر خاک ہوگئی ہیں اسپر اب کیا باقی رہا ہے جو اسکو پیش آئے۔ اسی پیچ و تاب میں برہمن نے ٹھان لی کہ اب دیکھنا چاہئے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور ہڈی کو احتیاط سے اپنی دھوتی کے دامن میں باندھکر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہونچکر اسنے بڑی حفاظت سے اُس ہڈی کو اپنے کمرے میں ایسی چیزوں کے ساتھ جنکی اپنے پیشے کے متعلق اسکو ضرورت پڑتی تھی اور جہاں اسکی نجوم اور رمل کی کتابیں رہتی تھیں نہایت پوشیدہ طور پر رکھا ہر روز صبح کے وقت اپنا بستہ کھولتا اور خبرداری سے جب کوئی دیکھتا نہو اس میں سے بدیں خیال وہ ہڈی نکالتا اور دیکھتا کہ اسمیں کوئی تغیر تو واقع نہیں ہوا۔ اِسی طرح مدتیں گذر گئیں ور کچھ بھی ظہور میں نہ آیا۔ اس اثنا میں برہمن کی عورت اسکی تمام کارروائی سے آگاہ ہوگئی اور دل ہی دل میں بے قرار تھی کہ الٰہی یہ کیا کرتا ہے اور تاک میں رہتی کہ برہمن کسی وقت غافل ہو اور میں اسکا بستہ کھولکر اِس راز سے واقف ہوجاؤں ایک روز قریب کے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا اور برہمن کو صبح سویرے مونھ اندھیرے وہاں سے بلاوا آیا اور اسکو فی الفور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے جانا پڑا۔ عورت جو موقعہ کی تلاش میں تھی وقت کو غنیمت سمجھی اور فوراً برہمن کی کوٹھڑی میں گھس اور بستہ کھول کر جو مقصود نکالا تو سوائے اُس استخوانِ بوسیدہ کے اور کچھ برآمد نہوا۔ بہت سٹ پٹائی کوئی بات سمجھ میں نہ آئی آخر سوچی کہ ہو نہو یہ ہڈی میری سوت کی ہے اور برہمن کو اس سے اسقدر محبت تھی کہ میرے حسد بھی اسکی

پیشانی اِس حفاظت سے رکھی ہے اور صبح صبح اوٹھکر اسکی پوجا کیا کرتا ہے بس
یہ خیال آنا تھا کہ آتشِ حسد سے آگ بگولا ہوگئی۔ ہڈی کو باورچیخانہ میں لیجا کر سل بٹے سے
پیسکر سرمہ کیا اور بدرو میں ڈالدیا برہمن نے آکر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ آخر اپنی بیوی
سے پوچھا تو وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑگئی اور گالی گلوج کا ایسا طوفان اُٹھایا کہ بیچارہ
برہمن مونہہ دیکھتے کا دیکھتا رہگیا۔ آخر جب اُسنے بتایا کہ میں نے اِس کتیا مردار کی
ہڈی جسکا تم روز درشن کرتے تھے اور جسکی پوجا کے بغیر تم رہ نہیں سکتے تھے بدرو
میں ڈالدی تو اسنے وہاں جاکر دیکھا۔ مگر سوائے ایک بھوری بھوری خاکستر کے
جسمیں پاخانہ سے میلا کچیلا پانی بہ کر لگگیا تھا اور کچھ نہ پایا۔ غرض استخوان شکستہ کا یہ انجام
ہوا۔ اور یوں اس خوفناک نوشتۂ تقدیر کی آخری پیشینگوئی پوری ہوئی۔

برہمن کچھ مونہہ میں بڑبڑاتا باہر چلاگیا اور جورو اپنی کامیابی پر گویا پھولی جامے میں
نہ سماتی تھی۔ رات کو خاوند اور بیوی آرام کے لئے اپنے کمرے میں سوگئے بیوی تو
سوگئی اور خاوند کو موت اور حیات کے پیچیدہ مسئلے سوچتے سوچتے آدھی رات
ہوگئی اسوقت اِسنے جو آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو اپنے بستر کے عین برابر چھت میں سے
ایک باریک سا تاگا لٹکتا ہوا پایا۔ پہلے تو کچھ خیال نہ کیا مگر رفتہ رفتہ تاگا بڑھکر اسکی
چارپائی کے قریب پہونچنے لگا۔ برہمن آنکھیں ملنے لگا اور قریب تھا کہ اپنی بیوی کو
آواز دے کہ تاگا ایک نہایت زہریلا سانپ بن گیا اور اِسنے برہمن کی ناک پر
کاٹ کھایا۔ پیشتر اِسکے کہ برہمن اُٹھکر بیٹھے سانپ ایک روزن دیوار میں سے نکلکر
کمرہ سے باہر ہوگیا یہ بمشکل اٹھا اور دروازہ کھولکر باہر نکلنے کو تھا کہ سانپ نے ایک
خوفناک بھیڑئے کی شکل اختیار کی اور ہمسایہ کے بچے کو جو صحن میں سو رہا تھا پھاڑ
کھایا۔ برہمن نے اب جان ہتیلی پر رکھ لی اور اسکے پیچھے پیچھے ہولیا اتنے میں
بھیڑئے نے ایک نوجوان کی شکل اختیار کی اور برہمن کی طرف مڑکر تبسم نگاہوں

سے دیکھا۔ برہمن نے دلکو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اسکے پاؤں میں گر پڑا کر یہ کیا ماجرا ہے اِس نوجوان نے جواب ایسی آواز سے دیا جس میں نہ خفگی تھی نہ ناراضگی تھی کہ میں موت کا گماشتہ ہوں اور دنیا میں جس جس طرح لوگوں کی موت لکھی ہوئی ہے اسکو پورا کرنے آیا ہوں۔ بس اب میرا پیچھا نہ کر۔

برہمن اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا تعاقب سے باز نہ آیا۔ فرشتہ نے پھر مڑ کر کہا کہ اب کیا چاہتے ہو برہمن نے کہا کہ میں صرف اسقدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری موت کس طرح لکھی ہے۔

موت کے گماشتہ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم دلیر آدمی ہو مگر اب بھی اسکی آواز میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ترس اور خوف پایا جاوے۔

برہمن اپنی بات پر اڑا رہا اور پھر وہی سوال کیا۔ اسپر فرشتہ نے رعد کی آواز میں جواب دیا کہ تم دریائے گنگا میں کام نہنگ کا طعمہ ہوگے۔ کیا تم اپنی تقدیر سے بھاگ سکتے ہو اور پیشتر اسکے کہ برہمن اِس خوفناک پیشین گوئی کے معنے سمجھے نوجوان ہوا ہوگیا۔

برہمن نے گھر آکر۔ اپنی جورو کا کریا کرم کیا اور ہمیشہ کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اسنے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ ہیبت ناک گنگا کے نزدیک نہ رہونگا۔ دیبی ہو یا کچھ ہو مگر ایسی جگہ جاکر رہونگا جہاں لوگوں نے اِس خوفناک دریا کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ کہنا آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔ بجائے اسکے کہ مغرب کی طرف جاتا جہاں خواہ لوگوں نے گنگا کا نام تو سُنا ہوگا مگر اسکی شکل نظر نہ آتی، وہ مشرق کی طرف روانہ ہوا اور آخر برما کے علاقہ میں پہونچ گیا۔ یہاں بود و باش اختیار کرلی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بناکر اُسے سجایا اور اپنے کار و بار میں مشغول ہوا۔ اسکی لیاقت اور دانشمندی کا جلدی شہرہ ہوگیا۔ اور وہاں کے مہاراج اور امرا کے دربار تک اسکی رسائی ہوگئی اتفاق سے مہاراجہ کو اپنے لڑکے کے واسطے ایک لائق پنڈت کی ضرورت تھی اسکے فضل و کمال کا شہرہ تو سُن ہی چکا تھا۔ اب دیکھا تو ہمہ دانی اور دانشمندی

میں اسے کہیں بڑھکر پایا۔ غرض اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ برہمن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اور اس نے اپنی پہلی عمر کے واقعات کی طرف کبھی اشارہ ہی نہ کیا لڑکا اس اثنا میں بڑا ہو گیا اور اب وہ وقت آپہونچا کہ مہاراج نے اپنے تمام ارکین سلطنت کو جمع کر کے دریافت کیا کہ شہزادہ کی تعلیم کا کیا بندوبست کرنا چاہیے۔ سب نے عرض کیا کہ نوجوان شہزادہ تمام علوم میں یکتا اور سارے فنوں میں کامل ہو گیا ہے اب مناسب ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھے اور سیر ممالک سے اپنی نظر کو وسیع کرے چنانچہ سب سامانِ سفر تیار ہوا اور شہزادہ نے اپنے اتالیق سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں اتالیق نے صاف انکار کر دیا۔ یہ خبر مہاراجہ تک پہنچی جس نے پنڈت کو ہمیشہ نہایت مطیع اور وفادار پایا تھا اسکو اس سے نہایت مایوسی ہوئی اور پنڈت سے بضد ہوا کہ آپکو ضرور شہزادہ کے ہمراہ جانا ہوگا۔ پنڈت کو اب انکار مشکل ہو گیا اور ناچار اپنی رام کہانی اور گنگا رانی کی واردات سنانی پڑی۔ اسپر درباری اور خود شہزادہ بھی خوب قہقہہ لگا کر ہنسے اور پنڈت کی توہم پرستی پر اسکو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ پنڈت بہت کھسیانہ ہوا۔ مگر سب کے اصرار و خوشامد و انعام بیش بہا کے وعدوں سے شہزادے کے ہمراہ رکاب جانے پر راضی ہو گیا۔ مگر شہزادے اور اُسکے باپ سے اِس امر کا وعدہ لے لیا کہ اگر کہیں شہزادہ دریائے گنگا کے نواح میں پہنچ جائے تو میں اپنے وطن کو لوٹ آؤنگا۔

لگن دیکھکر شہزادہ روانہ ہوا اور بہت سے مقامات کی سیر کی یہانتک کہ راس کا کیپ جنوبی بنگال میں پہنچ گیا۔ برہمن نے اپنا وعدہ یاد دلایا مگر شہزادہ نے ایک نہ سُنی اور اپنا تمام فلسفہ اور منطق برہمن کو سمجھانے میں خرچ کر ڈالا کہ آخر آپکو اس مقدس دریا سے کیوں نفرت ہے۔ پھر کہا کہ تنخواہ و انعامات موجودہ سے

دس گنا لیجئے اور ایک بار میرے ساتھ چلکر دریا کے کنارے پر کھڑے ہوجایئے ورنہ لوگ کیا سمجھیں گے کہ آپ سا دانا ایسی ویسی باتوں کے خیال سے اپنے اوپر جگ ہنسائی کراتا ہے۔

شہزادے کا اصرار۔ انعام کی توقع اسپر ہمراہیوں کی چھیڑ چھاڑ برہمن کے شکوک لگے زائل ہونے اور انجام کار وہ راضی ہوگیا۔ فوراً ایک سو سورما جوان زرہ بکتر پہنے۔ ہتھیاروں سے اوپچی بنے۔ ڈھال تلوار لگائے اُچھل پڑے اور دریا کے کنارے پہونچے۔ شہزادہ اور اتالیق بھی آکر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ پانی کس قدر صاف اور دریا کیسا خاموش تھا اسکے تمام وسعت پر ایک لہر تک نہ تھی۔ کیا اس میں گھڑیال ہوگا۔ سب بے اختیار ہنسنے لگے یہانتک کہ خود برہمن بھی اس خوشی میں شریک ہونے سے باز نہ رہ سکا اور وہ بھی مسکرا دیا۔

شہزادہ کے حکم پر ایک سو سپاہی پانی میں کود پڑے اور ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ایک ایسی جگہ حلقہ باندھکر کھڑے ہوگئے جہاں کمر تک پانی آتا تھا۔ اس حلقہ میں شہزادہ کو اشنان کرنا تھا۔ اس وقت شہزادے نے مسکرا کر اپنے اتالیق کی طرف دیکھا جسپر برہمن سے نہ رہا گیا اور اسکے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کہنے لگا میں ایسا بزدل بھی نہیں ہوں کہ آپکے ساتھ ایسی جگہ جہاں ایک سو مسلح جوان کھڑا ہی نہ نہا سکوں اس طرح سے ایک دوسرے کے ایک دوسرے کے ہاتھ میں دئے مزے مزے کی باتیں کرتے دونوں پانی میں اُترے اور اس حلقہ میں جا کھڑے ہوئے۔ سورج اندر یا ہر تھا۔ نہانے والوں نے اشنان کا گیت گانا شروع کیا ایک لمحہ میں سب کا اپنے سر پانی میں ڈبو کر غوطہ لگانا تھا کہ یکایک شہزادہ ایک مہیب تک اور مہیب گھڑیال نگیلہ گھڑیال نے گرج کر کہا کہ اوبرہمن میں وہی اجل کا گماشتہ ہوں اور برہمن کو کمر سے پکڑ کر مسلح آدمیوں کی صف چیر کر گہرے پانی میں لے گھسا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔ "عالم خیال"

یادِ اجل

"آسودگی بہ گوشۂ ہستی ندیدہ ایم | جاں دادہ ایم و کنج مزار خریدہ ایم"

میں اے اجل ہوں تیرا اُمیدوار کب سے! | تیری مفارقت میں ہوں بے قرار کب سے!

ہے میری جان اے جاں تجھ پر نثار کب سے! | کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے!

مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں
اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں

اے پُر ز نار نخوت۔ آن بان والی | اے غم فروشِ عالم۔ اُونچی دوکان والی

اے صاحبِ رعونت۔ برتر نشان والی | شرم و حیا کی دیوی۔ شاہانہ شان والی

جاں تیرے خیر مقدم کو رُک رہی ہے لب پر
دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے اے ستمگر

اے موت بندِ ہستی سے تو چھڑا لے مجھکو | آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجھ کو

صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو | آ حجرۂ لحد میں چلکر سلا دے مجھ کو

اے قبر ایک مدت سے وصل کا ہے ارماں
آغوش دل میں لے شفقت پہ تیری قرباں

میں ہوں فقط اکیلا۔ کچھ مال ہو نہ زر ہو | دو گز کا اک کفن ہو۔ کچھ اپنے پاس گر ہو

کھٹکا نہ رہزنوں کا چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو | شادی کی کچھ خبر ہو۔ غم کا نہ کچھ اثر ہو

وہ دن کب آئینگے جب احباب روتے ہونگے
ہم اپنا مُنہ لپیٹے بے فکر سوتے ہونگے

غربت کی ہو نہ پروا۔ دولت کی ہو نہ حاجت | عزت کی ہو نہ خواہش ذلت سے ہو نہ نفرت

اعدا سے ہو نہ کینہ۔ یاروں کی ہو نہ اُلفت | اولاد کی محبت۔ ماں باپ کی نہ چاہت

محفوظ ہوں غرض ہم ان ساری آفتوں سے
بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے

کپڑا سفید سر سے سر پا تک تنا ہوا ہو　　ڈھیلوں کا ایک تکیہ سر سے مرے لگا ہو
اور خوابہائے غفلت کا سلسلہ بندھا ہو　　لیکن وہ پریشان دنیا کے وہم سا ہو

اس میٹھی نیند میں ہم کچھ ایسے بیخبر ہوں
غل شور سے ہوں ایمن نالوں سے بے خطر ہوں

سبزے کی سبز چادر مرقد پہ اک چڑھی ہو　　پھولوں کے بیلے جس پر حسرت برس رہی ہو
سنگ لحد سے تصویر اک یاس کی کھڑی ہو　　جائے چراغ جس پر تاریکی چھا گئی ہو

سر پیٹتی ہو حسرت اور نوحہ خواں ہو ارماں
ماتم کرے تمنا۔ ہو شوق مرثیہ خواں

سنسان مقبرہ ہو۔ ہر سو ہو ہُو کا عالم　　اور لہلہا رہا ہو سبزے کا ایک پرچم
ہر پھول داغ غم ہو۔ ہر نخل نخل ماتم　　آنسو بہا رہی ہو تربت پہ میری شبنم

تنہائی ہو محافظ خاکی مکاں کی میرے
اور بیکسی ہوں درباں اس آستاں کی میرے

ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت　　مکار بے حمیت۔ بد چشم۔ بے مروت
تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت　　ہے بے وفائی تیری معمولی ایک عادت

تجھ سے اماں جو مانگے اس کے گلے لگے تو
جو دل سے تجھ کو چاہے اس سے الگ رہے تو

آمد کا اپنی مژدہ سنوائے گی یقینی　　اور میری آرزوئیں برلائے گی یقینی
آنے کو یوں تو اک دن تو آئے گی یقینی　　تو آج مجھ کو لیکن ترسائے گی یقینی
"نہ جاؤں گا میں کرتا اے موت تیری منت　　اور تو رہیگی یوں ہی محو خواب راحت"

نہر سویز

آج کل جبکہ ترکوں کے مصر پر حملہ کرنے کے متعلق نہر سویز کا اکثر ذکر ہوتا ہے اگر اس نہر کے ابتدائی اور مابعد کے تاریخی حالات لکھے جائیں تو خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔

قدیم تاریخ نمبرا

یہ تو بچے بچے کو معلوم ہے کہ نہر سویز بحیرہ روم کو بحیرہ قلزم سے ملاتی ہے۔ گویا جہازوں کے لیئے ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں پہنچنے کا راستہ قائم کرتی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان اور یورپ کی تجارت مصر میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ جہاں تک جہاز پہنچ سکتے تھے وہاں تک تجارتی مال جہازوں میں آتا تھا پھر خشکی کی راہ بحیرہ روم کے کنارے تک جاتا تھا۔ اس تکلیف کو زمانہ قدیم کے بادشاہوں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا جیسا کہ موجودہ زمانے کے حکمرانوں نے۔

چنانچہ سب سے پہلے مصر کے مشہور بادشاہ سیتی اوّل نے مسیح سے ۱۳۸۰ برس قبل اِس نہر کے تیار کرنے کا خیال کیا بعض یونانی مورخین دوسرے بادشاہوں کا نام بھی لکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ اس نہر کی تیاری میں ایک لاکھ سے زیادہ مزدور بخار اور وبائی بیماریوں میں مر گئے ایسا ہونا بالکل ممکن ہے۔ کیونکہ ہم موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں کہ پناما کی نہر کی تیاری میں بھی ایسا ہوا اور بہت سی جانیں اِس قسم کی وبائی بیماریوں میں ضائع ہوئیں۔

بادشاہ سیتی کی نہر دریائے نیل سے نکلکر کھاری جھیل میں آملتی تھی اس نہر کے نشان آجتک پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور بادشاہ نے یہ کام شروع کیا مگر ناتمام رہا۔

مسیح سے ۵۲۰ برس قبل بادشاہ دارا نے اس نہر کو بحیرہ قلزم سے ملانا چاہا اور بہت حد تک کامیاب ہوا۔ مگر بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ پانی جاری نہیں کیا گیا کیونکہ اندیشہ تھا کہ بحیرہ قلزم کی سطح بحیرہ روم سے بلند ہونے کی وجہ سے اس نہر کے کھودنے سے سارا ملک مصر پانی کی طغیانی سے غارت ہو جائیگا کہتے ہیں کہ اس مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے طالمی دوم کے زمانے میں نہر میں بند بنائے گئے اور نہر بہمہ وجوہ مکمل صورت میں آئی۔ اُسوقت اس کا طول ½ ۳۷ میل عرض ایکسو فیٹ اور عمق ۴۰ فیٹ تھا۔ لیکن موجودہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ نہر کی تکمیل دارا کے زمانے ہی میں ہو گئی تھی۔ بہرحال اسکی تکمیل کسی بادشاہ کے زمانے میں ہوئی ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایک قدیم زمانے سے یہ نہر موجود تھی۔ مگر رفتہ رفتہ بند ہو گئی۔ شاہان روما نے اسکو دوبارہ کھدوانا چاہا اور آخرش ساتویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے مصر پر قبضہ کیا تو حضرت عمرؓ کے حکم سے اس نہر کو پھر جاری کیا گیا۔ اور عرصے تک یہ نہر جاری رہی بسنہ ۷۶۷ء میں خلیفہ دوم ابوجعفر شاہ منصور بانئے بغداد کے حکم سے اسے بند کرایا گیا اور پھر اسی طرح بند پڑی رہی اگرچہ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ء میں سلطان حکیم کے عہد میں یہ نہر جاری ہو گئی تھی۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو بھی اس کے بعد یہ نہر پھر بند ہو گئی۔ آخرکار سنہ ۱۸۶۱-۶۳ء میں فرانس کے مشہور انجنیروں نے اسی نہر کو

جس کی ابتدا دو ہزار پانچسو برس پہلے ہوئی تھی دوبارہ کھودنا شروع کیا اور تھوڑے سے تغیر کے بعد اسکی وہ صورت قائم کی جو آجتک موجود ہے۔

نہر سویز کی موجودہ تاریخ نمبر ۲

اُوپر جو بیان کیا گیا ہے وہ دریائے نیل سے نہر نکالنے کے متعلق ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ خشکی کے راہ دوسرے راستے سے نہر نکالنے کی تجویز بھی آٹھویں صدی عیسوی میں خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں زیر بحث ہوئی تھی لیکن چونکہ خلیفہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ اِس بحری راستے سے اُس کے رومی دشمن عرب تک پہنچ جاوینگے اس لئے اِس منصوبے کو ترک کر دیا۔ پھر پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اہل وینس نے مصری حکمرانوں سے اس نہر کے اجرا کے متعلق گفت وشنید کی لیکن اسی زمانے میں ترکوں نے مصر پر قبضہ کر لیا اور اہل وینس خاموش ہو رہے۔ ۱۶۷۱ء بادشاہ فرانس کو اسکے وزیر نے مصر پر حملہ کرنے اور ایک نہر بنانے کا مشورہ دیا۔ ۱۷۷۰ء میں شیخ البلاد علی بے نے اس کام کو پورا کرنیکا ارادہ کیا۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ نے نہر کھودنے کے خیال سے زمین کی پیمائش کرائی مگر انجنیروں میں اِس امر پہ بہت اختلاف رہا کہ بحیرہ قلزم و بحیرہ روم کی بلندی سطح میں بہت فرق ہے ۴۷-۱۸۴۶ء کی تحقیقات سے یہ بلندی سطح کا فرق غلط ثابت ہوا۔

۱۸۵۴ء میں فرڈنند ڈی لسپ نے سعید پاشا خدیو مصر سے نہر بنانے کی اجازت حاصل کی۔ شرط یہ قرار پائی تھی کہ ۹۹ سال کے لئے اجارہ دیا جائے اور اس کے بعد نہر حکومت مصر کے قبضے میں آجائیگی۔ مگر چونکہ مصر سلطان ٹرکی کے ماتحت تھا اس لئے باب عالی سے منظوری حاصل

کرنی ضروری تھی۔ اس زمانے میں جنگ کریمیا کی وجہ سے ٹرکی اور انگلستان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور انگلستان اس نہر کی تکمیل کے خلاف تھا۔ انگلستان کے وزیر لارڈ پامرسٹن نے بیان کیا کہ اول تو ایسی نہر تیار ہونی محال ہے اور اگر یہ تیار ہو گئی تو انگریزوں کو اس سے بجائے فائدہ کے یہ نقصان پہنچیگا کہ بحیرہ روم کی سلطنتیں خاصکر فرانس مشرق میں انگریزی بحری غلبے کی مزاحمت کریگا۔ اس بنا پر انگریزی سیاسی ریشہ دوانیوں سے باب عالی ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۶ء تک اس نہر کے ٹھیکے کے معاہدے کو منظور نہیں کیا مگر لسپ نے نہر سویز کی کمپنی کا کام ۱۸۵۵ء ہی سے شروع کر دیا تھا اور باوجود انگریزوں کی ٹرکی کے ذریعہ ہر قسم کی مزاحمت میں نہر کھدائی شروع ہو گئی اور ۱۸۶۹ء میں جاری ہو گئی۔ اس نہر کی لاگت کا تخمینہ ۴۳۲۸۰۷۸۸۲ فرانک ہوتا ہے اگرچہ ۱۸۵۶ء میں اسکی لاگت کا تخمینہ صرف ۲۰ کروڑ فرانک کیا گیا تھا ۲۰ نومبر ۱۸۶۹ء کے بعد سے جہازوں کی آمدورفت باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔

اس نہر کا طول پورٹ سعید سے سویز تک سو میل ہے۔ شروع میں اسکا عرض کم تھا حتیٰ کہ دو جہاز برابر ہو کر نہ گزر سکتے تھے لیکن بعد کو اسکو زیادہ چوڑا کیا گیا اور اب دو جہاز اس طرح برابر سے گزر سکتے ہیں کہ ایک جہاز ٹھہر جائے اور دوسرا پاس سے نکل جائے۔ ۱۸۶۰ء تک اس نہر کے عبور کرنے میں جہازوں کو ۳۶ گھنٹے لگتے تھے لیکن اب صرف نصف وقت درکار ہوتا ہے۔

حق ملکیت

حق ملکیت کے لحاظ سے یہ نہر کسی ایک شخص یا بادشاہ کی نہیں ہے ۱۸۶۶ء کے معاہدے کی رُو سے تمام اقوام و ممالک کو جو حصہ دار تھیں برابر کے حقوق حاصل تھے اور کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ حق نہ تھا۔ اور ہر تجارتی جہاز بلا روک ٹوک اسمیں سے گزر سکتا تھا مگر ۱۷۹۸-۱۸۰۱ء میں جبکہ انگریزوں اور فرانسیسوں کی لڑائی ہو رہی تھی اور انگریزوں نے فرانسیسوں کو مصر میں شکست دی تھی اور بحری لڑائی اسی نہر کے کنارے ہو رہی تھی تو چار دن کے لئے انگریزی امیر البحر نے اس نہر کا راستہ بند کر دیا تھا۔ یہ معاملہ بعد میں زیر مباحثہ آیا اور ۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ میں ایک کمیٹی نے جس میں انگلستان۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ اسپین فرانس۔ اٹلی ہالینڈ روس اور ٹرکی کے نمائندے تھے نہر سویز کے معاہدے پر دستخط کئے جس کی رُو سے اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ یہ نہر زمانہ امن و زمانہ جنگ میں ہمیشہ اور ہر وقت ہر جنگی و تجارتی جہاز کے لئے کھلی رہیگی خواہ وہ جہاز کسی ملک کا ہو لیکن برطانیہ کلاں نے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اس معاہدے کی شرائط اس حد تک قابل تسلیم ہونگے کہ جس حد تک کہ برطانیہ کے مصر پر قبضہ قائم رکھنے میں خلل نہ آئے۔

اس موقعہ پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ انگریزوں کو جو شروع ہی سے اس نہر کے مخالف تھے اسکے معاملات میں رائے زنی کا حق کس طرح حاصل ہوا ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر پر قبضہ ہونیکی وجہ سے لیکن اصلیت یہ ہے کہ اسماعیل پاشا خدیو مصر نہایت فضول خرچ شخص تھا اور وہ اسقدر مقروض ہو گیا کہ اُسنے ۱۸۷۵ء میں نہر سویز کے حصے انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ نے نہر سویز کے ۱۷۶۶۰۲ حصے ۳۹۷۶۵۸۲ پونڈ میں خریدے اور اسطرح اسوقت نہر سویز کے

مغل شہزادوں کی تعلیم

رسالہ "مسوڈرن ریویو" میں اورنگ زیب کا ایک خط شایع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی میں مغل شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ کیا تھا۔ یہہ اصل خط فارسی زبان میں ہے مگر رسالہ مذکور میں بزبان انگریزی ترجمہ ہوکر شایع ہوا ہے جس سے ہم ترجمہ کرکے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۶۵۴ء میں خود اورنگ زیب با و شا ہ
بڑا بیٹا محمد سلطان جس کی عمر ابھی صرف پندرہ سال ہے اجمیر کو مغل اعظم (شاہجہاں) کی حضور میں باریاب ہونے کے لئے جا رہا ہے۔ اورنگ زیب کو قدرتی طور پر یہہ فکر ہے کہ اوس کا بیٹا شاہی دربار میں عمدہ اثر قائم کرے۔ اوس کی نسبت اورنگ زیب نے شہزادے کو جو ہدایتیں لکھی ہیں اون میں ہر وقت اور ہر کام کا ایک نہایت مکمل دستور العمل موجود ہے۔

اورنگ زیب لکھتا ہے سفر و حضر میں طلوع آفتاب سے ۷۲ منٹ قبل بیدار ہو جاؤ۔ غسل اور حوائج ضروریہ سے ۴۸ منٹ میں فارغ ہوکر نماز شروع کرو۔ نماز اور اوراد کے بعد بعد قرآن شریف تلاوت کرو اس کے بعد ناشتہ کھاؤ۔ اگر سفر میں ہو تو طلوع کے ۴۸ منٹ بعد تک گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ اگر راستہ میں شکار کرو تو اس بات کا ضرور لحاظ رکھو کہ منزل پر ٹھیک وقت پر پہونچ جاؤ منزل پر پہونچنے کے

بعد اگر تمہارا دل چاہے یا فرصت ہو تو عربی کی کوئی کتاب مطالعہ کرو۔ یا آرام کرو۔ زوال آفتاب کے ۲۴ منٹ کے بعد خیمہ سے نکلو اور ظہر کی نماز باجماعت ادا کرو۔ دوپہر کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرو۔ اس میں دو گھنٹے صرف ہو جاویں گے۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوپہر کا کھانا ظہر و عصر کے درمیان کھایا جاتا تھا۔ ایڈیٹر) لیکن اگر صرف کھانے ہی سے تمہیں کافی تفریح حاصل ہو جائے تو درمیان کا خالی وقت املار و انشار، اور فارسی نظم و نثر کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرو نماز عصر کے بعد کچھ دیر عربی پڑھو۔ اور اس کے بعد نماز مغرب سے ۲۴ منٹ قبل علمار و صلحار کی صحبت سے استفادہ کرو۔ اور اس شغل کو نماز مغرب سے ۴۸ منٹ بعد تک جاری رکھو۔ اسکے بعد قرآن کے ایک پارہ کی تلاوت کرو۔ اور اس کے بعد نو بجے سو جاؤ۔ اگر تم سفر میں ہو تو منزل کے روز تمام کام اوقات معینہ پر انجام دو۔ اور کوچ کے زمانہ میں صبح کے ۴۸ منٹ تیر و تفنگ کی مشق میں صرف کرو۔

کوچ کی حالت میں ۴۸ منٹ تیر اندازی و نشانہ بازی کی مشق میں صرف کرو۔ طلوع آفتاب کے ایک گھنٹہ ۲۴ منٹ بعد ۴۸ منٹ دیا حسب ضرورت زیادہ عرصہ) کے لئے دربار عام میں نشست کرو۔ اگر ضرورت ہو تو تقریباً ایک گھنٹہ دربار خاص میں اجلاس کرو۔ ورنہ اس وقت کو عربی کے مطالعہ میں صرف کرو۔ اگر منزل طویل ہو تو نماز فجر کے بعد فوراً گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور ناشتہ راستہ ہی میں کرو۔ ورنہ روانہ ہونے سے قبل ناشتہ کر لو۔ سپیدہ صبح نمودار ہونے کے وقت یا نو بجے دن کے بعد سفر کا آغاز نہ کرو۔ اگر راستہ میں شکار کہیں ہو تو فوج کو قریب میں

راستہ سے منزل کی طرف نز بیہ دار سپاہ کی معیت میں روانہ کرو۔ اور اپنے ہمرکاب صرف نہایت مختصر جمعیت رکھو۔ رفتہ رفتہ ہتھیار لگانے کی عادت ڈالو۔ کپڑے اوتارنے اور لیٹنے سے قبل پسینہ خشک ہونے دو۔ سوائے محمد طاہر کے (یہ شخص محمد سلطان کا اتالیق ہے۔ ایڈیٹر) میر کسی اور افسر کو یا شاہی کے دو ہزاری سے نیچے درجے کے عہدہ دار کو اپنی فوج کے آگے نہ چلاؤ۔ کیونکہ نوآزمودہ کاروں کی فوج کے آگے ہونے سے اوس کے رعب و داب میں فرق آتا ہے۔ ہمیشہ ماقل و دل بات کرو۔

باوجود اس اہتمام کے معلوم ہوتا ہے کہ محمد سلطان نے تعلیم میں زیادہ ترقی نہ کی۔ یہاں تک کہ اپنی خاندانی زبان ترکی سے بھی اُسے نفرت تھی۔ باوجودیکہ اورنگ زیب نے خاص زبان ترکی کی تعلیم کے لئے ایک معلم مقرر کر رکھا تھا۔ اورنگ زیب نے ایک بار شکایت کی تھی کہ "ترکی زبان کا معلم ایک سال سے مشاہرہ لے رہا ہے۔ مگر تم نے اوس سے پڑھنے کی کوشش نہیں کی"

اورنگ زیب نے لباس وغیرہ کے متعلق بھی شہزادہ کو ہدایات کی ہیں اور اپنا نمونہ اوس کو یاد دلایا ہے۔

بہرحال محمد سلطان ماہ دسمبر میں شاہجہاں کے دربار میں پہونچ کر مورد عنایات و الطاف شاہانہ ہوا ہے۔ غالباً ناظرین کو محمد سلطان کی آیندہ زندگی کا حال معلوم کرنے کا بھی اشتیاق ہوگا۔ اس کی کیفیت مختصراً یہ ہے کہ تمام تعلیم و تربیت محض بیکار ثابت ہوگی۔ اور یہ مضمون صادق آیا کہ۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اورنگ زیب طرز انشاء معلوم کرنے کے لئے اوس کو اکبر نامہ کے مطالعہ کا حکم دیتا ہے اور وہ اوس کی یہاں تک تقلید کرتا ہے کہ بجائے بسم اللہ کے "اللہ اکبر جل جلالہ" میں بھی ابوالفضل کا تتبع کرتا ہے۔ اورنگ زیب کو جب بھائیوں سے لڑنا پڑا ہے تو کئی معرکوں میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ آخرکار وہ شجاع سے ملگیا۔ مگر شجاع کی شکست کے بعد اوس نے اپنے آپ کو اورنگ زیب کے سپہ سالار میر جملہ کے حوالہ کر دیا۔ اسکے بعد عمر بھر داول گوالیار اور پھر سلیم گڈھ متصل دہلی میں قید رہ کر بعمر سی و ہفت سالگی۔ ۳ دسمبر سنہ ۱۶۷۶ء کو راہی ملک بقا ہوا

(انسٹیوٹ گزٹ)

ناظرین براہ کرم خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

منیجر

ابو نصر فارابی
معلّمِ ثانی

ابو نصر لقب، اور محمد ابن محمد ابن اوزلغ بن طرخان نام تھا۔ فاراب[۱] اوسکا وطن آبائی تھا۔ یہ ایک کمانڈر کا ہونہار لڑکا تیسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا۔ مدت تک بغداد میں رہا پھر شام میں جا بسا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔ معلم ارسطو کے فلسفہ کو اسی نے اہل اسلام کے سامنے پیش کیا اور اِسی صلہ میں علمی دربار سے خطاب معلّمِ ثانی حاصل کیا۔

اگرچہ نصر سے پہلے مسلمانوں کو یونانی فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر ارسطو کی نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ایک دوسری زبان درکار تھی قدرت کے اسرار ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اوسوقت تک یونانی فلسفہ عربی میں نہایت بھدّے اور ناموزوں تجربوں کے لباس میں تھا۔ جن سے فایدہ اٹھانا معلوم۔ بے جان الفاظ کے پیکروں میں۔ روح معانی کے جلوے نگاہ تصور کو بھی نظر نہ آتی تھی۔ تخیل سا ذوج تو کیا باریک بیں عقول بھی مصنوعی فہم و ادراک کا دعوی کرنا اپنی موت

---

[۱] فاراب ترکستان میں نہر سیحوں کے پرے بلاساغوں کے قریب ایک شہر ہے جو طول میں ایک دن کی مسافت رکھتا ہے۔

سمجھتی تھی کہ یہ نامور وجود خاک پاک پارس سے اُٹھا اور حقائق اشیاء کے اظہار کا چمکتا آفتاب تمام عالم افکار میں روشن کردیا۔ جس کی کرنیں عرب وعجم بلکہ یورپ وامریکہ کے فلاسفروں کے خلوت کدہ تخئیل میں پہونچ گئیں اوس نے فلسفہ کی تجلیوں کو دیکھا اور وہ اس کے فیض تنظر سے ایسی ہوگئیں کہ آج ہم سب دیکھ سکتے ہیں۔

ارسطو جو حقیقت میں یونانی فلسفہ کا موجد گزرا ہے اگرچہ قدما کی طرح فلسفہ کی عام تعلیم کا مخالف نہ تھا کہ سوا خاص شاگردوں کے اور کسی کو ایسی قیمتی جواہر کی طرف نگاہ کرنے کی بھی اجازت نہ دیتا اور ہمیشہ رمز واشارات کے صندوقوں میں محفوظ رکھتا۔ مگر اوس کے بسیط مضامین بھی معمولی ذہنوں کی چار دیواری میں نہ سما سکتے تھے۔ اوس نے گو افلاطون الٰہی کی طرح تعلیم فلسفہ کے لئے اپنی ہیکل کے دروازہ پہ یہ نہیں لکھدیا تھا کہ جو علم ہندسہ نہ جانتا ہو ہمارے پاس نہ آئے لیکن اوس کا تسلسل خیالات اور مقدمات تمہیدیہ کا سلسلہ بھی فہم وخرد میں بھی نہ آنے پاتا تھا۔ کہ مخاطب کثرت غور وخوض سے مجنوں ہوجاتا تھا۔

ابونصر نے ارسطو کی کتابوں پر کثرت سے تعلیقات لکھے اوس کے مجمل بیانوں کی تشریح اور کندی وغیرہ مترجمین کی اغلاط کی تصحیح کردی جس سے عربی خزانہ افکار میں یونانی جواہر کی قدر وقیمت بڑھ گئی۔ یونانی فلسفہ عام ہوگیا اور عام وخاص اوس سے مستفید ہونے لگے ابونصر خود ساختہ غریب وفقیر تھا وہ ابتدا میں ایک [illegible] سے [illegible] کھاتا تھا۔ مگر اسپر بھی اوس نے اپنے تمام مشاغل فلسفہ کے لیے وقف کردیئے تھے ارسطو کی کتابیں بڑی گراں تھیں اور ابونصر تنگدستی کی وجہ سے مؤل

نہیں دے سکتا تھا۔ کہ اتفاق سے ایک اجنبی ارسطو کی تمام کتابیں اوس کے پاس چھوڑ گیا اب کیا تھا ابونصر نے اون کتابوں کے دیکھنے کا حق ادا کر دیا۔ کثرت غور و خوض سے وہ اون کے تمام مطالب پر حاوی ہو گیا۔ وہ مطالعہ و تصنیف کی ضرورت سے رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اتنی استطاعت کہاں تھی کہ دمڑی کا تیل چراغ میں ڈالتا اور ایک گوشہ میں بیٹھکر مطالعہ میں مشغول ہوتا۔ غریب ساری رات اپنے گھر سے نکلکر چوکیداروں کی لالٹینوں کی روشنی میں پڑھتا پھرتا تھا۔ خدا نے اُسے ایسا ذہین کیا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ فیلسوف اعظم شمار کیا جانے لگا۔ فلسفہ مشک سے بڑھکر خوشبودار ہے وہ اگرچہ فلسفی کی نافہ دماغ میں محفوظ رہتا ہے مگر فلاسفر کی ہر نفس نفحات طیبہ بنکر مشام سامع کو معطر کرتے رہتے ہیں یہی سبب تھا کہ ابونصر تو ایک گوشہ میں تھا۔ مگر اوس کی باتیں جہان میں تھیں۔

غرض اوس کے علم و فضل کے دُور دُور چرچے ہونے لگے۔ ہر وقت شاگردوں کے جمگھٹے رہتے تھے حلقہ درس میں بڑے بڑے جلیل القدر امرا سائل فلسفہ کی دلچسپ تقریریں سُننے کے لئے شامل ہوتے تھے شدہ شدہ یہ خبر امیر سیف الدولہ کو پہونچی سیف الدولہ بڑا جوہر شناس اور علم دوست تھا۔ اوسکا دربار علم و فضل کا دربار تھا جس نے متنبی کے دیوان میں سیفیات کو پڑھا ہے وہ سیف الدولہ کی عظمت و شان کا کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ غرض سیف الدولہ نے ابونصر کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور قبیلہ تغلب کے اس مغرور امیر کو ابونصر کے فضایل کا اعتراف کرنا پڑا۔ دربار کے اراکین ابونصر کو دیکھنے اور اوسکے ساتھ گفتگو کرنے کو فخر سمجھنے لگے۔ ادھر سیف الدولہ کے خزانے اوری تالک میں سے تھے۔

کہ جس طرح ہوا اس کے نگہ بلند کو اجسام ترابیہ کی طرف مائل کریں اور فانی لذتیں غلبہ پاکر اسی منازل نفوس باقیہ سے دور کردیں۔ مگر وہ جو آزادانہ منظر اقدس کو دیکھ رہا ہے اور عالم اعلےٰ کی ورفعت حریت کے نغمو نپر کان لگائے ہوئے ہے عناصر اربعہ کی چار دیواری کا ہوکر نہیں رہ سکتا دنیا روئی کی پست آوازیں اوس کے عالم سامعہ تک نہیں پہونچ سکتیں

ابو نصر نے بھی اپنے کمال بیرغی کو ظاہر کیا۔ اوران مذموم علائق سے منہ پھیر لیا۔ اگرچہ ہموم دنیہ سے مطلقاً نجات پانا۔ اور اونکے اسباب دفع سے قطعاً اغماض کرنا فطرت انسانیہ کے خلاف ہے۔ ابو نصر نے بقدر ضرورت صرف چار درم یومیہ لینا منظور کیا۔ اور سیف الدولہ کے یہاں سے یہی روزینہ مقرر ہوگیا۔ ابو نصر فیشن کا دلدادہ یا دنیاوی طرز معیشت کا مقلد نہ تھا بلکہ وہ خود انسانی زندگی کا ایک کامل نمونہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ایسی جدوجہد حیات کے نمونے آج ہمارے پیش نظر ہوتے تو ہم وہی تھے جو ہمیں ہونا تھا۔ ابو نصر راہبوں کی طرح ایک ہستی بیکار نہ تھا بلکہ اوسکا زہد اختیاری دنیاوی جاہ و منزلت کی ناقدری اور بے ثباتی کا بہت بڑا واعظ تھا۔ وہ اپنے قول وعلم سے نہیں بلکہ عمل وفعل سے اپنا، دہر کا روحانی معلم تھا۔ وہ انھیں بتاتا تھا۔ راغب

دُنیا روئی اور یہ شوق تحصیل کیوں تم نے کیا ہو اپنی ہمت کو ذلیل
سمجھو تو سہی کس کے عوض بکتے ہو کہتا ہے خدا متاع دُنیا ہو قلیل

ابو نصر کی زاہدانہ زندگی کی حد ہوگئی اوس نے آخر دم تک کسی منزل ومکسب کی طرف مستقل توجہ نہیں کی وہ اگرچہ ابتدا میں قاضی ہوگیا تھا مگر جب اوسپر معارف کھلگئے اوس نے فوراً استعفا داخل کردیا۔ اور

ہمہ تن تحصیل فلسفہ میں مشغول ہوگیا۔ اوس نے ایک شخص یوحنا بن حیلان نامی سے زمانہ خلافت مقتدر میں فلسفہ آخر کتاب البرہان تک پڑھا۔ کتاب البرہان کا آخری حصہ درس میں نہ تھا مگر ابونصر کے زمانہ سے درس میں داخل ہوگیا تھا۔ افسوس ہے البرہان کا آخری حصہ تو کیا البرہان بھی ہمارے درس فلسفہ میں داخل نہیں۔ اور آج ہمارے طلبا سے فلسفہ اوس کی زیارت سے بھی محروم ہیں۔ ابونصر کے زمانہ تحصیل فلسفہ میں ایک شخص ابوالبشر متی بن یونان فلسفی بھی تھا۔ اس نے ابراہیم مروزی سے فلسفہ پڑھا تھا۔ متی اگرچہ بڈھا ہوگیا تھا مگر مسائل فلسفہ میں ابونصر کی طرح ژرف نگاہی اُسے نصیب نہ تھی اور نہ وہ ابونصر کی برابر ذہین وفہیم تھا متی ایام خلافت راضی میں ۳۲۳ھ لغایت ۳۲۹ھ کے دوران انتقال کرگیا۔ پھر تو ہر جگہ ابونصر ہی ابونصر تھا۔ شروع شروع میں ابونصر کو نحو اچھی نہیں آتی تھی اوس نے ابوبکر بن سراج نحوی سے نحو پڑھنا شروع کی اور اسکے معاوضہ میں اوسے منطق کا درس دیا۔

ایسے علم و فضل پر بھی اوسکا یہ عالم تھا کہ جب کسی نے پوچھا کہ تم زیادہ فلسفی ہو کہ ارسطو۔ تو اوس نے صاف الفاظ مین کہدیا کہ اگر میرے زمانہ میں ارسطو ہوتا تو میں اوس کے ایک شاگرد سے بڑھکر نہ تھا۔

ابونصر فلسفہ کا امام تھا۔ اور تمام متاخرین میں اوس کے مقتدی اوس نے محققانہ بلکہ مجتہدانہ انداز سے فلسفہ کی تمام شعبوں میں اسپنے کمالات دراک کا ثبوت دیا ہے یہانتک کہ وہ موسیقی کا بیمثال اوستاد تسلیم کیا گیا۔ اوس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس کے نغمے جذبات سامع میں آگ لگا دیتے تھے حلقہ سماع میں ہنسنا رونا سوجانا سننے والے کے

اختیار میں نہ تھا۔ بلکہ ابو نصر کے ارادہ اور اوس آلہ کی ایجاد معجزہ کے اشارہ میں تھا۔ خلکان نے لکھا ہے کہ ابو نصر جب سیف الدولہ کے علمی دربار میں پہونچا ترکانہ انداز تھا اور اسی طرح سیف الدولہ کے سامنے کھڑا ہو گیا سیف الدولہ نے کہا بیٹھو فرمایا کس حیثیت سے حیث آنا۔ ام حیث انت۔ سیف الدولہ نے کہا حیث انت سنتے ہی آگے بڑھا اور مسند شاہی تک پہونچکر سیف الدولہ سے بھڑ گیا یہانتک کہ وہاں سے ہٹایا گیا۔ سیف الدولہ کے پیچھے اوس کے مسلح غلام کھڑے رہتے تے جن کے اسلحہ آداب دربار کی بڑی زبردست نگراں اور اون کے ابروئے شمشیر بادشاہ کی ادا فہم نگہبان تھے۔ سیف الدولہ ایک خاص زبان میں اُنھیں احکام دیتا تھا۔ تب بھی اوس نے اوسی زبان میں اون سے کہا کہ اگرچہ اس بڈھے نے آداب شاہی کا لحاظ نہیں کیا مگر میں اس سے کچھ پوچھتا ہوں اگر جواب نہ دے سکے تو اس کے تم ٹکڑے اُڑا دینا۔ ابو نصر نے یہ سُنکر فوراً بادشاہ سے کہا کہ صبر کیجیے۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ است۔ سیف الدولہ یہ سنکر بڑا متعجب ہوا اور اوس سے کہا کیوں جی تم یہ بھی زبان جانتے ہو اوس نے کہا جی ہاں میں ستر سے زیادہ زبانیں جانتا ہوں پھر علماے حاضرین سے ابو نصر کی گفتگو ہوئی اور اوس نے ہر فن میں علما کا ناطقہ بند کر دیا۔ علما کو چُپ کر دینے کے بعد اوس نے خود تقریر شروع کی اور لوگوں نے قلم دوات سنبھالے۔

پھر سیف الدولہ نے پوچھا کہیے کچھ کھائیے گا۔ اوس نے کہا نہیں۔ پینے کو پوچھا تو بھی انکار رہا سیف الدولہ نے کہا اچھا تم کچھ سنو گے اب کے جواب اثبات میں تھا۔ سیف الدولہ کے حکم سے محفل سماع منعقد ہوئی

اب کوئی سازندہ یا نوازندہ ایسا نہ تھا جسے ابونصر نے نہ ٹوکا ہو اور اونکے
آلات طرب طبلہ سارنگی میں عیب نہ نکالا ہو۔ سب نے اپنا اپنا کان پکڑا اور
ہاتھ جوڑ کر یا اوستاد ٹھیک ہے۔ جی حضور بجا ہے۔ کہکر چپ ہوگئے
پھر ابونصر نے خود ایک تھیلی میں سے چند لکڑیاں نکالیں اور اونھیں
ترکیب سے ایک بنا لیا پھر جب اوسے بجایا تو محفل کی محفل ہنستے ہنستے
لوٹ گئی پھر دوبارہ ترکیب دیا اور بجایا تو سارے دربار کا روتے
روتے برا حال ہوگیا۔ تیسری دفعہ نئی ترکیب دیکر جب اوس نے بجایا
ہے تو اہل مجلس خواب راحت میں تہی دربان تک سوگیا اور ابونصر سبکو
سوتا چھوڑ کر چلدیا۔ خلکاں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابونصر شام کے
آبشاروں اور باغوں میں اوقات بسر کرتا تھا۔ اور وہیں تصنیف و تدریس
کا سلسلہ رہتا تھا وہیں اس کے حواری اوس سے فیض پاتے تھے
اسی بے سروسامانی کے باعث اوس کی کتابیں اکثر ناقص رہ گئی ہیں
جب اسی برس کی عمر ہوئی ۳۳۹ھ میں دمشق میں وفات پائی سیف الدولہ
نے چار اراکین کے ساتھ نماز پڑھی بیرون دمشق باب صغیر کے باہر
دفن کیا گیا بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ ابونصر نے ۳۳۰ھ میں
مصر کا سفر کیا اور وہاں سے لوٹ کر دمشق میں سکونت اختیار کی اور
وہیں رجب ۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ اس زمانہ میں خلافت عباسیہ
پر خلیفہ راضی کا تام تھا۔ سیف الدولہ نے پندرہ خواص کے ساتھ
نماز پڑہی۔ واللہ اعلم +

راغب جیلانی بدایونی۔

قدیم ہندوستان کی تہذیب

(مترجمہ - اے - ڈی - احمد صاحب)

کسی قوم کے تمدن کی اشاعت اور اُسکی قومیت کے قیام کے لیئے تاریخ کا مطالعہ جسقدر ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں کسی انگریزی مؤرخ کا قول ہے کہ جو قوم اپنے بزرگوں کے کارنامے نہیں یاد رکھتی وہ خود کبھی ایسا کام نہیں کرے گی جو آیندہ یاد رکھے جانے کے قابل ہو۔ لیکن محض قومیت کی عینک کو اُتار کر اگر آپ تاریخ کو فلسفی کی نگاہ سے دیکھیں تب بھی آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ تمدن کا تسلسل قومی ترقی کے لیئے اس اصول کو منضبط کرتا ہے کہ کسی قوم کی پچھلی تاریخ اُسکے عروج اور زوال کے اسباب اُسکی فطرتی قوتوں اور اُسکے مرز بوم کے حالات۔ اُس قوم کی آئندہ روش پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ آجکل کے نوجوانوں کے لیئے جنھیں ہندوستانی قوم کو از سر نو خلق کرنا ہے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔

مسٹر دت کی تاریخ ہندوستان قدیم ہمارے ملک میں انیسویں صدی کی نامآور کتابوں میں سے ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک محض واقعات کی تحقیقات کا تعلق ہے۔ اس کتاب میں بہت کچھ کمی ہے اگر یہی کتاب مسٹر دت آج لکھتے تو وہ موجودہ مستشرقین کی تحقیق اور تنقید سے ضرور فائدہ اُٹھاتے۔ اس خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر ونسنٹ اسمتھ پروفیسر رائیس ڈیوس کی کتابیں مسٹر دت کی

تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ معتبر ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ہمکو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مسٹر دت نے مسٹر اسمتھ کی طرح واقعات بیان کردینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُنسے نتائج بھی اخذ کئے ہیں اُنکی کتاب محض تاریخی روزنامچہ نہیں ہے بلکہ ہندو تمدن کی داستان ہے اور چونکہ وہ خود ہندو تھے اور اس تمدن کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بخوبی واقف تھے اسلئے باوجود تحقیقات کے نقائص کے جو کچھ اُنھوں نے ہندو تمدن کے متعلق لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ توجہ سے پڑھا جائے اور غور و فکر کی کسوٹی پر کسا جائے۔

مسٹر اے۔ ڈی۔ احمد صاحب نے مسٹر دت کی کتاب کے پہلے دَور یعنی ویدک زمانہ کی تاریخ کا ترجمہ کیا ہے اور کتاب کے باقی حصص کا ترجمہ کرنے کا آخر میں وعدہ فرمایا ہے۔ علاوہ ترجمہ کے آپ نے کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں قدیم داستانوں کے فوائد، مذہب اور تمدن کے متعلق۔ تاریخی تنقید کے اصول اور اسی قسم کے دیگر مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ زاں بعد وید سنسکرت کا علم ادب اور فلسفہ ویدانت۔ ہندوستان قدیم کے فنون نفیسہ وغیرہ کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسکے بعد مسٹر دت کی سوانح عمری درج ہے۔

نئی روشنی کے دلدادہ غالباً یہ کہیں گے کہ اتنا بڑا مقدمہ کسی تاریخی تصنیف کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ اسمیں اکثر انھیں باتوں کو دُہرایا گیا ہے جنپر مسٹر دت نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے اور جب ہمکو کتاب کا ضمیمہ بنانا ہے تو ان باتوں کے اعادہ کی مقدمہ کے شکل میں کیا حاجت

تھی۔ ترجمہ میں زبان کی لطافت بہت کچھ موجود ہے لیکن کہیں کہیں پرانی انشاپردازی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ذیل کے فقرے ملاحظہ ہوں:

"ابتدائی زمانے کی قدیم روایتوں اور قومی تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ بالکل اس زمانہ کی ضد واقع ہُوا تھا اُسمیں نہ تہذیب تھی نہ شایستگی تھی نہ تمدن کی ترقی تھی نہ تعیش کا وفور تھا نہ ایسے اسباب راحت موجود تھے نہ ایسے سامان فرحت مہیا تھے نہ اسطرح کی معاشرت تھی نہ اس نہج کی منافرت تھی نہ یہ حرفت وصنعت کی گرم بازاری تھی نہ یہ زراعت وتجارت کی بھرمار تھی نہ کوئی نظام درست تھا نہ کوئی اسلوب صحیح تھا نہ کہیں ایسی منتظم بادشاہت تھی نہ کہیں ایسی باقاعدہ حکومت تھی نہ ایسے دستور رائج تھے نہ ایسے اصول قائم تھے نہ کسی قسم کا قانون نافذ تھا نہ کسی نوع کا آئین شائع تھا نہ یہ خلش تھی نہ یہ روش تھی نہ ایسا تکلف تھا نہ ایسا تصنع تھا نہ اسطرح کا علم ادب دیکھنے میں آتا تھا نہ اس قطع کا فلسفہ پایا جاتا تھا نہ کسی ذات کی قید تھی نہ کسی رسم کی پابندی تھی نہ اس حیثیت کی آرائش تھی نہ اس کیفیت کی نمائش تھی نہ یہ آفتاب آفتاب سمجھکر پوجا جاتا تھا نہ یہ ماہتاب ماہتاب جانکر مانا جاتا تھا غرضکہ نہ یہ زمین زمین تھی نہ یہ آسمان آسمان تھا۔"

"جب ہمارا تصور ہم کو ابتدائی دُنیا کی سیر کراتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں خدا کی سادگی پسند مخلوق آباد ہے جسمیں نہ حد سے بڑھا ہوا تعصب ہے، نہ اقتدار سے زیادہ

تشخص ہے نہ افراط ہے نہ تفریط ہے نہ تعمیم ہے نہ تخصیص ہے
نہ پیکار غلو ہے نہ فضول علو ہے نہ تساہل ہے نہ تغافل ہے
نہ اندوہ ہے نہ یاس ہے نہ جسارت ہے نہ ہراس ہے نہ بغض
عداوت ہے نہ بے سبب نفرت ہے نہ حقارت ہے نہ شماتت
ہے نہ کراہت ہے نہ اہانت ہے نہ کہیں بڑھی ہوئی حاجتمندی
ہے نہ کہیں گھٹی ہوئی حوصلہ مندی ہے......"

اِس کتاب کی ریویو میں ہم ایک امر کا ذکر کرنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ ہندوؤں کی قدیم تمدن کی داستان کا ایک مسلمان مترجم کے ہاتھوں اس زمانہ میں ترجمہ ہونا جبکہ ایک طرف مسلمان لیگ کا دَور دَورہ ہے اور دوسری طرف ہندو کانفرنس کی اشاعت ہو رہی ہے ایک مسرت انگیز اور تعجب خیز واقعہ ہے۔ مترجم صاحب کو انکی علمی کوشش اور انکی بے تعصبی پر مبارکباد دیتے ہیں اور جس عزت کے ساتھ اُنھوں نے ہندو بزرگوں کا نام لیا ہے اور جس طریق پر اُنھوں نے ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کے خوبیوں کی قدردانی کی ہے اُسکو ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے لئے قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب محمد فدا علی خاں صاحب سکریٹری ٹرینسلیٹنگ کمیٹی گھاٹ دروازہ جے پور سے مل سکتی ہے۔

منوہر لال زتشی

خوفِ رُسوائی

(۱)

ایک آراستہ وپیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ وُہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر بظاہر اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے۔ بلکہ بے چینی اور انتشار۔ اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اُس کے حسین چہرے پر نمودار ہیں۔

سرلا۔ بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی۔ دھرن کلکتہ کے ایک ہونہار بیرسٹر تھے۔ خلیق اور غریب نواز فیشنبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے نہ بال سے رغبت۔ نہ گھوڑ دوڑ کے شیدا۔ وہ تھیٹروں اور پولٹیکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق وتدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا۔ جہاں تکلف اور ظاہر داری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے۔ دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولٹیکل خبروں سے گونج رہا تھا۔ مگر دھرن کو اُنسے صرف اتنی ہمدردی کہ اخباروں میں اُن کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا۔ پولٹیکس سے اُسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا سلیم الطبع صلح پسند۔ میانہ رو۔ خوش باش آدمی مشہور تھا اس کے برعکس سرلا نیشنلسٹ عقائد کی عورت تھی۔ اُس نے اعلیٰ درجہ کی

انگریزی تعلیم پائی تھی، اور ہندوستان کے پولٹیکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اِس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے برسبیل تذکرہ ہندوستانی عورات کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے! آزادی نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے۔ باوجود اِن اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی۔ وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی۔

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" "انھیں اِن معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں"

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی بنگل کے روز چار بجے شام کو ہیریسن روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم کا گولہ چلایا تھا۔ اِس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈالدی تھی۔ خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جُرم لگایا گیا تھا جو شخص سنتا اُسے حیرت ہوتی۔ دھرن بابو! نہیں۔ وہ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہو سکتے! وہ ایسے سیدھے سادے۔ سلامت پسند۔ اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو اُن کے متعلق ایسی متوحش خبر سُنکر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پہ یہ

شبہ محض ایک مخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا۔ مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ منگل کو چار بجے دھرن بابو ہیریس روڈ پر موجود تھے۔ اور اُنہوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے بم کا گولہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق۔ الماریاں۔ کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجودیکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھر بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہوسکے۔ تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیر حراست لے لیا۔ سرلا انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے

وہ خیال کرتی تھی ”ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اُس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت ملسکتا ہے۔ اُن کے موکل اور احباب اسکی تصدیق کرسکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کرلی ہوگی اور غالباً آتے بھی ہوں گے“

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک موٹر کار دروازہ پر آکر رکی۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرت سے بیتاب ہوکر زینہ سے نیچے اُتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندر دیبن بیٹھے ہوئے تھے۔ جو دھرن کے دلی دوستوں میں تھے۔

سرلا نے پوچھا: ”دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی

حماقت کی ہے۔ تم جانتے منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہو گئی نہ۔ کب تک آئیں گے؟ تم اُن سے ملے تھے؟"

جو تندرو کے چہرے نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکرمند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا "جو تن تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

جو ن نے کچھ سوچکر جواب دیا "شاید دھرن آج شب کو نہ آسکیں ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جونہی ان کی صفائی ہوگی۔ غالباً ان کا تم سے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں ....." یہ کہتے کہتے جو تن بابو رک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی۔ "جو تن اب مجھے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھرن ابھی رہا نہ ہو سکیں گے کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چار بجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا۔"

جو تندرو نے لمبی سانس لیکر کہا "منگل کے دن سہ پہر کو وہ عدالت میں نہیں تھے۔"

سرلا "کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے؟" جو تندرو "یہی تو وہ بتلاتے نہیں۔"

سرلا "کیوں آخر وجہ؟ کیا آپ ہی اپنے دشمن ہوئے ہیں۔؟"

جو تندرو "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ عدالت میں ان کے ۲ بجے

تک رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے۔ مگر کہاں گئے اور ۳ بجے سے ۶ بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے“۔

سرلا نے عالم وحشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا: ”میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اِس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آ سکتا۔ مگر وہ صاف صاف حقیقت حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انھیں سمجھایا نہیں“؟

جوتندر: ”سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزی کرتے رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہمکو اُن کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ایسے نازک موقع پر اُن کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بلا سے میں چند سالوں کے لئے جلاوطن ہو جاؤں گا۔ جلاوطنی اور قید جھیلنے کے لئے آ؛ دہ ہیں مگر منگل کو کہاں سے۔ یہ نہیں بتاتے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمہیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں“؟

سرلا نے سر ہلا کر جواب دیا: ”میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ منگل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا [illegible] کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ ذرا مجھے [illegible]

وہ سب مجھ سے کچھ اپنے دل کی بات کہیں. ضرور کہیں گے۔ میں اُنھیں سمجھاؤں گی مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقت حال سُن لوں گی۔ وہ میری درخواست کو رد نہیں کرسکتے۔ بس مجھے اُن کے پاس لے چلو۔

سرلا کا گلا بھر آیا۔ جوتن رو تسکین دہ لہجہ میں بولے "میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاید تم کو وہ کچھ بتلائیں۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر اب رات زیادہ آگئی ہے۔ اور اس وقت اُن سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے۔ مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی۔ میں کل تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا۔ ہائیں۔ یہ کیا۔ دل کو ڈھارس دو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے"

سرلا کی آنکھوں میں اشک اُمڈے ہوئے تھے۔ مگر اُس نے ضبط کیا اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "جوتن۔ تمہاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ مگر میں انھیں فراموش نہیں کرسکتی"

سرلا کی آواز پھر رک گئی۔ وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی دھرن کی واپسی کی امید نے اُس کے چہرہ کو روشن کردیا تھا۔ مگر اب اس پر حسرت و یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جوتن بابو آہستہ آہستہ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے۔ وہ سوچتے جاتے تھے "غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے۔ کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہہ دیتا۔ مگر تب بھی عجیب گومگو معاملہ ہے"

(۴)

دس منٹ گذرے تھے۔ سرلا [illegible] نہیں کیا یا۔ تو [illegible] سے باہر

نکلے آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی۔ مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی طرف تب وہ اٹھکر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں چلکر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے اُن سے ملاقات کرنے دو۔ کیا وہ انکار کرے گا؟

ہائے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں انکے پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ کیا اسوقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجلا اُٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل کا، اور میری محبت کا اندازہ نہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیوں۔

ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نگاہ دھربندر کی میز پر پڑی۔ خطوط۔ کاغذات اخبارات اوراق پریشان کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی۔ یکایک اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ اسے اٹھا کر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھ دے۔ مگر اس پرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اُسکی آنکھوں میں چبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ "منگل کے دن ۸ بجے!" سرلا چونک پڑی۔ اُس پرزے کو اٹھا لیا۔ منگل کے دن ۸ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اُس نے ان الفاظ کو پھر غور سے دیکھا کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اُسے

پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ انداز تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ سراپا وجودیکہ شوہر کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس کے دل میں یہ خیال قایم کر دیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں۔ ہے کیا۔ میں اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوں گے یقیناً اُس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیب جدید کی یہ قیدیں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں نہیں آسکتیں۔ کیا مجھے اُن کے رازدار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ میں ثابت کردوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں جس طرح اُن کے دل میں۔

اس نے خط کھولکر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ سرلا ایک ہی نگاہ میں اُسے پڑھ گئی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پرزہ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہوگیا تھا۔ عضوِ مفلوج کی طرح اس کے دل و دماغ اس وقت بیکار ہو گئے تھے خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے

صورت پذیر ہوگئی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کرسی پر گر پڑی
آہ اس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لیئے زبان پر مہر لگی ہوئی ہے،،
خیر اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کر دے گا۔ جو اُن پر
عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے
رکھدوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔
اور دھرن فوراً رہا ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد پھر کیسے نبھیگی! کیا
اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کی محبت کر سکیں گے۔!،،

اسے پھر خیال آیا۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح
طشت ازبام کر دوں جس کے مخفی رکھنے کے لئے دھرن یہ سب کچھ
جھیلنے کو تیار تھے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کر دوں۔ اور انھیں
اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے وہ بالکل پاک ہیں۔ انھیں
بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اس کے دل نے فیصلہ کر لیا۔ وہ کھڑکی کی طرف
گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر ایک چادر اوڑھ کر باہر
نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی
نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے
سامنے آکر رکی کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پر بیٹھی
ہوئی کچھ لکھتی دکھائی دیتی تھی۔ سرلا کو دیکھتے ہی اُس عورت نے گھبرا کر
پوچھا "سرلا! تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن
بیمار تو نہیں ہیں؟،،

سرلا نے میز کے سامنے آ کر کہا "کیا تم نے نہیں سنا کہ دھرن پر
حادثہ بمب میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے
کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بمب دیا گیا اُس وقت دھرن وہاں
موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے دھرن کا بیان ہے
کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں۔ اور نہ اُس وقت میں وہاں تھا لیکن
یہ وہ نہیں بتاتے کہ اُس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے
دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے؟

وہ عورت چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی "منگل کو چار بجے! اُس دن تو
وہ....." کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور بہت مدھم لہجہ میں بولی "لیکن وہ کچھ
بتاتے نہیں کیا۔ سوا کچہری کے اور کہاں ہوں گے!"

سرلا نے جواب دیا "نہیں اُس دن وہ عدالت میں نہیں تھے!"
مگر ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ "اُگل پڑی" اور اس معاملہ میں وہ اس لئے
خاموش ہیں کہ شاید اظہار حال کسی کے نام نیک پر دھبہ نہ لگا دے
اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھے
سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، یہ دیکھو" یہ کہکر اس نے وہی خط میز پر پھینک دیا

اس عورت نے ایک خط اُٹھا لیا۔ اور اس پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالکر
کسی قدر بیباکانہ لہجہ میں بولی "مجھے کسی کا خوف نہیں ہے بیشک دھرن کو
مجھ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے!"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے تحکمانہ انداز
سے کہا "تو انھیں بچا کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس
بھیجدو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے" یہ کہکر وہ لوٹ پڑی۔ اور

اور اپنے خانۂ محزوں میں چلی آئی۔

تڑکا ہو گیا تھا۔ اور سرلا کی آنکھیں ابھی نہیں جھپکی تھیں۔ اسے اب دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی، اس فکر سے اب وہ آزاد ہو گئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیر رکھا تھا وہ اس سے بھی زیادہ جانکاہ تھیں۔

"تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے مجھ سے ملاقات ہوگی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دعوے پر۔ کس برتے پر، اُن سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے تو میں کونسا مُنہ لیکر ان کے سامنے جاؤنگی۔ جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُن پر اعتبار تھا۔ مگر اب! آہ اب میرے لئے زندگی میں کیا امید رہے میرا دل۔ میری جان میری آرزوئیں۔ میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم رہے۔ میرا سہاگ اب کہاں"؟

سرلا کی آنکھیں کھڑکی سے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے دماغ میں اب احساس کا مادّہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس، نیند اور تکان۔ یہ ضرورتیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں۔ سُست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی کے سامنے انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اُس نے بارہا اُن سے اُن کی بے نمکی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دل کو تسکین ہو گئی تھی کہ ان کی طبیعت ہی یہ متین واقع ہوئی ہے۔ وہ

سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہار جذبات سے محترز رہتے ہیں۔ وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ درگا پوجا کے دن سرلا کے لئے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ مقدمات کی مصروفیت ان بے اعتنائیوں کا باعث ہے۔ اُسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی۔ مگر دل سے وہ میری محبت کرتے ہیں۔ مگر اب ان سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دام محبت میں گرفتار ہیں۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا مگر باوجود ان سرد مہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور تھی۔ اُس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دیدی تھی اور اب کسی طرح ہٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اُس کے لئے سوہان روح ہی کیوں نہ ہو۔ بیشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جانکاہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دیر تک سوچنے کے بعد سرلا اس نتیجہ پر پہنچی "میں اب ان کا دامن چھوڑ دوں گی۔ اس کے سوا میرے لئے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے میں نے اب تک نادانستہ انھیں قید جبر میں رکھا ہے اب میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ اُن کا گلا چھوٹ جائے گا۔ اُنکی زندگی آرام سے گذرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں سرسبز رہیں۔ انھیں خوش دیکھکر میں بھی خوش ہولیا کروں گی"!

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک ایک گاڑی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کھڑکی سے

جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا
مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔
اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔
اُسے الفاظ ہی نہ ملے دھرن نے اُس کے پاس آکر آغوشِ محبت میں
لینا چاہا۔ اور بولے "کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں؟" سرلا
نے مُنہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا۔ کہنے لگے "پولیس
والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا کسی طرح خانہ عافیت میں
تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا"

سرلا خاموش اُن کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی کیسی مکر کی باتیں ہیں۔
دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا
ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہ ہو سکی۔ ترش لہجہ میں بولی "تم یہاں کیوں آئے؟"
دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو اپنے گھر کے
سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات
ہوئی؟"

سرلا "ابھی اُس سے ملاقات کی یا نہیں۔؟"

دھرن "کس سے؟ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا"

سرلا "دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں
ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔ مجھ پر تمہاری
ساری باتیں روشن ہو گئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو
مجھے میز کے نیچے گرا ہوا ملا۔ یہ خط میں نے تمہاری معشوقہ کو دکھایا۔ اور غالباً
اس نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کر دیا اس لیئے اب مجھ سے دغل

فیصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمہیں شوق سے لطف زندگی اٹھانے کے لئے آزادی دیتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہوگئیں ورنہ تمہیں اتنے عرصہ تک قید بے جا میں نہ رہنا پڑتا۔"

دھرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر راز طشت از بام ہوگیا۔ میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کردیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیونکر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام نہ دیا تھا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا۔ مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا: "میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اس خطا کو معاف نہیں کرسکتیں۔ اگر کسی کے کان میں اس کی ذرا بھی بھنک پڑگئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے۔ مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اس نے خط کو دیکھکر مجھے تو رہا کردیا۔ مگر اسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہو کہ لوگوں کو ایسی باتوں کی کیونکر تلاش رہتی ہے۔ پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔"

سرلا: "کیوں تم اس پر عاشق نہیں ہو؟ اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلاوطنی جھیلنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اس کے دروازے پر نہ جاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقش محبت مٹ گیا۔ ان فریب کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں

ذرا بھی مخل نہوں گی۔ حسد کا کانٹا بنکر کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی۔"

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجہ میں بولے "سرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں۔ جب تم دیکھتی ہو کہ میں حد درجہ نادم اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمھیں ایسی باتیں کرکے میرا دل نہیں دکھانا چاہیئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیئے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لیئے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر مجھے جلاوطن ہونا گوارا تھا بجائے اس کے کہ منگل کے دن اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہوتیں۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں میں جلاوطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔

سرلا: "اگر راہِ محبت میں قدم رکھا ہے تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمھیں سوسائٹی کا اِس قدر خوف نہ کرنا چاہیئے!"

دھرن: "کیسی باتیں کرتی ہو۔ سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملا دوگی اور میرا مستقبل سیاہ ہو جائے گا۔ میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ سرلا۔ تم اِس وقت غصہ میں ہو مگر جب تمہاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہو جائیگا اور تم اِس مسئلہ پر غور کروگی تو یقیناً میری یہ خطا معاف کر دوگی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہوں گی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سوسائٹی میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر۔ تیرا دوسرے

کاشیدا سہی۔ کیا تمہیں بھی میری محبت نہیں۔ اُسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا" یہ کہکر دھرن باہر چلے گئے۔ اور سرلا وہیں خاموش بیٹھی سوچتی رہی: "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے"!
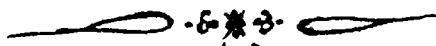
غزل

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری — شبیہ کھینچی تصور نے ہُوبہُو تیری

معاف رکھ! جو ہیں گلہائے تر سے بیزار مجھے — کہ اِن میں رنگ ترا کچھ ہی کچھ ہے بُو تیری

نسیم صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا! — رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری

یہ فخر کم نہیں ہم قابلِ خطاب تو ہیں — عزیز اوروں کے القاب ہیں "تو" تیری

دہانِ غنچہ ترسے، زبان سوسن سے — چمن چمن میں سنی میں نے گفتگو تیری

دل و جگر پھکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے — لگن عذاب ہوئی مجھکو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو، بقول سرورؔ
"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری"

مہر

گذرے ہوئے ملال فراہم نہ کیجئے — اچھے بھلے مزاج کو برہم نہ کیجئے

پھر کاہشِ ہوس سے تبہ ہوگی زندگی — دشمن پہ رحم کیجئے اب دم نہ کیجئے

الفت کو گر فروغ نہ دیجئے نہ دیجئے — جو رہ گئی ہے اس کو تو اب کم نہ کیجئے

روشن ہیں مجھ پہ حسن کی سب کارستانیاں — اپنے ستم کو لطف سے مدغم نہ کیجئے

مصروف منع گریہ رہے آستین خیر
[illegible] طریق سے ماتم نہ کیجئے

[illegible]

حکیم مارکس آریلیس

مارکس آریلیس ۲۶ اپریل ۱۲۱ء کو بمقام روما پیدا ہوا۔ اسکا اصلی نام مارکس اینٹونیس ہونا چاہیئے مگر چونکہ اس نے اپنی زندگی کے مختلف حصص میں مختلف نام اختیار کئے ہیں (کیونکہ اس زمانہ میں نام کی تبدیلی بالکل ایک معمولی بات تھی) اس لئے یہ دیکھنا مشکل ہے کہ وہ کس نام سے زیادہ تر مشہور ہے۔ اسکا والد انیس ویرس جو پریٹر (مجسٹریٹ) کے عہدہ پر ممتاز تھا، رومتہ الکبرے کے دوسرے بادشاہ نیوما کی اولاد میں سے تھا۔ اسکی والدہ ڈومیشیا کیلولا بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دونوں کے کیرکٹر بہت اچھے تھے۔ ہمیں اس کے والد کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں اسلئے کہ آریلیس کی شیرخوارگی ہی میں اسکا انتقال ہوگیا تھا۔ مگر اپنی کتاب "غور و فکر" میں وہ اپنے والد کی بہت تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اپنے دادا سے میں نے اخلاقِ حسنہ سیکھے اور یہ بھی سیکھا کہ مزاج پر کس طرح قابو رکھا جاسکتا ہے۔ اپنے والد کی یاد سے میں نے بہادری اور حیا سیکھی اور اپنی والدہ سے خداترسی، فیاضی اور سادگی سیکھی۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ تمام برے افعال حتے کہ برے خیالات سے بھی اجتناب کرنا مجھے میری والدہ ہی نے سکھایا تھا۔

ہمارے حکیم کا بچپن اور لڑکپن بادشاہ ہیڈرین کے عہدِ حکومت میں گزرا ہے۔ اس بادشاہ میں اگرچہ چند برائیاں بھی تھیں مگر بحیثیت مجموعی وہ دانشمند اور نیک بادشاہوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

یہ بادشاہ بہت قابل تھا اور اس نے اپنی فراست سے آرلیس میں وہ غیر معمولی اوصاف دیکھ لئے تھے جنہوں نے بعد میں سلطنت میں برکت دی اور عوام کے جذبات کو بہتر بنا دیا۔ یہ بادشاہ لاولد تھا اور اسلئے اس نے کیونٹیس کموڈس کو اپنا متبنٰے بنایا جو اگرچہ بہت کم اوصاف سے متصف تھا مگر اسکی ذاتی خوبصورتی بہت بڑی سفارش ثابت ہوئی۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ میرا آخری وقت قریب آگیا ہے تو اس نے تمام اعیانِ حکومت کو جمع کیا اور ان کے روبرو اپنے متبنٰے اور جانشین امیرس اینٹونیس کو ہی اس نے اس شرط پر بادشاہ بنانا منظور کیا تھا۔ کہ وہ اپنے بعد مارکس آرلیس کو ہی کو جانشین مقرر کریگا۔ تخت پر بیٹھنے کے وقت اینٹونینس کی عمر ۵۲ برس کی تھی۔

حکیم آرلیس کی تعلیم کا کہیں اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو محض اسکی اپنی تحریروں سے۔ اسکی تعلیم و تربیت اس کے دادا کے یہاں ہوئی جو تین مرتبہ کونسل کا ایک معزز عہدہ دار رہ چکا تھا۔ وہ اس امر کے متعلق دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسے کسی مدرسے میں نہیں بھیجا گیا ورنہ اخلاقی لحاظ سے اسکی بھی ویسی ہی دُرگت ہوتی جیسے دیگر طلبا کی ہوئی۔ وہ اپنے دادا کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے گھر پر اچھے اُستاد رکھدئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نہایت فراخدلی کے ساتھ تعلیم دی گئی۔ وہ مکہ بازی، اور رٹنت اور بھاگنے دوڑنے کا بہت شائق تھا۔ وہ بلّے میں اچھی طرح سے ماہر تھا، اور اسے جنگلی سور کے شکار کا خاص شوق تھا الغرض اسکے تفریحی مشاغل، اسکی اعلیٰ تعلیم، اسکی اخلاقی تربیت اور عزت نے اسکا کیرکٹر بہترین بنا دیا۔ اسکی تعلیم کے تین اوصاف۔

"محنت" "شکر گزاری" اور "نفس کشی" بالخصوص قابل ذکر ہیں کیونکہ وہ ان باتوں پر مذہبی عقیدت کے ساتھ زندگی بھر عامل رہا ہے۔

(۱) وہ اپنی کتاب "غور وفکر" میں بار بار وقت کی قیمت کے متعلق ذکر کرتا ہوا اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش مجھے علمی مشاغل کے لئے زیادہ فرصت مل جایا کرے۔ وُہ نہایت مستقل مزاجی سے مطالعہ کی ہر صنعت میں محنت کرتا تھا اور اگرچہ اس نے دیدہ و دانستہ فن بلاغت کا مطالعہ نہیں کیا مگر اس نے فلسفہ تعلیم الٰہی اور رومن لا پر زیادہ محنت صرف کی۔ وہ اپنے اتالیق رسٹیکس کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے مجھے غور وفکر کے ساتھ پڑھنے کی عادت ڈالی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ایک منٹ کو بھی رائگاں نہیں کھوتا تھا اور اسی وجہ سے اسکی صحت بھی خراب ہوگئی تھی۔

(۲) کتاب "غور وفکر" کے ابتدائی ریمارکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام اُستادوں کا خواہ وہ کیسے ہی معمولی ہوں، نہایت شکر گزار رہے۔ اس نے اپنے ہر استاد سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا اور اسی وجہ سے وہ فرنٹو، رسٹیکس اور جولیس پر وکیولس کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ وہ دیاتا ولن کا بھی ان الفاظ میں شکریہ ادا کرتا ہے کہ "وہ انھوں نے اسکے لئے اسکی خواہش کے موافق اتالیق مہیا کرد ئے" وہ اگرچہ اپنے استادوں سے معاشرتی اور ذہنی لحاظ سے بزرگتر تھا مگر اس نے اپنی بلند پوزیشن کے باوجود ان سب سے دوستانہ مراسم رکھے اور مرتے دم تک ان سے عزت اور محبت کا سلوک کرتا رہا۔ اس نے ان کے مجسمے اپنے مکان میں رکھے اور ان کی قبروں پر جاکر

پھولوں کے ہار چڑھایا کرتا تھا۔

(۳) اسکی نفس کشی اور ریاضت اسکی محنت اور شکر گزاری سے زیادہ مشہور ہے۔ اس شخص کو اگرچہ ہر قسم کے عیش و آرام کے سامان مہیا تھے مگر اس نے تن پروری کو ہمیشہ تنفر کی نظر سے دیکھا۔ اسکی یہ مثال ان نوجوانوں کے لیئے قابل تقلید ہے جو سیکنڈ کلاس گاڑیوں میں سفر کرنا اپنے لئے موجبِ فخر خیال کرتے ہیں جو انتہائی فیشن کے دلدادہ ہونے کے علاوہ برفوں اور شربتوں پر اسقدر روپیہ برباد کر دیتے ہیں جو ایک غریب شخص کے لئے سال بھر تک کافی ہوسکتا ہے۔ یقیناً وہ اس زندگی کو پڑھکر یہ معلوم کرینگے کہ اس شریف رومن کی نفس کشی ہماری تن پروری سے نہایت ارفع و اعلےٰ ہے۔ وہ ابتدا ہی سے محنت کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا اور اسے ہر قسم کے سامانِ مسرت سے نفرت تھی۔ وہ جو کچھہ کرتا تھا اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ گیارھویں سال کے سن میں اسکی ملاقات حکیم ڈائگن ٹس سے ہوئی جس نے سب سے اول اسے اسٹوئک فلسفہ سے آشنا کرایا۔ بارھویں سال کی عمر میں اس نے فرقۂ اسٹوئک کا لباس اختیار کر لیا۔ اس فلسفہ نے اسے سکھایا کہ "لکڑی کے فرش پر سونا بہتر ہے" کہا جاتا ہے کہ وہ لکڑی کے فرش پر کسی جانور کی کھال اس لیئے بچھایا کرتا تھا کہ اسکی ماں نے بمنت اسے بچھانے کے لیئے درخواست کی تھی وہ وہ کسی تخت پر یا زمین کے فرش پر سونا زیادہ بہتر خیال کرتا تھا۔ لیکن وہ یہ کام کسی نمود اور تمنائے تحسین کے بغیر کیا کرتا تھا۔ اسکے دوست اسے ہمیشہ بشاش پاتے تھے اور اسکی سکوت آمیز طرز عمل میں ایک خاص وقار اور تفکر معلوم ہوتا تھا۔ بدمزاجی یا افسردگی اسمیں نام کو نہیں تھی۔

مارکس آرہلیس کے سرپرستوں نے اسکے لئے زمانے کے ممتاز ادبی اُستادوں کو جمع کر دیا تھا۔ یونان یا اٹلی کے کسی شاہزادے کے لئے تعلیم و تربیت کا اتنا اہتمام نہیں کیا تھا جتنا اسکے لیئے کیا گیا تھا، اور ساتھ ہی واقعہ بھی یہ ہے کہ آجتک کسی اُستاد کو ایسا شکر گزار، منکسر المزاج اور بے لوث شاگرد بھی میسر نہیں ہُوا۔ کواڈی کی جنگ کے دوران میں اس نے ایک کتاب لکھی جسمیں اس نے اپنے تمام اوستادوں کا شکریہ ادا کیا۔ یہ کتاب بھی کتاب "غور و فکر" کا ایک جزو بن گئی ہے اگرچہ اسکی ساری عمر طرح طرح کے مصائب و واقعات سے لبریز ہے، لیکن اس نے ہمیشہ ان سے علیحدگی کی اور ان بڑی بڑی صفات پر غور کرتا رہا جو اسکے مشاہدے میں آتی ہیں اور ساتھ ہی وہ ان تمام اسباق پر بھی غور کرتا رہتا تھا جو اسکے نزدیک اس کے اوستادوں کی تعلیم سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اپنے ایک نگران سے اس نے محنت کرنے اور مغلطات سننے سے احتراز کرنے کا سبق سیکھا۔ ڈاگنیٹس سے اس نے اوہام باطلہ سے نفرت رکھنے اور نفس کشی کرنے کا سبق حاصل کیا۔ اپولونیس سے یکھا استقلال اور برداشت مصائب کرنا چاہئے اور بغیر کسی ظاہری نمود کے متانت اختیار کرنی چاہئے۔ اسی حکیم نے اسے یہ سبق دیا تھا کہ ہر شخص کے زمن فیاضی، اور حلم سے پیش آنا چاہئے۔ سیویرس نے اسے یہ سکھایا کہ ہر وقت طبیعت کو نیکی کرنے پر مائل رکھنا چاہئے اور ساتھ ہی یقین کرنا چاہئے کہ میرے دوست مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں میکسی مس سے اس نے یہ سیکھا کہ طبیعت میں بھاری بھرکم پن، اور وقار اور شیرینی پیدا کرنی چاہئے اور جو کچھ کام سامنے رکھا جائے اسے بغیر

کسی شکایت کے کرنا چاہیے۔ اسکندر سے اس نے یہ سیکھا کہ "نہ تو اثنائے گفتگو میں کسی سے یہ کہا جائے اور نہ چٹھی میں کسی شخص کو یہ لکھا جائے کہ مجھے فرصت نہیں ہے۔ اور نہ ہمیشہ یہ کہکر چھوٹے کاموں کو بغیر کئے چھوڑ دینا چاہیے کہ مجھے ضروری کام ہوگئے تھے!"

ان استادوں کے علاوہ اسٹکس نے بھی اسے سیدھی سادی عبارت لکھنے اور ہر قسم کی نمود سے بچنے کی ہدایت کی تھی۔ اینٹونی نس جس نے مارکس اریلیس کو متبنّٰی بنا رکھا تھا اور جو آریلیس کے نزدیک با حیا، وفادار اور مستقل مزاج بادشاہ کی زندہ مثال تھی۔ ہمیشہ ہمارے ہیرو کے پیش نظر رہتا تھا۔ یہ وہ بادشاہ تھا جسے خوشامد سے نفرت تھی اور جو تصنع کو حقارت کی نظر سے دیکھتا، جو دانشمند اشخاص کی عزت کرتا اور سخن اشخاص کو مدارج عطا کرتا تھا اور جو سلطنت کے کاروبار میں نہایت مشغول رہتا تھا۔ مارکس آریلیس کسی دوسرے مقام پر بھی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ خدا ترسی، پاکیزگی حلاوتِ سخن، استقلال، سادگی، صبر کی صفات اسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان الفاظ کے لکھنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ "تو ان تمام باتوں کا تتبع کرتا کہ تیرا ضمیر مرتے وقت ایسا ہی پاکیزہ ہوجائے جیسا کہ اسکا تھا۔"

اپنے استادوں اور آبیقون کی شکرگزاری کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہی کی رہنمائی سے میں نے فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کردیا تھا اور انہی کا فضل تھا کہ میں گناہ سے اجتناب کرتا رہا۔ ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ "میں اس لئے بھی دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی عنایت و فضل سے مجھ پر ایسی حالات طاری نہیں ہوئے جن کے باعث مجھے آزمایش میں پڑنا پڑتا۔ مزید برآں میں

ایک ایسے بادشاہ اور والد کے ماتحت تھا جنھوں نے میرے
دل سے تمام غرور و تکبر نکال دیا اور مجھے یہ سکھایا کہ محل میں محافظ
سپاہیوں، کشیدہ کپڑوں، مجسموں اور اس قسم کی دیگر نمائشوں کے بغیر
زندگی بسر کرنی ممکن ہے۔ نیز یہ کہ اگرچہ میری والدہ کا نوجوانی میں انتقال
ہوگیا تھا۔ مگر اس نے اپنے آخری برس میرے ساتھ بسر کیے، یہ کہ بچپن
میں میرے لئے بہت سے لایق اُستاد مہیا کیے گئے۔ اور ان امور
کے لیے دیوتاؤں اور قسمت کی امداد کی ضرورت ہے"

اس شہنشاہ اور حکیم کی کتاب "غور و فکر" اس قابل ہے کہ اس
زمانے کے لوگ اسے گہری توجہ سے پڑھیں حقیقت میں جس نفس کشی
کا اظہار اسمیں کیا گیا ہے، وہ ہمارے روز افزوں سامانِ آسائش و آرایش
کے لئے ایک زبردست تازیانہ کا کام دے سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں
جس توکل برضائے خداوندی کا ذکر ہے، وہ ہماری مسلسل بے چینی اور
بے اطمینانی کے لئے ایک زبردست دھمکی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں
جو بلند پروازیاں دکھائی گئی ہیں وہ موجودہ زندگی کے مراسم کی لاانتہا چھوٹی
بُرائیوں کو شرم دلانے کے لئے کافی ہیں۔

سنہ ۱۳۸ء میں ہیڈرین کے انتقال کے بعد اینٹونینس پائس تخت
پر بیٹھا اور متوفی شہنشاہ کی وصیت کے مطابق مارکس آریلیس اور ریبیس
کموڈس کو متبنےٰ بنالیا۔ مارکس کی منگنی ۱۵ برس کی عمر میں کموڈس کی ہمشیرہ
سے قرار پاگئی تھی، لیکن جدید شہنشاہ نے اس قرارداد کو فسخ کردیا۔ اور
اسکی بجائے اپنی بیٹی فاسٹینا سے منگنی ٹھیرادی مگر شادی سات سال بعد
یعنی سنہ ۱۴۶ء میں ہوئی۔

اینٹونینس کا عہد حکومت ان عمدہ زمانوں میں سے ہے جن کی کوئی تاریخ نہیں۔ اس زمانے میں ہر جگہ تقریباً امن ہی رہا۔ ٹیکس کم کر دیے گئے، لوگوں کی مصائب ہلکی کی گئیں، محکمہ جاسوس کم کیا گیا۔ ضبطیاں بہت کم عمل میں آئیں اور قتل و سازش کے واقعات بہت کم رونما ہوئے۔ ساری رعایا اپنے بادشاہ سے محبت کرتی تھی اور شہنشاہ کا بھی صرف یہ مقصد تھا کہ لوگوں کے آرام و آسایش کا خیال رکھے۔ اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ "جو چیز شہد کی مکھی کے لئے سودمند ہے وہی مکھیوں کے چھتہ کے لئے بھی مفید ہے"۔ اس نے جمہوریت کے طریقہ سے حکومت کی تھی۔ اسے لڑائی سے اصلی نفرت تھی اور یہی وجہ ہے کہ اسنے "امپریٹر" کے فوجی لقب کو اپنے لئے استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔

ایسے دانشمند اور قابل تعریف بادشاہ کے ساتھ مارکس آرلیس نے ۲۳ سال کا زمانہ بسر کیا۔ ان دونوں کے تعلقات اسقدر قریب تھے اور ان کی محبت اسقدر زیادہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو باپ اور بیٹا سمجھتے تھے اور اس طول وطویل زمانہ میں آرلیس دو مرتبہ سے زیادہ اینٹونینس کے مکان سے باہر نہیں سویا۔ ان دونوں میں کسی قسم کا باہمی رشک و حسد نہ تھا، بلکہ برخلاف اسکے وہ ایک دوسرے کے مشیر تھے۔ شہنشاہ نے اپنے جانشین کو "سیزر" کا لقب عطا کیا تھا اور اسے ہر قسم کے اعزاز عطا کئے تھے۔ دیگر امرا کو ایسے تعلقات دیکھکر جلن پیدا ہوئی اور انہوں نے اس باہمی اعتماد کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اینٹونینس نے آرلیس کی والدہ کو دیکھا کہ دیوتا "اپالو" کے مجسمہ کے روبرو نہایت تضرع اور عاجزی کے ساتھ

دعا مانگ رہی ہے۔ ویلیرین آمیوس نے شہنشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کی اور کہا کہ "آپ کیا خیال کرتے ہیں کہ یہ اسقدر عاجزی کے ساتھ کیا دعا مانگ رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے کہ خدا کرے کہ شہنشاہ مرجائے اور میرا بیٹا اسکی بجائے تخت نشین ہوجائے" یہ بات بظاہر معمولی سی دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس شہنشاہ کی بجائے کوئی اور معمولی ظرف کا بادشاہ ہوتا تو وہ یقیناً مارکس آریلیس کی طرف سے بدظن اور متنفر ہوجاتا مگر اینٹونیس نے اس بات کو نفرت آمیز خاموشی کے ساتھ سنکر ٹال دیا۔

یہ بادشاہ اکثر روما ہی میں رہتا اور ہیڈرڈ کی طرح اسے جہاں گشت بننے کا شوق نہ تھا۔ اسے عمارتوں سے بھی زیادہ کچھ دلچسپی نہ تھی اور نہ اسے اپنی خوراک و پوشش کا کچھ خیال تھا وہ عزلت نشین تھا اور اسکی ساری زندگی راہب درویش کی سی بسر ہوئی، مگر اس نے راہبوں کی طرح کبھی اپنے جسم کو ناجایز تکلیف نہیں دی۔

سنہ ۱۶۱ء میں جبکہ بادشاہ کی عمر ۷۵ سال کی تھی اور مارکس آریلیس کی عمر صرف ۴۰ سال کی تھی، بادشاہ بمقام لوریم بخار میں مُبتلا ہوگیا اور اس نے یہ محسوس کرکے کہ اب آخری وقت آپہنچا ہے، تمام امرائے سلطنت کو بلایا اور ان کے سامنے باضابطہ طور پر مارکس آریلیس کو اپنا جانشین قرار دیا۔ اس نے سب لوگوں کو تسلی و تشفی کرنے کی تلقین کی اور مارکس کے کمرہ میں قسمت کا طلائی مجسمہ بھجوادیا۔ یہ طلائی مجسمہ ہمیشہ شہنشاہوں کے پرائیوٹ کمروں میں رکھا رہتا تھا اور اسے خوشحالی کی نیک فال سمجھا جاتا تھا۔

جدید شہنشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے

اپنے برادر مجازی (جسے انٹونینس نے مارکس کے بعد اپنے متبنیٰ بنایا تھا) لوسیلس ویرس کو تمام ملکی اعزازات سے مشرف کیا اور ساتھ ہی "سیزر" اور "آگسٹس" کے معزز لقب عطا کئے۔ مارکس نے اسے فوج کا کمانڈر انچیف بھی بنا دیا تھا اور تمام سول معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مگر یہ شخص اپنے عہدۂ جلیلہ کا اہل ثابت نہیں ہوا۔

ملکہ فاسٹینا سے مارکس کے یہاں بہت اولاد ہوئی عہدِ حکومت کے اول سال میں دو لڑکے ایک ساتھ پیدا ہوئے جن میں فقط ایک شہنشاہ کموڈس (۱۸۰ء سے ۱۹۲ء تک) زندہ رہا جس کی عیاشانہ اور جابرانہ زندگی نے سب رعایا کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی تھی۔ دو بچوں کا ایک ساتھ پیدا ہونا رومیوں میں ایک فال بد سمجھا جاتا تھا اور اس لڑکے کے پیدا ہوتے ہی با امن سلطنت پر مصائب کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ سب سے پیشتر دریائے ٹائبر کی طغیانی روما کے ایک حصہ کو برباد کرنے کے علاوہ ہزارہا مویشیوں کو بہا لے گئی۔ فصلیں تباہ ہو گئیں اور ان تمام باتوں کا نتیجہ خوفناک قحط کی صورت میں نکلا۔ اس عہدِ حکومت میں بہت سے زلزلے آئے، بہت سے شہر جل کر خاکستر ہو گئے اور طرح طرح کی خوفناک وبائیں پھیلیں بادشاہ نے ان تمام قدرتی مصائب کو ہلکا کرنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی، مگر اس اثنا میں لڑائیوں کے خوف اور لڑائیوں کی افواہوں نے ملک کی رہی سہی حالت کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ بادشاہ والوجیس نے شام کے صوبہ کو جو رومیوں کے ماتحت تھا، تباہ و برباد کر دیا۔ کیٹی کی اقوام جرمنی پر ٹڈیوں کی طرح چھا گئیں اور وہاں جا کر انھوں نے آگ اور تلوار کے ذریعہ غارتگری شروع کر دی۔

انگلستان سے بھی بغاوت اور شور وشغب کی خبریں آنے لگیں۔ الغرض
مارکس آرلیس کے عہد میں شروع سے آخر تک یہی جھگڑے ہوتے رہے۔
چونکہ بادشاہ والوجیسس کا حملہ ان سب سے زیادہ بڑا تھا، اس لئے
اس کے مقابلہ کے لئے ویرس کے ماتحت فوج روانہ کی گئی۔ اس معرکہ
میں جنرل ایویڈس کیسیس کی اعلیٰ قابلیت کی بدولت سلطنت کی عزت
برباد ہونے سے بچ گئی۔ یہ دونو جنرل اس لڑائی کے فتح کرنے کے
بعد اس تزک واحتشام کے ساتھ شہر میں داخل ہوگئے جو اس زمانہ میں
فاتحوں کے لئے روا رکھی جاتی تھی۔ مگر رومی فوج واپسی پر اپنے ساتھ وبا
لیتی آئی۔ چنانچہ ویرس بمقام اکیوئیل اسی وبا کے نذر ہوگیا۔

بادشاہ نے کمنڈر ویرس کی لاس کو بادشاہ ہیڈرڈ کی قبر کے برابر
نہایت اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ لوگوں نے اس نیک دل بادشاہ پر
ویرس کے قتل کا الزام عائد کیا مگر یہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے
اسی لئے کہ بادشاہ نے ہمیشہ اس کے قصوروں کی عیب پوشی کی اور
باوجود اسکی نااہلیت کے اسکو ہر قسم کی عزت سے مشرف کیا۔

مارکس باوجود اس امر کے کہ شہنشاہ تھا، مگر اسمیں کسی قسم کا غرور و تکبر پیدا نہیں
ہوا وہ ہمیشہ حلیم الطبع رہا۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو تمام بندگان خدا کا خادم تصور
کرتا تھا۔ حفاظت نابالغاں، سڑکوں کی درستی، درستی اخلاق، تقرر مجسٹریٹ وغیرہ
کے مسائل ہمیشہ اسکے پیش نظر رہتے تھے اسنے مقدمہ بازی کو کم کیا، گلیڈی ایٹرز
کے خون آلود کھیلوں کو محدود کردیا اور اسکے علاوہ بہت سے رفاہ عام کے
کام کیے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اسکی صحت خراب ہوگئی بڑے بڑے تماشاؤں
اور کھیلوں میں اگرچہ اسکی موجودگی ضروری تھی مگر یہاں بھی وہ پڑھنے یا نوٹ لکھنے

اقبال

تقریباً آٹھ برس ہوئے کہ اقبال نے یہ نظم یورپ کی مادہ پرستی کے خراب اثرات کو دیکھ کر یورپ کے قیام ہی میں لکھی تھی۔ اور سچ ہے کہ حقیقی شاعر تلمیذ الرحمن ہوتا ہے۔ جو کچھ آٹھ برس پیشتر شاعر کے دماغ میں تھا وہ آج ہو بہو پیش آ رہا ہے۔ ہمارا

ایمان ہے کہ روحانیت کو مادیت پر فتح ہوگی

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنیگا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسینگے
برہنہ پائی وہی رہیگی مگر نیا خار زار ہوگا

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیار مغرب کے رہنیوالو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنیگا وہ ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگ گل بنا لیگا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

جنھوں نے میری زباں گویا کو محشرستان صدا کا جانا
وہ اس دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوت مزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنونگا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہیگی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بیقرار ہوگا

میں ظلمت شب میں لیکے نکلونگا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

نہ پوچھو اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سر رہگذار بیٹھا ستمکش انتظار ہوگا

شب ماہ

بیساکھ کا مہینہ قریب اختتام کے پہونچگیا ہے گرمی اب غیر معمولی ترقی پر ہے باد سموم کے تند اور سخت جھونکے اس شدت کے ساتھ چلتے ہیں کہ راستہ چلنے والے اگر دو قدم آگے بڑہتے ہیں تو ایکقدم پیچھے کو ہی ضرور لوٹ جاتے ہیں اگر کوئی گل اندام ناز کخرام کسی اشد ضرورت کی وجہ سے باہر نکلتا ہے تو ظالم لو اوسکے گورے گورے نازک رخسار و پر طمانچے مار مار کر آگ بھبوکا کر دیتی ہے۔ کپڑوں کی حالت تو قابل بیاں نہیں۔ ٹوپی سر پر رکہنا محال ہوگئی ہے رومال کہ کندہے پر ٹھیرتا ہی نہیں۔ اچکن کے دامن مور پنکھے کی طرح ہوا میں فر فر کرتے چلے جاتے ہیں۔ درختوں کا زمردی لباس لُو کی شدت سے جل بہن کر خاکستر ہو چکا ہے۔ مگر قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے کہ ادہر پیڑ پوری طرح پت جھڑ ہونے نہیں پاتے ادھر نئی نئی کونپلیں نکلنا شروع ہوگئیں اہا ہا پلکھن کے درخت کو تو دیکھئے کہ کیا ہی خوشنما ننی ننی پتیاں سُرخ و سبز نمودار ہوئی ہیں مگر ابہی تک لُو کی تیزی کم نہیں ہوئی۔ اُستہ ہوا کے سناٹے کے ساتھ ہی ساتھ وحشت ہی کچہ اسطرح سن سنا رہی ہے کہ ہر فرد بشر کے دل شگفتہ کے کنول کو پژمردہ کئے دیتی ہے۔ بیچارے غریب اور مزدور پیشہ آدمی اپنی اپنی مزدوریوں پر لگے ہوئے ہیں معمار بلند اور اونچی پاڑوں پر بیٹھے ہوئے بسولیاں بجا رہے ہیں مزدور اینٹیں اور مسالہ ٹوکریوں میں بھر بھر کر سر پر رکھے ہوئے ایک ہاتھ سے لمبی اور لچکتی ہوئی سیڑھیوں کے ڈنڈے پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے

نوکری تہاے ہوئے برابر پہنچا رہے ہیں۔ گرمی کی شدت سے پسینہ ٹپکتا جاتا ہے مگر وہ برابر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں۔

ان کی محنت سے بخبر آرام و راحت کی زندگی بسر کرنیوالے امراو رؤسا اگرچہ اس تکلیف میں نہیں ہیں اور بہ نسبت ان غربا کے نہایت عیش و آرام کے ساتھ ٹھنڈے کمروں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سے روشندان اور کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں جن میں خس کی ٹٹیاں لگائی گئی ہیں جن کی وجہ سے یہی باد سموم انکے لئے نسیم سحری کی تاثیر پیدا کر رہی ہے فرشی پنکھا برابر اپنی رفتار کے ساتھ چوں چوں چوں چوں کی صدائیں لگاتا ہوا چل رہا ہے مگر پھر بھی شدت گرمی سے اکثر بیتاب ہو ہو کر "اُف گرمی اُف" پکار اوٹھتے ہیں۔ آفتاب عین مقیاس پر پہنچگیا ہے ٹھیک نصف النہار کا وقت ہے بازاروں کا ہنگامہ اور چہل پہل بالکل موقوف ہے کوئی اکا دُکا آدمی بڑی ضرورت کا مارا بیچارا اِدھر اُدھر ٹکراتا پھرتا ہے۔ یا برف اور سوڈے والا اپنا ٹھیلا لئے ہوئے گلی کوچہ میں "سوڈا واٹر۔ سوڈا لیمونیڈ۔ یہ ٹھنڈا میٹھا برف۔ یہہ ملائی کا برف۔ یہہ ربڑی کا لچھے دار برف" کی صدائیں لگاتا پھرتا ہے۔ موسم بہار نے باغوں میں اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا ہے مگر دھوپ کی تپش سے سب بیل بوٹے پھول پھلواریاں کسی عاشق مہجور سے افسردہ دل کی طرح کمہلا گئے۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلنا شروع ہوا۔ امراو رؤسا نازنیناں اپنے خواب ناز سے بیدار ہوگئے ہیں۔ اور بستر استراحت سے اوٹھ اوٹھکر چلمنیں الٹ اولٹکر صحن مکان میں دھوپ کو دیکھ رہے ہیں اسوقت دھوپ دیوار و نپر چڑھ گئی ہے کسی نے تو صرف منہ ہاتھ دہو کر کپڑے پہن لئے اور اکثر صفائی پسند اور نفیس طبیعتوں

والے غسل کر کے لباس بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اب پانچ بج چکے ہیں بازاروں میں پھر وہی صبح کی طرح حسب معمول چہل پہل ہونے لگی مگر اسوقت کچھ عجیب لطف ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہو چکا ہے گرد وغبار کا نام نہیں اگرچہ لکھنؤ کے سارے ہی بازاروں میں خوب رونق ہے لیکن جو دلچسپی اور تفریح کے اسباب سبزی منڈی میں مجتمع ہیں وہ اسوقت کچھ عجیب لطف پیدا کر رہے ہیں۔ سبزی فروش اپنی دوکانوں پر قسم قسم کے میوہ جات اور ترکاریاں چُن چُن کر لگا رہے ہیں ایک طرف سیب رکھے ہوئے کیسی سیب زنخداں اور گلابی گلابی رخساروں کی یاد دلا رہے ہیں ہری ہری تپلی تپلی ککڑیاں کیا ہی نازک ہیں جنکو دیکھکر کسی کی نازک کلائیوں کی تصویر پیش نظر آجاتی ہے۔ ہر قسم کی ترکاریاں پھل پھلار رنگا رنگ کے میوے کچھ عجب بہار دکھلا رہے ہیں۔ ایک مقام پر مالی اور مالنیں گلاب کے پھول رابیل چنبیلی کے ہار چنپا موتیا جوہی کے پھول گجرے مولسری کے ہار لئے بیٹھے ہیں آؤ چلیں ذرا قیصر باغ کی بھی سیر دیکھ آئیں۔ اہاہا وہ کمہلائے ہوئے درخت پھلواریاں سب سرسبز اور تر و تازہ ہو گئے ہیں چاروں طرف سے کیا ہی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ آنکھوں میں کھپ جانے والا سبزہ کس شان سے اپنا فرش بچھا رہا ہے کہ دیکھکر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے بلبلیں چہچہا رہی ہیں قمریاں سرو پر بیٹھی ہوئی آزادی کے گیت گا رہی ہیں کوئل کی آواز دلکو بیقرار کیئے دیتی ہے۔ آہ یہ سین دیکھکر ہم سے بھی خاموش نہ رہا گیا اور بے اختیار دلِ بیقرار سے یہ اشعار نکلے اور زبانی گراموفوں میں آکر گونجنے لگے۔

غزل

ہمیں تو چین سے گذرا نہ اک لحظہ بھی بچپن میں ہوا کمبخت یہ عشق بتاں پیدا لڑکپن میں

پھرا کرتے ہیں ہم چھنتے ہوئے تنکے اسی دھن میں ترا سودا لئے پھرتا ہے ہمکو جنگل و بن میں

سدا آتا ہے خوش بزم حسیناں جہاں ہمکو بہلتا ہے دل مضطر ہمیشہ سیر گلشن میں

حسینان جہاں غمزے کنایہ ہمسے کرتے ہوں نظارے لٹ رہے ہوں بیٹھے بیٹھے خود در چلمن میں

کوئی نازک بدن گلرو مرے پہلو میں بیٹھا ہو گلے میں ہار پہنے ہو پڑے ہوں پھول دامن میں

مہکتے ہوں ادھر تو گل چہکتے ہوں ادھر بلبل ٹہلتے ہوں لیا ہاتھ ہم ڈالے اونکی گردن میں

پھر اک جلسہ ہو جسمیں ہر طرح کی ہوں بہم اشیا کہ گلدستے رکھے ہوں سبزہ بچھا ہو فرش آنگن میں

سر پر بزم پر پھر وہ پری سج بن کے آ بیٹھے عجب انداز کا جادو بھرا ہو اسکی چتون میں

گھٹائیں چھا رہی ہوں ننھی ننھی پڑتی ہوں بوندیاں پڑے جھولے ہوں گاتے ہوں بہاریں ماہ ساون میں

اگر اک دم کو ہو پنہاں مری آنکھوں سے وہ جاناں کھلے دروازہ آنکھیں لگ رہی ہوں شوق دیدن میں

دل مضطر کی بیتابی مٹا دے جلد وہ آکر مسیحائی بھری ہو کوٹ کر اوس چشم پرفن میں

شراب وصل سے بیخود بنا دے ساقی گلرو مزہ آئے وہ جس سے محو ہوں میں اوسکے جوبن میں

افق دل کی تمنائیں جو نکلیں بھی تو کیا حاصل
نہ چھوڑیگا تجھے پیک اجل گلشن میں اور بن میں

دن ختم ہو چکا آفتاب کو غروب ہوئے کامل ایک گھنٹہ گذر چکا ستارے چمکنے لگے اور چاند کی آمد کی خوشخبری سنانے لگے اب چاندنی رات اپنی رونق دکھلا رہی ہے چندا شاہ اپنی معمولی آن بان شوکت وشان کے ساتھ جانب مشرق سے برآمد ہوئے آج چاند کی چودھویں ہے چاند اپنے پورے چہرے مہرے کے ساتھ نکلتا ہوا ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا کوئی نازنین مہ جبین اپنے رخ تاباں سے برقع اٹھائے ہوئے کسی عاشق منتظر

دیدار کی طرف دوڑی چلی آتی ہے اور واقعی عشاق جو اسوقت خوش ہوتے ہیں اوسکی یہی وجہ ہے کہ چاند میں چونکہ انسانی شکل دکھائی دیتی ہے بس وہ دیدار یار کا تصور باندھکر محو نظارہ مہتاب ہوجاتے ہیں۔ آہا ہا تمام روئے زمین پر چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے شجر جو دیوار در چاندنی کا لباس پہنے ہوئے چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔ دنکی گرمی کی ستائی ہوئی تکلیف اُٹھائی ہوئی مخلوق آرام سے پیر پھیلائے ہوئے ٹھنڈی چاندنی اور تاروں کی چھاؤں میں سورہی ہے۔ واقعی اے چاندنی اللہ پاک نے تجھے ایک بڑی نعمت عظمیٰ بنایا ہے سبحان اللہ کیا نور ہے ہر شخص کا دل مسرور ہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے مسجدوں کے صحن میں خشوع خضوع سے نمازیں پڑھ رہے ہیں کہیں خوش الحان قاری مصری عربی لہجوں میں قرآن پاک ایسے مؤثر اور دلکش آواز سے تلاوت کر رہے ہیں کہ سننے والوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور دل بیتاب ہوا جاتا ہے ایک طرف خدائے پاک کے دنیا دار شوقین مزاج بندے باغوں کوٹھیوں مکانوں کے صحنوں میں بیٹھے ہیں کرسیوں پر دوست احباب کا مجمع ہے اور اس وقت کی دلچسپیوں کا لطف اُٹھا رہے ہیں بیچ میں ایک تخت پر گھڑے اور نازک صراحیاں برف کے پانی اور شربت سے بھرے ہوئے رکھے ہیں صراحیوں کی گردنوں میں ہار پڑے ہوئے ہیں چاروں طرف گلدستے رکھے ہوئے ہیں ایکطرف میز پر ہارمونیم رکھے ہوئے کوئی خوش گلو اپنی سُریلی آواز اور اوسکے مست کر دینے والی دلکش آواز کو ملا ملا کر ایسے دلآویز لہجہ میں گا رہا ہے کہ سامعین کے دل پر ایک بیخودی کا عالم طاری ہے۔

چندا شاہ اُسی شان و شوکت کے ساتھ دربار کر رہے ہیں تاروں کی

تمام فوج حاضر ہے مگر اپنے بادشاہ کے دبدبۂ رعب کی وجہ سے ایسے خایف ہیں گویا سب غایب ہیں۔ مگر نہیں برابر آہستہ آہستہ رعب و استقلال کے ساتھ ملک مغرب کے فتح کرنے کو برابر بڑھی چلی جا رہی ہے۔
تقدیر کے یاور اور خوش نصیب عشاق اپنے اپنے معشوقان نازنین سے ہم آغوش ہیں اور عیش وصل میں مدہوش ہیں۔ ایکطرف بیچارے محرومانِ وصال پڑے ہوئے کبھی آہ کرتے ہیں کبھی بالکل خاموش ہیں کوئی حسرت بھری آواز میں اِس غزل کو پڑھ رہا ہے اور خیال یار سے باتیں کر رہا ہے۔

غزل

لطف جب آئے کہ اے دوست ہو چاندنی رات　　محفل اگ ہو مینو شی ہو اور چاندنی رات
باغ میں لالہ و گل مہک رہے ہوں ہر سو　　بھینی خوشبو بہی وہاں آتی ہو اور چاندنی رات
ساقی سیم تن اِک جام پلا دے ہم کو　　ماہرو سامنے اک گاتی ہو اور چاندنی رات
ہو رقیبوں کا نہ کھٹکا نہ کسی شے کا غم　　نازنیں پہلو میں اک سوتی ہو اور چاندنی رات

عیش ہو وصل ہو آرام ہو راحت ہو اُفق
دل کی حسرت مری بر آتی ہو اور چاندنی رات

آہ ایک دن وہ تہا کہ چاندرات کو چاند نہایت باریک کسی کے ہلال ابرو کی یاد دلاتا ہوا نکلا بڑہتے بڑہتے چودھویں رات تک بڑھا اور کسی کے روح تاباں کا تمام رات جلوہ دکہایا۔ پندرھویں سے گھٹنے لگا اور گہٹتے گہٹتے وہی ہلال رہگیا۔ اور کوئی ارمان ہی اودل حسرت کے ساتہہ۔ وہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات!! کہکر افسردہ ہوگیا۔ آہ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط

سید حبیب احمد افق امروہوی

عرفجہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

عرفجہ نے اِس شاطرانہ کامیابی اور مساعدت احوال کی اطلاع اپنے ایک ایسے معزز و موقر رازدار (عمرو ابن طارق امیر (صوبہ دار) مدینہ کو کی، جسکے وعدے اوسکی طمع دُنیا و حرص جاہ کی کفالت سے ضامن ہو رہے تھے۔

عمرو ابن طارق کا نام چونکہ ناظرین کے لئے بالکل نیا نام ہے۔ پس واقفیت کے لحاظ سے نامناسب نہوگا اگر ہم اِس موقعہ پر عمرو ابن طارق اور عرفجہ کے تعلقات اور اونکے موجبات پر روشنی ڈالکر قصہ کی طرف رجوع کریں۔

اصل میں ہمارے قصہ کی جان نازک اندام سمیہ پر جو جبر و سختی، اور جس قسم کا سلوک ناروا ہو رہا ہے۔ وہ اِسی عمرو ابن طارق کے حُبِ دولت وجاہ سے مغلوب۔ کیا آفرین طبیعت کی اختراع خاص ہے۔ اوسے مال و متاع اور دُنیاوی عزت و اقتدار کی چاہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اوسکا دُرِ مقصود جہان سے حاصل ہو سکتا ہے وہ حجاج ابن یوسف کی سرکار عظمت مدار ہے جس کی شاہد پرست و بادہ گسار طبع رنگین پر فتح حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کہ کسی معشوقۂ شیریں اَدا سے اوسکا کاشانۂ شوق منور و معمور کرایا جائے۔ اسی بُنیاد پر اوس نے کنایۃً عرفجہ کا استمزاج کیا، کہ سمیہ کیلئے اگر کسی بڑی جگہ کی نسبت کا پیغام اوسکے سامنے پیش کیا جائے تو اوسکے

شرائط کچھ اہم تو نہوں گے۔ اور دو ہی فقروں میں اوس نے اندازہ کر لیا
کہ طمع زر کے سوا اوسکے مخاطب میں کسی قسم کا حوصلہ نہیں۔ اوسکے بعد صاف
الفاظ میں اوس نے ظاہر کیا کہ اگر وہ خواہش رکھتا ہے تو حجاج ابن یوسف
کے مخدرات عالیہ میں داخل ہونے کی عزت وسمیہ کو دلا سکتا ہے۔

عرفجہ اس منتہائے عروج پر پہونچانے والی مگر اپنے حاشیۂ خیال میں بہی
نہ آنے والی تدبیر کو سنکر ششدر و حیران رہ گیا۔ اور مسرت خیز استعجاب کا
اظہار کیا۔ جسکی اس تنگیٔ ظرف اور پستیٔ حوصلہ کو دیکھکر عمرو ابن طارق اپنی جگہ پر
اوسکی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا۔ اس لئے اوس نے پیشگاہِ حجاج میں
بذریعہ ایک معروضہ کے سمیہ کے حُسنِ عالم افروز کی اطلاع کی۔ جس کے
جواب میں وہاں سے ایک ضروری فرمان آیا۔ جسمیں اظہار خوشنودی کے بعد
اشتیاق وبیقراری کا مضمون تہا۔ اور لکہا تہا کہ جلد سے جلد اوس وحشی
اور بڑی آنکہ والی ہرنی کو یہاں پہونچانے کی تدبیر کی جائے۔ تاکہ حسب قاعدۂ
شرع رسم عقد عمل میں آئے۔ اور تمہاری اعلےٰ ترین کارگذاری کا ثبوت پہونچے۔

بہر حال اس طریقہ سے جب عرفجہ اور حجاج میں اوس نے آمادگی کی روح
پہونکدی تو استحکام کی نسبت اور تمہیداً ایفاء وعدہ کے طور پر عرفجہ سے ایک رقم
مشخصہ کا اظہار کر کے اوسکا نصف عمرو نے عرفجہ کے حوالہ کر دیا۔ نصف بعد
عقد دینے کا وعدہ کیا۔ اور عرفجہ سے اوسکی روانگی میں تعجیل کی تاکید کی۔ مگر عرفجہ
کو اسکے بعد جو ناگوار موانع اس کار خیر میں تعجیل کے پیش آئے۔ اونمیں سب سے
زیادہ اہم اور اندیشناک خود سمیہ سے اوسکی خوش بختی اور طالع وری کا ذکر آنے پر
اوسکا خلاف امید اختلاف بلکہ انکار، بعد ازاں مدینہ میں حسن کا اتفاقی ورود اور اوس
سے سمیہ کے صبر و سکون میں یکایک اضطراب اور اوسکے دبے ہوئے جذبات عشق و شوق

مبارک ہو

امہات الامۃ

مولانا مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مصنفہ جو بعض کوتاہ بینوں کے تعصب سے معدوم یعنی نابود ہو چکی تھی اور جس کی مطالعہ کا شوق لوگوں کو مضطرب کیے ہوئے تھا۔ جس کی ایک ایک جلد سو سو دو دو سو روپیہ شائقین قیمت دیکر تیار تھے اس کا دوبارہ طبع ہوکر غیر مسلم اقوام کو مفت تقسیم ہو رہا ہے چونکہ اس کی اشاعت کی غرض زیادہ تر یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام میں بکثرت تقسیم ہو تاکہ تعدد ازواج پر جو مستعمل بے جا اعتراضات ہیں ان کی اصلاح ہو اور اسلام کی حقانیت ان کی ذہن نشین ہو اس لیے مسلمانوں سے توقع کی گئی ہے کہ وہ اسکو خرید کر اس کے مصنفہ ترجمہ انگریزی کو مدد دیں تاکہ وہ بھی چھپ کر بکثرت تقسیم ہو سکے کتاب کی عمدگی کی نسبت کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں صرف مولانا کی مرحوم کا نام کافی ہے کہ یہ کتاب انہی کی ہو گی حصہ دوم زیر اہتمام ہے اور ترجمہ ڈاکٹر شرف الحق صاحب کے اہتمام میں اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے کہ اسکی تکمیل جس قدر چاہیں جلد ہو سکتی ہے قیمت بارہ آنہ (۱۲)

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجیے

جلد ۲ ماہ جون جولائی ۱۹۱۵ء نمبر ۶، ۷

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور علمی مضامین کا
مخزن

ایڈیٹرز شیخ محمد اکرام بیرسٹرایٹ لا۔ محمد عبدالراشد الخیری

(فہرست مضامین)

باہتمام محمد عبدالراشد الخیری
تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۳۳
سالانہ قسم اول ۲ قیمت قسم دوم ۱ قیمت فی پرچہ ۱۲ کتبہ ابوالوفار
دفتر رسالہ عصمت کوچہ چیلان مدرسہ اسلامیہ دہلی

ہمیں تھے نہ تیری توبہ کے قابل — مگر تجھ سے جو ہو سکا کر گئی تو
گنہگار کا ساتھ دینا تھا مشکل — تجھے شرم آئی حیا کر گئی تو
نصیحت سے خالی نہیں تیرا جانا — کہ تنبیہ حد سے سوا کر گئی تو
سمجھ جائیں رہتے ہوں گر عقل کچھ بھی — سبق ہم کو ایسا پڑھا کر گئی تو
جو ہم اب بھی تائب ہوں افعال بد سے — تو گویا ہمیں پارسا کر گئی تو
گناہوں کا جاتا رہے روگ بالکل — ہمارے مرض کی دوا کر گئی تو
رہے گا ہمیں یاد تیرا یہ احساں — کہ تاکید یاد خدا کر گئی تو

وجاہت نہ غفلت میں کھو عمر باقی،
سنبھل دیکھ بس ذرا کر گئی تو،

وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی

تعلیم نسواں کی ضرورت اب اس قدر زیادہ محسوس ہو رہی ہے کہ اس میں بحث کی گنجایش نہیں۔ مگر یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ باوجود اس ضرورت کے گنتی کے تین چار پرچے قوم میں شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم کو یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی کہ ہماری محترم بہن فاطمہ سعید بیگم نے۔ جو عرصہ سے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی بہنوں کی خدمت میں مصروف تھیں اب یہ ہفتہ وار اخبار "سہیلی" شائع کر رہی ہیں۔ ہمیں فاطمہ سعید بیگم کی وقعت اور ذاتی اثر سے یقین کامل ہے کہ ہندوستان کی بہترین اور قابل نامہ نگار خواتین "سہیلی" کی خدمت میں مصروف ہونگی سہیلی کے ان پرچوں سے ہمیں آیندہ کی بہت کچھ امیدیں بندھتی ہیں۔ جن بہنوں نے اس کی ترقی کا وعدہ کیا ہے وہ بجائے خود قابل اور زمانہ شناس ہیں۔ "سہیلی" کے دو ہی پرچوں میں مضمون بہت اچھے لکھے گئے ہیں اور ہم اپنی محترم بہن فاطمہ سعید بیگم کو اپنے تجربہ کی بنا پر یقین دلاتے ہیں کہ بہنیں اپنے پرچہ کو سنبھال لیں گی وہ سہیلی کی خدمت

میں سرگرم رہیں سہیلیاں انکی خدمت سے باہر نہ ہونگی۔

فاطمہ سعید بیگم ہماری دلی مبارک باد کی مستحق ہیں اور ہمیں اپنی بہنوں سے اُمید ہے کہ وہ انکا ہاتھ بٹانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑیں گی ٭

قیمت سالانہ ۲ روپے مینجر سہیلی سے درخواست کیجئے۔

اکسیر اعظم یہ ایک مختصر لیکن پُر معنی رسالہ ہے۔ جو بغرض ریویو ہمارے پاس آیا ہے۔ ہمیں اس کے مصنف مولوی سید محمد عطاء الحق مدرس علوم مشرقی اینگلو عربک ہائی سکول دہلی نے حب تسخیر۔ دست غیب۔ کیمیا۔ اور اسم اعظم کے متعلق نہایت سیدھے سادے مگر نصیحت آمیز اور سچے الفاظ میں بحث کی ہے۔ ہر ایک مضمون کے عام اور اصل مفہوم کو بیان کر کے پھر حصول کامیابی کے ایسے طریق بتائے ہیں جو عقلاً معتبر اور نقلاً مسلم ہیں۔ علاوہ ازیں مصنف نے خاص اپنے تجربات کا بھی اظہار کیا ہے جس سے اسکی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اور یہ رسالہ مضامین مذکورہ کے متعلق بلا شبہ رہبر ہے اور اسم بامسمی ہو گیا ہے۔ قیمت قسم دوئم جو بالفعل تیار ہے صرف ۸؍ اور قسم اول جو زیر طبع ہے ۱۰؍ محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ۔ سید محمد عبد الکریم حفیظی۔ دہلی۔ پہاڑ گنج۔

اُمہات الاُمہ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی وہ لاجواب کتاب جو پردہ دنیا سے ناپید ہو چکی تھی اور جسکی ایک ایک جلد کے

واسطے لوگ سیکڑوں روپیہ صرف کر رہے تھے حصہ اوّل قیمت ۱۲ار

یاسمین } پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ کا وہ ناول جسکی اشاعت کا ملک کو مدتوں سے انتظار رہتا اور جس میں بنگالہ کی نازنین یاسمین کی زندگی کا ہر ورق فلسفہ محبت کی ایک سچی تصویر ہے قیمت عہ ر

اورنگ زیب پر ایک نظر } شہنشاہ اورنگ زیب پر غیر اقوام کیطرف سے جو اعتراض کیے جاتے ہیں اس کے جواب میں شمس العلما رمولانا شبلی نعمانی مرحوم نے مورخانہ پیرایہ میں ایک تنقیدی نظر اورنگ زیب شہنشاہ کی زندگی پر اس قابلیت سے ڈالی ہے کہ بیساختہ داد نکلتی ہے قیمت ۸ ر

راحت زمانی } عورتوں کے واسطے ایک عجیب وغریب کتاب جس میں مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ نے قصہ کے پیرایہ میں لڑکیوں کو دنیا کے نشیب وفراز سے اچھی طرح آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بیوی کو اپنی زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے قیمت عہ ر

مہر افروز بیگم } مولوی سید احمد صاحب کی یہ دوسری کتاب ہے جو لڑکیوں کے واسطے نہایت سودمند ہے۔ اور قیمت بھی صرف ۸ ر رکھی گئی ہے

جملہ کتب منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجیے

نماز روزہ

جو مومن مسلمان ہیں خواہ مرد خواہ عورت اُن پر نماز۔ روزہ فرض ہے اور یہی دین اسلام کی جڑ ہے مگر اب جو بہنیں انگریزی وغیرہ پڑھ گئیں ہیں اکثر نماز سے غافل رہتی ہیں اور جنھیں خدا نے نیک ہدایت اور نیک توفیق عطا کی ہے اور خدا تعالیٰ کا ڈر دیا ہے وہ برابر پڑھتی ہیں کیسی وہ خوش قسمت بی بیاں ہیں۔ جو پنجگانہ برابر وقت پر نماز حق تعالیٰ کی ادا کرتی ہیں گویا ان کا دین دنیا میں بھلا ہے۔

ایک بہن جو اب کچھ تھوڑی سی انگریزی پڑھ گئی ہیں وہ کبھی بھول کر بھی نماز نہیں پڑھتی ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہے کہ گویا خدا کو یہ بالکل ہی بھول گئی ہیں۔ اکثر بہن بھائی روزہ بھی پورے نہیں رکھتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ہر مومن مسلمان پر نماز روزہ واجب کیا ہے اور یہی عبادت اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہر مومن مسلمان کو یہ نیک ہدایت دے کہ وہ پنجگانہ برابر وقت پر نماز اور روزہ اپنے حق تعالیٰ کی ادا کریں آمین ثم آمین

بنت سید عبدالحمید ڈاکٹر

لڑکیوں کی تعلیم

بعض بہنوں کا یہ خیال ہے کہ لڑکیوں کے پڑھانے لکھانے سے فائدہ کیا انکو کہیں نوکری نہیں کرنی روٹی نہیں کمانی سارے جہان کا حال بتا کر دیدہ دلیل کرنا ہے مگر یہ میری عزیز بہنوں کا خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اسبات سے ہر مسلمان عورت اور ہر مسلمان مرد بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے پیغمبر صاحب نے فرمایا ہے علم ہر مسلمان عورت و مرد پر فرض ہے یہ ایک بچوں کی سی باتیں ہیں۔ پڑھنے سے عقل بگی یا دیدہ دلیل ہوں گے البتہ بعض بڑے مولوی اور پچھلے زمانے کے بزرگوں کا یہ خیال تھا کہ لڑکیوں کو پڑھانا بہت بُری بات ہے۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکی جاہل ماں کو بہت بری نظر سے دیکھتی ہے اور اُس کی نظر میں ایسی ماں کی عزت نہیں ہوتی اور اُس کے ہر کام کی نکتہ چینی کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔

پچھلے زمانہ کے جن بزرگوں یا جن بڑے بڑے مولویوں کا جو یہہ خیال تھا۔ وہ غلطی پر تھے وہ اسبات کی تہ کو نہیں پونچے۔ اور مسلمانوں کو جان بوجھکر کوئیں میں دھکیل دیا۔

مائیں رہیں جاہل بچوں کی تربیت اچھی ہوئی نہیں۔ خاصی بھلی چنگی

قوم کا ناس ہوگیا۔ پیغمبر زادیاں اور پیغمبر صاحب کے زمانہ کی مسلمان عورتیں
علم کا دریا تھیں۔ یہ موٹی سی بات ہے کہ علم آدمی کو آدمی بنا دیتا ہے۔
پڑھ لکھ کر تو عورتیں خدا کو خدا سمجھنے لگیں گی۔ گناہ سے بچیں گی
بُرائی سے پرہیز کریں گی۔ ایمان کو ایمان عزت کو عزت بڑوں کو بڑا چھوٹوں کو
چھوٹا ہر چیز کی اصلیت معلوم کریں گی

و دیدہ دلیل کی جو کہتے ہیں تو کیا ان پڑھ عورتیں چلتی ہوئی نہیں ہوتیں
جاہل تو ایسی ایسی چاتر ہوتی ہیں کہ بڑی بڑی پڑھی لکھیوں کے کان
کاٹیں۔ تم کو کچھ دنیا کی بھی خبر ہے کبھی اخبار دیکھو اور دنیا کا حال سنو
تو معلوم ہو کہ مسلمان کتنے ذلیل ہو گئے روز بروز بدتمیز نالائق چھوٹے
کمینے ہوتے جاتے ہیں یہ کیوں صرف اس وجہ سے کہ عورتیں جاہل
ہیں اور گود ہی میں دنیا بھر کے عیب بچوں میں پیدا کر دیتی ہیں
بچوں کے واسطے ماں کی گود پہلا مدرسہ بتلایا ہے۔ سچ ہے
مدرسہ سمجھو یا اتالیق سمجھو جو کچھ بھی ہے ماں کی گود ہے جو سنیں گے
وہ جانیں گے جو دیکھیں گے وہ سیکھیں گے ماں کی جب یہ حالت
کہ خدا کی نہ رسول کی تہذیب سے کوسوں دور جہالت میں چکنا چور عقل
نہ شعور۔ برکت نہ نور۔ چہرہ پر پھٹکار صورت پر خدا کی مار۔ نالائق طریقے
بیہودہ طور وہی اثر بچوں پر کیوں نہ ہوگا۔ بچپن کی پڑی ہوئی عادتیں
قبر تک ساتھ جاتی ہیں کسی طرح چھڑائے نہیں چھوٹتیں۔ مکر دغا فریب
بے ایمانی۔ بس کیا اسی کا نام مسلمانی ہے۔

سید مرحوم جو مسلمانوں کے تعلیم کے موجد تھے اگرچہ وہ وقت کے
لحاظ سے عورتوں کے لیے تعلیم اسی حد تک ضروری سمجھتے تھے۔ کہ مستورات
کو خدا اور رسول کا جاننا گھر کا ضروری خرچ لکھ لینا وموٹی کوٹیئے ہوئے
کپڑے لکھ لینا کافی ہے مگر میں کہتی ہوں اور میرا ایسا خیال ہے کہ اگر
آج بھی سید مرحوم زندہ رہتے تو وہ اپنے خیال پر قایم نہ رہتے
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں کس قدر ترقی کرتی جارہی ہیں
عورتوں کا یہ حال ہوگیا ہے۔ کہ وہ سرکار سے حق کا مطالبہ کررہی
ہیں اس لیے میری رائے ہے کہ مستورات کی تعلیم قریب قریب مردوں
کے ہونی چاہیئے مجھے امید ہے کہ میری عزیز بہنیں اس بارہ میں
اپنے خیالات سے مجھے مطلع فرمائیں گی۔

وا۔ ح۔ د۔ س۔ محمد نظام الدین نائب

سہیلی

یہ ہفتہ وار اخبار خاص لڑکیوں کے مذاق کے موافق محترمہ
فاطمہ سید بیگم صاحبہ کی اڈیٹری میں ہر جمعہ کو دہلی سے شائع
ہوتا ہے۔ جسکی لکھائی چھپائی۔ نہایت عمدہ اور کاغذ دبیز
قیمت سالانہ عہ منیجر سہیلی سے طلب کیجئے۔

رنگ میں بھنگ

گرو نانک شاہ کے مزار کے قریب ایک ہندو مہاجن رہتا ہے یہ ایک بڑا دولتمند شخص ہے اس نے اپنے بیٹے کا پیام ایک دوسرے مہاجن کے یہاں جو ریلوے اسٹیشن کے سامنے رہتا ہے بھیجا جب سب بات پختہ ہوگئی تو دن تاریخ مقرر ہوئی یعنی ۲ جولائی ۳۲ء کو بارات لانیکا دن مقرر ہوا اور ۴ جولائی کی رخصت ٹھیری۔ اب بیٹے والے نے بارات کی رونق کے واسطے بڑا سامان کیا یعنی میرٹھ شہر سے انگریزی باجے والے بلوائے اور کچھ لڑکے جو ہندوانا بھجن گاتے ہیں وہ بنارس سے بلوائے اور بہت سامان اس ہی شہر سے کیا غرض بارات کو بڑی دھوم دھام اور خوب گاجے باجے کے ساتھ لے گئے بیٹی والا بھی چونکہ ایک بڑا دولتمند شخص ہے اور صرف یہی ایک لڑکی تھی اس نے اپنے دل کا سارا ارمان نکالنے کے لیے بیٹے والے سے بہت زیادہ سامان کیا باراتیوں کے لیے ایک بہت بڑا مکان سجوایا جس میں باراتیوں کے آرام کے لیے ہر طرح کا سامان موجود تھا دلہن کے لیے جو ڈولا تیار ہوا تھا وہ قابل دید تھا بہت خوبصورت اور بہت لاگت سے تیار ہوا تھا تمام سچے کام سے بسایا تھا ہر شخص اسے بڑے شوق سے دیکھتا تھا علاوہ اس کے جہیز بھی بڑا اعلیٰ درجہ کا تھا غرض اسے ہر طرح سے اپنے

دل کا ارمان نکالنا تھا۔

دوسری جولائی کو بارات بڑے دھوم دھام سے آئی۔ سب باراتیوں کو اس ہی مکان میں ٹھیرایا اور سب کی خاطر تواضع کی گئی۔ ایک دن اور رات خوب دھوم دھام رہی تین وقت سب باراتیوں کو کھانا کھلایا گیا سب باراتی اور خاصکر دولہا کا باپ اپنے سمدھی کی اس انتظام اور مہمان داری کو دیکھکر بہت خوش ہوا چار جولائی کو دلہن کی رخصت تھی صبح سے تمام جہیز وغیرہ باہر سجایا جا رہا تھا دلہن کے رشتہ دار کیا عورت اور کیا مرد سب ملکر جہیز کو بڑی خوبصورتی سے سجا رہے تھے اور قریب سارا جہیز باہر نکال کر سجا دیا گیا تھا اب صرف دلہن کے رخصت کرنے کی دیر تھی اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دلہن کی طبیعت کچھ خراب ہونی شروع ہوئی اور اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اس کی ایسی حالت کو دیکھ کر سب گھبرا گئے اور سب اپنی سی کرنے لگے کوئی کچھ بتاتا تھا کوئی کچھ دوا دیتا تھا غرض اتنے میں اس غریب لڑکی کے سر پر قضا کھیلنے لگی آدہ گھنٹہ تک جس سے جو ہوا سب نے اپنی سی کی لیکن بعد آدہ گھنٹے کے موت نے آن دبوچا اور یہ لڑکی اپنے کل رشتہ داروں اور باراتیوں کو اس حالت میں چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئی۔ اسوقت اس شادی کے گھر میں جو کہرام مچ رہا تھا دیکھنے والوں کے بھی بدن پر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے خاصکر ماں باپ اس لڑکی کے اس طرح تڑپ رہے تھے

اور اس وقت رو رہے تھے کہ جسکی کچھ انتہا نہیں دولہا بھی بہت ہی رنجیدہ
تھا اس کی آنکھوں سے آنسو کے چشمے بہ رہے تھے ہر چند اس کے
دوست احباب سمجھاتے بوجھاتے تھے لیکن اس کے آنسو بند نہ ہوتے
تھے اسوقت اس خاندان کی اور کل بارات والونکی جو حالت تھی اس کا
اندازہ ناظرات خود کر سکتی ہیں کیسے رنج اور صدمہ کی بات ہے کہ ایسے
وقت میں لڑکی کا مرنا والدین کے لیے ایک صدمۂ عظیم تھا ایک دم
کیا رنگ میں بھنگ ہوگیا جس گھر میں ابھی دھوم دھام مچ رہی تھی
وہاں اسوقت رونا اور پیٹنا ہو رہا تھا سب ایک دوسرے کے منہ تکتے
تھے اور کہتے تھے کہ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا دلہن کے
ماں باپ کی عجیب حالت تھی دونوں نے اپنی بُری حالت کر لی تھی ہر چند
سب سمجھاتے تھے۔ لیکن ماں باپ کے دل سے اولاد کا داغ کب جاتا ہے
اور جب ایسا موقع۔ مہمانوں نے جہیز کو اوندھا سیدھا ادھر ادھر رکھ کیا
دیا جس طرح جہیز وغیرہ سجایا گیا تھا اسی طرح اب اس دلہن کا جنازہ
سجایا گیا جو وقت رخصت کا مقرر تھا اسوقت اس کا جنازہ نکالا گیا
اس کے جنازہ کے ساتھ آدمیوں کا بڑا ہجوم تھا کیسے رنج اور صدمہ
کی بات ہے کہ ایسی خوشی کے موقع پر ایکدم ایسا حادثہ کا ہونا ماں باپ
کے لیے تمام عمر کا رونا ہو جاتا ہے خداوند کریم تو دشمن کو بھی ایسا صدمہ اور
ایسا برا وقت دیکھنا نہ نصیب کرے۔

محمد فاطمہ

اظہارِ احسان

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے بہن بھائی اگر کسی انسان پر احسان کرتے ہیں خواہ وہ احسان کسی قسم کا ہو مگر ضرور اپنے ہم جلسوں یا مجلسوں میں اسکو ظاہر کرتے ہیں بلکہ فخر کیا جاتا ہے اور مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ شخص جس پر احسان کیا گیا ہے شرمندہ یا خائف ہو سکے۔ یہ عادت جہانتک دیکھا گیا ہے۔ مردوں کے بہ نسبت عورات میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے بعض اوقات وہ شخص بھی جسپر احسان کیا گیا ہے محسن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اور عوام بھی ایسے شخص کو کم ظرف خیال کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ رفتہ رفتہ محسن اپنے اس طریقہ سے عام نظروں میں ذلیل بھی ہوجاتا ہے۔ اور وہ شخص جسپر احسان کیا گیا ہے جب یہ کیفیت دیکھتا ہے تو ناراض ہوجاتا ہے۔ حالانکہ قبل اس کے وہ ممنون تھا۔ مگر اب بسبب وہ نہ احسان مانتا ہے۔ اور نہ محسن ہی پر اس کا کچھ اچھا اثر مرتب ہو سکتا ہے۔ اگر رفتہ رفتہ ہم اپنی اس مذموم عادت کو ترک کر دیں۔ تو میرے نزدیک ازدیاد محبت کا اس سے بڑھکر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا اور نہ طرفین میں منافرت کا کوئی باعث ہو سکتا ہے۔ اور اس وعید سے بھی نجات مل سکتی ہے۔

سید معصوم اثلث حسینی۔ نقشبندی غفرلہ

موت

زینِ چمن گل کہلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اے موت اے ظالم و بے رحم موت۔ اُف اُف تیرے
تو نام سے ہی جسم لرزتا ہے۔ نہ معلوم قدرت نے تیرے نام
میں کیا اثر رکھا ہے کہ جہاں تیرا نام آیا اور روح کانپ گئی۔
دم زدن میں ہی ہولناک بھیانک تصویر نگاہوں میں پھر گئی
بیشک بابیشک تو ہے ہی اس قابل کہ ہر جاندار تیرے نام سے
پناہ مانگے۔ تو وہ ہے کہ اولیا اللہ بھی تیرے نام سے کانپ
اُٹھتے تھے۔ تو مجسم بے رحمی و بے دردی کا پتلا ہے۔ انسان ہو یا
حیوان تیرا حکم ہر ایک جاندار پر قادر ہے۔ پیغمبر بھی تیرے پنجۂ ظلم سے
نہ بچ سکے اور جب قرآن پہونچی تو بے عذر تیرے ساتھ ہو لئے۔ اے
یگانوں کو بیگانہ بنانے والی۔ تو نے جسکو طلب کیا اوس نے فوراً
جانِ شیریں تیرے سپرد کر دی۔ عزیزوں کو بلکتے تڑپتے چھوڑا۔
مگر تجھ سے منہ نہ موڑا۔ معمر ہو یا کمسن کڑیل جوان ہو یا معصوم بچہ تو کسی
پر رحم کرنے والی نہیں تیرا دل جسکو چاہتا ہے فوراً لے اڑتی ہے
تیرا کام اچھوں کو چن چن کر لے جانا ہے خواہ مرنے والے کے

اعزا کتنے ہی روئیں پیٹیں مگر تجھکو مطلق پرواہ نہیں تیرا دل ذرا نہیں پسیجتا۔ تجھکو تو خبر ہی نہیں ہوتی کہ کون تڑپتا ہے۔ رحم تو درکنار وہ تو تیرا شیوہ ہی نہیں رحم تو تیرے خمیر ہی میں نہیں پڑا۔ ارمانوں کا اور تیرا بیر ہے۔ جہاں تک تیرا قابو چلتا ہے۔ مجال نہیں کہ کسی کے ارمان نکلنے دے۔ شدّاد نے کس چاؤ سے باغ لگایا اور عین اوسوقت جبکہ وہ اسکو دیکھکر اپنا دل خوش کرنا چاہتا تہا۔ تو دروازے پر ہی سانپ بنکر ڈس گئی اتنی بہی مہلت نہ دی کہ وہ غریب اندر قدم رکہہ سکتا۔ تیرے آنے کا ایک منٹ ہی بہروسہ نہیں۔ اور جب تو آن پہونچی تو ممکن نہیں کوئی پلک بہی جہکا سکے۔ تو بہروپئے کے سے نئے نئے بہیس بدل بدل کر نئی نئی صورتوں میں نمودار ہوتی ہے۔ کہیں ہیضہ بنکر شہروں میں تلاطم برپا کردیتی ہے۔ کہیں پلیگ بنکر قصبوں کو برباد کردیتی ہے کسیکو سانپ بنکر ڈس گئی۔ کسیکو شیر بن کر نگل گئی۔ کسی کا خون تلوار بنکر چوس گئی۔ تیرا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ آجکل تیرا کلیجہ ٹہنڈا ہے نہ معلوم کتنے مدتوں کی دیرینہ آرزوئیں میدان کارزار میں نکل رہی ہیں لاکہوں کروروں خاندان تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ صدہا کروڑوں بیواؤں اور یتیموں کی آہ و زاری تجہ سنگدل پر کچہہ اثر نہیں کرتی۔ تو وہ نہیں جو کسی سے چوکے اور کسی پر رحم کرے۔ تیرا رنگ ڈہنگ ہی زمانہ سے نرالا ہے

تجھکو دوسروں کے ستانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ تو دوسروں کو
رُلا رُلا کر ہنسنے والی ہے۔ تیرا شعار ہی یہ ہے کہ کسی کے سر سے
شفیق باپ کا دستِ شفقت اوٹھا کر اوسکو بے یار و مددگار کر دیا
کہیں کسیکی پیاری ماں کو جدا کر کے اوسکو دربدر کر دیا۔ کسی بہن
کو بھائی کے غم میں تڑپا دیا۔ تو کہیں کسی بھائی کو جان نثار بہن کے
الم میں پھڑکا دیا۔ کسی بدنصیب کے سر سے غمگسار شوہر کا سایہ عاطفت
اٹھا کر اوسکو زندہ درگور کر دیا۔ کسی ماکی آغوش محبت سے پیارا بچہ
چھین کر کنارِ لحد میں سلا دیا۔ تیری رفتار یہی ہے کہ آناً فاناً
میں لاکھوں شہروں کو خاک میں ملا دے ظالم...... تو صرف
ظلم و ستم۔ بے رحمی۔ بے دردی سے واقف ہے۔ انہیں میں
مشاق ہے۔ ہائے تو نے کیسے کیسے حسینوں مہ جبینوں کو پیوند
خاک کر دیا۔ جن نازک اندا موں کو برگِ گل علحدہ کرنا بھی بارگراں تھا
آہ تو نے اونکو لاکھوں من مٹی کے تلے دبا دیا۔ جن نازک دماغوں
کو کبھی پھولوں کی سیجوں پر بھی نیند نہ آتی تھی۔ تو نے اون کو فرش
خاک پر ایسا بے خبر سلا دیا کہ اونہوں نے کروٹ بھی نہ لی۔ امیر ہو
یا غریب۔ شاہ ہو یا گدا۔ تیرے یہاں سب کی قدر و منزلت یکساں ہے
خواہ عالیشان محلات میں پر لطف زندگی بسر کرنے والا ہو یا شکستہ
جھونپڑی میں مشجر کے گدڑ و نپر آرام کرنے والا ہو یا پھٹی پُرانی گوڈری
پر تیرے یہاں سب کے لیے وہی فرشِ خاک کا بچھونا اور قبر کا تنگ

تاریک گوشہ ہے۔ افسوس کبھی جن شاہنشاہوں کے در دولت پر محبتا کا مجمع رہتا تہا۔ آج اونکی تربتوں پر کیسی حسرت برس رہی ہے۔ تونے سب کو جام مرگ سے سیراب کردیا۔ اور کوئی اتنا بھی نہ چھوڑا جو ذرا فاتحہ پڑھکر قبر پر دو پہول ہی چڑھا دیتا۔ تیرے دست ستم سے دنیا میں کسیکو مخلصی نہیں ہے۔ ناانصافی ہوگی۔ اگر تیری بے حد و شمار ان گنت بے رحمیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہ کہا جائے کہ جہاں تیرے ظلم ستم حد سے فزوں ہیں وہاں ایک ہمدردی بھی بے مثال اور قابل قدر ہے۔ اس ہمدردی اور دلسوزی کا اندازہ بخوبی وہی لوگ کرسکتے ہیں جو سدا مورد آفات رہتے ہیں اور اون کا کوئی حامی و مددگار نہیں رہتا ایسے وقت اگر کوئی ہمدرد اور مصیبت سے نجات دینے والا ہے تو وہ تو ہے۔ جہاں تیری مہربانی ہوئی پہر تو خواہ کتنے ہی ہجوم افکار کیوں نہوں جہاں تونے تہپک تہپک کر آرام کی نیند زیر خاک سلا دیا پہر خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہمارے بعد کیا ہو رہا ہے۔ پہر نہ تو کوئی بجھپن کرسکتا ہے نہ دنیاوی تکالیف ایذا دے سکتی ہیں۔ کسیکو تو مار کر دنیاوی تکالیف اور غم و الم سے نجات دے دیتی ہے۔ اور کسی کے ارمانوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور۔ اوس کی عیش و عشرت کی زندگی پر خاک ڈالدیتی ہے

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے

بنت محمد احسن۔ بہوپال

نورانی ذات کی صفت

جدا کب یا محمدؐ حق سے تو ہے — جو گُل ہے تو تو وہ مانند بُو ہے

شمیم مشک پھیلی چار سُو ہے — زباں پر نعتِ گیسو مو بمو ہے

زلیخا کو لبھائے حسنِ یوسف — خدا عاشق ہے تو وہ خوبرو ہے

موذن نام لینے کو ہے اُن کا — ادب کا دھیان ہے فکرِ وضو ہے

ہے الا الانسانُ سِرّیؐ سے یہ ظاہر — وہ تیرا بھید اُس کا بھید تو ہے

ہے عکسِ نور تیرا مہر و مہ میں — سراپا نورِ ذاتِ پاک تو ہے

ترا دیدار ان آنکھوں سے دیکھوں — حبیبِ حق یہ میری آرزو ہے

یہ روزِ حشر ہر عاصی کہے گا — شفیع المذنبینؐ کی جستجو ہے

دیا چھینٹا ترے ابرِ کرم نے — مرا سرسبز نخلِ آرزو ہے

یہ ہے عکسِ لبِ حضرت کا صدقہ — جو ہر لعلِ بدخشاں سرخرو ہے

دُرِ دندانِ احمدؐ کے مقابل — ہر اک سلکِ گہر بے آبرو ہے

کیا ہے دامنِ دل عشق نے چاک — رفوگر کو عبث فکرِ رفو ہے

جو ہے مجھکو خطا کرنے کی عادت — تو یا رب بخشدینا تیری خو ہے

مری آنکھوں کو وقتِ نزع حضرت — تمھارے دیکھنے کی آرزو ہے

ترے محبوب کے در پر یہ سر ہو
الٰہی یہ حسنؔ کی آرزو ہے

از منشی ...

الوانِ نعمت

مزعفر

چاول ایک سیر۔ قند سوا سیر۔ گھی ڈیڑھ پاؤ۔ زعفران چھ ماشہ عرق لیموں پانچ تولے۔ ڈنڈیاں چھٹانک بھر۔ الائچی خورد تین ماشہ لونگ دو ماشہ۔ پستہ ۵۔ تولہ۔ گری بادام ۵۔ تولہ۔ کیوڑہ گلاب آدہ پاؤ۔ ڈنڈیوں کو پانی میں جوش دیکر چاول جوش دیں اور ایک کنی پر اتار کر قند کا شیرہ بنالیں۔ پھر زعفران کو کیوڑہ میں پیس کر بادام و پستہ ملاکر آنچ دیں جب تیار ہو جائے گھی میں الائچی کڑکڑا کر ڈالیں اور باقی گلاب۔ کیوڑہ۔ عرق لیموں سمیت دم پر رکھدیں پھر گنگروندے کا مربی بھی چاہے تو ڈالدیں۔

چائنا گراس کی کھیر

نو ماشہ گراس لیکر پانی میں بھگودیں گھنٹہ بھر بعد سیر بھر دودہ لیکر آگ پر حرکت دیں اور گراس ڈالتے رہیں۔ تھوڑی دیر گھونٹیں اور قند ملادیں اس کے بعد چاقو سے لوزات کی طرح تراش لیں۔

راقمہ صغریٰ بیگم

گاجر اور میٹھے کدو کی لوزبنانے کی ترکیب

گاجر کا میدہ آدہ سیر شیرہ قند سفید ایک سیر

روغن زرد آدہ سیر دیگچہ میں ڈال کر جل کرے اوپر سے شیرہ ڈالکر
قوام کرے تار ٹوٹنے کے وقت آدھے لیموں کا عرق اور قدرے
زعفران مشک و گلاب اور مغز بادام مصفا ڈالکر ملا دے بعد ظرف
روغنی میں نکال کر سرد کرکے لوز تیار کریوے۔

لیموں کے اچار بنانے کی ترکیب

اول لیموں کو تیہر پر رگڑ کر پانی میں ڈالے
بعد مشکی میں نمک کے ساتھہ ڈالکر تین روز رہنے اور خوب ہلاتا رہے
جو پانی کہ اُس سے نکلتا ہے دور کرتا جاوے جب نرم ہو جاویں
چادر پر سایہ میں رکھہ کر ہوا دیوے جب سخت ہوا جاوے
پودینہ کا عرق یا سرکہ یا لیموں کا رس جو پسند آوے ڈالے

کاغذی لیموں کے اچار کی ترکیب

کاغذی لیموں ایک سیر نمک آدہ پاؤ میں ڈالکر
آٹھہ روز یا سات روز رکہے تا پانی نکل جاوے پہر چار تولہ نمک
لاہوری اور دو تولہ کاغذی لیموں کا رس پہر فی سیر لیموں کو
آدہ پاؤ نمک ملاکر رکہہ دیوے دہوپ دیا کرے

راقمہ۔ والدہ سکندر مرزا

خط وکتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر
فرمایا کریں۔
منیجر

جن بہنوں نے جولائی کی پہیلی کا جواب بھیجا دیا ہے ان کے نام شکریہ کے ساتھ درج فرمائے جاتے ہیں :- بیگم صاحبہ نمبر ا- انعام کی مستحق تھیں جنکی خدمت میں کتاب بھیجدی گئی۔

محمدی بیگم صاحبہ لکھنؤ۔ مسز خواجہ صلاح الدین صاحبہ ڈھاکہ ہمشیرہ فضل حق صاحب پٹیالہ۔ راحت بانو بیگم صاحبہ پٹیالہ۔ مسز بدر الحسن صاحبہ بدایوں۔ انجم جہان بیگم صاحبہ مراد آباد۔ مس مولوی رونق علی صاحب دکن۔ کنیز آمنہ صاحبہ اندور۔ سید ممتاز علی صاحب لائل پور۔ ہمشیرہ سید عنایت حسین صاحب میانوالی۔ بنت مولوی امجد علی صاحب ہندور۔ فاطمہ بیگم صاحبہ ہمیر پور۔ مسز علی محمد صاحب سوہانپور۔ بنت مولوی نیاز علی خانصاحب لاہور۔ مسز علی اکبر صاحب۔ چھپرہ۔ مسز سید عباس علی صاحب ہمشیرہ کامل حسین صاحب جونپور۔ سیدۃ النساء بیگم صاحبہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ م۔ ح۔ صاحبہ آگرہ لاہور۔ ایک بہن صاحبہ۔ مسز حامد صاحب ثروت بنت ڈاکٹر محمد عثمان صاحبہ۔ ص۔ ک۔ جامع میری عزیز بہن اختر فاطمہ صاحبہ کے ہاں پرسوں ۲۰ راگست کو لڑکا تولد ہوا خداوند کریم مولود کی عمر طبعی عطا کرے۔ امیر فاطمہ۔ اگر کسی بہن کو مہتابی کیلونکی دوا معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔ ممنون ہونگی۔ ا۔ م۔ جو بہنیں اس پہیلی کو بوجھیں گی انمیں سے ایک بہن کو بذریعہ قرعہ کتابیں قیمتی عہ۸ر انعام دی جائیں گی۔ پہیلی یہ ہے۔

پہیلی }
انار دانہ لب شکر۔ میں کہڑی تھی بے خبر۔
رنگ محل میں بجلی چمکی۔ سیاہ پری کو کیا خبر
ا۔ ف۔ ض

لوری

کود تجھ پہ سے کود
تیری نلیوں میں دود
تیری ایک ایک پور تیری نس نس میں زور
تیری طاقت کا اور کوئی پائے نہ چھور
(تو) کود تجھ پہ سے کود
تیری نلیوں میں دود
تیرا ایک ایک قدم نہ ہو سو سے کم
تو ہو صاحبِ علم نہ کہ خالی شکم،
(تو) کود تجھ پہ سے کود
تیری نلیوں میں دود
تیرا ایک ایک گام چڑھے عزت کی بام
آئے ملت کے کام پائے تحسین عام
(ہاں) کود تجھ پہ سے کود
تیری نلیوں میں دود
تیری ایک ایک چال بنے دشمن وبال،
نہ ہو غصہ میں لال اماں صدقے! نہال

(تو) کود بچھیرے کود
تیری نلیوں میں ُود
سر دشمن کچل مونگ چھاتی پہ دل
باد تند اجل جیسے چلتی ہو چل
(اور) کود بچھیرے کود
تیری نلیوں میں ُود
تو ہے شیروں کا شیر میرے بچے دلیر
کرنا دشمن کو زیر مارلاتوں سے کے ڈھیر
(ہاں) کود بچھیرے کود
تیری نلیوں میں ُود
میرے نو لکھے ہار میرے سولہ سنگھار
نہیں! دل کی بہار کوئی کلکاری مار
(اور) کود بچھیرے کود
تیری نلیوں میں ُود
میری آنکھوں کے نور میرے دل کے سرور
پھوٹے دیا سے دودُ بجتے دیکھیں جو گھور
(تو) کود بچھیرے کود
تیری نلیوں میں ُود
واری صدقہ نثار بھائی بہنوں سے پیار

رکھنا اپنا شعار   ہونا نیکوں کے یار

کود بچھیرے کود

تیری نلیوں میں دُو

ساتھی بد ہے، بُرا   اس سے بچنا ا بھلا

رکھنا شرم و حیا   اپنا شیوہ سدا

کود بچھیرے کود

تیری نلیوں میں دُو

سارے بچوں کی خیر   ہوں وہ اپنے کہ غیر

جس کے دل میں ہو بیر   اس کا سر ہو نہ پیر

کود بچھیرے کود

تیری نلیوں میں دُو

روؤ نہ ہیرا میرے   بھیا صدقے تیرے

اُوں اُوں اُوں   اُوں اُوں اُوں

مچلو نہ بھیا ایسے تم   لال ہمارے کیسے تم

آؤ لگاؤں کندھے سے   سو جا بھیا جھپکے سے

اُوں اُوں اُوں   اُوں اُوں اُوں

بھیا ہمارے اچھے جی   رونے نہ پچھے چھی چھی

آ گئی نندیا آ ہا ہا   سو گئے بھیا واہ وا

اُوں اُوں اُوں   اُوں اُوں اُوں

پردہ

آجکل جہانتک دیکھنے اور سننے میں آتا ہے انگریزی طرز معاشرت کے دلدادہ پردے کے سخت مخالف نظر آتے ہیں۔ اون کا بیان ہے کہ ہماری قوم کا بغیر بے پردگی کے ترقی کرنا ناممکن ہے کیونکہ پردہ تعلیم نسواں اور صحت دونوں کو مضر ہے۔ جائے تعجب ہے کہ مخالفین اہل اسلام کہلا کر خود بجائے پردہ کو ترقی دینے کے سراسر اوس کے باب میں تنزل کی بنا ڈالتے ہیں۔ پردہ ہی وہ شے ہے جو کہ مستورات کا ہر حال میں محافظ ہے۔ اس بات کو اہل ہنود بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ واقعی پردہ بڑا قیمتی جوہر ہے اس کا مستورات میں رائج نہ ہونا قوم کی بڑی بدنصیبی کا باعث ہے۔ بعض صاحبان نے ایک یہ بھی حیلہ کھڑا کیا ہے کہ خواتین عرب بازاروں میں جا کر خود خرید و فروخت کرتی ہیں۔ یہ صحیح اور بالکل راست۔ لیکن کس طرح پر۔ اسکی اجازت تو شرع نے بھی دی ہے اوسوقت جبکہ کوئی سرپرست نہو یا اور کوئی امر ضروری مجبور کرے تب بھی یہ حکم ہے کہ سر سے پاؤں تک برقعہ میں پوشیدہ ہو جائے۔ اسطرح نہیں کہ بے نقاب و برقعہ کھلی گاڑیوں میں سیر و تفریح کو نکلیں جس طرح کہ آجکل کی مستورات اکثر نظر آتی ہیں۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر مسجد نبوی میں تشریف لیجاتی تہیں تو

آپ تمام جسم کو سر سے پیر تک چادر میں پوشیدہ کرلیتی تھیں اور مسجد و کوچہ میں ممانعت کردی جاتی تھی کہ جب تک آپ تشریف نہ لیجائیں تب تک کوئی ادھر کا راستہ نہ چلے۔ پس اس حدیث شریف سے ظاہر ہے کہ پردہ کی پابندی کس حد تک موزوں و مناسب ہے۔

دراصل مخالفین صاحبان شیفتہ تو انگریزی طرز معاشرت کے ہیں لیکن بہانہ غریب عرب کا پکڑ لیا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ ان اصحاب کی حالت پر غور نہیں کرتے کہ جو بے پردگی کی وجہ سے کن کن بلاؤں اور آفتوں میں مبتلا ہیں۔ پردہ نہ تو تعلیم ہی کا مانع ہے نہ صحت ہی کو مضر ثابت ہوا ہے۔ میری عقل اس مسئلہ پر غور کرتے میں مدد نہیں دیتی کہ پردہ صحت کو مضر کیونکر ہوا۔ کیونکہ صحت کا دارومدار تو صفائی۔ ورزش۔ اور صاف ہوا پر ہے پردے کی ممانعت کے کیا معنی۔ سیر و تفریح و گلگشت باغ وغیرہ بھی پردہ کے انتظام میں بخوبی ہو سکتی ہے۔ پردہ کسی امر کا مانع نہیں ہے۔

سخت تعجب خیز تو یہ بات ہے کہ ہمارے یہاں کی خواتین خود پردے کی قید سے بیزار نظر آتی ہیں۔ وہ پردہ کے زنجیر سے آزاد ہو کر بے تکلف انگلش لیڈیز کی طرح کھلی بے پردہ گاڑیوں میں ہوا خوری کو جانا موجب فخر سمجھتی ہیں۔ ابھی حال میں دوران سفر میں مجھکو ایک واقعہ پیش آیا جس نے مجھے اس کی بابت قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ میں اپنے بھائیوں کے پاس سے واپس آرہی تھی۔ ہم جسوقت ایک بڑے

سوار ہوئے شب کا وقت تہا۔ ایک مسلمان بیوی صاحبہ بینچ پر ذرا آرام
فرما رہی تہیں۔ جسوقت ہماری ملازمہ کی نگاہ اُن پر پڑی تو کہنے لگی
کہ یہاں تو کوئی مرد سو رہا ہے میننے مڑکر دیکھا تو واقعی ایسا معلوم ہوا کہ بیشک
کوئی مرد ہی ہے۔ کیونکہ اون کا لباس اسکا ثبوت دے رہا تہا اسوقت
وہ سفید علیگڑھ فیشن کا پائجامہ اور سفید قمیض زیب تن کئے ہوئے تہیں
سر سے صرف ایک چھوٹا سا رومال لپٹا ہوا تہا جس سے مجھے یہ پتہ چل سکا
کہ یہ عورت ہیں۔ دن نکلنے پر میں انگشت بدنداں رہ گئی جسوقت مینے دیکھا
کہ باوجود مسلمان ہونے کے اسٹیشن پر مردوں کے سامنے آتی اور بے تکلف
گفتگو کرتی ہیں۔ ۸-۹- بجے انکو اپنے جا ئے قیام پر اترنا تھا جائے
قیام سے ایک سٹیشن قبل انہوں نے ساری باندہی انگریزی فیشن کے
بال سنوارے اور تیار ہوکر بیٹھ گئیں جسوقت سٹیشن پر ریل رکی یہ فوراً
ہاتھ میں چھتری لیکر اتر پڑیں اور ایک مرد کے ہمراہ (جوکہ قیاس سے ان کے
شوہر معلوم ہوتے تہے) وٹینگ روم میں چلے گئیں۔ میں یہ دیکھ کر دنگ
رہ گئی اور اپنی بدنصیب قوم پر بہت افسوس آیا اور بہی پردہ نشین بیگمات
جوکہ اوس درجہ میں سوار تہیں وہ بہی حیرت زدہ رہ گئیں اور ان کی بابت
بہت دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

خاکسار

س۔ نواب منزل

مسلمان عورت کی موجودہ حالت

اور اس میں اصلاح کی ضرورت

دو مدت دراز سے مسلمانوں کی قوم کا نصف حصہ یعنی ہمارا طبقہ نسوان ایسا بیکار اور بے حرکت رہا ہے کہ گویا اس میں زندگی کا کوئی نشان باقی نہیں تھا اور ایسی صورت میں صریحاً نا ممکن تھا کہ ہماری قوم سالم قوم کی حیثیت سے میدان ترقی میں اپنا قدم بڑھا سکے۔ بگڑے ہوئے خیالوں اور بُری حالتوں کی وجہ سے ہمارے مردوں کے دلوں میں یہ غلط عقیدہ بیٹھا ہوا تھا کہ عورتوں کو تعلیم دینا جایز نہیں۔ اور اگر جایز بھی ہے تو نامناسب ہے۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بے نظیر اخلاقی قوت اس بات کی تلقین پر صرف کی۔ کہ مردوں پر عورتوں کے بے شمار حقوق ہیں اور ان حقوق کی نگہداشت کے لئے خدا اور پیغمبر خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مفصل اور تاکیدی احکام جاری کئے۔ مگر جوں جوں قوم کی مذہبی اور اخلاقی حالت بگڑتی گئی۔ مردوں کا طبقہ ان احکام کو فراموش کرتا گیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہانتک پہنچی کہ عورتوں کو ناقص العقل کا معزز خطاب دیا جانے لگا۔ انھیں جو حقوق مردوں کے مقابلہ میں حاصل تھے وہ نظر انداز کیے گئے۔ ان کو جہالت کی چادر پہنا کر گھر کی چار دیواری میں بند رکھنا عین فرض سمجھا گیا۔ اور ان پر علم کا دروازہ ایسا بند کیا گیا کہ انھیں یہ خبر بھی نہ رہی کہ ان کا فرقہ دنیا میں کیوں پیدا ہوا۔ اور ملک اور قوم کی ترقی کے اسباب مہیا کرنے میں فطرتاً وہ کس قدر حصہ لینے کی حقدار تھیں۔ ہم مسلمانوں کی قوم کے لئے یہ ایک

نہایت بدنصیبی کا زمانہ تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہل عورتوں کی اولاد اور زیادہ جاہل ہوتی گئی۔ اہل اسلام کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کا چشمہ مکدر ہو گیا وہ تمدن کے صحیح اصول اور معاشرت کے درست طریقے بھول گئے۔ اور جو قوم سب امتوں سے اچھی سمجھی جایا کرتی تھی وہ آخر کار سب سے حقیر اور سب سے بُری تصور کی جانے لگی۔ نہایت شکر کا مقام ہے کہ سوئی ہوئی قوم نے آخر کروٹ بدلی ہے اور ہمارے مردوں نے ذرا آنکھیں کھولکر زمانے کے تیور پہچانے ہیں۔ اور اس بات کی ضرورت محسوس کی ہے کہ اصلی اور پایدار قومی ترقی کے حاصل کرنے کا سب سے پہلا ذریعہ یہ ہے کہ اُٹھتی ہوئی نسلوں میں لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے"

غور سے دیکھو اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (اسلامی تعلیمی کانفرنس) کے شعبۂ تعلیم نسواں اور زنانہ کانفرنس پر نظر ڈالو لوہا کر "ہم سب کو یہ بات واضح طور سے سمجھ لینی چاہیئے کہ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے ہر سال ہمارا ایک دفعہ کسی خاص مقام پر ملک کے مختلف حصوں سے آکر جمع ہونا کافی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ لازمی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ممبر سال کے دوران میں اپنے اپنے مقام میں تعلیم نسواں کا رواج دینے کی کوشش کرے اور پھر سال کے انجام پر اپنی عملی کارروائی کی سرگذشت پیش کرکے دوسری خواتین کے سامنے ایک ایسی مثال قایم کرے جس کی تقلید سے ساری قوم کو فائدہ ہو"

حق یہ ہے کہ کہنے کو تو عورت صنف ضعیف ہے لیکن امتنانی قول اور فعل کے وسیع دائرے میں جو قدرت خدا نے اسکو بخشی ہے وہ مرد کو حاصل نہیں اور نہ کبھی حاصل ہوگی زود پیدایش سے لیکر جبکہ ایک پیاری

روح چھوٹے سے نازک جسم کا خوش نما لباس پہنے عالم وجود میں آتی ہے۔
تا دمِ مرگ جبکہ وہ قفسِ عنصری سے پرواز کر کے عالم بالا کی طرف جاتی ہے
عورت کی ذات کا اثر انسانی زندگی پر بے شمار شکلوں میں اپنے جوہر دکھاتا ہے۔
بہ حیثیت دختر اور ہمشیرہ اور زوجہ اور والدہ کے عورت مرد کو اطاعت اور
خدمت گذاری اور محبت کے جادو بھرے ذریعوں سے مسخر کرتی ہے اور
سچ تو یہ ہے کہ انسانی زیست کا ہر ایک لطیف اور درد آمیز پہلو عورت ہی
کے آئینہ دل کا عکس ہے۔ پس جس قدر طاعت عورت کو ان مختلف حیثیتوں
میں ہر ملک اور قوم میں حاصل ہے۔ اسی قدر اسکی ذمہ داریاں بھی بڑھی ہوئی
ہیں اور اس لئے ہندوستان کی مسلمان عورتوں کا پہلا اور سب سے ضروری
فرض یہ ہے کہ وہ اپنی بھاری ذمہ داریوں کو محسوس کر کے قومی ترقی میں مردوں
کے ساتھ نہایت گرمجوشی سے شریک ہوں۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ ہماری
قوم ترقی نہیں کر سکے گی۔ جب تک کہ ان اسباب کو دور نہ کیا جائے۔ جو
اس ترقی کے سدِ راہ ہیں۔ آپ کی اجازت سے میں اس مقام پر ان اسباب
کا مختصراً ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ اول ہماری معاشرتی زندگی بہت بگڑی ہوئی
ہے۔ دوم ہماری عام اخلاقی حالت نہایت کمزور ہے۔ سوم دنیادی
مرفہ الحال کے اصول ہم نے نظر انداز کر رکھے ہیں۔ چہارم مدت دراز کے
غلط طریق عمل نے ہم مسلمانوں کی طبیعتوں پر کچھ ایسا اثر کیا ہے کہ ہم اکثر
معاملات کو صحیح نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے۔

تھوڑے غور کے بعد ہم میں سے ہر ایک کو ماننا پڑیگا کہ مسلمانوں کی
معاشرتی زندگی میں بے شمار نقص موجود ہیں، اور اس لئے ہم میں اصلاح
معاشرت کی نہایت ضرورت ہے اکثر نقص ایسے ہیں۔ جن کی ذمہ داری

سب سے زیادہ طبقہ نسواں پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ مثل دوسری قوموں کے مسلمانوں کی سوسائٹی کا ڈھانچ ایسا بنا ہے کہ ہر قسم کے معاملات معاشرت پر عورت کا بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور عورت کی طبیعت فطرتاً کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ انسانی زندگانی کے ہر چھوٹے بڑے موقع پر ایک رسم کا ادا کرنا نہایت موزوں سمجھتی ہے۔ یہ رسمیں گو ابتدا میں مفید ہوں لیکن حالات کے بدل جانے کی وجہ سے قوم کے لئے غیر مفید بلکہ مضر ہو جاتی ہیں مثلاً ہماری شادی و غمی کی بے شمار رسمیں جو بچے کی پیدائش سے لیکر بوڑھے کی مرگ تک ملک کے مختلف حصوں میں ادا کی جاتی ہیں ایسی ہیں کہ کم از کم سو میں سے پچاس نہ فقط صرف بیجا کا باعث ہوتی ہیں۔ بلکہ ہماری اخلاقی حالت پر ان کا نہایت بُرا اثر پڑتا ہے۔ ہماری قوم کبھی ترقی نہیں کر سکیگی جب تک یہ مُضر اور قبیح رسمیں موقوف نہ کی جائیں۔ اور یہ رسمیں موقوف نہیں ہو سکینگی۔ جب تک کہ ہمارا فرقہ نسواں اُن کی بُرائی کا قایل نہ ہو اور ان کے رفع کرنے میں نہایت کھُلے دل سے مردوں کا ساتھ نہ دے میری رائے میں ہم سب تعلیم یافتہ عورتوں کو اصلاح معاشرت میں عملی حصہ لینے کے لیئے نہایت ہمت کے ساتھ کمربستہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب تک ہم مسلمانوں کی معاشرتی زندگی درست اصول پر قایم نہ ہوگی اُس وقت تک ہمارا بہ حیثیت قوم کے ترقی کرنا نہایت مشکل ہوگا۔

اصلاح معاشرت کے ساتھ ہم کو اپنی بگڑی ہوئی حالت کے سنوارنے کی بھی کوشش کرنا چاہیئے۔ یہ دونوں باتیں باہم ایسی وابستہ ہیں کہ ایک کا بغیر دوسری کے حاصل ہونا ناممکن ہے، اور دونوں کے ساتھ ہمارے مذہبی عقاید اور خیالات کا گہرا تعلق ہے۔

مسلمانوں کی سوسائٹی کو غور سے دیکھو تو اسکی کم ہمتی اسکی بے بضاعتی اسکی اخلاقی کمزوری اور اس کی عام بگڑی ہوئی حالت کا ایک بڑا بھاری سبب یہ معلوم ہوگا کہ اس کے افراد نے اپنے مقدس مذہب کے صاف اور سادہ اصولوں کو چھوڑ دیا ہے۔ کہنے کو تو وہ خدا کے کلام پاک اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کرتے ہیں لیکن در اصل خدا اور رسول کے احکام کی اصلیت کو بھول چکے ہیں۔ اور ان کا عمل صرف رسمیات شرعی پر مبنی ہے۔ ہم عورتوں کے لئے لازمی ہے کہ احکام مذہب پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی کوشش کریں اور اپنی زندگانی کے سب کاروبار کو معاشرت اور اخلاق کے وسیع دائرے میں درست اخلاقی اصول پر قایم کر کے اصلی اسلامی ترقی کے راستہ پر اپنی قوم کو چلائیں۔

ہمارے طریق معاشرت اور ہماری اخلاقی حالت کے بگڑنے کی وجہ سے ہماری قوم کا شیرازہ منتشر ہوگیا ہے اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہم کو طمانیت اور قومی تقویت حاصل نہیں جس کا قایم کرنا ہمارے پاک مذہب کا سب سے بڑا مقصد تھا مرد عورت کے تعلقات کے متعلق جو احکام ہماری مقدس کتاب میں موجود ہیں ان پر نہ مرد عمل کر رہے ہیں، اور نہ عورتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی ہے۔ اور اس کے بُرے نتیجوں کا خمیازہ زیادہ تر ہم عورتوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ ہزاروں گھرانے کثرت ازدواج کے مسئلہ کو غلط سمجھتے ہیں اور اسپر غلط عمل کرنے کی وجہ سے برباد ہوگئے اور ہوتے جاتے ہیں اور قوم میں اخلاقی بزدلی اسدرجہ تک اثر کر گئی ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس مسئلہ کے درست اطلاق کی طرف توجہ نہیں کرتے، میاں بیوی کی رنجشیں، اولاد کے تنازعات، جایدادوں کے جھگڑے اور خانگی زندگی کی

پیچیدگیاں یہ سب بُرے نتیجے اس بات کے ہیں کہ ہم مسلمان شرعی احکام پر سچے دل سے عمل کرنے کی بجائے ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور اپنی خود غرضانہ اور عارضی خوشی کے حصول میں اپنے فعلوں کے بُرے نتیجوں کو بھول جاتے ہیں۔

اولاد کی صحیح تربیت کرنا بے شبہ قومی ترقی کی بنیاد ہے اور چونکہ اس کے ابتدائی مرحلے زیادہ تر ہم عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے اس کی طرف ہم کو خاص توجہ کرنا چاہئے ۔"

رونے کے بعد کی ہچکیاں

مومنو وہ نائب شاہد ہوا جاتا رہا — جادۂ دین نبی کا رہنما جاتا رہا

دھوم تھی عرش بریں تک جس کے فضل و علم کی — بحر عالم سے وہ دُر بے بہا جاتا رہا

تھا جو دلدادہ نبی اور سیرت نبوی نگار — ہائے وہ شیدائے محبوب خدا جاتا رہا

رہبر و نامی مورخ اور مصنف اور ادیب — عالم دوراں فقیہ بے ریا جاتا رہا

بلبل باغ شریعت کا جو تھا نغمہ سرا — شبلی شیریں سخن شیریں نوا جاتا رہا

عالم انشا میں تھا اک ناثر جادو رقم — وہ سخنور ناظم معجز نما جاتا رہا

اب بھلا اے دل کسے دکھلائیں ہم نثر و قلم — زورق شعر و سخن غرق فنا جاتا رہا

جس کی خوش طبعی سے حاصل ہوتی تھی فرط نشاط — وہ ظریف نکتہ داں۔ نکتہ سرا جاتا رہا

منزل شبلی پہ کس کے شوق میں اب جائیں ہم — مہربان۔ مخدوم مشفق۔ رہنما جاتا رہا

لاکھ سر پٹکوگے حیرت پر نہ پاؤ گے کہیں
ملک فانی سے وہ اب ملک بقا جاتا رہا

خواب ہستی

شاہد چشمہ کے کنارے ایک پہاڑ کی چوٹی کے قریب بیٹھا۔ قدرتی دلفریبیوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ گنجان درخت انوکھی ادا سے ایک دوسرے کے گردن میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ بھینی بھینی ہوا خودرو نازک پھولوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ خوبصورت پرندے راگنیاں چھیڑ کر آفتاب کی آمد آمد کا مژدہ سنا رہے تھے۔ یکایک گھاٹیوں میں سے گونجتی ہوئی ایک پُرسوز گانے کی صدا کان میں آئی

کرلے سنگھار چتر اہیلی ساجن کے گھر جانا ہوگا

دیکھا تو یہہ ایک نازنین کی آواز تھی جس نے دنیا کو تیاگ گیروہ کفنی پہن منہ پر بھبھوت مل کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے جوگن کا روپ لیا تھا۔ اس دلچسپ نظارہ اور سریلی آواز نے شاہد کو خود رفتہ کر کے بالکل اپنی طرف محو کر لیا۔ اور اسی عالم فراموشی میں اسکی آنکھہ لگ گئی۔

خواب میں دیکھتا کیا ہے گھنگور گھٹا چھا رہی ہے۔ طوفانی ہوائیں سائیں سائیں چل رہی ہیں تاریکی کا وہ عالم ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ خوف کے مارے اسکا کلیجہ ہاتھوں اُچھلنے لگا۔ آخر کچھہ سنبھلنا چاہا۔ کہ یہاں کے حالات معلوم کرے۔ دفعتہً غیب سے ندا آئی او شاہد قدرت کاملہ کا بھید کوئی منکشف نہیں کر سکتا۔ تُو تو کیا ہے بڑے بڑے کاملین اِس راہ میں برسوں بھٹکے لیکن بجز حیرانی و پریشانی کچھہ حاصل نہوا۔ خیر تو اتنا سن لے یہہ دشت نابود ہے۔ جا۔ اب اپنی راہ لے۔

شاہد منزل مقصود سے بے خبر راستہ سے ناآشنا اس ظلمات کے کنارہ مشکل ہی سے پہنچا ہوگا۔ دفعتہً بجلی چمکی۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں بیہوش ہوکر گر پڑا۔

جب ہوش میں آیا تو ایک فرشتہ صورت مرد اور ایک نیک خاتون کو اپنے پاس بیٹھے دیکھا یہہ دونوں محبت بھری نگاہوں سے اسکے منہ کو تک رہے تھے کبھی کبھی کچھہ شاہد سے کہتے لیکن کیونکہ غیر زباں سے ناآشنا تھا۔ اسلئے سوائے ہوں۔ ہاں کے کچھہ نہ کرسکتا تھا۔

انکو اکثر ٹکٹکی باندھے بغور دیکھا کرتا۔ کچھہ عرصہ یونہی گزرا۔ جب کچھہ ٹوں ٹاں کرنیکے قابل ہوا تو ایکدن اسنے پوچھا۔ آپ کون لوگ ہیں؟ یہ کیا مقام ہے؟ اُنمیں سے ایک نے مسکراکر کہا۔ یہاں ہم تمہارے رہبر ہیں یہہ مقام ہستی ہے اسکی راہیں پُرخطر و پرمصائب ہیں۔ اب آئے ہو تو سیر بھی کرتے جاؤ۔ ہم تمہاری حفاظت کرینگے مگر حد جوانی تک اسکے بعد ہمارا گذر نہیں۔ دیکھو ہماری صلاح پر کاربند رہنا۔ ذرا ڈگمگائے اور مشکلوں میں پھنسے۔ یہاں شاہ افعال کا راج پاٹ ہے۔ طفلی۔ شباب۔ پیری۔ سلطنت کے تین حصہ ہیں۔ علاوہ اسکے شاہ افعال کے لڑکے نیک خصال اور بدافعال مملکت ترقی و تنزل میں حکمراں ہیں۔ مگر بادشاہ کے لڑکے ہیں اسلئے مملکت طفلی شباب پیری میں بھی انکا بہت کچھہ عمل دخل ہے۔ یہہ لوگ شاہد کو لیکر چلے کچھہ دور آئے تھے کہ نیک خصال اپنے صوفیانہ سادے اور بدافعال اپنے زرق برق شاہانہ لباس میں ایک دوسرے سے روسٹھے شارع عام ترقی و تنزل پر کھڑے تھے۔ یہاں خلقت کا اژدہام تھا۔

پھل چکھتے لیکن چکھتے ہی تھوک دیتے تھے۔ یہ ثمر جھوٹ تھے۔

لوگ آگے بڑھکر جہالت میں سے گزرے راستہ ایسی دشوار گزار گھاٹیوں میں سے تھا۔ جن کے دونوں طرف بڑے بڑے تاریک غار اور کھڈ تھے ان کو غار الجہالت کہتے تھے لوگوں کو ہر بار گرنے کا خطرہ تھا۔ علاوہ ناہمواری زمین کے پتھریلے راستہ نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ لوگ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے تھے سینکڑوں جانیں آکر تلف ہوئیں۔ یہاں اژدہائے بدزبانی کو بھی دیکھا آگ کے شعلے اسکے منہ سے نکل رہے تھے بہت سے اسکی نذر ہوئے۔

پھر یہ مملکت تنزل کے آخری حصہ میں پہنچے جسکی زمین بالکل سیاہ تھی یہاں ایک خونخوار قوی ہیکل دیو چاروں پانچوں ہتیاروں سے مسلح ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ دوسرے پر خون کا پیالہ لئے ایک سرخ ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ گو کہ نخوت کے آثار اسکی پیشانی سے عیاں تھے تاہم پرخون پیالے سے مسافروں کی آؤ تواضع کر رہا تھا اسکے قریب ہی ایک آتش کدہ تھا جسکے شعلے آسمان تک پہنچتے تھے اسکو آتش آہ مظلومان کہتے تھے۔ تھکے ہارے مسافر پیالہ کا خون شربت سمجھکر پیتے لیکن پیتے ہی اس دیو کی ہمشکل ہوجاتے تھے۔ اسوقت آتشین شعلے بڑھتے اور انکو جلاکر خاکستر کر ڈالتے تھے۔

اس عبرتناک نظارہ کو دیکھکر شاہد اپنے رہبروں کے ہمراہ مملکت ترقی کی طرف چل پڑا۔ اسنے شارع ترقی پر پہنچکر دیکھا کہ لوگ شوق کے گھوڑوں پر سوار باگیں اٹھائے چلے جارہے ہیں۔ آگے بڑھکر دیکھا ایک دیو غصہ کے مارے دانت پیس رہا ہے اسکے منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں طیش میں آکر بار بار زمین پر پاؤں مارتا ہے۔ لوگ اسکو دیکھکر خوف کے مارے لرزنے لگے انکی بڑھی ہوئی طبیعتیں پست ہونے لگیں اور گھوڑوں کی رفتار بھی دھیمی پڑگئی۔

اتنے ہی میں ایک نقاب پوش بھی آ پہنچے لوگوں کو حیران و پریشان دیکھکر پوچھا
خیر تو ہے ایسے حواس باختہ کیوں ہو! انھوں نے کہا کہ مملکت ترقی میں
جانا چاہتے ستھے۔ کہ راستہ میں یہ بلا نازل ہو گئی کچھ تدبیر نہیں بن آتی۔
نقاب پوش نے جواب دیا اگر یہی ارادہ ہے تو بسم اللہ بلا خوف و خطر میرے
پیچھے پیچھے چلے آؤ میرا نام استقلال ہے۔ مجھپر اعتماد رکھو حالانکہ تمکو بہت سی دقتیں
پیش آئیں گی تاہم تمہارے سلامتی کی ذمہ واری میں لیتا ہوں۔ سن لو یہہ مشکلات
کا دیو ہے یہاں شہزادہ بد افعال کی طرف سے متعین ہے۔ لوگوں کو لیکر نقاب
پوش آگے بڑھا۔ ان سبکو آتے دیکھکر دیو کی سٹی گم ہو گئی۔ چہرہ پر زردی سی چھا گئی
اور ایک دم میں غائب ہو گیا۔

یہہ لوگ تھوڑی دیر میں دشت محنت میں پہنچے۔ آفتاب نصف النہار پر
تھا سورج کی سیدھی کرنیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ اسپر طرہ یہ کہ علاقہ ریگستانی تھا
باد سموم چل رہی تھی۔ درختوں کے آثار پژمردگی نمایاں ستھے پرندے چونچیں
کھولے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے ستھے۔ گویا رحم کے ملتجی ہیں۔ غرض
ہر چیز زبان حال سے پناہ مانگتی نظر آتی تھی۔ گرمی کی شدت کے علاوہ لوگ
پیاس کے مارے بیقرار ستھے العطش العطش کی آوازیں چاروں طرف سے
آنے لگیں۔ اب تو استقلال کے پاؤں بھی لڑکھڑانے لگے۔

اسوقت ایک پرانے زمانہ کا آدمی جسکے چہرہ سے جفاکشی اور اولو العزمی
برستی تھی سامنے سے آتا معلوم ہوا۔ لوگوں نے اسکے پاس جاکر منت سماجت
کی کہ اے خضر پیاس کے مارے برا حال ہے کوئی تدبیر بتا۔ اس نے کہا میں
خود اسی لئے تمھارے پاس آیا ہوں اور آج سے تمھارے ساتھ ہوں اس
بیابان میں صرف ایک ہی چشمہ ہے اسکا نام چشمۂ تسکین ہے۔ حضرات میرا نام

تو صبر ہے۔ خضر کا دشت سخت میں گذر بھی نہیں۔ یہہ شخص مع استقلال لوگوں کو لیکر چشمہ تسکین پر پہنچا۔ پانی پیکر لوگوں کی جان میں جان آئی۔ اور آگے بڑھے یہہ سب کچھہ دور آئے تھے کہ آسمان پر ابر محیط چھاگیا۔ موسلا دھار بارش ہوکر مصیبت میں اضافہ کرنے والی سخت ژالہ باری ہونے لگی حالانکہ ریگستانی علاقہ تھا مگر سردی ایسی شدت سے پڑنے لگی کہ بدن میں خون جما جاتا تھا سوائے ایک دلدلے راستہ کے چارونطرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اسوقت صبر اور استقلال بیچارے کیا کرتے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ لوگوں میں ایک اُداسی چھاگئی۔ اسوقت ایک شخص جس کے چہرہ سے متانت اور سنجیدگی برستی تھی انکے پاس آکر کہنے لگا۔ سوائے میری مدد کے آپ کا چھٹکارا امر محال ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ میرے کہنے پر چلیئے اور ہر شخص سے کانا پھوسی کرکے کہا کہ یہہ اسم اعظم ہے اسکو پڑھتے ہوئے میرے پیچھے چلے آیئے۔ مصیبت سے نجات مِل جائیگی میرا نام علم ہے۔

لوگ شوق سے گھوڑونپر سوار معہ صبر و استقلال علم کے پیچھے ہو لئے۔ تھوڑی دیر میں یہہ سب سرحد ترقی کے قریب پہنچ گئے۔ اگرچہ صبر و استقلال اور علم جیسے ساتھی انکے ساتھ تھے لیکن پھر بھی سرحد عبور کرنے میں ناکامیاب رہے۔ کیونکہ نیک اخلاق لاؤ لشکر ڈالے سرحد پر پڑے تھے۔ حضرت علم نے سخت جدوجہد کی لیکن ایک پیش نہ گئی۔ صبر اور استقلال سے کہا کہ مقتضائے وقت یہی ہے کہ محاصرہ کرلیا جائے کچھہ عرصہ بعد نیک اخلاق نے شرائط صلح پیش کیئے کہ آپ مملکت ترقی میں اُسوقت داخل ہوسکتے ہیں جبکہ ارسطوِ زماں افلاطون وقت حکیم نیک عمل آپکے ساتھ ہوں۔ سوائے اسکے داخلہ کسی صورت نہیں۔ علاوہ اسکے ہماری حکومت اقرار کرتی ہے کہ اگر آپنے

یہہ شرط پوری کر دی تو آپ لوگوں کو مناسب جلیلہ پر ممتاز کیا جائیگا۔ لڑائی جھگڑے سے طرفین کے نقصان ہونے کا احتمال ہے۔ حضرت علم بھی فوراً راضی ہوگئے کیونکہ بجز اسکے کوئی چارہ نہ تھا۔ بصد تلاش حکیم نیک عمل کا پتہ لگا۔

علم معہ حکیم نیک عمل دارالاستقلال مملکت ترقی میں جا داخل ہوئے۔ شہزادہ نیک خصال نے حسب وعدہ ان چاروں کو بعہدہ وزارت مقرر کیا اور سلطنت کے مہمات بھی انہی کے صلاح مشورے سے انجام پانے لگے ان کے ساتھیوں نے بھی مملکت ترقی میں بود و باش اختیار کرلی اور آسودگی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

یہاں سے شاہد کے ساتھی اسکو مملکت طفلی میں لیکر پہنچے یہہ مقام پرلطف وادی میں واقع تھا کوسوں سبز مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ پھیاں پھیاں پھوار پڑ رہی تھی کلیاں چٹک رہی تھیں رنگارنگ کے گل و بوٹے کھل رہے تھے۔ میوہ کی ڈالیاں ہوا میں مستانہ رفتار سے جھوم رہی تھیں۔ غرض ایک عجیب بے فکری کا عالم تھا۔ اس وادی کے بیچ میں بچپن بھی ایک جواہرات سے مرصع کرسی پر جلوہ افروز تھا۔ خوشی اور آرام دائیں بائیں دست بستہ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بچپن ایک گورا چٹا چاندسا بچہ تھا اسکی موتی کیسی آنکھیں چمک رہی تھیں بھولے بھولے چہرہ سے بشاشت ٹپکتی تھی اسکے سنہرے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ مگر کیونکہ یہ مملکت وسیع نہیں تھی اسلئے جلد ختم ہوگئی۔

اس کے بعد شاہد اپنے ساتھیوں سمیت مملکت شباب میں پہنچا یہاں ایک شگفتگی برس رہی تھی۔ بڑے بڑے قد آور درخت بادِ نسیم سے حالت بیخودی میں جھوم رہے تھے۔ پتا پتا زبان بنکر صانع حقیقی کی تعریف کرتا معلوم ہوتا تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا زمردیں ڈالیوں کو آہستہ آہستہ جنبش دینا۔ دل میں
از خود گدگدیاں پیدا کر رہا تھا۔ شاہد کے ساتھی کچھ دور آکر یہاں سے واپس پھر
اور وہ تنہا چلتے چلتے ایک ٹھلا اٹھلا کر بہنے والی ندی کے کنارے پہنچا۔
دیکھتا کیا ہے کہ ایک نوعمر حسین شخص جس کے بشرہ سے ہمت جیسی چالاکی
برستی تھی ندی کے کنارے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھا ہے لہریں دوڑ دوڑ کر
اس کے قدموں کو چوم چوم کر چلی جاتی ہیں اکثر پانی اچھل اچھل کر اسکے چہرہ
کی بلائیں لینا چاہتا ہے مگر ہر بار اسکے حسن کی تاب نہ لاکر گر پڑتا ہے لہریں
عالم وجد میں آکر اسکی طرف دیوانہ وار دوڑتی تھیں لیکن کنارہ سے سر ٹکرا کر
رہ جاتی تھیں اگرچہ اس جوان کے پاس بظاہر کسی چیز کی کمی نہ معلوم ہوتی
تھی مگر پھر بھی آثار تفکر اسکے چہرہ سے نمایاں تھے۔ شاہد نے اس سے پوچھا
آپ پریشان کیوں ہیں؟

اسنے کہا خدا کا دیا سب کچھ ہے لیکن آسودگی نہیں ہے یہ مملکت طفلی
میں پائی جاتی ہے اسکے لیئے پریشان ہوں علاوہ اسکے ایک راہزن فکر
سے از حد پرخوف ہے جو کہ اکثر میری مجلس نشاط درہم برہم کر دیتا ہے۔

اسکے بعد شاہد چلتے چلتے مملکت پیری میں پہنچا یہ بستی کا بدترین نمونہ
تھا اجڑے ہوئے مملک میں خزاں کا زمانہ تھا بہار کی دلہنوں کا سر تیوں سے
ٹکا ہوا زمردیں لباس اور پھولوں کا سہرہ خزاں کے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا
تھا۔ ہر چیز سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی اتنے میں ایک ضعیف العمر آدمی جسکا سن
شاید اسی پچاس برس کا ہوگا تقاضائے عمر سے سر اور ڈاڑھی کے علاوہ پلکیں
تک سفید تھیں ضعف سے کمر دوہری ہوگئی تھی۔ سارے دانت گر چکے تھے
چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں ہپ ہپ کرتا لکڑی پکڑے لڑکھڑاتا ہوا

سامنے سے آتا معلوم ہوا۔ یہہ پیر مرد شاہد کے قریب آکر ٹھیرا۔ شاہد نے
اس سے پوچھا براہ خدا یہہ تو بتایئے آپ کون ہیں۔ اسنے کہا مجھے اب تو خواجہ
پیری کہتے ہیں کسی زمانہ میں مملکت طفلی میں آرام سے گذرتی تھی بعد میں مملکت
شباب میں جلا وطن کر دیا گیا مگر یہہ خبر نہیں کس جرم کی پاداش میں۔ وہاں
سے بھاگ کر اس اُجڑے ہوئے علاقہ میں برسوں کے بعد پہنچا ہوں۔ روز بروز
بدتری کے سامان ہوتے جاتے ہیں۔ بھائی انیسویں بیسویں صدی میں ہزاروں
ایجادیں ہوئیں ریل کے ذریعہ برسوں کے راستہ دنوں میں طے ہوگئے مگر
پھر بھی ہمکو تو یہاں آتے آتے برسوں لگ گئے۔ مملکت شباب سے ایک
گھوڑے کو لایا تھا ہمت اسکا نام تھا راستہ میں وہ بھی لنگڑا ہو کر مر گیا
اب نہ کوئی یار ہے نہ مددگار سوائے فکر کے۔ جس سے مملکت شباب
میں ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ دوست بھی دشمن جاں ہے اپنی زندگی سے
عاری آگیا ہوں۔ سوائے اس گٹھڑی کے دہن دولت مال و متاع
رستہ ہی میں لٹ گیا ہے۔
اس میں میرا توشہ آخرت ہے۔ لو خدا حافظ اور زار و قطار روتا ہوا
آگے بڑھا شاہد بھی اسکے پیچھے پیچھے ہولیا۔ یہہ شخص ایک تنگ و تاریک
غار کے کنارے پہنچکر اس میں گر پڑا۔ سطح زمین فوراً ہموار ہوگئی پھر معلوم
کہ اس مصیبت مارے پر کیا بیتی ہو۔ اس دہشت ناک نظارہ کو دیکھکر شاہد
خواب میں اُچھل پڑا اور اس کی آنکھ کھل گئی +

محمد صدر الدین

آج اعظم گڈھ سے دیکھو خستہ جاں آئے ہیں ہم — ڈھونڈھنے اپنے مسیحا کو یہاں آئے ہیں ہم

جلسۂ ندوہ کا تھا ہی ذوق دلمیں اسلئے — دیکھنے ندوہ کے جلسہ کا سماں آئے ہیں ہم

نونہالانِ چمن کے آج سج دھج ہیں نئے — دیکھنے یاں رنگ و بوئے گلستاں آئے ہیں ہم

باغ ندوہ مختلف پھولوں سے ہے آراستہ — دیکھنے آرایش باغ جناں آئے ہیں ہم

گو سماں دلکش ہے لیکن لطف کچھ حاصل نہیں — لیکے یاں داغ مصیبت کا نشاں آئے ہیں ہم

ڈر ہے سنکر چھا نہ جائے بزم میں غم کی گھٹا — لیکے یاں عبرت نما اک داستاں آئے ہیں ہم

ہائے جو اس باغ کا مالی تھا وہ جاتا رہا — اس چمن میں آج اسی کے نوحہ خواں آئے ہیں ہم

ذات سے جسکی تھی قایم باغ ندوہ کی بہار — آج اوسی کے غم میں پامال خزاں آئے ہیں ہم

کیا سنوگے اسکے سننے سے جگر ہوتا ہے چاک — نوحۂ پُر درد جو لیکر یہاں آئے ہیں ہم

جلسۂ ندوہ ہے۔ یا یہ ماتم شبلی ہے آج — ماتمی جامہ میں جو ماتم کناں آئے ہیں ہم

کچھ بتاؤ بھائیو اُس خضر کو ڈھونڈیں کہاں — جستجو میں اسکے با آہ و فغاں آئے ہیں ہم

لوگ ہم کو خبطی و دیوانہ ٹھہرائیں تو کیا — اُسکا سودا سر میں لیکے بیگماں آئے ہیں ہم

آؤ شیدایان نعمانی۔ خرید و جلد تو — لیکے نسخہ ماتم شبلی کا یہاں آئے ہیں ہم

اے عزیزو حیرت خستہ پہ ہو بس اک نظر
صرف دو دن کے لئے یاں میہماں آئے ہیں ہم

قاضی عبدالرحمٰن حیرت اعظم گڈھ

[illegible] جو خاکسار نے بصد رنج و غم کہے تھے۔

وطن

ہر شخص کو اپنے وطن سے جیسی موانست ہوتی ہے ظاہر ہے۔ مرتا ہے کھپتا ہے جان دیتا ہے یہی محبت ہے۔ یہی الفت ہے جو جان جیسی عزیز چیز کے دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ تاریخ کے صفحات کو دیکھئے ہر زمانہ ہر ملک ہر قوم میں ایسی مثالیں صدہا ملینگی جنہوں نے اپنی عزیز جانیں وطن پر نثار کی ہیں۔ کیا انگلستان کیا خراسان کیا چین وکیا ترکستان ایسے فرد بیشمار ملینگے جنہوں نے فدائے قوم و وطن کہلا کر اینٹ سے اینٹ بجادی اور آیندہ نسلوں کے لئے اس حمیت و حریت کی ایسی مثالیں چھوڑیں جو ابدالآباد تک زندہ رہینگی۔ پاک نفس تھے وہ لوگ جنہوں نے بتلا دیا کہ آخر مرنا ہے تو پھر کیوں اسکا اچھا مصرف نہو اور وطن کی حمایت میں کیوں نہ قربان ہو جاویں۔ پاک ہے وہ ذات جسکا طائر روح وطن وطن کہتے اِس قفس عنصری سے پرواز کر جائے مبارک ہیں وہ لوگ جن میں ایسے فرد موجود ہوں۔ مبارک ہے وہ قوم جسکا کلمہ یہ ہو جان گو عزیز لیکن آخر جانیوالی اسی پر آنیوالی نسلیں کاربند رہیں

اور یہی شعار قوم رہا۔ انسان تو انسان کیا چرند کیا پرند جب کبھی اس مصیبت میں
آجاتے ہیں تو کیسے جینے سے بیزار نظر آتے ہیں بلبل مشت پر ملک سے وطن
سے اور اپنوں سے جدا جب کبھی کنج قفس میں مقید ہوتی ہے اپنا ترانہ ہی بھولجاتی
ہے۔ وہ سما کوئی دیکھے بہار کا موسم درختوں کا جھنڈ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ گویا کسی
نے فرش مخملین بچھا دیا ہے۔ جہاں گل وہاں بلبل دیکھو ترانہ و سنج میں عالم محویت
میں اوراق گل پریشاں کر رہی ہے گویا یہ کہتی ہوئی "خار وطن از سنبل و ریحاں
خوشتر" اور کئی شان خدائی کے محو تماشائی ایک اہتزاری رقص کیساتھ خراماں
خراماں پرند تو پرند درخت ہی جب کبھی اپنے مرکز اصلی سے ہل جاتے ہیں
سوکھ سوکھ جاتے ہیں گویا اس غم نے سنبھلنے نہ دیا۔ اشرف المخلوقات
سے لیکر اوس چیز تک جو حس رکھنے والی ہے یہی رغبت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے
مانا کہ دولت نہیں مانا کہ حیثیت نہیں وہ جاہ و تمکنت نہیں کچھ نہیں نہ سہی
پھر بھی وطن اور اوسکے دل خوشکن نظارے محو حیرت کیئے دیتے ہیں۔
غم اور اس درجہ کا غم بھلا کون سہ سکتا ہے لیکن یہ عالم محویت جو اپنے ساتھ
سرور لیئے ہوئے ہے گو بادہ عشرت سے مخمور تھیں لیکن نشۂ الفت سے
چور ضرور ہے۔ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں سب کچھ رکھتے ہیں۔ پھر بھی کچھ
نہیں رکھتے۔ وطن کا خیال آتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے ایک
زمانہ تھا کہ ہم بھی اپنے وطن میں تھے فطرتی اصول کے بموجب خیالات
چکر لگاتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ یہ کیا! روتے کیوں ہو؟
مظلوم نہیں جانتا کہ رونے سے کچھ حاصل نہیں۔ دشت نوردی رہیگی۔ اور کچھ
دن اور رہیگی۔ سونیکی آواز کوئی شخص پکار پکار کر روتا ہے۔ وطن۔ وطن کا
غم اور اسقدر غم ہوش کی دوا کھاؤ کہیں وطن کے لیئے بھی اسقدر جان کھوتے

ہیں۔ اسوقت مغنی ناداں نہیں جانتا کہ خود ہی وطن وطن عزیز عزیز کہتے پھوٹ پھوٹ رویا کرتا تھا۔ سچ ہے وطن کا داغ بُری بلا ہے۔

تری دوری مورد آلام
ترے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

جب وطن کی الفت بدرجہ غایت ہر کس و ناکس میں پائی جاتی ہو بھلا کون ایسا شخص ہوگا جسکو وطن کی یاد نہ ستاتی ہو۔ مرد نہیں ہے وہ شخص جو اس صنعت سے مبرا ہے قابل نفرین ہے وہ شخص جو اس زمرہ سے مبرا ہے دیکھو بھولے سے بھی کبھی اوسکے گرد نہ پھٹکنا کہیں صحبت بد کا اثر نہ ہو اور جب اوسکی روح اور گندی روح عالم اسفل کو عود کرے اوس جسد ناپاک کو پیوند خاک نہ کرنا۔ کیوں؟ جسمیں حب وطن نہیں قابل دفن نہیں

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

زمانہ کروٹ بدلتا ہے۔ کچھ لوگ اس سرزمین سے الگ رہتے ہیں مگر وہ بھی وطن کا خیال دل میں آتے ہی بے آب کی طرح تڑپ جاتے ہیں آنکھیں کھلتی ہیں جستجو بڑھتی ہے حقیقت کی طرف لو لگاتے ہیں لیکن حقیقت وہ حقیقت جسکو قدرت نے خود پوشیدہ رکھا۔ بھلا اوس سے کہاں آشنا اور ابھی کوسوں دور منزل کٹھن راہ کانٹوں بھری گھبرا کر کچھ کا کچھ کہدیا اسمیں شک نہیں کیا دکن کیا ختن کیا عرب کیا عجم محمد مہدی

حضور کا مزار

پاک ہے وہ زمین جس میں یہ نور کا پتلا پیدا ہوا ہو۔ رحمت ہے خدا کی اوس قطعہ پر جہانکہ یہ مقدس انسان آرام کی نیند سوتا ہے۔

تجھے شمع جمال خدا نے کیا مجھے عہد تنگ کا اوسنے دیا
پھر بزم پھریں میں جو گردتے نہ فنا ہو نہ شرم وحیا ہے

کیوں نہو وہ شان کبریائی وہ محبوب الٰہی جسکا وجود اس عالم وجود وشہود کا بانی ہوا۔ ملک کیسا ملک عرب کا ملک مقام کیسا مقام آقا کا مقام پھر کیوں جی نہ لگے۔ ہر چیز اپنے ماخذ اپنے چیز اصلی اپنے نقطہ کشش سے کبھی نہ کبھی ملجانیوالی ہے۔ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

دنیا یہ دنیا یہ دنیائے دوں ایک مسافر خانہ ہے تو پھر کیوں گوشہ کیسا گوشہ محبوب کا گوشہ اپنا قیامگاہ نہو۔ اس دنیا میں سدا رہنے والے نہیں وطن اصلی کی طرف پھر عود کرنیوالے۔ غافل ہیں وہ لوگ جو جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں کرتے جاہل ہیں وہ لوگ جو یہیں کے ہو رہنے کا یقین کرتے ہوں۔

بد و نیک جہاں چو در گذر است
در گذر از جہاں کہ چیزے نیست

رہروانِ صراط مستقیم نے جب اس بے ثباتی دنیا کو بچشم داد دیکھا تو یہ سمجھکر

نزمی است کہ وا ماندہ صد جمشید است
قصر یست کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

اس سے کنارہ کش ہوئے گوشہ عزلت میں قدم رکھا۔ قناعت کا دروازہ کھلا تھا اقبال کا ستارہ پیشانی پر عیاں تھا چندروزہ زندگی اسیطرح یاد میں

بسر کردی۔ عارف اوڑھے اطاعت پر کمر باندھی سر تسلیم خم کیا مولا کی یاد دلیں اور ہُو کا نعرہ زبان پر جب تک جے، یہی حال رہا اور جب مرے دنیا نے بھی خوب جی کھولکر قدر کی آج اونکا نام دنیا میں ڈنکے کی چوٹ مشہور ہے یہ تھے پاک نفس یہ تھے پاک ذات لیکن غلام وہ غلام محمدؐ کا غلام بھلا ان باتوں کی کہاں سدہ بدہ ہے۔

از باد صبا دلم چو بوئے تو گرفت مارا بگذاشت جستجوئے تو گرفت
اکنوں ز منش ہیچ نمی آید باد بوئے تو گرفتہ بود خوئے تو گرفت

ظاہری اسباب مانع دشت نوردی ہوتے ہیں۔ دنیوی تعلقات پا بہ زنجیر کیے لیتے ہیں لیکن جو رند ہیں وُہ کہاں کسی کے پابند ہیں۔

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

چاہے ہندوستان ہو یا ترکستان خراساں ہو یا ماژندران جب کہ

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
جبکہ اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ان تعلقات کو مدتیں ہوئی ہم نے چھوڑا سوائے ہے اور کیسی ہوس! یہی ندا ہمارے گوش گذار ہے اور یہی صدا ہمارے زبان سے جاری

ہاں کھا یو مت قریب ہستی
ہر چند کہیں ہے یا نہیں ہے

"غلام محمد ابو الحسن حیدر آبادی"

لوئی پاسٹر

فرانس کا مشہور محسن انسان سائنس داں

کسولی اور ہندوستان کے بعض دیگر مقامات کے ہسپتالوں کا نام (جن کو پاسٹر انسٹیوٹ“ کہتے ہیں اور جہاں سگ گزیدگاں کا علاج تقریباً صد فی صدی کامیابی کے ساتھ ہوتا ہے) اکثر بہنوں نے سنا ہوگا لیکن ان ہسپتالوں کی وجہ تسمیہ شاذونادر ہی لوگوں کو معلوم ہوگی۔

بقول نامہ نگار ہمارا یورپ کے سب سے بڑے خلیج فرانس کے بادشاہ نپولین بونا پارٹ کی فوج میں ایک بہادر سپاہی بنام لوئی پاسٹر تھا۔

جب آخر نپولین اکیلا سارے یورپ کے برخلاف لڑتا ہوا گرفتار ہوگیا تو لوئی پاسٹر کا روزگار چھن گیا پس پاسٹر فرانس کے شہر ڈول میں چلا گیا اور وہاں چمڑا صاف کرنے کی دوکان کھولی۔ پاسٹر کی بیوی بڑی خوبصورت اور عقلمند تھی ۱۸۲۲ء میں لڑکی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی انہوں نے اس کے باپ کی طرح لوئی پاسٹر رکھدیا۔ پہلے ایک کوئی پاسٹر تھا اب دو ہوگئے۔ اس لڑکے نے جو کام کئے وہ ہمیشہ فرانس کی تاریخ میں ہیروں اور جواہرات کی طرح چمکتے رہیں گے۔

جب یہ چھوٹا لوئی ذرا سیانا ہوگیا اس کے والدین نے اسکو اسکول میں بٹھا دیا۔ اگرچہ بیچارے غریب تھے تاہم جس طرح ہوسکا اس کی فیس ادا کرتے رہے مگر بچپن میں لوئی کو کھیل کود کا بڑا شوق تھا اور فرصت کے

وقت میں وہ تصویریں بنایا کرتا لیکن ایک دن جب لوئی کو معلوم ہوا کہ اس
کے والدین بڑی مشکل سے اس کی فیس ادا کرتے ہیں اور بڑے غریب ہیں تو
لوئی نے دل لگا کر مختلف ترقی شروع کر دی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات
جب لوئی کے استاد نے سنا کہ اس کا باپ اس کو پروفیسر بنانا چاہتا ہے
تو اس نے لوئی سے کہا لوئی تو بڑا ذہین لڑکا ہے میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تو
ایک نہ ایک دن پیرس کی یونیورسٹی میں پروفیسر بن کر رہے گا۔ لوئی کو علم کیمیا
کیمسٹری کا بڑا شوق تھا پس جب وہ اس چھوٹے اسکول میں اپنی تعلیم ختم کر چکا
تو ایک بڑے اسکول میں داخل ہو گیا اور علم کیمیا گری میں بڑے تجربے حاصل
کرنے لگا اور استاد سے اس قدر سوالات پوچھنے لگا کہ استاد دنگ رہ گیا
اور کہنے لگا یہ سوال مجھے تم سے پوچھنے چاہئیں نہ کہ تم مجھ سے بات یہ تھی
کہ لوئی اپنے استاد سے بھی زیادہ سیکھ گیا تھا اور فرصت کے وقت میں
وہ ایک کیمیا گر کی دوکان پر جا کر سبق عملی لینے لگا تھا۔

جب امتحان ہوا تو پاسٹر سب میں چودھویں نمبر پر رہا لوئی پاسٹر چونکہ
سمجھتا تھا کہ میں اول نکلوں گا اس لیے وہ بہت اداس ہوا مگر خیر اگلے سال
پھر امتحان ہوا اور اس کا نمبر چوتھا تھا اب لوئی پاسٹر ماں باپ سے اجازت
لیکر پیرس کی مشہور یونیورسٹی میں شامل ہوا یہاں پروفیسر ڈیوما کو لوئی کی لیاقت
دیکھکر اس سے محبت ہو گئی اور وہ بڑے شوق سے اسے کیمیا گری کے راز
سکھانے لگا اس یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے ثابت کیا تھا کہ جب
گرمی ہوتا ہے تو اسکی کرنیں دائیں ہاتھ کو جاتی ہیں لوئی پاسٹر نے کہا کہ میں
ثابت کر سکتا ہوں کہ کرسٹل کی کرنیں بائیں ہاتھ کو بھی جاتی ہیں کسی نے پاسٹر کی
بات پر اعتبار نہ کیا اور سب نے قہقہہ لگایا۔ مگر جب پاسٹر نے یہ ثابت کر دکھایا

تو پروفیسر کا بدن جوش سے کانپنے لگا اور نہایت پیار سے اسنے پاسٹر سے کہا۔ میرے پیارے بچے مجھے سائنس سے اتنی الفت ہے کہ میرا دل خوشی سے اُچھل رہا ہے۔

اس طرح تجربے کرتے کرتے پاسٹر آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ مختلف رقیق چیزوں (مثلاً شراب ۔ دودھ ۔ عرق وغیرہ) میں جو کیڑے پڑ جاتے ہیں وہ ان میں خود بخود پیدا نہیں ہوجاتے کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ البتہ ہوا میں کڑوڑوں چھوٹے چھوٹے کیڑے ہیں۔ جو رقیق چیزوں میں گر پڑتے ہیں اور جلد جلد بچے پیدا کرکے تعداد میں بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کیڑے اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ بغیر خوردبین کے دکھائی نہیں دیتے پاسٹر نے اپنے دعویٰ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ اگر تم دودھ کو صاف بوتل میں اس طرح بند کردو کہ وہاں ہوا نہ پہونچ سکے تو اس میں ہرگز کیڑے نہیں پیدا ہوں گے نہ دودھ ترش ہوگا اگرچہ یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر لوئی پاسٹر کے وقت کے لوگ ایسا نہیں خیال کرتے تھے۔

اس دریافت سے لوئی پاسٹر کا نام ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب لوگ دودھ شراب ۔ سرکہ ۔ اچار وغیرہ چیزوں کو سڑنے سے بچانے کے لئے اُن کو ڈھک کر رکھنے لگے تاکہ ہوا داخل نہو اور ہوا کے جرم و کیڑے اُن کے اندر نہ جاسکیں پھل پھول کو بھی کاغذ میں لپیٹ کر رکھنے لگے تاکہ سب سڑ نہ جائیں۔

جب مشہور انگریز ڈاکٹر لارڈ لسٹو نے اخبار میں پاسٹر کی اس دریافت کا حال پڑھا تو اس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور ہے کہ زخموں کو ڈھک کر رکھنے سے کسی قسم کی خارش نہو گی کیونکہ خارش کا سبب

کیڑے ہوئے ہونگے جو ہوا میں سے گر پڑتے ہیں یہ بات ٹھیک ہوئی اور اس سے پاسٹر کی شہرت اور بھی پھیل گئی سب لوگ اب زخم کو ہوا لگنے سے بچانے لگے جس سے زخمی جلد جلد اچھے ہونے لگے۔ ڈاکٹر اب جسم کے ہر حصہ میں اپریشن عمل جراحی اس طرح کرنے لگے کہ زخم کو ہوا نہ لگے۔ جس طرح پاسٹر سے پہلے تجربہ کو دیکھکر پیرس کا پروفیسر اُچھلنے لگا تھا پاسٹر کی اس دریافت کو دیکھکر سارے یورپ میں خوشی دل سے اُچھلنے لگے جب لارڈ اسٹر کو اس میں کامیابی ہوئی تو اس نے پاسٹر کا نام انگلستان میں چاروں طرف مشہور کر دیا۔

پاسٹر رات دن اس قدر تجربات میں مشغول رہتا تھا کہ جب اس کی شادی کا دن آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ پاسٹر برابر تجربے کر رہا ہے اس کے دوستوں نے کہا کہ دولہن گرجا میں معہ اپنے والدین اور پادری کے آپ کے انتظار میں ہیں اسٹھے اور دولہابن کر دلہن کو لے آئے۔ پاسٹر دلہن کو گھر لایا اسکی بیوی بڑی لایق عورت تھی اُس نے پاسٹر کا خوب ہاتھ بٹایا اور ہر طرح سے عام کیمیاگری کی تحقیقات میں اسے مدد دی۔ اس طرح چند سال گذر گئے تھے کہ پاسٹر ۴۵ برس کا ہوگیا۔ اس وقت اسے پیرس کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا اگرچہ اس سے پہلے پاسٹر کئی چھوٹی چھوٹی یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہ چکا تھا۔ مگر پیرس کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں پروفیسر بننا بڑی عزت کا کام تھا!

اس زمانہ میں سارے یورپ میں ریشم کی تجارت صرف فرانس کے ہاتھ میں تھی۔ اتفاق سے ریشم کے کیڑوں میں بیماری پھیل گئی۔ جس سے کیڑے بڑی تعداد میں مرنے لگے لوگوں نے پاسٹر سے التجا کی کہ تحقیقات

کرکے اُن کو بتائے کہ ریشم کے کیڑے کیوں مرتے ہیں اور ان کو کس طرح بچایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ساری عمر میں پاسٹر نے کبھی ریشم کا کیڑا نہ دیکھا تھا مگر اپنے اہل وطن کے فائدے کی خاطر اس نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینا منظور کیا۔ اس نے تحقیقات شروع کی کہ کیڑوں کا معائنہ کیا ان کے انڈوں کو کاٹ کر خوردبین سے دیکھا اور آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ ریشم کے ان کیڑوں سے جو بیمار ہوں اُن سے تندرست کیڑوں کو بیماری لگ جاتی ہے پس اگر وہ ایک دوسرے کو چھو جائیں یا اس پتے کو چھو جائیں جہاں بیمار کیڑا بیٹھا ہو تو وہ بیمار ہو جاتے ہیں اس کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن کیڑوں کو بیماری تھی اُن کے انڈوں کو ضائع کر دیا گیا۔ اور تندرست کیڑوں کو الگ رکھا گیا ایسا کرنے سے ریشم کے کیڑوں کی جان بچ گئی اس طرح پاسٹر نے فرانس کی ریشم کی تجارت کو (جس سے فرانس کو کروروں روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے) غارت ہونے سے بچا لیا۔

پچھلی صدی تک یوروپ میں یہ بات کوئی نہ جانتا تھا کہ بیماریاں ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہیں۔

پاسٹر نے ثابت کیا کہ بغیر جراثیم (چھوٹے چھوٹے نہ دکھائی دینے والے کیڑے) کے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ پلیگ ہیضہ۔ ملیریا۔ زکام۔ غرض ہر بیماری کا سبب جراثیم ہی ہیں۔ پاسٹر کی جرم تھوڑی اس قدر مشہور ہوئی کہ اب دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچہ بچہ اس کو جانتا ہے اور ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آنے والے زمانہ میں لوگ ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کی بجائے کہ آپ کو کیا بیماری ہے یہ پوچھا کریں گے کہ آپ کو کس قسم کے جراثیم ستاتے ہیں۔

پاسٹر کہا کرتا تھا کہ چونکہ سب بیماریاں جسم میں جراثیم پیدا کرتے ہیں اس لئے
اگر ہم بدن سے وہ چیز نکالدیں جسکو کھا کر بڑھتے ہیں تو ہم صحتیاب ہو سکتے ہیں
کیونکہ جراثیم بھوکے مرجائیں گے۔ چنانچہ یورپ میں ایک قسم کا بخار پایا جاتا تھا
جو نہایت مہلک تھا اور جس کو انثرکس کہتے تھے پاسٹر نے انثرکس وہیضہ
کو یورپ میں ہمیشہ کے لئے کچل دیا۔ اس نے یہ ترکیب نکالی کہ طرح طرح کی
بیماریوں کے کیڑے پالے مگر خاص ترکیبوں سے اُن کو ایسا کمزور بنایا کہ وہ
انسان کو ضرر نہ پہونچائیں۔ فرض کرو کسی شخص کو ہیضہ ہوگیا۔ فوراً پاسٹر نے اس
کے جسم میں ٹیکہ لگا کر تھوڑے پالے ہوئے جراثیم داخل کردیئے۔ پلے ہوئے
جراثیم اس قسم کی تمام خوراک کو کھا گئے جن کے ہیضہ کے جراثیم کو ضرورت
تھی۔ اس سے ہیضہ کے جرم بھوکے مرگئے اور وہ آدمی جس کو ہیضہ ہوگیا
تھا بچ گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد پیرس میں چند بچے کھیل رہے تھے اتنے میں اُنھوں نے
ایک خطرناک دیوانے بھیڑیئے کو آتے دیکھا دیوانہ بھیڑیا ان کا صفایا کر دیتا
مگر ایک بہادر لڑکا مسمی جین جوبل بھیڑیئے پر جھپٹ پڑا اور اس کا منہ پکڑ کر اپنا
رومال اس کی گردن میں ڈال کر اوس کا گلا گھونٹ دیا۔ مگر پیشتر مرنے کے
بھیڑیئے نے اس بہادر لڑکے کو کاٹ کھایا جب پاسٹر نے یہ حال سنا تو وہ
دوڑا ہوا آیا اور خاص قسم کے جراثیم لڑکے کے خون میں داخل کرکے اس کی
جان بچائی اس طریقہ سے پاسٹر اب نہ صرف ان لوگوں کا علاج کرنے لگا
ان کو کسی دیوانہ کتے نے کاٹا ہوتا تھا بلکہ دیوانہ کتوں کا بھی علاج کرنے لگا
اس سے پاسٹر کی شہرت اور بھی بڑھ گئی اور ساری دنیا سے لوگ پاسٹر سے
علم سیکھنے پیرس آنے لگے ہندوستان میں بمقام کسولی (متصل شملہ) جو دیوانہ

کتوں کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے وہ پاسٹر کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔

پیرس کے لوگوں نے روپیہ جمع کر کے پاسٹر کے خیالات سکھانے کے لئے ایک بڑا بھاری اسپتال قایم کیا۔ روس کے بادشاہ نے بھی سات ہزار روپیہ چندہ بھیجا۔ ایک فرانسیسی امیر نے مرتے وقت اپنے دو کروڑ روپیہ کی جائداد پاسٹر کے نام کر دی جس سے پیرس میں پاسٹر انسٹیٹیوٹ بنائی گئی جہاں ہر ملک سے طلبہ علم حاصل کرنے آتے ہیں اسپتال کے سامنے جین جوپل کا بت بنا کر لگایا کیونکہ اسنے بہادری سے بچوں کو بھیڑیے سے بچایا تھا اس بت میں جین جوپل اور بھیڑیے کو بالکل اسی طرح کرتے دکھایا گیا ہے جس طرح دراصل واقع ہوا تھا۔

۱۸۹۵ء میں آخر پاسٹر علم جاودانی کو سدھارا۔ اگرچہ پاسٹر کا جسم پاسٹر انسٹیوٹ کے ایک مقبرے میں دفن ہے مگر پاسٹر کا علم ساری دنیا میں جلوہ فگن ہے اور جین جوپل جس نے بھیڑیئے کا گلا گھونٹا تھا اور جس کا علاج پاسٹر نے کیا تھا ابھی زندہ ہے اور بنارس میں پاسٹر کی قبر اور انسٹیوٹ کی حفاظت پر مقرر ہے۔

پاسٹر کے علم کی مدد سے دنیا کے تمام ملکوں سے ہیضہ و ملیریا اور چیچک وغیرہ بیماریاں دور کر دی گئی ہیں یہ بیماریاں اب ہندوستان میں پائی جاتی ہیں کیونکہ ہندوستان کے نوجوان سائنس نہیں سیکھتے۔ خدا نے ہمیں عقل سلیم دی تو اس لئے اپنا اور اپنی نوع انسان کا فائدہ کریں۔ نہ اس لئے کہ استعمال ہی نہ کریں۔ پیاری بہنوں۔ تم بھی علم حاصل کر کے اپنے پیارے اہل وطن کو بیماریوں سے نجات دو۔

فیثاغورس

پیدایش سنہ ۵۸۰ء قبل مسیح۔ وفات سنہ ۵۰۰ قبل مسیح

ساموس جزایر یونان میں سے ۲۱۳ میل مربع کا ایک سرسبز جزیرہ ہے۔ جسکو ایک تنگ خلیج نے ایشیائے کوچک سے جُدا کر دیا ہے، اُسمیں بلند بلند پہاڑ ہیں، جنکی چوٹیوں پر نہایت عمدہ پھلدار درخت ہیں۔ ارخبیل کے تمام جزائر میں اپنی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے ممتاز ہے اسی جزیرے میں یونان کا نہایت مشہور فلسفی فیثاغورس چھٹی صدی قبل حضرت عیسیٰ کے پیدا ہوا اور اسی صدی میں کنفیوشس چینی فلاسفر بھی پیدا ہوا تھا۔ یہ دونوں فلاسفر ایک زمانے میں پیدا ہوئے۔ اور باوجود یکہ ان کے مولد و مسکن میں ہزارہا میل کا فاصلہ ہے مگر ان کے اعمال ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔

فیثاغورس سنہ ۵۸۰ قبل مسیح میں کنفیوشس سے ۴۰ سال قبل جزیرہ ساموس متذکرہ بالا میں پیدا ہوا۔ اُسی جزیرہ میں اُسکا زمانہ طفولیت بسر ہوا اور ابتدائی علوم کریوفیلوس سے (جو اُس زمانہ کا عالم تھا) حاصل کئے۔ پھر جزیرہ اسکیردس میں گیا اور حکیم فریسیدس سے (جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ اوّل وہ شخص ہے جسنے علوم طبعی میں کتاب تصنیف کی، اور جو روح کے قیام کا قائل تھا) فلسفہ حاصل کیا، حکیم موصوف اُس سے بنہایت درجہ محبت رکھتا تھا حتیٰ کہ اُسکو اپنا متبنّےٰ بنالیا۔

اُسکے انتقال کے بعد فیثاغورس نے حکیم طالیس ریاضی دان سے (جو یونانی فلاسفروں کا ابو الآبا کہا جاتا ہے اور جو پانی کو اصل ہر چیز کی بتاتا ہے) تعلیم حاصل کی

فیثاغوس کو فلسفہ کا غایت درجہ شوق تھا، اُسکے حاصل کرنے کے شوق میں
اُسنے بڑے بڑے سفر اختیار کیے۔ اوّل فینیقیہ میں پہونچا اور وہاں کاہنوں سے
بلکہ جزوِ اعظم اُن سے علوم کا حاصل کیا۔ اُس زمانے میں وہاں جمعیۃ الکبرےٰ
کے نام سے ایک انجمن قائم تھی۔ اُس میں داخل ہُوا اور اُس کے تمام اسرار
سے واقفیت حاصل کی۔ پھر تمام بلاد شام کا سفر کیا اُسکے تمام مذہبی رسوم و علوم
سے آگاہی حاصل کرکے یہود کی سرزمین میں پہونچا۔ اُن میں ایک مخفی انجمن تھی
جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش تک قائم رہی، اُس میں شامل ہوا۔
اِس سے بھی اُسکی علمی پیاس نہ بجھی، اور شوقِ تحصیل علم پُورا نہوا، تو مصر کا قصد
کیا، امسیس کا زمانہ تھا جسمیں بدوں سخت محنت اور جانکاہی اور کسی بادشاہ یا
امیر کے توسُّط کے تحصیل علم ناممکن تھی اسلئے اپنے وطن ساموس کو واپس گیا
اور وہاں کے بادشاہ کو لیکر اُس سے تقرّب پیدا کرکے امسیس پادشاہ مصر کے
نام خط لکھا لیا، اُسپر اُسکو علوم حاصل کرنیکی اجازت دی گئی۔ مصر میں اُن کے
دیوتا کے نام پر ایک انجمن ایزیس سیریہ کے نام سے قائم تھی اُس میں داخل ہوکر
تمام اسرار اور علوم سے واقفیت پیدا کی، مگر پھر بھی طلبِ علم کا شوق کم نہوا
اور وہاں سے ہندوستان کا رُخ کیا۔ یہاں پہونچکر جوگی فقیروں کے گروہ میں
شامل ہوگیا، جو برہنہ زندگی بسر کرتے ہیں اور جسمانی تکالیف کی پرواہ نہیں کرتے
اُن کی تعلیمات حاصل کرکے کلدانیوں میں گیا اور پارسیوں سے علوم حاصل کیے
وہاں سے کریٹ پہونچکر وہاں کے کاہنوں سے بلا وہ اُس کے ساتھ نہایت
عزت اور احترام سے پیش آئے اور اُسکو اپدا کے متبرک غاروں میں جنکی
نسبت اُنکا خیال تھا کہ جوبیٹر کو علوم و فنون انھیں غاروں سے حاصل ہوئے
ہیں، داخل ہونے کی اجازت دی، وہاں پر حکیم اپی مینیدس سے دیوتاؤں کے

سب سے بڑے حکماء سبعہ میں داخل ہے، ملاقات ہوئی اور اُسنے فیثا غورس کو فلسفۂ یونانی کی تلقین کی۔ کریٹ سے اسپارٹا گیا اور وہاں کے حاکم لیون سے ملا اُسنے دریافت کیا کہ تم کون ہو اُسنے کہا کہ میں فیلسوف یعنی محب علم حکمت ہوں یہی لفظ فیلسوف عربی میں رائج ہُوا۔ اسوقت تک تمام فلاسفر اپنے آپ کو حکماء کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، فیثا غورس نے تواضعاً یہ لقب اختیار کیا اور وہ پہلا شخص ہے جو فیلسوف کے نام سے ملقب ہوا۔

تعلیمات فیثا غورس | جب فیثا غورس اپنے زمانے کے تمام علوم سے واقفیت اور آگاہی حاصل کر چکا تو اپنے وطن اصلی سامُوس میں واپس آیا اور مدرسہ ساموس کے نام سے ایک اسکول جاری کیا جسمیں اپنی تعلیمات کو مزید طریقہ پر پھیلانا شروع کیا مگر اُسکا مقصد صرف تعلیم و تعلّم ہی نہیں تھا بلکہ کسیقدر پولٹیکل پہلو بھی لئے ہوئے تھا اُسکو قوت اور شوکت حاصل کرنیکا بھی خیال تھا اسلئے ساموس میں اُس کے مقاصد پورے نہوئے، تو وہاں سے یونان اعظم کے شہر کروتونہ میں چلا گیا اور وہاں ایک مخفی انجمن جمہوری اُصول پر پولٹیکل گروہ طیار کرنے کے لئے اُسی طریقے پر قائم کی جو اُس زمانے میں رائج تھا اُسکے قوانین ہمارے زمانے کے سوشیالسٹ فرقہ سے بہت مشابہ تھے۔ اُسکی پہلی شرط یہ تھی کہ اُسکے تمام ممبروں کی املاک اور جائداد مشترک ہوگی اور سب برابر خرچ کرنے کے مجاز ہونگے۔ اس گروہ میں سوائے شرفا کے اور کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا اسلئے کروتونہ کے عمائد اکثر اُس میں شامل ہو گئے اور پہلے بہت سخت امتحان سلئے بدون کسیکو اپنے گروہ میں شامل نہیں کرتے تھے۔ اُسکے ممبروں کے لئے ضرور تھا کہ تمام لذاتِ دنیوی سے بالکل انقطاع کرکے زہد اور پرہیزگاری اختیار کریں۔ اکثر لوگ کئی کئی سال تک خاموش رہنا اپنے اوپر لازم کر لیتے تھے

جو شخص اس گروہ میں داخل ہوجاتا اور امتحانات کی شدت اور قوانین کی سختی سے گھبراکر شکایت کرتا تو اُسکو اجازت دیجاتی تھی کہ اپنا مال و متاع لیکر چلا جائے اور کوئی شخص اُس سے کچھ تعرض نہیں کرتا تھا۔

جب کوئی ممبر تمام امتحانات میں کامیاب ہوکر امتیاز حاصل کرلیتا تو اُسکو اسرارِ انجمن سے واقفیت حاصل کرنے اور علوم طبعی اور روحانیات اور ادبیات اور سیاستِ مدن وغیرہ کے تحصیل کرنے کی اجازت ہوتی تھی اور جب ان علوم میں مہارت حاصل کرلیتا تو انجمن کے کاموں پر گردونواح میں مقرر کیا جاتا تھا اور جابجا اسلیئے روانہ کیا جاتا تھا کہ دیگر بلادِ یونان میں انجمن کی تعلیمات کو شہرت دے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس انجمن کے قائم کرنے کی اصلی غرض یہ تھی کہ اُن تمدنی اُصول اور اجتماعی تعلقات کو عالم میں مشتہر کرے جن سے عقلونکی صفائی اور جلا ہوکر حق کے قبول کرنے اور انصاف کے اختیار کرنے کی اُن میں قابلیت پیدا ہوجائے۔ اسکے تمام ممبر اپنے اہل و عیال سمیت قریب قریب اور ہمشکل مکانات میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ سب صبح کو جمع ہوتے تھے کہ تمام دن میں کرنیکے کاموں کو متعین کریں اور شام کو اُن تمام اعمال پر نظر کرتے تھے۔ صبح کو سب سے اول نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے تھے اور پھر ہومر وغیرہ شعرای یونان کے اشعار پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ان اشعار کو آلاتِ موسیقی پر بھی گاتے تھے کہ اُس سے عقل کی ریاضت ہوتی ہے اور دوسرے کاموں کو عمدہ طور سے انجام دینے کی اُسکو قدرت اور ہمت ہوجاتی ہے اُسکے بعد انجمن کے کاموں میں شغل درس تدریس و بحث و مباحثۂ علمی سے مشغول رہتے، اور کسی قدر آرام لیکر ریاضت جسمانی کرتے تاکہ جسم میں چستی اور چالاکی پیدا ہوجائے، پھر صبح کا کھانا کھاتے،

جسمیں اکثر روٹی شہد اور پانی ہوتا تھا، اور بقیہ دن بھی علمی مشاغل اور دوسرے کاموں میں بسر کرتے۔

اس انجمن کے قائم ہونے سے پہلے تمام یونانی اقوام جہالت کی تاریکی اور لہو و لعب وغیرہ وغیرہ میں منہمک رہتے تھے اور فتنہ و فساد اور ظلم و ستم کا بازار اُن میں گرم رہتا تھا۔ اس انجمن کے قائم ہونے اور اُسکی تعلیمات کے رائج ہونے کے بعد یہ تمام معائب فرحت و انبساط، عدل، استقلال، علم فضیلت سے بدل گئے۔ تمام ملک میں امن ہوگیا، علم و ادب تمام ملک میں پھیلگیا، اور یونانی قوم سعادت اور فلاح سے متمتع ہونے لگی۔

لیکن اس انجمن کی عمر کچھ زیادہ نہوئی اسلئے اسکی ترکیب جمہوری طریقے کی تھی، اور سیاسی پہلو لئے ہوئے تھی، اور اکثر اسکے ممبر شرفا میں سے تھے اسلئے ارسطو قراسی گروہ بدظن ہوکر مقابلہ پر کھڑا ہوگیا اُسکے ایک شخص نے اس گروہ میں شامل ہونا چاہا، مگر اسکو شامل نہ کیا گیا، تو تمام گروہ برافروختہ ہوگیا اور مکانِ انجمن کو توڑنا پڑا اور اُسکے تمام ممبر منتشر ہوگئے۔

مگر اُسکے ممبروں کا پراگندہ ہونا فیثاغورس کی تعلیمات کے عام ہوجانیکا سبب ہوگیا۔ ہر ممبر جس جگہ جاتا تھا مدارس اور انجمنیں قائم کرتا اور فیثاغورس کی تعلیم کو رواج دیتا تھا، حتیٰ کہ صدیوں تک اُسکی تعلیمات عالم میں رائج رہیں

فیثاغورس نے اپنی عمر کا آخری حصہ نہایت جد و جہد سے اپنی تعلیمات کے شائع کرنے میں صرف کیا۔ اور اُس میں بڑی مشقتیں اور محنتیں برداشت کیں۔ بسا اوقات ذلت و توہین بلکہ قتل کا کھٹکا لگا رہتا تھا اسلئے کہ اُسکی تعلیم تمام قوم کے اعتقادات اور اوہام رائجہ کے خلاف تھی۔

نچہ لوگ نیک خصال کی طرف جاتے باقی بدافعال کی طرف اسکی زرق برق پوشاک اور سج دھج پر جاتے۔ خبر نہیں اسکی آنکھوں میں کس بلا کا جادو تھا کہ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی مملکت تنزل کی راہ لیتے۔ یہاں قریب ہی نیک خصال کے مشیر مسٹر ضمیر نامی کھڑے ستے لوگوں کو اس طرف جاتا دیکھکر باآواز کہنے لگے صاحبو! اس راہ کو چھوڑئے اول منزل عیش سے گزر ہوگا۔ عیش ثقہ بدمعاش ہے۔ دیکھئے پچھتائیگا لیکن طوطی کی آواز سنتا ہی کون ہے کہتے کہتے لوگ منزل عیش میں جا داخل ہوئے۔ حضرت عیش ہر ایک سے بہت تپاک سے پیش آئے۔ از حد بے تکلف ہوکر ملے گویا یہ انکے ہمدم دیرینہ تھے یا برسوں کی ملاقات تھی۔ دعوت کے لوازمات کے علاوہ دوستوں کے جمگھٹے راگ رنگ شراب کباب غرض جملہ سامان نشاط پہلے سے موجود تھا۔ لوگوں نے کچھ عرصہ خوب گلچھرے اڑائے جو کچھ اپنے ساتھ لائے تھے وہ بھی انعام واکرام میں صرف کیا۔

جب تک انکے پاس تار منکا رہا حضرت عیش نے خوب آنکھیں بچھائیں اخیر یہ روز روز کے جلسہ کبتک مہمان ایک دن کے دو دن کے تیسرے دن کے.........

حضرت عیش خود تو آئے نہیں کیونکہ مہمان نوازی کے خلاف تھا ایک خادمہ سی بے مروتی کو بھیجا کر شرم و حیا اس سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔ یہ حقاقہ دقاقہ طوطا چشم ننگی شمشیر گرجتی ہوئی آئی۔ اور آتے ہی ایک ایک کے لتے لے ڈالے اسکا طرز کلام بھی درشت تھا۔ کہنے لگی صاحبو! مہمان داری ہوچکی ہے اب خیر اسی میں ہے کہ اپنا اپنا بدھنا بوریا سنبھال چلتے بنئے۔ لوگ عذر بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ایک تنومند

دیو نی کیچڑ میں لتھڑی بھاڑ سا مونہہ کھولے نمودار ہوئی۔ حلیہ تو اسکا خوبصورت تھا ہی لیکن اسکی پھٹی ہوئی ناک۔ دانتوں کی پھپھوند۔ آنکھوں کے چیپڑ اسکے حسن کو اور بھی چار چاند لگا رہے تھے۔ اسکے ساتھ مکھیوں کی فوج شمع کے پروانہ کی طرح اسکے چہرہ پر قربان ہو رہی تھی۔ یہ کاہلی کی دیو نی تھی اسنے لوگوں کو گھیر کر ایک آن واحد میں سبکی مشکیں باندھ لیں اور انکو میدان افلاس میں لیجا کر چھوڑ دیا۔ اتنے ہی میں ایک خانہ بدوش مست قلندر ننگا چشم بازاد آخ تھو کی ہر اسے لیتا۔ سامنے آیا اسکے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی فاقوں کا مارا سوکھ کے کانٹا ہو گیا تھا۔ ہاں اسکے گلے میں ایک جھولی بھی تھی یہہ سب عرصہ سے بھوکے تھے جھولی کو دیکھکر اس بے چارہ پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ مگر اسکے پاس کیا رکھا تھا۔ یہہ تو مجسم افلاس اس جگہ کا مالک تھا۔ قریب تھا کہ لوگ اسکی جھولی اُتار لیں کہنے لگا بابا میرے پاس کیا دھرا ہے۔ دیکھو سامنے دریائے حرص ہے اور یہہ جہالت دریا سے پیاس بجھاؤ پہاڑ و نپر سرسبز میوے سے لدے ہوئے درخت ہیں میوے چکھتے ہی سیر ہو جاؤ گے۔

یہہ لوگ اسکے چکمہ میں آکر دریا کے کنارہ پہنچے۔ دریا کا پاٹ بے انتہا چوڑا تھا۔ خوفناک گرداب پڑ رہے تھے ہیبت ناک دریائی جانور جنکو دیکھکر زہرہ آب آب ہوا جاتا تھا سطح آب پر منہ کھولے کھڑے تھے۔ مگر پیٹ کی آگ سب کچھ کراتی ہے امید موہوم کی کشتیوں میں بیٹھکر پار لگنے کی کوشش کرتے۔ اکثر کشتیاں دریا ہی میں غرق ہو جاتی تھیں۔ دریائی جانور انکی تکا بوٹی کر لیتے تھے۔ بہت سے بہزار وقت دریا کو عبور کرنے میں کامیاب ہوتے تھے میوہ دار درختوں کو دیکھکر خوش ہوتے ذوق شوق سے

جلد ۲ ماہ اگست و ستمبر ۱۹۱۵ء نمبر ۸ و ۹

تمدن

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا
مخزن

ایڈیٹر ایم۔ اے قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری
محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ (۳۰ - اکتوبر تک رعایتی قیمت ۓ) فی پرچہ ۴ر

پبلشر محمد عباس حسین قاری (علیگ) قیصر پریس دہلی میں چھپا پرنٹر سید علی قادری

مقام اشاعت دہلی

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے چنانچہ مذکورہ ذیل عبارت پڑھنے سے ناظرین تمدن پر روشن ہو جائیگا کہ ہم نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوا۔ ہم نے رسالہ تمدن کے لکھنؤ میں شایع ہونے کی درخواست ۲۶ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر صاحب لکھنؤ کے اجلاس میں پیش کی تھی اور جب ہی رسالہ لکھنؤ سے چھپنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ ہماری درخواست ۴ اکتوبر تک منظور ہو کر نہ آئی اور اسی وجہ سے رسالہ کے پرنٹر صاحب اس رسالہ کے چھاپنے سے قاصر رہے۔ اس درخواست کے منظور ہونے کی جلد توقع اس وجہ سے منقطع ہو گئی کہ درخواست کو تفتیش کے لئے دہلی بھیجنا قرار پایا کیونکہ جس پریس میں رسالہ چھپنے کا انتظام ہو گیا تھا وہ دہلی میں تھا۔ اس حالت میں ایک صورت تو یہ تھی کہ ہم اس انتظار میں بیٹھے رہتے کہ جس وقت اجازت آجائے گی پرچہ شایع کر دیں گے مگر ہم نے یہ گوارا نہ کیا کہ رسالہ کی اشاعت معرض التوا میں پڑ جائے اور ناظرین تمدن اس کے شایع ہونے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ مکرمی جناب مولوی عبدالراشد صاحب نے جو الفاظ ہمارے متعلق پچھلے رسالہ میں تحریر فرماتے تھے وہ بھی تاخیر نہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے چنانچہ میں نے یہاں آ کر دہلی سے رسالے کے شایع ہونے کی درخواست دی اور لکھنؤ کی درخواست

کو مسترد کیا۔ کیونکہ اس کے بغیر میں دہلی میں منظوری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ شکر ہے
کہ وہ منظور ہوگئی اور ۸ روز کے اندر یہ پرچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

اب جو کچھ کرنا ہے وہ لکھنؤ سے شایع کرنے کی اجازت حاصل کرنی ہے۔ اور جس وقت
وہ درخواست منظور ہوگی اس دن سے رسالہ لکھنؤ سے شایع ہوگا۔ چونکہ ہم رسالے کا
دفتر لکھنؤ میں قایم کر چکے ہیں اس وجہ سے دلّی سے وی پی ان صاحبان کے نام نہیں جا رہا۔
جن کا چندہ ختم ہوگیا۔ بلکہ پرچہ بھیجنے کے بعد کارڈ ان کے نام دفتر رسالہ تمدن لال جھاؤ
لال لکھنؤ سے وی۔ پی بھیجے جائیں گے۔ امید کہ حضرات اسے وصول فرمالیں گے۔

تمام خط و کتابت و ترسیل زر دفتر رسالہ تمدن لال جھاؤ لال لکھنؤ کے پتہ سے
ہونی چاہئے۔

ہم کو اس معاملہ میں حضرات لکھنؤ سے بہت شرمندگی ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اہل
انصاف خود اس بات کا اندازہ کر سکیں گے کہ ہم کس حد تک معذور ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب
تمدن کلی طور پر حضرات لکھنؤ کے سایہ عاطفت میں آجائیگا۔

خاکسار

ایم۔ اے۔ قاری

(دہلی)

"تمدن" کیوں حاضر ہوا ہے؟

یہ رسالہ ان اصحاب کی خدمت میں بھی بھیجا جا رہا ہے جو "تمدن" کی خریداری سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ان صاحبان کو
تعجب ہوگا کہ آخر "تمدن" ان کی خدمت میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ "تمدن" ان اصحاب کی خدمت میں اس غرض سے حاضر
ہوا ہے کہ وہ سابق کی طرح اب پھر اس کی سرپرستی فرمائیں کیونکہ انشاء اللہ اب "تمدن" نہایت باقاعدگی کے ساتھ
شایع ہوگا اور پھر کبھی ان اصحاب کو جو "تمدن" کی خریداری سے اس لیے سبکدوش ہوئے تھے کہ وہ باقاعدہ نہیں نکلتا
کم از کم اس قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ جو اصحاب دوبارہ خریداری چاہینگے انکو پرچہ بذریعہ وی پی ملیگا (ایڈیٹر)

اہل لکھنؤ کو قدرت نے ہمیشہ یہ موقع دیا ہے کہ کوئی لگا لگایا پودا ان کے ہاتھ آ گیا اور انھوں نے جان اور مال سے اسکی آبیاری کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پودے کی تاریخ میں جہاں کہیں اسکے لگانے والوں کا نام آتا ہے وہاں حضرات لکھنؤ کے نام کو بھی بہت ممتاز جگہ ملتی ہے - زبان اُردو دلی میں پیدا ہوئی اور اس وقت جبکہ دلی اُجڑ گئی تھی اُردو کو ترقی کرنے کا جو میدان ملا وہ لکھنؤ تھا - اور جن لوگوں کی نظر کیمیا اثر نے اُردو کو زندہ رکھا بلکہ معراج کمال پر پہنچایا وہ حضرات لکھنؤ ہی تھے کم و بیش اسی طرح آج اسی زبان کا ایک رسالہ "تمدن" جو عم مکرم جناب مولانا عبدالراشد الخیری صاحب کی ایڈیٹری میں دلی سے نکلتا تھا بزرگان لکھنؤ کی فراخ حوصلگی او مہمان نوازی کی توقع پر دلی سے لکھنؤ آتا ہے - یہ یاد دلانا بے سود ہوگا کہ یہی

زبان کا ایک ماہواری رسالہ ہے جس کی پرورش میں انھوں نے اسقدر کوشش کی کہ مثل اہل دہلی کے اہل لکھنؤ بھی بجا طور پر اُردو کے دعویدار قرار دیے جائینگے "تمدن" نے دلّی سے چل کر لکھنؤ تک کی منازل اس امید پر طے کی ہیں جو دلّی کے مشہور شعرا اور خصوصیت کے ساتھ میر تقی تک کو جو دلّی چھوڑنا بمنزلہ کفر خیال کرتے تھے ان پورب کے ساکنوں تک لائی تھی۔ حضرات لکھنؤ سے "تمدن" کے لیے پرورش و اعانت کی توقع کرنا کچھ بہت زیادہ نہیں ہے اسی طرح "تمدن" کا حضرات لکھنؤ کے ساتھ وہی سعادتمندانہ برتاؤ رہے گا جو ایک خورد کا ایک بزرگ اور سرپرست کے ساتھ ہونا چاہیے۔ "تمدن" حضرات لکھنؤ کے مضامین نظم و نثر لکھنؤ کی زبان میں شائع کرے گا۔ اور سعادتمندی سے سرمو تجاوز نہیں کرے گا۔ "تمدن" کے اس نئے دور یا لکھنوی دور کا پہلا پرچہ جناب کی خدمت میں حاضر ہے۔

حضرات لکھنؤ اپنے مضامین بہت جلد بھیجیں نیز وی۔ پی بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمائیں اور خریداروں کی فہرست میں توسیع کرنے کی کوشش شروع فرمائیں۔ "تمدن" کا دہلوی دور تو جسطرح بھی ہوا گذر گیا اب امید ہے کہ اسکا لکھنوی دور لکھنوی احباب کی حسن توجہ سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔

اس وقت یہ رسالہ لکھنؤ سے سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے (علیگ) و مولانا عبدالراشد الخیری صاحب سابق ایڈیٹر "تمدن" و ایڈیٹر رسالہ "عصمت" اور قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح انگلستان و جاپان (پرائیویٹ مشنری آف اسلام) کی سرپرستی میں شائع ہوگا اور ان تمام توقعات کو آپ کی ذرا سی نظر عنایت سے پورا کرنے کے

قابل ہو جائے گا جو ایک علمی ادبی رسالہ سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

نیاز مند

ایم۔ اے۔ قاری (علیگ)

ایڈیٹر "تمدن"

خلف اکبر قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دھلوی

(علیگ) سیاح جاپان و انگلستان

ریویو

ہندوستان میں اُردو رسالہ جات کی جسقدر ضرورت ہے اس سے ہر اردو داں بخوبی واقف ہے۔ مردوں کے لیے رسالہ جات اتنے کم ہیں کہ اگر اس سے دگنے چوگنے اُردو رسالہ بھی موجود ہوں تو وہ ملک کی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہیں اور طبقۂ نسواں کے لیے تو اس میدان میں ابھی بہت زیادہ گنجایش ہے۔ ہمکو یہ دیکھکر خوشی ہوی کہ کرہل ضلع مین پوری سے ایک اُردو ماہواری رسالہ "پیام امید" نامی ستمبر سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ "پیام اُمید" آزاد بیگم جیلہ اہلیہ اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) کی ایڈیٹری میں نکلنا شروع ہوا ہے پہلا پرچہ کامل اہتمام سے نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکالا گیا۔ اور عمدہ مضمون دیے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی کے اعتبار سے پرچہ بہت عمدہ ہے۔ خدا کرے آملک میں سدا بہار پھول کی طرح پھلے پھولے۔ پرچہ کی سالانہ قیمت (عہ) اور ششماہی قیمت عہ ہے

مذہب و قومیت

دنیا کوئی نہیں بتا سکتا کہ کہاں سے شروع ہوئی تھی؟ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک پہنچے گی؟

اس کی نسبت بھی یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جب شروع ہوئی تھی تو اس کی کیا حالت تھی؟ اور جب ختم ہو گی تو اس کی کیا حالت ہو گی؟ ہماری نگاہ کے سامنے کوئی ایسی مکمل تاریخ نہیں ہے جو آغاز عالم پر فیصلہ کن رائے قائم کر سکے! اس گتھی کو سلجھانے کے لیے جب دماغ انسانی تخیلات کے سمندر بے پایاں میں شناوری کرتا ہے تو ہمیشہ اپنی ذاتی قائم کردہ رخ پر تیرتے ہوئے کسی ایک طرف نکل جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اس نے اس بحر ناپیدا کنار کی ابتدا و انتہا معلوم کر لی! مذہب کے جہاز میں سوار ہونیوالا اپنے معتقدات کے راستہ پر" آغاز و انجام اپنے مذہب کے موافق دریافت کر لیتا ہے اور اسی پر مطمئن ہو کر اسے حقیقت سمجھ لیتا ہے! فلسفہ کے اسٹیمر پر سفر کرنے والا اپنے مفروضات کی راہ پر، ابتدا و انتہا کی نسبت اپنے علم و عقل کے موافق، دماغ فریب استدلال قائم کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اسکی رائے زنی اصلیت کے بالکل قریب ہے! مگر فی الحقیقت حقیقت جس پردۂ گو مگو میں پہلے تھی، اب بھی رہتی ہے! فریقین کے مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ۔ معتقدات ہوں یا مفروضات۔ آغاز و انجام عالم کی نسبت رائے لگانے والے کے یقین و استدلال میں حصۂ غالب ذاتی کیفیت ہے! جس آب و ہوا اور حالتِ گرد و پیش میں جن سے

واقعی انسانی دماغ کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ انسان نے ہوش سنبھالا اور اپنے خیالات پیدا کیے ہیں؛ اُسی کے موافق وہ اس مسئلہ پر بھی راے زنی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ بقیہ دنیا بھی ماضیِ غیر محدود اور مستقبل نامعلوم کو اسی عینکِ تخلیات سے دیکھے جس سے وہ دیکھتا ہے ! آپ مذہبی عینک سے اگر فلسفہ کے استدلال کو ملاحظہ کریں تو وہ محض لغو نظر آئے گا : اور فلسفہ کے نقطۂ نظر سے اگر مذہب کے معتقدات کا مشاہدہ کریں تو وہ بھی کچھ کم پوچ نہیں معلوم ہونگے !

تہذیب زمانہ کی رفتار کے ساتھ بلٹتی رہی اور پلٹتی رہے گی ! نیک و بد کا مسئلہ ۔ ضروریات زندگی کے تابع ہو کر ۔ دنیا کی رفتار کے ساتھ ساتھ ایک خاص حد تک برابر رنگ بدل رہا ہے ! گویا ماضی سے حال تک معاشرت کا تسلسل ؛ ایک ایسی نہ محسوس ہونے والی زنجیر ہے جس کی ہر کڑی اپنے سے ماقبل والی کڑی سے بالکل ملی ہوی ہے ! فرض کیجیے کہ ، اس زنجیر کی ہر کڑی اپنے سے پہلے والی کڑی سے ، رنگ کے لحاظ سے ، نہایت ہی خفیف حد تک ہلکی ہوتی چلی گئی ہے : اب ایسی زنجیر کے مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اگر اُسکی ایک کڑی بالکل سیاہ ہے تو کم و بیش سو کڑیاں چھوڑ کر آنے والی کڑی ، رنگ کے بتدریج ہلکا ہوتے جانے سے ، بالکل سفید ہوگی ! لیکن اگر آپ اُسی سیاہ کڑی کے ماقبل یا مابعد والی متصل کڑی کو ملاحظہ کریں گے تو ان تینوں کے رنگ میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں پائیں گے جو بادی النظر میں ایک دوسرے میں رنگ کا امتیاز قائم کر سکیں ! وجہ یہ ہے کہ رنگ اسقدر خفیف انقلاب کے ساتھ ہلکا ہوا ہے کہ نظر کسی ایک کڑی کا رنگ اس کے ماقبل والی متصل کڑی سے بالکل ملتا جلتا پاتی ہے ، البتہ بتدریج ہلکا ہوتے ہوتے دس بیس کڑیوں کے بعد اسکا پتہ چلتا ہے کہ رنگ ہلکا ہوتا جاتا ہے ، یہانتک کہ سو کڑیوں کے بعد سیاہ رنگ بالکل

سفید بن جاتا ہے! بالکل یہی حالت معاشرتِ عالم کی ہے! موجودہ سال کی معاشرت کو گذشتہ سال یا آیندہ سال سے مقابلہ کیجیے کوئی بیّن فرق نظر نہیں آئے گا: البتہ بیس سال پیشتر کی معاشرت سے مقابلہ کیجیے، تھوڑا بہت فرق، غور بین نظر ڈالنے پر ضرور معلوم ہوگا: پچاس سال قبل کی معاشرت کو دیکھیے آپ فوراً مان لیں گے کہ انقلاب ہو رہا ہے یہانتک کہ ایک صدی میں بالکل دنیا کا یا پلٹ ہو جائے گی!

نہیں بتایا جا سکتا کہ معاشرت تہذیب کی پابند ہے یا تہذیب معاشرت کی؟ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہوں! اس میں شک نہیں کہ ایک دوسرے میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے! دماغِ انسانی ہر نئی چیز کی تلاش و تحقیق میں ہمیشہ سے مصروف چلا آتا ہے: نئی چیز دریافت ہو کر۔ یا ایجاد ہو کر۔ استعمال میں آتی ہے: نئی چیز کا نیا استعمال گرد و پیش کی تمام چیزوں پر۔ یا ان کے طریقۂ استعمال پر۔ اپنے نیچرل تعلق کے لحاظ سے نیا اثر پیدا کرتا ہے: نیا اثر ضروریات میں نیا تغیر کرتا ہے: اس تغیر سے دائرۂ تہذیب میں اسکے موافق انقلاب واقع ہوتا ہے: اور اس انقلاب سے معاشرت کا رنگ متاثر ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے!

دنیا آگے بڑھ رہی ہے یا پیچھے ہٹ رہی ہے؟ اس کا جواب بھی دیکھنے والے کے نقطۂ خیال پر منحصر ہے! جو اسکے ساتھ ساتھ متحرک ہے اُسکو بڑھتی ہوی نظر آئے گی: اور جو کسی نقطہ کو ناقابلِ تغیر سمجھ چکا ہے اُسے ہٹتی ہوی معلوم ہوگی! واقعہ یہ ہے کہ آگے اور پیچھے محض ایسی دو سمتیں ہیں جو انسان کا رخ پلٹ جانے کے ساتھ ساتھ پلٹ جاتی ہیں! مشرق کی طرف مُنھ کر کے کھڑے ہو جیے مغرب آپ کے پس پشت ہو جائے گا! اور مغرب کی طرف روگردانی

کردیجیے مشرق پیچھے ہو جائے گا! کعبۂ مذہب کی طرف مُنھ کرنے والے کو فلسفہ پس پشت نظر آتا ہے اور فلسفہ کی طرف رخ کرنے والے کو مذہب! اسقدر شاید دونوں فریق مان لیں کہ دنیا۔ آگے بڑھ رہی ہو یا پیچھے ہٹ رہی ہو۔ متحرک اور منقلب ہے!

جس رخ اور جس سمت میں دنیا چلی جا رہی ہے۔ اُسی رخ اور اسی سمت کی طرف اُسکی معاشرت بھی برابر چلی جا رہی ہے! رجحان طبع بھی تغیر معاشرت کے ساتھ پلٹتا جا رہا ہے؛ دماغی پسندیدگی و نفرت بھی اسی کے زیر اثر منقلب ہے؛ گویا تمام عالم جسمانی اور عالم دماغی ایک نامعلوم سمت کی طرف مجنونانہ یا نیچر کے قوانین کے زیر فرمان۔ گام زن ہے!

انسان کی تمام ترقی یا انقلاب اُسکے علم پر منحصر ہے: اور اُسکا علم اُسکی واقفیت اور تجربہ پر مبنی ہے: واقفیت میں اضافہ اسی طرح ممکن تھا کہ حاصل کردہ واقفیت کو۔ جو عرصۂ دراز کی تحقیقات و تجسس کا نتیجہ ہے روزمرہ کی زندگی میں بلا دوبارہ تحقیقات کرنے میں تضیع اوقات کے، آسانی کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور باقی زندگی میں اُس میں اضافہ کی کوشش کی جائے! ایک دور لوہے کو کارآمد چیز ہونا معلوم کر لیتا ہے اور یہ علم آنے والے دور کو ورثہ کے طور پر اور چیزوں کے ساتھ ساتھ عطا کر جاتا ہے؛ دوسرا دور لوہے کے کارآمد ہونے کی تحقیقات کے لیے پھر دوبارہ وقت ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اس علم کو روزمرہ کی زندگی میں حاصل کرتے ہی اُسکے استعمال میں کوشاں ہو جاتا ہے اور اس سے کارآمد چیزیں بنا ڈالتا ہے؛ اب تیسرا دور اُس علم اولیں اور ان اشیاے ثانیہ، سب کو، ورثہ میں پاتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھکر اور چیزیں وجود میں لاتا ہے اسیطرح ماضی کی تحقیقات و ایجادات حال کو ورثہ میں پہنچتی رہتی ہیں اور حال اس علم و

واقفیت میں اضافہ کر کے مستقبل کے حوالہ کرتا رہتا ہے! نہ صرف ایجادات و اشیا تک ہی یہ علم واقفیت محدود ہے بلکہ ہر ہر واقعہ میں یہ ہی کیفیت ہے!

حاصل کردہ علم و واقفیت کو آنے والی نسل کے لیے چھوڑ جانے کا نام فن تاریخ ہے! ہم معلوم کرتے ہیں کہ بارش جب کبھی ہوی ہے بغیر ابر کے نہیں ہوی ہے، اور آیندہ کے لیے ہمارا دماغ مان لیتا ہے۔ یقین کر لیتا ہے۔ کہ بغیر ابر کے بارش ناممکن ہے! ماضی کی تحقیقات عرصۂ دراز تک تجربہ کی کسوٹی پر صحیح اُترنے کے بعد حال کی نسلوں کے لیے بدیہیات کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے، اور اُس سے انکار کرنا بدیہیات سے انکار کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے!

تاریخ ماضی، رفتار زمانہ کا رنگ بتاتی ہے، حال میں اسکے موافق عمل کر کے مستقبل میں خوشگوار یا مفید مطلب نتیجہ کی امید کی جاتی ہے! گویا تاریخ انسانی تہذیب و معاشرت کے انقلاب کا جزو اعظم قرار پائی ہے! تہذیب امروزہ، تہذیب دیروزہ کی پابند ہے اور تہذیب فردا تہذیب امروزہ کی! دنیاے دیروز اگر اپنے تجربات و علم کو نہ چھوڑ جاتی تو دنیاے امروز کو ورثہ میں کچھ نہ ملتا، اور اسی طرح وہ دنیاے فردا کو کچھ نہ دیسکتی! نتیجہ یہ ہوتا کہ دنیاے دیروز جن باتوں کو سمجھ چکی تھی، ان ہی کے سمجھنے میں دنیاے امروز پھر از سر نو کوشاں ہوتی، اور دنیاے فردا بھی اسی گردش میں سرگرداں رہتی! گویا جانور اور انسان کا فرق زائل ہوجاتا! جانور اپنے تمام عمر کے تجربات کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے لہذا اسکی نسل جس جگہ تھی وہیں کی وہیں رہتی ہے: اور انسان اپنے علم کو ورثہ میں دے جاتا ہے اس لیے اس کی نسل مفید مطلب اضافہ کرتی جاتی ہے!

ہر مسئلہ و ہر شعبۂ زندگی کی تاریخ۔ جس وقت سے انسان نے اسکو درج کرنا شروع کیا ہو۔ حاصل کی جاسکتی ہے: اور اسپر جزرس نظر ڈالنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ

وہ خاص چیز اپنے بکار آمد ثابت ہونے کے زمانہ سے اسوقت تک، کسقدر تغیر اور انقلاب کے ساتھ بتدریج پلٹتی ہوی موجودہ صورت تک پہنچی ہے! اسی کو زیر غور رکھ کر لیل و نہار کے رُخ کا لحاظ رکھتے ہوے، آیندہ کے لیے بھی قریب قریب صحیح راے زنی کی جا سکتی ہے!

دنیا۔ غالباً اپنے آغازِ انسانیت سے۔ مختلف حصوں اور فرقوں پر تقسیم چلی آتی ہے! انسان نے اسکو کسی مصنوعی کوشش کے ساتھ تقسیم نہیں کیا، بلکہ فطرت نے ہی مختلف آب و ہوا کے وجود سے اس تفریق کی بنا ڈالی، انسان نے صرف اُس قدرتی تفریق کے حدود معلوم کرنے اور اسکو بنی نوع انسان کے لیے کارآمد بنانے کی کوشش کی! اختلاف آب و ہوا، اختلاف خصوصیات مقامی۔ جنکا اثر جسم انسانی اور دماغ انسانی، دونوں پر مرتب ہوتا ہے! اختلاف رجحان طبع، اختلافِ زبان، اختلافِ معتقدات اور اختلاف طرز معاشرت، یہ سب اختلافات انسانی آبادی کی تقسیم و تفریق کا باعث ہیں! ان اختلافات کو یکجا کر کے، اگر جزرس نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہو جائے گا کہ تمام اختلافات دو قسم کے ہیں۔ صرف دو قسم کے؛ یعنی :- (۱) مادّی (۲) طبعی یا دماغی! مثلاً اختلاف آب و ہوا" مادی اختلاف ہے اور اسکا وجود خارج میں ہے؛ اختلافِ رجحانِ طبع دماغی چیز ہے اور خارج میں اسکا کوئی وجود نہیں!

تاریخ عالم میں انسان کے معتقدات کی تدریج صورت گیری کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمانہ جاہلیت میں ہر اپنے سے طاقتور جسم کو قابل پرستش سمجھ لیتا تھا۔ گویا بہ الفاظ دیگر۔ مادہ پرست تھا! مذہبی پیشوا یا پیغمبران مرسل اپنے اپنے حسب مراتب فلسفۂ مذہب کی تکمیل کے باعث ہوئے اور انسان مادّہ سے ہٹ کر روح کی طرف چلا! مختلف خداؤں کو پوجتے پوجتے وحدانیت کی لاثانی

حد تک جا پہنچا! یہ گویا روحانیت کی تکمیل تھی! اب مادہ پرستی نے روحانیت کے آگے سر جھکا دیا اور معتقدات و معاشرت۔ تمام تر۔ روحانیت کے سانچہ میں ڈھل گئیں! اس دور کے بعد فلسفۂ جدید نے مادہ کی تحقیقات و تجسس میں سرگرم رہ کر، پرانے خیالات کو ایسا خوبصورت جامہ پہنا دیا کہ عملی زندگی کا مشاہدہ اس ترقیِ مادہ سے روحانیت آمیز معاشرت کو متاثر پانے لگا! اب پھر معاشرت روحانیت کے بجائے مادیت کی طرف منتقل ہوئی! گویا موجودہ زمانہ۔ مذہب کی صورت میں نہیں بلکہ فلسفہ اور سائنس کی صورت میں۔ مادیت کا زمانہ قرار پایا!

بتایا جا چکا ہے کہ دنیا مادی اور دماغی اختلافات کی بنا پر ہمیشہ سے منقسم چلی آتی ہے! اس تقسیم پر انسانی معاشرت کا رنگ برابر چڑھتا رہا ہے۔ اور غالب رہا ہے! روحانیت کے زمانے میں جبکہ تمام تر معاشرت میں روحانی عنصر غالب تھا، تقسیم نوعِ انسان بھی اُسی عنصر کے لحاظ سے کی گئی تھی! روحانیت ایک دماغی کیفیت ہے، خارج اسکے وجود سے مبرا ہے! تقسیم آبادی بھی جس بنا پر کی گئی، روحانی۔ یا دماغی۔ تھی اور خارج اسکے وجود سے بھی مبرا تھا! یہ بنا جس پر دنیائے قدیم نے تقسیم نوعِ انسان کی عمارت چُنی، مذہب تھا: ساری دنیا مختلف معتقداتِ انسانی کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئی: ہمدردی، اتفاق، اخوت وغیرہ وغیرہ۔ معاشرت و تقسیم کے زیر اثر۔ یکسانیت معتقدات پر منحصر ہو گئیں! نتیجہ۔ یہ الفاظِ مختصر یہ تھا کہ۔ نوعِ انسان اپنے تمام نیچرل جذبات کو معتقدات کا تابع فرمان بنا کر مذہب کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی! اختلافِ مذہب نفرتِ باہمی کا باعث قرار پایا اور اتفاقِ مذہب اتفاقِ معاشرت و تمدن کا مرکز ٹھہرا! دنیا میں مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو وغیرہ وغیرہ مختلف دائرے قائم ہو گئے!

فلسفہ و سائنس کی ترقی نے بعد میں مادیت کو پھر زندہ کر دیا! نئے نئے اختراعات روزانہ مشاہدہ میں رہکر، اور بکار آمد ثابت ہوکر، معاشرت کو اپنے رنگ میں رنگنے لگے: تہذیب و تمدن پر۔ عملی زندگی میں۔ مادیت غالب ہو چلی اور اسی وجہ سے تقسیم بنی نوع انسان پر بھی اسکا اثر مرتب ہوا! معاشرت کا مرکز روحانی۔ مادی تاب اختیار کرنے لگا اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والی دنیاے مغرب نے، بجاے مذہب کے قومیت کو تقسیم نوع انسان کی بنیاد قرار دیا! اختلاف معتقدات کے بجاے اختلاف آب و ہوا یا اختلافِ خصوصیاتِ مقامی، اختلاف باہمی کا مرکز قرار پایا! "خاص آب و ہوا اور خاص حدودِ ملک میں پیدا ہونا اور نشو نما پانا" بنیاد اخوت و ہمدردی یا مرکز اتفاق و یکجہتی، ٹھہرا! تمام جذبات قومیت۔ یا بالفاظِ دیگر، مادیت کے رنگ میں رنگ گئے اور دنیاے جدید قومیت اور ملکیت میں تقسیم ہوگئی! قومیت کے مختلف دائروں کے نام تاریخ قدیم میں بھی موجود تھے مگر اُس زمانے میں وہ محض ملکی اعتبار سے استعمال کیے جاتے تھے اور انکو کوئی خاص اہمیت نہیں دیجاتی تھی! فرانسیسی ہونے پر۔ یا امریکن ہونے پر اتفاق کا دارومدار نہیں تھا، بلکہ جذبات و یکرنگی کا تعلق مذہب سے تھا! فرانسیسی و امریکن وغیرہ محض ملک ظاہر کرتے تھے اُن سے کوئی خاص حُبِّ قومیت متعلق نہیں تھا! مگر اب تمام تر اتفاق و اخوت فرانسیسی یا امریکن وغیرہ ہونے پر مبنی ہوگیا اور تمام جذبات اس احساس قومی کے تابع فرمان بن گئے! گویا قدیم اعزاز مذہبی نے معمولی مذہبی حیثیت اختیار کرلی اور قدیم معمولی لقب ملکی نے معزز ترین احساسِ قومی کی جگہ لے لی!

اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنا معتقدات دماغی پر ہے، جنکا کوئی ذاتی وجود خارج میں نہیں: اور قومیت کا دار مدار خاص حدود جغرافیائی اور خصوصیت آب و ہوا پر ہے، جنکا وجود سرتا پا خارج میں ہے! تقسیم قدیم۔ اسی لحاظ سے۔

ایک ایسی تقسیم کہی جاتی ہے جسکا دار و مدار محض معتقداتِ دماغی پر ہے اور جس کا مادّی وجود خارج میں قطعی نہیں، علےٰ ہذا تقسیم جدید ایک ایسی تقسیم سمجھی جاتی ہے جو مادّی اصول پر مبنی ہے اور جس کا تعلق نیچرل اختلافات کے قواعد پر ایسی چیزوں سے ہے جو مادّی ہیں اور خارج میں ہر وقت موجود ہیں! استدلال جدید کہتا ہے کہ قدیم طریقۂ تقسیم نہایت ناقابل اعتبار و غیر مستقل ہے اور جدید طرزِ تقسیم ناقابل تغیر و مستحکم ہے! وجہ۔ نہایت مختصر الفاظ میں۔ یہ بیان کی جاتی ہے کہ معتقدات دماغی نیچر کے پیدا کردہ قوانین کے ہمرنگ نہیں ہیں۔ اور جو چیز قوانین قدرت کے ہمرنگ نہو اس مادّی عالم میں قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے غیر مستقل ہیں: ایک عیسائی ایک منٹ میں مسلمان ہو سکتا ہے اور ایک مسلمان ایک لمحہ میں عیسائی گویا منقسمہ دنیا کے ایک دائرہ سے فوراً دوسرے دائرہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے یہ تقسیم نہایت ناقابلِ اعتبار ہے: ساتھ ہی معتقدات کا کوئی وجود خارج میں نہیں مل سکتا کہ کسی خاص شخص کے معتقدات میں کوئی تغیر اندر ہی اندر تو واقع نہیں ہو گیا؟ برخلاف اسکے، جدید طرزِ تقسیم قوانینِ قدرت کے پیدا کردہ اختلافات پر مبنی ہے اور جبتک وہ قوانین ہی تبدیل نہو جائیں یہ تقسیم بھی نہیں تبدیل ہو سکتی ایک شخص فرانس میں محض قدرت و اتفاق کے حکم غیر مرئی کے بدولت، بلا کسی اپنی ذاتی رائے کے۔ پیدا ہوتا ہے اور نشوونما پاتا ہے، اب وہ کہیں جائے، کہیں رہے کوئی مذہب اختیار کرے، لیکن تادمِ آخر فرانسیسی ہی رہے گا اور فرانسیسی ہونے کو فی الواقعی، وہ کسی طرح اور کسی حالت میں اپنے ذات سے الگ نہیں کر سکتا! گویا قومیت ایک ناقابل انفصال اتفاق ہے! اور قومیت پر مبنی ہونے والی تقسیم۔ اسی وجہ سے۔ نہایت مستحکم اور مادّی چیز ہے! مجھے اس جگہ اس بحث سے مقصود نہیں کہ دنیا کی آبادی کو پُرانے رنگ میں تقسیم کیا جانا زیادہ

موزوں ہے یا نئے رنگ میں ؛ واقعات کا من وعن بیان کر دینا اور رائے زنی کو ہر شخص کے نقطۂ نظر کے موافق، اسی کے دماغ پر چھوڑ دینا۔ میری رائے میں بہترین طریقہ ہے !

دنیائے مغرب زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی، مادیت کے سانچے میں ڈھلتی رہی، اور مذہب کو صرف روحانی جگہ دے کر، معاشرت اور عملی زندگی کو مادیت کے رنگ میں رنگتی رہی ! معاشرت کے ساتھ ہی ساتھ تقسیم دنیائے مغرب بھی جدید اصول قومیت کے لحاظ پر مبنی ہو گئی اور مذہب کے بجائے قومیت نے مغرب کی آبادی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا اس تقسیم کا عنصر تمام جذباتِ انسانی پر اسقدر غالب آیا کہ آج قومیت پر لاکھوں جانیں فخر کے ساتھ نثار کی جا رہی ہیں ! گویا مغرب نے عملی زندگی میں زمانے کا ساتھ دیا۔ اور مذہب کو روحانیت کے دائرۂ دماغی تک محدود کر کے معاشرت کو اس کے حلقۂ اثر سے نکال لیا !

سلطان حیدر جوش (علیگ)

"بغیر خلوص کے کوئی انسان کبھی بڑا آدمی (قابل وقعت) نہیں ہو سکتا اور نہ وہ عظیم الشان کام کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہو۔ لوگوں کو بہت محظوظ کر سکتا ہو اور بہت مشہور ہو مگر اس کو سنجیدگی کی ضرورت ہو گی۔ اور جب وہ بڑا آدمی ہو سکے گا۔

"وِیْن"

حضرتِ انسان

حضرت انسان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے دنیا پر بھی نظر ڈالنی ہے۔ دنیا کب قائم ہوئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسکا تشفی بخش جواب ملنا ناممکنات سے ہے۔ اگر انسان کے اُس قلیل التعداد طبقے کو چھوڑ دیا جائے جو اپنی قوت متخیلہ کے بل پر بہت کچھ اُچھلتا کودتا ہے اور اُسکے زعم میں اپنے آپ کو کسی عقیدہ کا پابند نہیں مانتا اور جس وقت جو کچھ اسکے خیال میں آجاتا ہے اسکو خود ماننا تو ایک طرف دوسروں سے بھی متوقع ہوتا ہے کہ اسکا تتبع کریں مگر دنیا کی وہ آبادی جو اپنی قوت فہم کو اسقدر صحیح نہیں سمجھتی کہ اپنی ہادی خود ہو سکے اور جس نے کسی نہ کسی مذہب کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا ہے دنیا کی اس دہریہ بحث سے کہ دنیا کیونکر بنی؟ آیا اسکو اس صورت سے جس میں کہ یہ آج ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے آسمان پر سے حضرت آدم کی طرح کسی جرم کی پاداش میں "دنیا" بنا کر پھینک دیا گیا؟ یا اس ضرورت سے پیدا کیا گیا کہ حضرت آدم کو یہاں بھیجنا مقصود تھا؟ یا خدا کو نہ ماننے والے ہم ہی جیسے انسانوں کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ شکل (میں موجودہ شکل کہنے میں غالباً غلطی کرتا ہوں کہ ہر زمانے میں اسکی موجودہ شکل کچھ اور ہی خیال کی گئی اور آج کون اس امر کا مدعی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے گول ہونے کا آج کا دعویٰ کل دنیا کو مثلث نہ ثابت کر دے گا۔) آپ سے آپ پیدا ہو گئی۔ کیونکہ عناصر تو موجود تھے ہی ان کی مختلف حرکتوں سے مختلف صورتیں پیدا ہوتی گئیں اور انکے عقیدہ کے مطابق بھی یہ بہت کچھ ممکن ہے ان ہی ابتدائی یا بنیادی عناصر کی مزید حرکت سے

آج جو شکل بیان کی جاتی ہے کل وہ نہ بیان کی جائے اپنے آپکو بالکل علیحدہ رکھتی ہے اور اس قسم کے خیالات کو نہیں جانتی ہے مذاہب کے پابند لوگوں نے تو اس فضول بحث کو بہت کچھ چھوڑ کر دنیا کی ابتدا اُسی وقت سے مانی ہے کہ حضرت آدم آسمان پر سے ایک مقام پر وارد ہوے جو زمین اور اسکے بعد اور ابتک دنیا کے نام سے موسوم ہوی۔ ڈارون اور ان کے طبقہ کے دوسرے لوگوں کو تو قدرتاً اس سے بھی اختلاف ہونا چاہیے کیونکہ دنیا کے اکثر مذاہب تو اشرف المخلوقات انسان کا وجود حضرت آدم سے ہی مانتے ہیں مگر ڈارون صاحب جو ترقی کے اصولوں سے ہماری نسبت زیادہ واقف معلوم ہوتے ہیں انسان کے وجود کی بنیاد تو خبر نہیں کہاں سے مقرر کریں گے مگر وہ شکل انسانی کی انسان ہونے سے پہلی منزل کا پتہ تو بندر سے دیتے ہیں۔ اگر ڈارون صاحب کے قول کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بندر کا وجود بندر کی ہی ذات سے ہو اگر اسی طرح بندر کا وجود کسی اور چیز یا جانور سے قرار دیا جاے اور اس طرح ایک دوسرے کے وجود کے متعلق ڈارون کے خیالِ دوربین کو کام میں لاکر تحقیق کی جائے تو انسان کا وجود خدا جانے کہاں سے نکلے گا اور خدا جانے کچھ وجود کی بنیاد نکلے گی بھی یا نہیں آگے چل کر اسکے متعلق بھی یہ ہی کہا جاے گا کہ بعض عناصر نے مل کر یہ شکل اختیار کی خیر کچھ بھی ہو ہم تو انسان اور دنیا کی ابتدا اُسی وقت سے کرتے ہیں جب سے حضرت آدم دنیا میں تشریف لائے۔ حضرت آدم کے ساتھ ہی حضرت حوا کو بھی مسلمانوں اور بعض سماوی مذاہب کے اعتقاد کے مطابق جنت سے نکالا گیا تھا چنانچہ اس مقام پر دونوں کو گرایا گیا جسکو آج ہم دنیا کہتے ہیں گو اس وقت دنیا کی حد بہت تھوڑی ہوگی اور خبر نہیں اس وقت اس خطہ زمین پر کس لفظ کا اطلاق ہوتا ہوگا۔ غرضکہ جب خلد سے نکلنے کے بعد دوسرے خطہ میں حضرت

آدم اور حوا کی ملاقات ہوی اور اس وقت سے دنیا نے اپنا وہ دور شروع کیا
جس پر ہمیں نظر ڈالنی ہے۔

چونکہ دنیا صرف آدمی اور زمین پر مشتمل نہیں ہے اسلیے بظاہر ہم نے جو لفظ دنیا
استعمال کیا ہے اسکے لیے ہم کو دنیا کی کل موجودات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے مگر
ہم اپنے اس مضمون میں چونکہ انسان اور اسکی مختلف ترقیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں
اس لیے صرف انسان یا آدمی کا زمین پر آنا اور پھر مختلف حالتوں کا پیدا ہونا
وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو اس وقت پیش نظر ہیں باقی دنیا کی موجودات سے
گو ہم اسوقت بحث نہ کریں مگر ہم انکے وجود کو نظر انداز کر کے پورے طور پر اپنا
کام نہیں نکال سکتے۔ دوسرے یوں بھی دوسری موجودات کا ذکر کرنے کی ضرورت
نہیں کیونکہ انھوں نے کوئی ترقی نی نفسی نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ خدا نے اشرف المخلوقات
قرار دینے میں یہ ہی رمز رکھی تھی کہ انسان کو کامل جانور ہونے کی تمام بلکہ ضرورت سے
زیادہ قوتیں دیدی جائیں مگر کمال پر پہنچنے یا کامل جانور بن کر پھر انسان کہلانے
کے لیے اسکو خود اُن قوتوں کو استعمال کرنا پڑے۔ اگر خدا نے ایک طرف
دوسرے حیوانات کی طرح انسان کے لیے زندگی کے تمام کلیے قائم کرکے اسکو
دوسرے حیوانوں کے برابر نہیں کیا تو دوسری طرف اُسکو وہ فہم و ادراک
مرحمت کیا جو انسان کو کامل بنائے اور اسکو دنیا کی موجودات میں سب سے افضل
کہے انسان کو خود انسان بننے کی جو قوت دی گئی ہے (عقل۔ ضمیر وغیرہ) وہی
وہ چیز ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کہلوایا۔ اگر انسان اپنے تمام کاموں
اور انتظاموں کو جانوروں کے انتظامات کے برابر بھی مکمل نہ کر سکے تو وہ دراصل
اس لقب سے ملقب نہیں کیا جا سکتا جو اسکے لیے تجویز ہوا ہے۔

ظاہرا طور پر نظام قدرت یا عالم موجودات میں جانوروں کا انتظام مکمل ہوتے ہوئے

اگر آپ صرف چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں ہی کے انتظام پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کا انتظام ہم انسانوں کے انتظام سے زیادہ مکمل ہے اسکے علاوہ ایک جانور ہرگز اُس چیز پر مُنھ نہ ڈالے گا جو اُسکے لیے قدرت نے وضع نہیں کی مثلاً اگر آپ ایک گدھے سے اس امر کے متمنی ہوں کہ وہ کتے کی طرح گوشت کھانے لگے تو یہ گدھے کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنی اس عالم موجودات کی سب چیزیں انسان کے لیے ممکن ہیں میرا اس سے یہ مقصد تھا کہ خدا کا انسان کو بنا کر اسکو اشرف المخلوقات قرار دینے سے یہ مطلب تھا کہ وہ خود اپنے فہم اور ادراک سے جو اسکے شرف کی جڑ ہیں "کچھ نہیں" سے "سب کچھ" بلکہ "سب کچھ" سے بھی "افضل" بن کر اپنے تئیں سب موجودات میں ممتاز بنائے۔ سب پر حکومت کرے۔ دنیا اور اسکی کُل کائنات کو اپنے تابع رکھے اور آپ پہلے کامل حیوان بنے یعنی اپنے میں ان تمام انتظامات کو مکمل کرے جو خدا نے دوسرے جانوروں کے لیے بدرجۂ احسن کیے ہیں اور اسطرح ان جانوروں سے ممتاز ہو کر دنیا کی تمام چیزوں پر قبضہ جمائے۔

کوئی چیز دنیا میں کسی دوسری چیز سے افضل اُسی وقت کہلائی جا سکتی ہے جس وقت وہ اپنے میں تمام وہ خوبیاں بھی رکھتی ہو جو اس چیز میں موجود ہیں جس سے برتر اسکو بننا ہے اور اسکے علاوہ اسمیں کچھ اور زیادہ خوبیاں ہوں۔ اب انسان کے وجود سے اس کی ترقیوں کی طرف رجوع کیجیے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے اور اسکے علاوہ بعض حالات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان پہلے ننگا رہتا تھا جو ملتا تھا اسے کھا لیتا تھا۔ جانور کیا جانور سے بھی بدتر تھا۔ اس وقت تک دنیا میں بعض مقامات پر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ترقی کے اُسی درجے پر ہیں جو قدرت نے ان کو عطا کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ترقی کی اسکے ایجاد کرنے والے دماغ نے

بار بار ٹھوکا دے کر اسکو بتایا کہ تو اس لیے نہیں پیدا ہوا کہ یہاں کا یہیں رہ جائے
بلکہ تو ترقی کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد جو انسان کی شکل
نظر آئی تو اسکے ستر کی جگہ پتے بندھے ہوئے ہیں اسکے ہاتھوں میں نوکدار
پتھر ہیں اب وہ انسان کو نہیں کھاتا بلکہ موجودات میں سے دوسری اقوام کے
جانداروں کو مثلاً چرندوں پرندوں کو ان پتھروں کی نوکوں سے کاٹ کر کھاتا ہے
پھر تاریخ کے کچھ اوراق اُلٹے اور دو تین کیا بلکہ کچھ زیادہ صدیوں کا غوطہ دے کر
جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت انسان ہیں تو ویسے ہی مگر اب ان کو یہ خیال
پیدا ہو چلا کہ کچا گوشت کھانا ٹھیک نہیں اسکو دھوپ میں سکھایا مگر اس سے کچھ
اسکا مقصد پورا نہیں ہوا اور اس وقت قدرت نے قاصر بندے کی مدد کی اور
ایک دن حضرت انسان نے ایک جانور کو مارنے کے لیے زور سے پتھر جو پھینکا تو
وہ اُس جانور کے لگنے کے بجاے دوسرے پتھر سے ٹکرا گیا اور اس سے ایک روشنی
پیدا ہوگئی روشنی نے پیدا ہوتے ہی ترقی کی اور اُس گھاس کو جو اس پتھر کے
قریب تھی اپنے زیر اثر کرلیا انسان یہ ماجرا دیکھکر بہت تعجب میں ہوا پہلے تو
دور سے تماشا دیکھا پھر وہاں سے بھاگ کر اس روشنی کے اکھاڑے میں کود ہی
پڑا پہنچتے تو پہنچ گیا مگر جاتے ہی جو گرمی لگی تو پریشان ہوا اور واپس بھاگنے لگا
واپس پہنچتے پہنچتے آپ کے سب بال وغیرہ جل گئے اور تمام بدن میں بیحد
سوزش پیدا ہوگئی۔ مگر آپ کو اس سے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ اس سے
گوشت ضرور پک جائے گا۔

کئی صدی بعد جو دیکھتے ہیں تو وہ ہی انسان صاحب کھال منڈھے ہوے
تشریف فرما ہیں پتھروں کا چولہا بنائے ہوے مٹی کی ہنڈیا میں کچھ پکا رہے
ہیں اور اب آپ اکیلے نہیں ہیں آپکے طبقے کے کچھ اور لوگ بھی ہیں۔غرض اسطرح

ترقی کرتے کرتے حضرت انسان آدمیوں میں داخل ہو گئے جب کھانے پینے ساتھ رہنے سہنے کا مزا پڑ گیا۔ جانوروں کے مارنے کے لیے تیر کمان بنا چکے تو آپ کی بلند پروازی نے اور رنگ دکھایا اور کچھ دنوں بعد آپ شہر میں رہتے ہوئے عمدہ عمدہ پوشاکیں زیب تن کیے ہوئے بندوقیں ہاتھوں میں لیے ہوئے نظر آئے اور ایک اور صلاحیت بھی آپ میں دکھائی دی کہ آپ اپنے ہم جنسوں میں سے ایک کو اپنے اوپر حکومت کر لینے دیتے ہیں۔ گھوڑے ہاتھی آپ کے تابع ہیں تمام جانوروں پر آپ کو قدرت ہے کڑوے تیل کے چراغ گھروں میں روشن ہیں اب حضرت انسان جھونپڑوں اور درختوں کے نیچے جانوروں کی طرح بسیرا لینے کی جگہ مٹی اینٹ کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ قوموں سے لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں ایک دوسرے کو مار بھی ڈالتے ہیں مگر ان سے اگر یہ کہو کہ فلاں پرستان میں ایک پری ایک گاڑی میں بیٹھ کر تمام دنیا کی سیر کر آتی ہے مگر اس گاڑی میں نہ گھوڑا ہے نہ ہاتھی نہ کوئی اور جانور اور اسکے محل میں تمام چراغ آپ ہی آپ روشن ہو جاتے ہیں اور ان چراغوں میں نہ تیل جلتا ہے نہ وہ چراغ موم بتی کی شکل کے ہیں تو حضرت انسان کہنے والے کے پیچھے لٹھ لے ڈالتے ہیں اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہوائی تخت کا ذکر کرو تو آپ چونکہ کچھ صدیوں کے بعد مذہب کے پابند ہو گئے ہیں اعتقاد کے خیال سے ہاں تو کہہ دیتے ہیں مگر یقین نہیں آتا۔

ان ہی انسان کو ایک صدی بعد دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریل میں سوار موٹر میں سوار اور سب سے زیادہ ہوائی جہاز پر سوار نظر آتے ہیں اور بعض تو یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں بھی لوگوں کو اتنی زیادہ انجنیری آتی ہو کہ انھوں نے ہوائی جہاز کے نمونہ کا تخت

بنا لیا ہو۔ بعض بیچارے اب بھی اعتقادات کی بندش میں جکڑے ہوئے ہیں اور چپ ہیں۔ دیکھتے سب کچھ ہیں مگر بولتے نہیں۔ اس وقت بھی اگر آپ سے کوئی یہ کہنے لگے کہ میاں توپ بندوق کو چھوڑو ہم تم کو ہوا کا ایک میگزین دیتے ہیں جس سے سب مرجائیں گے تو یقین نہیں آتا مگر ایک دس برس کے بعد یہ ہی حضرت انسان خود لوگوں کے مارنے میں ہوا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک مقام سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر گولہ پھینکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب یہ لوگ اسقدر بداعتقاد یا بھولے نہیں رہے اب تو ان کو امریکہ کے مشہور سائنس داں کے یہ کہنے کا یقین آجاتا ہے کہ سائنس اور انسان دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کے موجود ہونے کی حالت میں معلوم ہوگا کہ دنیا میں کیا کیا ایجادیں ہوتی ہیں اور آج کی چیزیں تم کو کل کی چیزوں کے آگے اتنی ہی ہیچ معلوم ہوں گی جیسے موٹر کے آگے پرانے زمانے کی شکرم۔ اب اُن کو یہ کہنے کا بھی یقین آجاتا ہے کہ اس نظام عالم میں ایک نہیں بہتیری دنیائیں ہیں چنانچہ مریخ سائنس میں ہماری دنیا سے اسقدر آگے ہے کہ وہ ہم سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری کرنا چاہتا ہے مگر ہم اسکے پیغامات سمجھنے اور حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ (باقی آیندہ)

(ایڈیٹر)

خط وکتابت

جو صاحب اب "تمدن" کے متعلق کسی قسم کی خط وکتابت کریں۔ پرچہ بھیجنے یا نمونہ بھیجنے کی ہدایت کریں یا مضامین بھیجیں وہ خاص طور پر اس امر کا خیال رکھیں کہ اب رسالہ "تمدن" کا دفتر بل جھاؤلال لکھنؤ میں ہے۔ جو صاحب "تمدن" کے سابقہ پتہ پر خط وکتابت کرینگے اُنکی تعمیل نہونے کی شکایت کی تلافی ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ایڈیٹر

فلسفہ راز و نیاز

(۱)

نظام عالم میں سب سے زیادہ قابل قدر انسان کا وجود ہے جسمیں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ حیات انسانی کے کسی ایسے پہلو کو مکمل نہیں کہہ سکتے جس میں اولاً فرداً فرداً مرد اور عورت سے اور ثانیاً مجموعی طور پر مرد عورت یا عورت۔ مرد کے مسئلہ پر غور نہ کی جائے۔

مرد اور عورت پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے میں یہ لازم آئے گا کہ مرد کی صفات اور خصوصیتیں علیحدہ بیان کی جائیں اور عورت کی صفات اور خصوصیتیں علیحدہ۔ دونوں کے مخلوط مسئلہ کے یکجا مطالعہ میں واضح طور پر بیان کرنا ہوگا کہ کون کون سی صفات اور خصوصیات دونوں میں مشترک ہیں اور یہ کہ

(۱) جانبیں کی مشترک صفات اور خصوصیات کے ایک جگہ جمع ہونے سے ان میں کیا جلا ہوتی ہے

اور (۲) غیر مشترک صفات اور خصوصیات کے ایک جگہ جمع ہونے سے علیحدہ علیحدہ مرد اور عورت پر کیا اثر ہوتا ہے۔ انجام کار یہ دیکھنا ہوگا کہ اس اختلاط اور معجون مرکب سے مجموعۃ حیات انسانی کس کس طرح اور کس درجے تک ترقی یاب ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ مرد اور عورت کے فطری تعلق اور اتحاد سے جسمانیات دماغیات قلبیات اور روحانیات کے عالموں میں کیا کیا تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان تحریکوں کے نتائج ترقیِ عالم کے

اہم مسئلہ میں کیا تک حصہ لیتے ہیں۔

(۱) نفس مضمون پر بحث کرنے سے پہلے جبکہ ہیں زیادہ ترکیبات انسانی سے بحث کرنی ہوگی اور جن کو ہم آئندہ باطنیات سے تعبیر کریں گے ہم کو بیرونیات پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔

تمام بیرونیات ایک پہلو سے مجموعہ محاسن ہے ہرطرف حُسن ہی حُسن ہے زمین پر شجر حجر پھول پتے۔ دریا۔ پہاڑ اور بے شمار رنگین اور پُر بہار اشیاء جنہیں معدنیات بھی شامل ہیں ایک لاانتہا حُسن کے سلسلہ کو قائم کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چرند۔ پرند۔ دریائی جانور درندے۔ سانپ بچھو۔ حیات عظیم کی بےمثل کڑیاں ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اوپر نظر کرو تو آسمان اپنے چاند سورج ستاروں اور مختلف شواہد قدرت کے ساتھ کوس لمن الملک بجا رہا ہے اسکی دنیا کیا بیشمار دنیائیں بالکل علیحدہ ہیں اور حیات عظیم میں تکمیلی ضرب دینے کی مدعی معلوم ہوتی ہیں۔ موسموں کا تغیر تبدل بذات خود ایک دلچسپ سماں ہے اگر جب اسکے جلو میں مختص الموسم نباتات میوے ترکاریاں وغیرہ حساب میں لگائی جائیں تو ایک علیحدہ علم ہو جاتا ہے۔ ان سب شواہد قدرت کی جان شکل وصورت رنگ روپ چھٹائی بڑائی۔ موٹاپن دُبلاپن اور ان سب کی اصل گولائی حُسن کی الف۔ب۔ت ہے۔

اس وسیع دائرہ حُسن میں انسان جو خود بھی بدرجہ غایت حسین ہے فرام گزین ہے۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب اسکے بیرونیات اسقدر حسین ہیں تو اس کے باطنیات اس سے کم حسین ہوں گے۔

(۲) حسن وجمال کے متعلق عقلا نے مختلف کلیے قائم کیے ہیں۔ غالب رائے یہ ہے کہ خلاق عالم جمال مطلق ہے اور اسی کا ایک ادنیٰ جلوہ کائنات میں

ظہور پذیر ہے۔ اس لیے شواہد قدرت کے جمال کو انتہائے جمال سمجھنا غلطی ہے۔ بلکہ ادراک جمال قلب انسانی کو اس حالت میں حاصل ہوتا ہے جب وہ محسوسات سے گذر کر روحانی سکون حاصل کرتا ہے۔ مگر بغیر شکل وصورت رنگ و روپ جمال کا مفہوم مرتب نہیں ہو سکتا۔ اسمیں بھی صرف یہ دقت ہے کہ شکل وصورت رنگ و روپ کے ساتھ خواہش اکثر وابستہ ہو جاتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہش قوائے مدرکہ کو اپنی خدمت میں مصروف کرلیتی ہے۔ اور اسی شکل و صورت اور رنگ و روپ میں جو جمال مطلق جلوہ گر ہوتا ہے اسوقت تک قوائے مدرکہ کو نہیں پہنچنے دیتا اور چونکہ نیکی۔ علم اور جمال (یا بعضوں کے نزدیک صدق جمال اور نیکی) آپس میں نہایت رابطہ اور اتحاد رکھتے ہیں۔ اس لیے جمال کے صحیح ادراک میں جسقدر نقص رہ جائے گا اسقدر نیکی اور علم یا صدق اور نیکی میں بھی کمی رہ جائے گی۔ لہذا جمال حقیقی کی تلاش انسان کو مجموعۂ محاسن بناتی ہے۔

ان سب باتوں کو مان لینے کے بعد صرف ایک ایسے فلسفہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جو حسن ظاہری سے خواہشات نفس کو دائمی طور پر وابستہ نہ رہنے دے بلکہ جس کے ذریعہ سے قلب انسانی جمال حقیقی کی طرف ہدایت پائے یا یوں کہیے

حسن سے مرد اور عورت جو حسن ظاہری کے بہترین نمونہ ہیں ایک دوسرے کے حسن سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی کیفیات قلب کو سمجھکر جمال حقیقی اور زندگی کے اعلےٰ مدارج کی طرف ترقی کریں اس فلسفہ کا نام ہم نے فلسفۂ راز و نیاز رکھا ہے جو ہمارے اس مضمون کا عنوان ہے۔

(۴) اب ہم (جیسا اس مضمون کے شروع میں ظاہر کیا گیا ہے) مرد اور

عورت کی صفات اور خصوصیات سے بحث کرتے ہیں۔ اس بیان میں فلسفیانہ پیچیدگیوں میں جانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جہانتک ممکن ہوگا اسکو سہل کیا جائیگا

(۱)۔ جیسا کہ اسکی ساخت سے ظاہر ہے۔ مرد زیادہ محنت کرنے زیادہ تکلیف برداشت کرنے۔ معاش اور ترقی کی تدابیر عمل میں لانے۔ جلب منفعت اور دفع مضرت کے سامان فراہم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

(ب) عورت محنت اور تکلیف کو سمونے اور خوشگوار بنانے۔ سامان ترقی کو سلیقہ سے برتنے اور جلب منفعت اور دفع مضرت کی تدابیر میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کے لیے ہے۔

اس اعتبار سے مرد کو زندگی کی نثر اور عورت کو زندگی کی نظم کہنا بیجا نہوگا۔

آگے چلیے تو مرد اپنی شجاعت لیاقت دولت وغیرہ کی داد طلب کرنے کا قدرۃً مریض معلوم ہوتا ہے۔ یا بتبدیل الفاظ عزت اور فضیلت طلب واقع ہوا ہے۔ یہ عزت اور فضیلت طلبی غرور کے درجے پر پہنچ کر مرد کو جانور سے بدتر کر دیتی۔ مگر قدرت نے اس کا علاج عورت کی فطرت سے کیا ہے۔ اور جہاں قدرت نے عورت کو نرمی۔ حلم۔ صبر اور محبت کے صحیح مفہوم سے جو عین داد ہے مزین کیا ہے۔ وہاں اسکی صورت شکل۔ نقل و حرکت۔ مزاج اور برتاؤ میں ایک ایسی پاکیزہ لچک رکھدی ہے جس سے مغرور سا مغرور آدمی بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ مرد اور عورت میں مشترکہ صفت بقاء حیات انسانی کی خواہش اور آرام اور سکون حاصل کرنا ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ یہ بقا اور سکون شجاعت لیاقت دولت وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے مگر عورت سمجھتی ہے کہ یہ اہم کام زندگی کی کرخت باتوں میں نرمی پیدا کرنے

اور زینت کا ملمع دینے سے پورا ہوتا ہے۔

غیر مشترک صفات مرد اور عورت کے یہ ہیں مرد اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت جلد جبر اور بے اعتدالی کو کام میں لانے لگتا ہے جبکا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے قربان کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ اسکے برعکس عورت ہر وقت قربان ہونے کے لیے تیار رہتی ہے

اب مرد اور عورت کو جمع کرنے سے منشار قدرت یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک کی عزت طلبی دوسرے کی محبت رسی ایک کی سرفرازی دوسرے کی شاعرانہ رنگینی۔ ایک کی دنیا بھر کو اپنے لیے قربان کرنے کی خواہش دوسرے کی ہر یگانہ اور بیگانہ کے لیے قربان ہو جانے کی نیت۔ غرض یہ سب چیزیں مل کر زندگی کے غبارہ کو اعتدال اور لطافت کے ساتھ پرواز میں لائیں اور خواہشات جسمانی اور نفسانی کی زنجیروں کو محبت کے غیر محسوس مگر پُر اثر ضرب سے توڑ کر حیات حقیقی اور کیف روحانی سے مشرف ہوں۔ سبحان اللہ

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاے ہے

(۲)

یہ دریافت کرنے کے بعد مرد اور عورت کا یکجا ہونا بہترین منشاء قدرت ہے مذہب اور رواج نے ابتداء سے سینکڑوں پلٹے کھاے مگر آخر یہ لڑھکتی ہوی گیند یہیں آکر ٹھہی کہ شادی بیاہ اور محبت کے بیش قیمت تخت پر ان کو جلوہ افروز کرنا چاہیے۔ بعض ملکوں میں شادی سے پہلے محبت کا ہو جانا لازمی قرار دیا گیا بعض ملکوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم اسطور کی دی گئی کہ بعد شادی کے محبت کا ہونا شاذ و نادر ٹھہرا۔ بہر حال محبت دونوں اسکیموں میں جزء مشترک رہی محبت بعض حالتوں میں اتفاقی اور پہلی مرتبہ دوچار ہونے کا نتیجہ بھی سہی مگر پھر بھی

مزاج شناسی اور عام رواداری کے بہت سے مدارج ایسے ہیں جنکو نیک نیتی اور احتیاط کے ساتھ طے کرنے سے مرد اور عورت دونوں کا بام محبت پر پہنچنا ناممکن نہیں۔ اسوقت ہم صرف اسی شق پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ مرد ہوں یا عورتیں بعضے بالطبع خاموش۔ سنجیدہ اور جذبات کو پوشیدہ رکھنے والے ہیں۔ برعکس اُنکے بعض زیادہ بولنا چالنا جنسی مذاق اور جذبات کا اظہار کچھ بُرا نہیں سمجھتے۔ جہانتک صداقت اور راستبازی شامل ہو وہاں تک ان دونوں باتوں میں کوئی عیب نہیں مگر ان ہی متضاد صفات میں سے اگر خاوند ایک صفت کا ہو اور بیوی دوسری صفت کی تو باوجود حقیقی محبت کی پوشیدہ چنگاری کے دونوں میں دن رات کے برتاؤ میں بہت کچھ اختلاف بلکہ بعض اوقات مخالفت پائی جائے گی اور کوئی بھی اُنکو سچی محبت اور رواداری کے بہترین نمونے نہ تسلیم کرے گا۔ مگر یہی دونوں اگر ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیں اور دن رات کے برتاؤ میں میانہ روی اختیار کرلیں تو گو شروع شروع میں جوشیلی طبیعت والوں کے لیے گونہ باعثِ افسردگی اور پژمردہ دلی ہوگا مگر آگے چل کر ان ہی دونوں میں ایسا سمو یا ہوا زریں رشتہ سچی محبت کا قائم ہو جائے گا جو نہ صرف اُن کی متحد زندگی کو کامیاب اور شاداب کرے گا بلکہ جو اوروں کے لیے بھی قابل تقلید ثابت ہوگا۔

جن نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے اُنکو اس معاملہ میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مغرب میں مرد اور عورت دونوں دل کی حقیقی رہنمائی سے یکساں طور پر محبت کا اظہار کمالِ صداقت و شرافت سمجھتے ہیں ایشیائی عورتیں مرد کی طرف سے سچی محبت کا اظہار ہونے پر اُسی رفتار بلکہ اُس سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ استقبال محبت کے لیے تیار ہوتی ہیں اور جان

قربان کر دیتی ہیں مگر یکساں الفاظ یا یکساں حرکات و سکنات سے یکساں طور پر اظہار محبت سے قاصر رہتی ہیں۔ اسے کسی حال میں فقدان محبت پر محمول نہ کرنا چاہیے۔ اولاد ہونے کے بعد عورت کا دل فطرتاً بچوں میں زیادہ لگ جاتا ہے اور خاوند کے ساتھ ہر وقت اُٹھنے بیٹھنے میں کمی ہونے لگتی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُسے خاوند سے محبت کم ہو گئی ہے۔ مرد کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اولاد ہونے کے بعد عورت دنیا کے مقدس ترین کام میں مصروف ہے اور لازم تو یہ ہے کہ مرد اُس کا پورا ہاتھ بٹائے مگر یہ نہ ہو سکے تو اُس سے محبت میں کمی کرنے کی شکایت تو نہ کرے۔

جس طرح زن و شو کی محبت فطری اور مقدس ہے اُسی طرح اولاد کی محبت بھی قدرتی اور پاک ہے۔ دونوں محبتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ دونوں ایک ساتھ چلنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ محبت خواہ کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو ہر جزوی حالت اور عادت کا تفحص یا اظہار اور ہر بات میں انتہا درجہ کی بے تکلفی کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوتی۔ خصوصاً عورت کے لیے اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت اپنا دل الگ رکھے یا خواہ مخواہ کھنچی رہے مگر اُسے چاہیے کہ وہ کسی حال میں اپنے آپ کو نہ بھولے اور نفاست اور خوش دلی کے ساتھ خوشگوار رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھے۔ جس سے اُسکی قدر و منزلت میں فرق نہ آئے۔ کیونکہ اسی قدر و منزلت پر گھر کے قیام اور بچوں کی تربیت کا انحصار ہے۔ سچی محبت میں پوری قدر و منزلت خود مضمر ہوتی ہے مگر بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں میں یہ قدر و منزلت چھوجھری ہوتے ہوتے محبت کے مستحکم اور مضبوط قلعہ کو بھی بوسیدہ کر دیتی ہے۔ اور زندہ در گور ہیں وہ خاوند اور بیوی جنمیں باہمی محبت اور قدر و منزلت نہ رہے۔

(باقی آئندہ)

سرفراز حسین

اُردو شاعری

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

استاد الشعرا میرؔ مرحوم نے شعر بالا نظاہر اپنی حالت پر لکھا ہے یا اسمیں عموماً عاشقوں کی رسوائی و بے توقیری کا نقشہ کھینچ کر دکھلایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عاشقی کبھی اسقدر عزت سادات یا مشائخ کو خاک میں ملانے والی نہیں ثابت ہوئی جسقدر شاعری قولاً و فعلاً شیخ، سید، مغل، پٹھان، چھتری راجپوت کو فرداً فرداً نہیں بلکہ من حیث القوم بھی بدنام و رسوا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور اُردو شاعری کے تمام زمانے پر نظر کرنے کے بعد اس تمام لٹریچر کا اکثر حصہ ایسا نکلے گا جس کو پڑھکر ہمیں بے اختیار یہ کہنا پڑے گا

اس شاعری میں عزت اقوام بھی گئی۔

جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ شاعر سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ ملک و قوم کے جذبات و محسوسات کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ہر شاعر کے سوانح پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی مصیبتوں کا مرثیہ یا کامرانیوں کا زمزمہ نہیں گایا ہے تو ہم اس کلیہ کو جو تحریک شعر گوئی کی بنا ہے، شعر ذیل میں تسلیم کرتے ہیں ؎

طبع شاعر کو بنا دیتا ہے موزوں ذکر درد
داغ کھا کر ہر کسی کے رازداں ہم ہو گئے

اور یہ سوچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اُردو شاعری کی کیا کیا خصوصیتیں ہیں

اور ان خصوصیتوں کے محرک و مؤید کون کون اسباب ہیں۔

عموماً تسلیم کیا گیا ہے کہ شمس اللہ ولی اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالنے والے ہیں اور ان ہی کی باغبانی کا نتیجہ ہماری شاعری کے پھول پھل ہیں۔ گویا اُردو شاعری نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مغلیہ خصوصیات مٹ چکی تھیں یا مٹنے ہی کو تھیں۔ ایرانی تمدن اور ہندی معاشرت جو اصل آریہ معاشرت نہ تھی بلکہ ایک مفتوح قوم کی مخلوط اور انحطاط پذیر معاشرت رہ گئی تھی، شاہی مزاج کا خمیر بن چکی تھی۔ اور یہ اثر فرق حکومت سے اعضائے رئیسہ، قومی رگ و ریشہ میں سے سرایت کرتا ہوا ملک کے طبقے تک پہنچ گیا تھا۔ پس اُردو شاعری اس زبان کی شاعری بنی جو بھاشا کے الفاظ، فارسی کی صرف و نحو اور ترکی، عربی، ہندی، فارسی محاوروں، اصطلاحوں اور طرز ادا سے مرکب تھی۔ اُردو زبان کو شاہی سکہ تو بہادر شاہ ظفر کے بیس تیس سال قبل ہی ملا، جبکہ اُردو محاوروں، استعاروں اور مثالوں کی سند بیگمات سے لی جانے لگی۔ اور علمی درجہ اسکو شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کے طفیل حاصل ہوا، جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ ورنہ اس سے پہلے علماء اُردو میں کسی قسم کی تحریر کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ولی دکن سے دہلی میں اپنا دیوان لے کر آئے ہیں تو ان کے کلام کو تحسین و استعجاب سے سُنا اور پسند کیا گیا۔ ولی کے کلام سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ فارسی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسکے معنے یہ نہیں کہ ان کے طرز بیان میں فارسیت یا غالبیت تھی بلکہ یہ کہ اُنکے کلام میں جذبات کا اظہار فارسی شعرا کے اسلوب پر کیا گیا تھا۔ اس بارے میں ہم اُن کو الزام نہیں دے سکتے

کہ انھوں نے غیر ملک کی زبان میں حسن و عشق کا چرچا کیا۔ وہ مجبور تھے ؎

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی نے نہیں ہے

آریہ ورت کی اصلی شان و شوکت کا نظارہ ان کی آنکھوں نے دیکھا نہ تھا بھاؤ بھوتی، ویاسی، والمیک اور کالیداس کا معجز نما اور رنگا رنگ کلام انکے کانوں نے سُنا نہ تھا۔ خود وہ شیریں اور ام الالسنہ زبان جس کے بولنے والوں کی نسلیں آج دنیا کے مختلف اقطاع میں پھیلی ہوئی ہیں، زبان کی حیثیت سے ناپید ہو چکی تھی۔ پس سنسکرت کی شاعری سے کسی مقبول یا معقول درجہ تک ستفادہ کرنا دائرہ امکان سے بعید تھا۔ شاعری کے میدان میں جو تخیلات ملک کے ہر طبقے پر حاوی تھے وہ خاقانی، فردوسی، انوری، سعدی، حافظ، جامی، قاآنی، عرفی، فیضی، حزیں وغیرہم شعرا اساتذہ کے تخیلات و تصرفات تھے۔ ان زبردست و قادر الکلام شعرا کے ساتھ سمرقند، ترکستان، ایران کے مناظر چمن، کہسار، ندی نالے بھی اہل ہندوستان کے جذبات کے درد مند و غمگسار ہو گئے۔ بعینہ جیسا کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ یوروپین طرز معاشرت، طریق بود و ماند اکل و شرب، لباس و وضع، گفتگو و طرز خیال ہماری زندگیوں کا لازمہ بن گئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کوہ ہمالہ دنیا کا عظیم ترین پہاڑ ہے، مگر ہم تعریف کوہ الپائن کی ہی کریں گے کیونکہ ایسا کرنا اگر اس تاریخی پہاڑ کو دیکھ لینے کی دلیل نہیں ہے تو کم از کم اس سوسائیٹی میں ملنے جلنے اور اس لٹریچر سے آشنا ہونے کی دلیل ضرور ہے جس میں اسکی مدح سرائی کی گئی ہے۔ اگر چشم حقیقت سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے اصل باشندوں کو یا ان باشندوں کو جو اسکے متوطن ہوتے رہے، کبھی یہ دیکھ بھال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ گھر میں کیا کچھ موجود ہے!

بھیل گونڈ ابھی اس درجۂ ارتقا میں نہ پہنچے تھے کہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں اسکی مختلف شاداب و گلستاں خیز گھاٹیاں اور پہاڑیاں گنگا جمنا اور نربد اسکے تموج در وانیساں اور اودھ، گجرات اور پنجاب کی سرسبز و زرخیز زمینیں ان میں نظم کے ولولے پیدا کرتیں اور کالیداس و دوالمیک کے قابل تقلید ہیشیروان میں جنم لیتے۔ سنسکرت اور اسکی نظم ابھی زبان زد عام نہ ہوئی تھی۔ اس میں زیادہ تر قصور اس گروہ کا ہے جو دریا کو مذہباً محدود کر چکے تھے) کہ مسلمانوں کے پھیرے پھیرے ہونے لگے اور آہستہ آہستہ وہ یورشوں سے فتوحات کی شکل میں آنے لگے۔ بارھویں صدی کے آخر میں ان کے ڈیرے بھی یہیں نصب ہو گئے۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا محتاج بیان نہیں ہے۔ اکبر نے ہندو و مسلم کو ایک قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی، اسیوقت یورو پین اقوام کی تاجرانہ سیاحت اس مخلوط تہذیب میں تیسرا جزو بن کر شامل ہونے لگی۔ اور اس جزو کو جو تاثیر آج حاصل ہے، وہ سب کو معلوم ہے

بیان بالا سے جو شاید کسی قدر طول پکڑ گیا ہے، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کسی مربوط، مستقل، مسلسل اور خانہ ساز تمدن میں نشوونما نہیں ہوئی۔ بلکہ ہیئتہ غیر ملکی آب و ہوا میں پیدا ہوئی، پلی اور بڑھی یہی وجہ ہے کہ مالاتی اور مادھو اور پریا درسکا کے حسن و عشق کے چرچے لیلیٰ مجنوں شیریں و فرہاد اور مانی و بہزاد کے آگے ماند ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ رستم و سہراب و افراسیاب جو محض نامور جنرل تھے، راجگان مہابھارت اور رامائن کے اوتاروں سے زیادہ اُردو لٹریچر کا جزو بن گئے۔ فیضی نے نل دمن کو فارسی میں لکھا اور زندۂ جاوید کرنے کی کوشش کی، مگر جس اسلوب پر اردو شعرا نے قلم اُٹھائے تھے وہ ان طالب و مطلوب کو شاعری کے سوز و ساز

میں جھٹلا نہ سکا۔ اگر سنسکرت شاعری یا بھاشا کی نظم اسی تخیل، بلند پروازی اور شیرینی کے ساتھ قائم رہتی جو سولھویں اور سترھویں صدی تک جے دیو اور مادھو کے دم سے پرانی جھلک دکھلا رہی تھی اور اگر سنسکرت اپنی بیٹیوں بنگالی دیوناگری اور خود اردو کے ساتھ عصا ٹیکے ہوئے بھی زندہ رہتی تو بھی ناممکن تھا کہ سیتا، دروپدی، شکنتلا اور کنتلا کے کارنامے اور مہابھارت، رامائن، گھدوتا اور گیتا گووند اکے نازک دلفلک سیر خیالات اردو صنف نظم کو مالامال نہ کرتے۔ اس خیال کی تائید میں ہم امیر خسرو کی پہیلیاں اور دوہرے وغیرہ پیش کر سکتے ہیں فیضی کے تراجم کی مثال دے سکتے ہیں یعنی جب تک خود زبان کے انشا پردازوں میں جان رہی، ان کا اثر دیگر زبانوں کے ناظموں پر ہوتا رہا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی شاعری جو درد و سوز میں ڈوبی ہوی ہے، اب بھی زندہ ہے۔ لیکن اسکی زندگی ایسی ہی ہے جیسا کہ اٹلی میں قدیم محو شدہ لاطینی زبان۔ علاوہ ازیں جس وقت اردو علمی زبان کی شکل میں آئی ہے، اس وقت باقی سب زبانوں مثل بنگلہ، ناگری، تامل، پنجابی وغیرہ سب زبانوں کو دربارشاہی میں دخل پانے کا برابر موقع تھا بلکہ فی الحقیقت ایک وقت ایسا گذرا ہے کہ اردو زبان کا ہیولہ بھی موجود نہ تھا اور حکمرانوں کو بھاشا اور دیگر ہم مخرج زبانوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے میں کوئی تعصب یا سیاسی مصلحت درپیش نہ تھی۔ لیکن دہلی و آگرہ کے اثر نے غلبہ کیا اور جوں جوں فاتح قوم کے افراد اپنے جدید ہم وطنوں کے ساتھ شیر و شکر ہوتے گئے، فارسی اور بھاشا سہیلیاں بنتی گئیں۔ زمانے کے لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ کتابت فارسی نستعلیق کی شکل پر مجبور ہوتی۔ اب خیالات کا

مقابلہ تھا۔ اسوقت عوام کی زبان بھاشا نے جس کا کچھ نمونہ ابتک کاشی جی ہردوار اور بانگڑ کے علاقوں میں مل سکتا ہے، جو کچھ پیش کیا وہ ذہنی قوت کے لحاظ سے فارسی کے جواہر سال سے سجے ہوئے شگفتہ تخیل سے لگا نہ کھا سکتا تھا۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شعرا بھونرے کو چھوڑ کر بلبلیں پکڑنے لگے اور سورج مکھی کی جگہ گل شبو سونگھنے لگے۔ یہ کہنے سے میرا منشا ہرگز یہ نہیں کہ بلبل وگل میں شعریت نہیں ہے اور علے وجہ کمال ہیں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے غیروں کے حُسن وعشق کو اپنے دل کے حُسن وعشق پر کیوں اور کس طرح ترجیح دی۔

اب تک میں نے وہ اسباب بیان کیے ہیں جو اُردو زبان کو وجود میں لائے اور جن کی وجہ سے اُردو شاعری منفعل اور اثر پذیر ہوئی۔ اب میں اُن اسباب پر بحث کروں گا جو ہماری شاعری کی موجودہ شکل وضع کرنے میں کارگر ہوئے ہیں۔

اُردو شاعری میں سب سے زیادہ قابل اعتراض شئے وہ "معشوق" ہے جس کا سراپا انسانی ہیولیٰ میں تو نظر نہیں آسکتا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ کسی اہل دل مصنف نے مخزن میں قلمی خاکہ اس معشوق کا کھینچ کر دکھلایا تھا، مجھے یقین ہے اگر کسی شاعر نے اس خاکہ کو دیکھ لیا ہوگا تو پھر اپنے واقعی "معشوق" کی توصیف وتعریف میں بھی کبھی کوئی شعر نہ کہا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں انسان کو جانوروں، پودوں، اور پتھروں کا مثل یا مشبہ بہ بنایا جائے۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہرن کی آنکھیں دیکھکر معشوق کی آنکھ کا یاد آنا بروئے منطق جائز اور قدرتی ہے مگر اس وقت یہ خیال بھی تو آنا چاہیے کہ یہ آنکھ سخن ساز نہیں، ہم آہو دیکھکر محبوب کی گریز یاد آنی بجا مگر رم آہو خوف ووحشت سے ہے اور گریز معشوق

بے اعتنائی و نازآفرینی سے ہے ۔ ہم اپنے دلربا کو سروقد کہتے ہیں، کیوں؟ کیا بزدبان کے استعمال کے لیے قد محبوب ہی مناسب ہے! اور جب اسکے ساتھ یہ خیال بھی ملایا جائے کہ آپ سیڑھی لگا کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور آپ کے رقیبوں کا گروہ مور و ملخ کی مانند چوٹی تک کی خبر لاتا ہے، تو آپ کی بدمذاقی و بے غیرتی کا اس سے بدتر ثبوت نہیں مل سکتا ۔ اسکے معنی یا تو یہ ہیں کہ آپ کی عاشقی محض شعرگوئی تک محدود ہے، آپ شعروں میں اپنا مرثیہ کہتے ہیں اور آپ کے رقیب آپ کا عملی مذاق اڑاتے ہیں یا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا "معشوق" واقعی کوئی سرو ہے، جسکے سر پر انسان کی کھوپری لگائی ہوئی ہے، اسپر بال کچھ تو انسان کے ہیں اور جہاں سے زلفیں اور کاکل شروع ہوتے ہیں وہاں سنبل اور سانپ لٹکا دیے گئے ہیں گردن کی جگہ کسی صراحی کا ٹوٹا کر چپکا دیا گیا ہے ۔ آنکھیں ہرن کی نکال کر بٹھا دی گئی ہیں دل کی جگہ ایک پتھر باندھ دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ الغرض یہ ایسا بے حس و باحس چھلاوا ہے جس کی نظیر انسان، جن، حیوان، نباتات، موجودات میں باتمامہ مل نہیں سکتی ۔ ہر بات فرضی و ذہنی ہے ۔ مگر اسکے نتائج کیا ہوئے ۔ شاعری بجائے سچے جذباتِ محبت پیدا کرنے کے تخریب اخلاق کا پیش خیمہ ہوگئی ۔ اچھے اچھے نیک کردار شاعروں کو بھی زورِ طبیعت اور قادر الکلامی دکھانے کے لیے واسوخت جیسی نظمیں تصنیف کرنی پڑیں ۔ کیا کوئی صاحب غیرت شخص ایسے بازاری خیالات کو نثر میں آپ بیتی کے طور پر بیان کرنا بھی پسند کرے گا! لیکن تخیل کی رو میں آ کر ہم اپنے چال چلن کے ساتھ ایسی ایسی رکیک باتوں کو منسوب کر لیتے ہیں جو کوئی شریف آدمی اپنی اولاد اور بہو بیٹیوں کے لیے کبھی گوارا نہیں کر سکتا ۔ لیکن اسپر بھی واہ واہ ہوتی ہے اور بھولا شاعر بقول امیر

ع سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

ترنگ لے کر اور فرضی باتیں منظوم کرتا ہے۔ اسی ملکی حالت پر جل کر غالب مرحوم کی پاکیزہ طبیعت نے شعر ذیل کہا ہوگا:۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ہمارے معشوق پر ایک اور اعتراض ہے اور وہ بہت ہی شرمناک اعتراض ہے یعنی وہ صیغۂ تذکیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اسکی اصلی وجہ تو فارسی تتبع ہے۔ متقدمین فارسی نے عملاً یا ذہناً جس طرح بھی اس معشوق کو اپنا ہم جنس بنایا اس کی وجہ ان کی تصوف مزاجی تھی۔ صنفِ لطیف کا خیال وشوق (شاعرانہ شوق کو درجۂ استغراق حاصل ہوتا ہے) میں نفسانیت کا حملہ آور ہو جانا قرین قیاس و باعث رسوائی بھی تھا۔ اسلیے انھوں نے ناکردہ گناہ ماخوذ ہونے اور تشنیع افعاحشہ کے الزام سے بچنے کی خاطر اس اسلوب کو اختیار کیا۔ وہ اپنی پاکیزہ طبائع کے اقتضا سے ابنائے جنس کو ٹھیک صحیح الفطرت سمجھتے تھے، مگر انہیں قوم لوط کا بھی خیال آنا چاہیے تھا۔ وہ جیسا کہ شیخ عراقیؒ کے مشہور مطلع سے

صنما رہ قلندر سزاوار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس مجاز کو حقیقت کی نردباں بناتے تھے مگر بہتان لگانے والی گندی طبیعتوں نے ان پر بھی بہتان لگا یا۔ بہرنوع اس کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دنیا میں سوائے فارسی واردو شاعری کے کہیں معشوق کو مذکر نہیں باندھا گیا۔ لیکن اب اسقدر افراط ہو گئی ہے کہ

خوشتر آن باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

کی حقیقت بھی مشتبہ ہوگئی - میری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس صنف کو کھلم کھلا درجۂ محبوبیت عطا کردیں جسے قدرت نے اس کا اہل و مستحق بنایا ہے۔ ہندی شاعری میں عورت عاشق کا درجہ لیے ہوئے ہے، اس میں درد ہونے کی یہی وجہ ہے۔

ہمارے ہاں بھی ریختی ایجاد ہوئی مگر وہ رکیک ہوگئی۔ ہندی میں زیادہ تر گھریلو زندگی کو عشق و محبت کا رنگ دیا جاتا ہے، اسلیے اس میں حیوانیت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو شاعری میں اسقدر تبدیلی نہ ہو سکے گی - ہمیں حسن و عشق کو قدرتی رنگ میں دیکھنا چاہیے - اپنی اپنی جگہ ذکور و اناث دونوں میں حسن صورت موجود ہے، دونوں کے دلوں میں درد ہے احساس ہے، پس دونوں کا عاشق ہونا یا معشوق بننا عین اقتضائے فطرت ہے۔

اسی ذیل میں ایک اور اعتراض ہے، جو بالکل طبیعت انسانی کے منافی و متضاد ہے۔ وہ معشوق کی کور باطنی، سنگدلی، بے رحمی، بے رخی، آشنا بیگانگی، بیگانہ دوستی، حیائے بے معنی، شوخی لا یعنی کا ذکر ہے کہ وہ زندہ عاشق کو اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر قتل و بے جان کرنے میں مزے لیتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو کوئی معشوق روتا اور افسوس کرتا ہے اور جو معشوق کامل ہے یعنی درجۂ انسانیت سے بالکل گرا ہوا ہوتا ہے، وہ رقیبوں کے ساتھ جشن کرتا اور مُوئے سو دُرتے مُرا اس کی قبر تک کو ہموار کردیتا ہے - حالانکہ صحیح جذبہ جو انشاپردازی کے اعلیٰ ترین و شیریں ترین صنف کو پیدا کرنا چاہیے تھا وہ یہ تھا کہ اگر عشق

صادق اور محبت پاک تھی تو معشوق پر اثر ہوا اور وہ خود سوز عشق میں مبتلا ہوگیا
اور اگر عشق فاسد تھا تو معشوق کی پاکیزہ طبیعت کو روز بروز نفرت بڑھتی گئی۔
اور اس نے اس بوالہوسی پر مطلق التفات نہ کیا۔ اگر جذبات کا اظہار اسطرح کیا جائے
تو ہمارے شعر نیچرل ہوں گے اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے، اس کا سچا نقشہ
ہوں گے اور ملک کے مذاق کو صحیح راستہ پر لے جائیں گے۔ ایسے کلام سے
مجاز و حقیقت میں بھی قرب ہو جائے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے تمام
شعرا کا تمام کلام متبذل ہے، نہیں اساتذہ کے کلام حقیقت، معنی آفرینی، تنوع
اور اظہار فطرت سے خالی نہیں۔ مگر غالب حصہ جسے دیکھ دیکھکر ہر خواندہ شخص
شاعر بننے کی جرات کر بیٹھتا ہے، وہ قطعی بزم رقص و سرود کے مطلب کا
ہوتا ہے۔ اور اس سے اگر کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں تو غارتگران دنیا و
آخرت ہی سیکھ سکتے ہیں۔

ایک اور عام و فاش غلطی جو شعرائے اردو کرتے ہیں وہ مذہب سے بے اعتنائی
میں فخر کرنا ہے۔ وہ لا مذہبی کا دعوی بھی نہیں کرتے لیکن مذہب یا
پابندئی مذہب کی تحقیر کو اپنا شرف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو رمز اس خیال میں
پوشیدہ رکھی گئی تھی اور ہے، وہ غرض مند خدا پرستی کا ابطال تھا۔
یعنے خدا کی عبادت کی جائے تو نہ خوف جہنم سے اور نہ شوق حور و طہور سے فارسی
شعرا خصوصاً متصوفین نے "مذہب اور محبت" کو ایک کرنا چاہا تھا اور جس
زہد خشک و ریاکاری کی مذمت توریت مقدس میں نام لے لیکر کی گئی ہے
اس سے قوم کو بچانا منظور تھا، یہ اصول تمام ادیان پر صادق آتا ہے اور
اخلاص ہر مذہب کی بنا قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہم نے اس میں اسقدر مبالغہ اور
اور مشیخت سے کام لیا کہ ذاتی تحقیر و مذہبی تذلیل تک اتر آئے۔ اس ذیل میں

ہم نے اپنے فرضی مرتبۂ عرفان میں اسقدر دون کی لی کہ انبیا علیہم السلام تک کی منزلت کو بھلا دیا حضرت موسیٰ حضرت یوسف، حضرت عیسےٰ ہماری بیہودہ بلند پروازیوں کے بہت شکار ہوتے ہیں۔ نعت گویوں نے ان اساتذہ کو چھوڑکر جن کے کلام ایسے فواحش سے مبرا ہوتے ہیں) محمدؐ رسول اللہ کی رفعت دکھانے کی کوشش میں دیگر انبیا سے ان کا ایسا مقابلہ شروع کر دیا جو مذہباً گناہ کبیرہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس بارے میں جہاں تک مجھے اس وقت یاد ہے، ہمارے ہندو بھائیوں نے نسبتہً ادب سے کام لیا ہے۔ حضرت زلیخا کو شعرا نے غالباً کبھی ایک نبیِ جلیل القدر کی زوجہ سمجھا ہی نہیں۔ یہ سب فروگذاشتیں شاعرانہ تصرف کے بےجا اور نافہم استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ میرا یہ دعوی نہیں ہے کہ ہمارے فاضل شعرا اس امر سے آگاہ نہ تھے۔

اس جملہ بیان سے میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ اُردو شاعری میں اصلاح کا مادہ ہی نہیں ہے یا وہ اسقدر پائے سے گرچکی ہے کہ اس کا ترک کر دینا لازم آتا ہے۔ برخلاف ان اصحاب کے جو ہر وقت غیر زبانوں کی نظمیں اور گیت یاد کرتے اور گنگناتے رہتے ہیں اور اُردو ادبیات کو سراسر ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے میں تیار ہوں، کہ ہمارے اساتذہ میں قریباً ہر اُستاد کے کلام میں ایسا نمونہ موجود ہے جو انکی طبیعت کے فطرتی رنگ کی جھلک دکھلا جاتا ہے اور جو صاف عیاں کرتا ہے کہ اگر ان سے اس رنگ کو اختیار کرنے کی توقع کی جاتی، تو ان کا تمام کلام قابلِ ناز سرمایۂ ادب ہوتا۔ اب میرے خیال میں اُردو شاعری کو پاکیزہ روش پر لانے کی ترکیب اول تو خود شعرا کی توجہ سے وابستہ ہے۔ دوسرے فنِ تنقید کا

جاری کردینا اس کا صحیح علاج ہے۔ آج تک (بجز ان جستہ جستہ کوششوں
کے جو بعض اہل قلم نے رسالوں میں کی ہیں) ہمارے شعرا کے کلام پر تنقید
نہیں لکھی گئی۔ مولانا نظم طباطبائی لکھنوی (حیدر آبادی) نے شرح غالب
لکھ کر داغ بیل ڈالدی ہے۔ جو اصحاب مغربی فن تنقید سے براہ راست
واقف ہیں وہ اسکو اور جلا دے سکتے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ذوق
سلیم رکھنے والے سخن فہم اصحاب اُردو شاعری کی اس خدمت پر
کمربستہ ہوجائیں گے اور انجمن ترقی اُردو اس ضمن میں اپنے وجود کے
مفید ہونے کا عملی ثبوت دے گی۔ بہر نوع ؎

سخت کافر تھا جسنے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

عزیز منصورپوری

تبادلہ

چونکہ "تمدن" اب لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے اور اس کا موجودہ دفتر پُل
جھاؤ لال لکھنؤ ہے اس لیے تمام اڈیٹران اخبار و رسالہ جات کی خدمت
میں درخواست ہے کہ وہ تبادلہ میں اپنے پرچے اڈیٹر "تمدن" پُل
جھاؤ لال کے پتہ پر روانہ کریں۔ یہ پرچہ تو تمام اُن پرچوں کے دفتروں میں
بھیجا گیا ہے جن کا نام ہمارے تبادلہ کی فہرست میں درج ہے اگلا پرچہ صرف
ان پرچوں کے تبادلہ میں بھیجا جائیگا جو دفتر "تمدن" میں وصول ہونگے امید ہے
کہ اڈیٹران اسیر توجہ فرماکر تبادلے کے رجسٹروں میں پتہ تبدیل فرماکر مشکور فرمائیں   اڈیٹر

عالمِ خیال

آپ آ گئے تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے
ہوش آ گیا تو آپ سرہانے نہیں رہے

ناظرین - خیالی عالم کی نیرنگیاں بھی اپنے دیکھنے والے کے سامنے نت نئے جلوے ہر دم پیش نظر کرتی رہتی ہیں - دل کی خواہشوں کے مطابق - خیالی تماشہ گاہ کی اسٹیج پر ہر وقت نئی نئی سینریاں (منظر) موجود ہیں اور چشم زدن میں ادھر جھلک جھپکی ادھر غائب - غرض یہ تماشہ اپنی دلفریبیوں میں ہر وقت دیکھنے والوں کو محو رکھتے ہیں -

میرا جہاں تک خیال ہے - مجھے یقین ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں ایک بھی ایسا آدمی نہ ہوگا جو عالم خیال کی دلچسپیوں میں دن رات اُلجھا نہ رہتا ہوگا -

ہر شخص کئی دلفریب خیالات اپنے دل میں محفوظ رکھتا ہے اور جب اپنے کاروبار سے اسکو فرصت ملتی ہے ان میں محو ہو کر اُس کے مزے دل ہی دل میں لیا کرتا ہے -

معلوم ہوتا ہے دل کی قدرتی خاصیت شاید یہی ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں محو رہے شاید کوئی وقت بھی ایسا نہ ہوتا ہوگا جو حضرت دل کسی سوچ بچار میں نہ رہتے ہوں - بعض دلخوش کرنے والے خیالات کا اثر دیر تک معلوم ہوتا ہے - جس سے فلسفے والے کہتے ہیں کہ جسم کی نشو و نما بہت اچھی ہوتی ہے اور یہ صحت و تندرستی کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں اور اسی طرح بعض مایوس کن خیالات بیحد نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہتے - اسی لیے لوگوں کا

یہ کہنا سچ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا اثر جسم انسانی پر بہت زبردست پڑتا ہے
خیالی دنیا کے رہنے والے قریب قریب ساری دنیا کے باشندے کہے
جا سکتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اُن میں شاید ایک بھی ایسا نہو کہ جو دعوے
کے ساتھ کہہ سکے کہ میرا دل پانچ منٹ کے لیے بھی خیالات سے بالکل خالی رہا ہو
شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ خلا محال ہے۔

بعض دل تو واقعی خیالات کے پتلے بنے ہوئے ہوتے ہوں گے کیونکہ منٹ
بھر کے اندر حضرت دل کی شاہراہ پر سیکڑوں خیالات کی سواریاں بڑی
بڑی شان و شوکت کے ساتھ گذر جاتی ہیں۔ ادھر ایک خیال ختم ہونے نہ پایا
تھا کہ دوسرا موجود تیسرا حاضر چوتھا پیش نظر اور اسی طرح یہ نہ ختم ہونے والا
سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہانتک کہ عالم خواب میں بھی یہ خیالات پیچھا
نہیں چھوڑتے جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر متفرق طور پر سامنے آتے رہتے ہیں۔

خیالات کو ایک مرکز پر قائم کرنے والے ہی اُس تنہائی کے مزے اچھی
طرح جانتے ہیں جو گوشۂ عافیت میں دین و دنیا سے بے خبر ہو کر کسی کے
تصور میں محو رہتے ہیں۔ ایک مشتاق دیدار آدھی رات کے وقت جبکہ
ہر طرف سناٹے کا عالم ہے دنیا کے نظارے پر ڈراپ سین پڑا ہوا ہے
عالم تصور میں کسی کی صورت کا نقشہ پیش نظر کیے ہوئے اس لطف کے
مزے لے رہا ہے جو اُس کے خیال میں اتنا بے بہا ہے کہ جس میں از حد محو
ہو کر اپنی ہستی تک کو بھول گیا۔ اور ایک بیخودی کے عالم میں کہہ رہا

آپ آگئے تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے

اور جس وقت یکایک کسی دبدبے سے چونک پڑا تو وہ بیش قیمت نظارہ
سامنے سے غائب ہو گیا۔ اب پچھتا پچھتا کر کہہ رہا ہے۔

ہوش آگیا تو آپ سرہانے نہیں رہے۔ ایسی ہوشیاری سے بیہوشی اچھی
نیرنگ خیال کا سماں دنیوی رنگینیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ صرف اتنا
فرق ضرور ہے کہ عالم خیال میں ناکامی کا نحس وجود مفقود ہے۔

تصور میں مزے لیتا ہوں وصل یار کے ہردم
مجھے ملتا ہے وہ لکھا نہیں جو میری قسمت میں

اے شکستہ دلوں کی مومیائی۔ اے زخمی تنوں کے لیے مرہم زنگار تصور اگر
دنیا میں لطف کا کچھ نشاں پایا جاتا ہے تو وہ تجھ ہی میں ہے خیالی دنیا کے رہنے والوں
سے یقیناً اس کے مزے پوشیدہ ہوں گے۔

ہمارے وصل سے نفرت سہی ارماں تو رہنے دو + شاد و گے اسے بھی کیا جو لکھا ہے مقدر میں

ارمانوں کے مزے۔ حسرتوں کے لطف۔ آرزوؤں کا ہجوم۔ تمناؤں کی دھوم اگر
کسی کو دیکھنی ہو تو عالم تصور میں دیکھے۔ کیسے کیسے لطیف نظارے پیش نظر ہوتے
ہیں۔ کہ جنسے جدا ہونے کو اگر قابو چلے تو حشر تک جی نہ چاہے ایک مشتاق
جمال فرماتے ہیں کہ اگر وصل سے نفرت ہے تو ارمان ہی رہنے دو یعنی ہم ارمانوں
کی سیری بذریعہ تصور ہی کر لیا کریں گے۔

تصور ایک نہایت تیز دست مصور ہے جو حسب منشا ہر شے کا ہو بہو نقشہ
چشم زدن میں تیار کر کے نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے جس میں کہیں
اعتراض کرنے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اور پھر بے دغدغہ جب تک جی چاہا
کسی ایک نظارے کو دیکھے جائے جس سے دلچسپی ہے۔ اور جس وقت طبیعت سیر
ہوئی ایک سکنڈ میں سارا کارخانہ درہم و برہم کر دیا۔ گویا کچھ تھا ہی نہیں
ایک ایسی دنیا ہے جو سنٹ منٹ بھر میں بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ حضرت دل
کے بنانے کی ... ن میں جب چاہتے ہیں بے مصالحہ کے بنا لیتے ہیں جیسے

مکڑی جالا تن لیتی ہے اور خود ہی اُسمیں پھنس جاتی ہے اسی طرح تمام آدمی اپنے اپنے خیالات کے سلسلے میں محو ہیں۔ اور اسی میں قید نظر آتے ہیں۔ او ہو غلطی ہوتی ہے۔ قید نہیں۔ اپنی ہستی کو قائم رکھتے ہیں۔ اگر خیالات کا وجود نہ رہے تو میرے خیال سے زندگی ممکن نہیں تو محال ضرور ہو جائے۔ اس لیے خیالات کا سلسلہ انسانی زندگی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ اگر مان لیا جائے تو میری رائے میں شاید کچھ بیجا نہ ہو گا۔

م-ج-ا- دہلوی

سفرنامۂ قاری

والد ماجد قاری سرفراز حسین صاحب نے ہندوستان سے باہر ابتک دو سفر کیے ہیں۔ ایک دس برس ہوے جاپان میں اور دوسرا پچھلے سال انگلستان میں۔ انکا ارادہ کوئی مستقل سفرنامہ لکھنے کا نہ تھا مگر انھوں نے کچھ نوٹ اپنے سفروں کے قلمبند کر لیے تھے ان نوٹس میں اُن باتوں سے بہت کچھ گریز کیا گیا ہے جو عام طور پر سفرناموں میں درج ہوتی ہیں۔ مثلاً تاریخی اور جغرافیہ کی باتیں مگر وہ باتیں خاص طور پر قلمبند کی گئی ہیں جن سے نوجوانوں کو عمدہ اخلاقی سبق حاصل ہوں۔ اب اپنے متعدد احباب کے اصرار سے انھوں نے اپنا سفرنامہ ناظرین "تحلّن" کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مرتب کرنا شروع کیا ہے۔ پہلی قسط جو بقول جناب والد ماجد کے بالکل خشک ہے اس پرچہ میں درج ہے۔ انشاء اللہ آیندہ اس سفرنامہ میں بہت دلچسپ اور مفید باتیں درج ہوں گی۔

ایڈیٹر

غروب آفتاب

آیندہ کے لیے تو ہم کو حضرات لکھنؤ سے بہت کچھ توقعات ہیں مگر اس دفعہ نثر میں اہل لکھنؤ کا بہت کم حصہ ہے مگر نظم کے حصہ میں حضرات لکھنؤ کا کلام قابل شکریہ ہے اور یہ ہمارے دیرینہ کرم فرما مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی کی عنایت کا نتیجہ ہے جنھوں نے نہ صرف خود ایک غزل اور ایک نظم مرحمت فرمائی بلکہ اپنے شہر کے دیگر مشہور شعرا سے غزلیں دلانے میں کوشش فرمائی اور لکھنؤ کے مشہور شعرا سے ہمارا تعارف کرایا۔ جناب ثاقب صاحب نے مستقل طور پر ہمکو اپنا کلام مرحمت فرمانے اور اپنے احباب سے ان کا کلام دلانے کا وعدہ فرمایا ہے جس کے ہم تہِ دل سے ممنون ہیں بلکہ حضرت ثاقب نے اس قدر عنایت اور فراخ حوصلگی سے کام لیا ہے کہ دوسرے پرچہ کے لیے بھی غزل عنایت فرمادی ہے۔ امید ہے کہ جناب ثاقب صاحب کی طرح ہندوستان کے دیگر مشہور شعرا اور نثار صاحبان اپنا کلام ہم کو عنایت فرما کر شکریے کا موقع دیں گے اور یہ یقیناً ہمارے گلدستہ کے لیے موجب فخر و ناز ہوگا۔ حضرت ثاقب کی نظم حسب ذیل ہے۔ (ایڈیٹر)

نتائج فکر مرزا غالب حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

خدا کا نام لے اے طالبِ نور ۔۔۔ کہ دن کی روشنی ہوتی ہے کافور

سرِ مشرق پہ آ پہنچا اندھیرا ۔۔۔ عنانِ مہر کو گردوں نے پھیرا

غضب ڈھایا شبِ نو میہماں نے ۔۔۔ افق کو آگ دے دی آسماں نے

رخِ مشرق پہ رنگ سوسنی ہے ۔۔۔ درِ مغرب پہ کچھ کچھ روشنی ہے

شفق میں ہے یہ سورج کا قرینہ ۔۔۔ کہ جیسے آگ میں نانِ شبینہ

کہاں تک دھوپ کی رنگت ہو زرد | ہوا جاتا ہے برج آتشیں سرد
تڑپ مدہم ہے روئے شعلہ زا کی | جلا جاتی رہی طشتِ طلا کی
شعاعوں نے جو آنکھیں پھیر لی ہیں | اندھیرے نے بھی راہیں گھیر لی ہیں
فروغ مہر تھا جن کے سہارے | وہ تارا اب ہو گئے معدوم سارے
جو دیکھا سیہ چراغِ زیرِ دامن | پرندوں کو ملی راہِ نشیمن
چلا ہے کوئی سوئے آشیانہ | بٹھائے ہے کسی کو حرصِ دانا
اُڑے جاتے ہیں سارے جانے والے | ارادے میں ہیں جلدی کھانے والے
اندھیرے کا جو بیچاروں کو ڈر ہے | کبھی دہنے کبھی بائیں نظر ہے
شمالی سمت کو جاتا ہے اک غول | کہ جس کی سبز پوشاکیں ہیں انمول
صدا پرواز کی آتی ہے ہر گام | بیاباں میں ہے سناٹا سرِ شام
ڈھونڈلکا ہو چلا ہے اب زمیں پر | کہیں ظلمت سوا ہے کم کہیں پر
توقف کا زمانہ ہے بہت کم | گلے ملتے ہیں دونوں وقت باہم
ہٹا کر طائروں کو زیرِ اشجار | سیہ بستر لگاتی ہے شبِ تار
سفر بھی ساتھ ہی دن کے ہے آخر | قریب آئے ہیں منزل کے مسافر
ہے دل کو رہروں کے فکرِ آرام | کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں سرمۂ شام
کنانت سے طبیعت کو ہے الجھن | جھٹکتے ہیں غبار آلودہ دامن
کہیں مارے ہوئے منزل کے بیٹھے | وہ کیا بیٹھے سفینے دل کے بیٹھے
رگیں لیتی نہیں آرام اب تک | وہاں آئی نہیں ہے شام اب تک
وہ جنبش کر رہی ہیں اس طرح سے | کوئی دم توڑتا ہو جس طرح سے
بہم پہنچے نہیں راحت کے ساماں | تھکے ماندے مسافر ہیں پریشاں
کوئی تو آگ روشن کر رہا ہے | کوئی تدبیرِ مسکن کر رہا ہے

گئی ہمراہ مہر اس کی روانی — تھا بہتے ہوئے دریا کا پانی
کیا لہروں نے پیدا رنگ گیسو — سیہ ہونے لگا آئینہ جو
نظر آئی جو پانی میں سیاہی — تو جل اُٹھے چراغ فلس ماہی

نوید رحلت پروانہ لائیں
گھروں میں سے لیاں شمعوں کی آئیں

غزل ظرافت

حضرت ظریف لکھنوی کا کلام اپنی خاص نوعیت میں بہت ممتاز درجہ رکھتا ہے جو ناظرین کو غزلیات پڑھنے کے بعد معلوم ہوجائے گا انھوں نے دو غزلیں عنایت فرمائی ہیں جنمیں سے ایک غزلیات کی ذیل میں درج ہوا اور یہ یہاں درج کی جاتی ہے — **ایڈیٹر**

جناب منشی سید مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی
حسب فرمائش جناب ثاقب قزلباش

ترے کپڑوں کی لادی لادنا جب یاد کرتے ہیں — [illegible] شب کو دھوبی کے گدھے فریاد کرتے ہیں
کہو اُنسے جو اکثر شکوۂ بیداد کرتے ہیں — سبب اُنکے داد ہو جاتا ہے کیوں فریاد کرتے ہیں
بتوں کو بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں — برہمن جب سفر سوئے الہ آباد کرتے ہیں
نہ گردن مارتے ہیں یہ نہ دیتے ہیں کبھی پھانسی — حسینوں کو یہ سب مشہور کیوں جلاد کرتے ہیں
یہ مجنوں کو کہن تو جس زمین شعر کو دیکھو — دہاں [illegible] اس پل کے اک عاشق پڑا آباد کرتے ہیں
ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر — ستم [illegible] کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں
ہمیں بتلا دیں عاشق ہیں جو دو ے کتابی کے — سبق [illegible] کیا کوئی معشوق جسکو یاد کرتے ہیں
سیہ مستوں کی شادی دختِ رز کے ساتھ ٹھہری ہے — مبارک حضرت پیر مغاں داماد کرتے ہیں
چڑھیا رہا کو کیسے شوق سے کیا ہرج ہے اسمیں — [illegible] دل تیکے جو صیاد کرتے ہیں
یہ واٹرلیس کوئی ٹیلی گرام اسمیں لگا ہے — کہ ہمکو ہچکیاں آتی ہیں صاحب یاد کرتے ہیں
حسینو کیا تمھارے باپ کے ہیں ہم غلام آخر — جو کہتے ہو ظریف اب ہم تمھیں آزاد کرتے ہیں

خدائی فوجدار

موجودات عالم میں یا یوں کہیے کہ اس ظاہری دنیا میں قدرت کے تمام کاموں کا ایک دلچسپ نقشہ انسانوں کی آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے کہیں ایک شخص عدالت کی کرسی پر رونق افروز ہے اور میزان عدل کے پلڑوں کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور انصاف کے لیے رتی سے رائی کا فرق نکال کر قدرت کے اس ضروری کام کو انجام دے رہا ہے جس کے بغیر کم از کم اس ظاہری دنیا میں ایک منٹ کو بھی کام نہیں چل سکتا۔ آگے چل کر دیکھیے تو ایک دوسرا شخص اپنے اوپر زیادتی کرنے والے کو محض اسلیے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اسپر رحم کرنا چاہتا ہے۔ ایک تیسرا شخص جو ان دونوں کے معاملہ کو دیکھ رہا ہو وہ ایک طرف تو رحم کرنے والے صاحب کی نیکی کی تعریف کرے گا مگر جب اُسکو خدائی فوجداری کا خیال آئے گا تو اس کو محسوس ہو گا کہ اگر اس شخص کو بغیر سزا دیے چھوڑ دیا گیا تو یہ شخص آگے چل کر دوسرے شخص پر محض اس امید پر زیادتی کر سکتا ہے کہ وہ بھی مجھپر رحم کردے گا۔ یہ خیال آتے ہی ہمارے خدائی فوجدار صاحب آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور انصاف کے طالب ہو کر رحم کرنے والے سے لڑنے لگتے ہیں۔ نیکی برباد گناہ لازم کی مثل صادق آتی ہے ہم یہاں سے اپنے خدائی فوجدار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شکرہ ایک درخت پر بیٹھا ہوا ایک چڑیا کو کھا رہا ہے۔ ہمارے خدائی فوجدار اس حرکت پر بہت طیش میں آئے اور اس شکرہ پر بندوق چلائی۔ تقدیر کا اچھا تھا

اتفاق سے شکرہ اُڑ گیا اور ہمارے خدائی فوجدار غصہ میں بڑبڑاتے ہوئے رہ گئے۔ ہمارے خدائی فوجدار دنیا کے اُن مشہور اور ہمدرد لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں دنیا میں ظلم اور زیادتی کے انسداد کے لیے وقف کردی ہیں اور اخیر میں یہ معلوم ہوا ہے کہ اسکا علاج کچھ نہیں۔

گوتم بُدھ نے اس ایک نکتہ پر قادر ہونے کے لیے جو کچھ ریاضتیں کیں وہ آج کسی سے چھُپی نہیں اور اصل تو یوں ہے کہ اسکی دنیا سے ظلم اور زیادتی کو مٹانے کی ہی کوشش نے اسکے اتنے پیرو کردیے اور اس کو بہت کچھ منوا دیا۔ ہمارے خدائی فوجدار صاحب تو ان لوگوں میں سے ہیں جنکو دنیا اور دنیا والوں میں بیسیوں عیب معلوم ہوتے ہیں مگر اپنے میں عیب نظر نہیں آتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا شہتیر دکھائی دیتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر تنکا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ خدائی فوجدار سیر وشکار کے شوقین اور گوشت کھانے کے دلدادہ ہیں اگر آپ سے کوئی یہ پوچھے کہ جناب جب مرغیاں آپ کے لیے حلال ہیں تو آخر کیوں شکرے کے لیے چڑیا حرام ہونے کا فتوی آپ دیتے ہیں شکار میں جاکر آپ بیسیوں پرند اور چرند مار کر لاتے ہیں اور وہ آپ کے لیے کیونکر روا ہیں اور انکا گوشت آپ پر کیونکر حلال ہے۔ خدائی فوجدار صاحب یہی جواب دیں گے کہ قدرت نے یہ چیزیں ہمارے لیے وضع کی ہیں۔ خوب۔ اس اللہ کے بندے سے کوئی یہ تو پوچھے کہ۔ آپ نے قدرت پر کون سا احسان کیا ہے کہ جو قدرت نے آپ کو دنیا کی چیزوں کے جان ومال کے حقوق بخش دیے اور شکرے پر قدرت کا آپ نے کیونکر عتاب مان لیا کہ اس بچارے کو موجودات کا ایک چھوٹا سا پرند جانور کھانے کی اجازت نہیں۔ اس سے آگے چلیے تو اس

چڑیا نے قدرت کا کون جرم کیا ہے جو وہ شکرے کا شکار ہوئی اور وہ جانور جو
آپ کی زبان کے ذائقہ کے لیے ذبح کیے۔ تڑپائے۔ بھونے جُھلسے جاتے ہیں وہ
کس جرم کی پاداش میں گردن زدنی کے قابل ہیں۔ خدائی فوجدار صاحب اگر
اس سین کو دیکھ لیں جو ایک بلی چوہا پکڑ لینے کے بعد پیش کرتی ہے تو خدا جانے
یہ آپے میں بھی رہیں یا نہیں۔ کہ بلی ایک جان کو سِسکا سِسکا کر لینا اپنے
لیے باعث تفریح قرار دیتی ہے۔ مگر حضرت اگر بلی ظالم ہے تو آپ کون سے
رحم دل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کسی جانور کو اپنی تفریح طبع کے
لیے مار کر زہر مار کرنے کا اپنے تئیں حق دار سمجھتے ہیں اور اگر کوئی پوچھے
تو بتا دیتے ہیں۔ مگر شکرے اور بلی کے زبان نہیں ہے وہ بھی چڑیا اور چوہے
کو کھانے کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہیں مگر آپ کی طرح کج بحثی نہیں کر سکتے

جہاں دیکھو حضرت انسان درندوں کا ذکر "موذی" جانور کہہ کر کرتے ہیں
کوئی پوچھے کہ وہ موذی کیوں ہوئے؟ کیونکہ وہ انسان کو کھا جاتے ہیں
کیا خوب۔ کیا نرالی منطق ہے۔ آپ کو جو کھائے وہ موذی اور آپ اگر
کسی کو کھائیں تو آپ کو کوئی خطاب بھی نہیں دیا جائے بلکہ آپ نہایت
سادہ لوحی سے کہہ دیں کہ یہ چیزیں ہمارے لیے بنائی گئی ہیں۔ اگر آپ
کو انسان اسی لیے بنایا گیا تھا کہ آپ اپنے لیے ہر چیز کو جائز قرار دے لیں
اور دوسرے کے لیے ناجائز تو سلام ہے آپ کی اس انسانیت کو۔

دنیا کی اس اسٹیج پر ہر ایکٹر کے پارٹ پر کوئی نہ کوئی نکتہ چینی ہو سکتی
کیونکہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی کام جو ایک کی منفعت کے لیے
کیا جا رہا ہے دوسرے کا اسمیں نقصان ہوتا ہے۔ اور اس لیے د
کے اس کاروبار میں نکتہ چینی کرنے کے بعد آدمی کو یہی معلوم ہوتا ہے

کہ میری نکتہ چینی فضول ہے اور دنیا میں ہر شخص اپنا پارٹ اتنی خوش اسلوبی سے کر رہا ہے اور اُسکا وہ پارٹ اتنا ضروری ہے کہ بغیر اسکے اس نیرنگ دنیا کی اسٹیج پر ایک ایسا ایکٹر کم ہو جاتا ہے جس سے بہتر اس خاص نوعیت میں کوئی دوسرا ایکٹر وہ پارٹ نہیں کر سکتا جو قدرت نے اس خاص شخص کے لیے وضع کیا ہے جسکے پارٹ پر جناب معترض ہیں۔

اخلاق حسین

ضروری اعلان

اس رسالہ کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ انشاء اللہ اسے مستقل محنت اور کوشش کے ساتھ تدریجی ترقی دیجائے۔ شروع کے پرچوں میں آب و تاب اور غیر معمولی دلکشی کے سامانوں سے ارادتاً پرہیز کیا گیا ہے۔ ورنہ بہت کچھ ممکن تھا۔ تدریج انشاء اللہ تعالیٰ اسے نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بنانا مقصود ہے بلکہ اس سے چند اور ضروری علمی کام لینے ہیں مثلاً (۱) اُن حضرات کی قابل قدر تصنیف و تالیف کو اپنے خرچ سے چھپوانا اور شائع کرنا جو بعض مجبوریوں سے خود ایسا نہیں کر سکتے۔ جن صاحبوں کو ہمسے یہ خدمت لینی منظور ہو وہ براہ نوازش ہمسے خط و کتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جائے گی۔ (۲) وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوانا اور ہونہار طالب علموں کو خاص طور پر اس علمی خدمت کیطرف متوجہ کرنا اور اُن سے مضمون لکھوا کر اُنکی مالی خدمت کرنا۔ بعض اوقات انعامی مضامین ہم خود تجویز کریں گے مگر جو صاحب کسی خاص مفید مضمون پر قلم اُٹھانا چاہیں اور ہم سے حق الخدمت کے متوقع ہوں وہ براہِ نوازش ہم سے خط کتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جاے گی۔ (۳) خریداران "تمدن" کے لیے ایک سرکیولیٹنگ لائبریری قائم کرنا۔ جس سے بہت کم خرچ میں عمدہ عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے گذر سکیں۔

السعی منی والاتمام من اللہ

ایڈیٹر

امیر غریب

سوال۔ اے دل بے مدعا۔ یہ جہاں منی کا تماشا ہمیں اچھا نہیں لگتا
بیگم صاحبہ کی سواری دور سے جاتی ہو۔ تو جہاں ہو ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے
اپنے دکھ درد کچھ کم ہیں جو نواب صاحب کی تندرستی کی دعائیں مانگتا ہے
اپنے بال بچوں سے دور پڑا ہے مگر صاحبزادے صاحب کو دیکھکر باغ باغ
ہو جاتا ہے۔ میری جان تجھ میں کیا کمی ہے جو ناظم صاحب نائب صاحب
اور ڈاکٹر صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے سچ بتا کوئی غرض تو ہمیں
پوشیدہ نہیں ہے؟ یہ نہیں تو صرف امارت کا رعب ہے؟ یہ جو" آئیے
حضرت" کہکر مزاج پوچھتے ہیں اس سے دل بڑھ جاتا ہے؟
دیکھ سلامت روی کے مرکز سے مت ہٹ۔ خوشی جسکا تو بفضلہ تعالیٰ
مالک ہے ریاست۔ وزارت۔ نیابت۔ سب سے بڑھکر ہے۔ فارغ البالی جو
تجھے نصیب ہے خلش والی بے انتہا دولت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ چل
اس وجاہت پرستی سے منہ موڑ۔ گوشہ نشینی اختیار کر اللہ کا نام لے اور
قناعت! در سرور دائمی کی موت مرنے کے لیے مردانہ وار تیار رہ۔

جواب۔ اے پیاری روح۔ اے صدائے ربانی۔ تیری تنبیہ تیری
جھڑکیوں اور لعن طعن پر ظاہر بینوں کی ہزار ہا تحسین و آفرین قربان۔
خدا تجھے قائم رکھے۔ تو نے اچھے وقت میں خبر لی۔ دل میں جو کچھ چور ہیں اُس
سے تو بھی واقف ہے۔ خدا شاہد ہے بیگم صاحبہ سے بہت زیادہ عظمت
دل میں اُس دکھیاری بیوہ عورت کی ہے جو چکی پیس کر اپنا بھی پیٹ بھرتی

اور اپنے یتیم بچوں کا جسے تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی - عزت نہ آبرو - مگر جو - محنت - صبر اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کر کے حیات عظیم کے لا انتہا زنجیر میں ایک گمنام مگر بے حد ضروری کڑی ہونے کا ثبوت دے رہی ہے -

نواب صاحب کو خدا صحت اور عمر عطا کرے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی جان سے ہزار درجہ زیادہ اُس شخص کی جان عزیز ہے جو غریب کنبہ - غریب بچوں - غریب عورتوں کا وارث ہے جس کو نہ کوئی تفریح درکار ہے نہ سامان عیش - فرض اور ادائے فرض جسکی جان عزیز کی صدائے پُر درد ہے - جسپر ہر امیر جس وقت چاہے ظلم کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے جس پر ہر آفت جس وقت چاہے آ جاتی ہے - مگر جس کے دل سے گھر بار کی فکر - محنت اور استقلال کا خیال ایک لمحہ بھر کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتا -

صاحبزادے صاحب سے کہیں زیادہ وہ معصوم بچے دل میں بسے ہوئے ہیں جن کو آنکھ کھول کر نہ باپ کا سایہ نصیب ہوا ماں کا بچھوا - جو کسی کے سامنے مُنھ سے بھی نہیں نکال سکتے کہ ہمارا جی کیا کھانے کو چاہتا ہے اور کیا پہننے کو - عرش کے کنگورے اُن کے درد پر ہل جائیں تو ہل جائیں مگر بے درد دنیا ٹس سے مس نہیں ہوتی - وزرا امرا ہبت دیکھے ہیں مگر ہم تو ان سادہ مزاج سادہ حال غریبوں کے دیوانے ہیں جن کے دل خوف خدا سے لرزتے ہیں اور جنکو تصنع اور تکلف کی ایک بات بھی نہیں آتی -

بالاجمہ - میری جان - میں تجھے بتاؤں کہ پھر کیوں بیگم صاحبہ کی سواری کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں - کیوں نواب صاحب کے لیے دعا مانگتا ہوں کیوں صاحبزادے صاحب کو دیکھکر خوش ہو جاتا ہوں - اور کیوں ناظم صاحب نائب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے پھرتا ہوں -

میری جاں۔ دیکھ۔ ان سے غریبوں کی عزت ہے۔ یہ بیکسوں کا سہارا ہیں اول تو یہ اچھے ہیں ہی۔ اور اگر اور زیادہ اچھے ہو جائیں تو غریب ترِ جائیں بیوائیں۔ یتیم۔ بیمار۔ محتاج۔ بے علم۔ سب ان کے ایک آنکھ کے اشارے میں ادھر سے اُدھر ہو جائیں۔ مدرسے۔ حرفت و صنعت کے اسکول یتیم خانے۔ محتاج خانے۔ یہ۔ وہ۔ اور جو کچھ ہو وہ سب امرا کر سکتے ہیں۔ جن جن ملکوں میں اور جن جن وقتوں میں غریب ترے ہیں امرا ہی کی بدولت ترے ہیں۔ توفیق الٰہی شامل حال ہو اور غریبوں کا دکھ درد کوئی ان کو بتاتا رہے تو پھر دیکھو یہی امیر ظلِ سبحانی ہیں۔ یہی امیر ابر رحمت ہیں یہی بیکسوں کا سہارا اور رانڈ بیوہ اور یتیموں اور مظلوموں کی پشت و پناہ ہیں۔ خدا انھیں قائم رکھے اور نیک توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

خوش نصیب ستارے کے تحت میں نقرئی چمچہ منھ میں لے کر دنیا میں پیدا ہوے ہیں۔ ان سے یہ توقع کرنی قانون فطرت کے خلاف ہے کہ یہ لوگ روکھی سوکھی کھائیں گے موٹا جھوٹا پہنیں گے۔ ریاضات شاقہ کریں گے۔ نفس کو ماریں گے اور ہر طرح غریبی سے زندگی بسر کریں گے۔ ان کا مشن پورا اور ان کی نجات محفوظ ہے اگر انکو غریبوں کے حال پر نظر ترحم رہے۔ یہی دعا ہے اور اسی لیے ان کو سلام کرتا ہوں۔

سرفراز حسین قاری

ایران کا ایک حسرتناک منظر

مین سنہ ۱۹ء میں براہ کوئٹہ و بلوچستان و افغانستان سرحد ایران میں داخل ہوا اور سیستان سے ہوتا ہوا چار ماہ پندرہ روز بعد شہر مشہد مقدس میں پہنچا۔ ایک روز ایک راستہ سے میں گذر رہا تھا کہ ایک دریچۂ کلاں نظر پڑا اسکے قریب ایک چارپائی پر لاش پڑی دیکھی اور اس کے سرہانے ایک کاسہ رکھا تھا جسمیں کچھ پیسے پڑے ہوے تھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب کوئی غریب و نادار مرجاتا ہے تو اسکی نعش کو ایسی گذرگاہوں میں ڈالدیتے ہیں تاکہ راہرو حسب مقدور کاسے میں کچھ تجہیز و تکفین کے لیے ڈالدیں۔ مقام خاص پر یہ منظر کچھ ایسا عبرتناک تھا جسکا اثر قابل بیان نہیں نہ تحریر میں آسکتا ہے اُسی حالت کو مختصر طور سے ان چند اشعار میں دکھایا گیا ہے

نشر تم منھ اُٹھاے جاتے ہو کسطرف ٹھہرو
پڑا ہے راستہ میں کس کا لاشا دیکھتے جاؤ

مسافر ہے کوئی عاشق ہے کوئی یا کوئی مفلس
کوئی زخمی ہے یہ یا کوئی پیاسا دیکھتے جاؤ

تمھاری قوم کا ہے یا کوئی اقوام دیگر سے
یہ بیدردی نہیں اچھی خدارا دیکھتے جاؤ

مجھے امید ہے ہوگا تمھاری قوم کا کوئی
یقین بھی تمکو ہو جائیگا اچھا دیکھتے جاؤ

تمھاری قوم کا گر ہے تو بس گویا تمھیں تم ہو
اسے دیکھو نہ دیکھو حال اپنا دیکھتے جاؤ

پڑا ہے راستہ میں پوچھنے والا نہیں کوئی
تم اپنی قوم کی غفلت کا نقشا دیکھتے جاؤ

پڑا ہے کب سے کیونکر مر گیا کیا حادثہ گذرا
ذرا پوچھو کسی سے حال اسکا دیکھتے جاؤ

یہ کیسی رسم جاری ہے تعجب دل کو ہوتا ہے
ہوی ہے قوم اسی صورت سے رسوا دیکھتے جاؤ

بہت آواز دی عبرت نے حسرت لاکھ چلائی
مگر تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا دیکھتے جاؤ

احسن مرزا نشر مشہدی لکھنوی

پرستان کا جلوہ

اس سچے چشم دید قصے کا ایک حصہ اختصار کے ساتھ اودھ اخبار
میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ قصہ بہت عجیب اور دلچسپ ہے اسلیے
ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ قصے کے سچے ہونے میں
بالکل کلام نہیں"! ایڈیٹر

دنیا ترقی کے موٹر کار پر سوار ہے اور زمانہ بہت سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے ہر طرف ہر علم و فن میں ترقی ہو رہی ہے اور سائنس اور علوم کی ترقی سے وہ چیزیں ممکن معلوم ہونے لگیں جو امکان سے بعید نظر آتی تھیں۔ ایک صدی قبل بجلی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کسی شہر کے تمام لیمپ خود بخود ایک ساتھ روشن ہو جائیں۔ اس زمانے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی ایجاد ہونے کا امکان ثابت کرنا چاہتا تو لوگ اسکو قیس عامری نہیں تو جارج اسٹیوں سن (جس نے چلتا ہوا انجن ایجاد کیا تھا) کا سا مجنوں ضرور بنا لیتے۔ ایک صدی کا ذکر تو جانے دیجیے ایک دس برس پیچھے ہٹ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ آلہائے پرواز جو آج آپ کو آسمان پر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں انکا وجود کچھ بھی نہ تھا۔ پرانے زمانے کے قصے کہانیوں میں بعض ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں کہ جو اس وقت گویا ناممکن تھیں۔ وہ لوگ جو تعلیم کی روشنی سے معمور ہو گئے ہیں بہت سے قصہ جات کو بالکل مہمل خیال کرتے ہیں۔ میں خود ان لوگوں میں سے ایک ہوں کہ جو فسانہ عجائب اور مثنوی بدرمنیر اور اسی قسم کے دوسرے قصوں کو سچ خیال کرنا انتہائی حماقت خیال کیا کرتے ہیں اور باوجودے کہ یہ

میری آنکھوں کے سامنے ایک اس قسم کا واقعہ گذر گیا مگر اب گو ان قصوں کو صریح جھوٹ سمجھنے کا اعتقاد کچھ پژمردہ سا ہو گیا مگر باوجود اس مشاہدہ کے میرے اعتقاد نے ابھی اتنا پلٹا نہیں کھایا کہ میں ان کو سچ سمجھنے لگوں۔

میں اس چشم دید قصے کی ابتدا یہاں سے کرتا ہوں کہ میرے متعلقین دہلی سے لکھنؤ آنے والے ہیں آنے سے پہلے وہ مع چند اور بچوں کے شیخ ہرے بھرے صاحب کی زیارت کو تشریف لیے جاتے ہیں جسوقت وہ زیارت کے لیے گئے رات کے کوئی دس بجے تھے گرمی کے دن اندھیری رات اسپر کچھ ابر غرض رات بہت بھیانک سی تھی وہاں جاتے وقت ان لوگوں کو کچھ خوف سا محسوس ہوا مگر اسکی طرف توجہ نہ کرکے یہ لوگ وہاں مزارات پر فاتحہ پڑھ کے واپس آ گئے اس رات کو دہلی میں رہ کر دوسری رات کو لکھنؤ روانہ ہو گئے لکھنؤ پہنچکر ایک رات گذر گئی دوسری رات کو یہ ساری پارٹی کوٹھے پر سوئی اور ان میں سے ایک صاحب جو اس افسانہ کے ہیرو ہیں کوٹھے ہی پر دوسری چھت پر سوئے (صاحب افسانہ جن کا اصلی نام درج کرنے کے بجاے ہم وہ نام درج کرتے ہیں جو انھوں نے اس واقعہ میں اپنے لیے پسند کیا اور وہ بادشاہ بے وزیر ہے) رات کے کوئی ایک بجے کے قریب شدید آندھی آئی اور ابھی یہ آندھی فرو نہیں ہونے پائی تھی کہ ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب کی زبان سے سوتے ہی بہت زور سے آواز نکلی کہ "میں نہیں جا سکتا" اس آواز کو سنتے ہی سب لوگ چونک پڑے اور ابھی انکی طرف متوجہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ یہ چارپائی سے زمین پر آرہے اور فوراً ہی نہایت تیزی کے ساتھ اندھیرے میں دو کمروں کو اور ایک زینے کو طے کرتے ہوے مکان کے دروازے سے جا ٹکرائے اور وہاں سے واپس آکے وسط صحن میں گر کر بیہوش ہو گئے۔

اتنے میں کوٹھے پر سے سب لوگ نیچے پہنچ گئے اور اُن کو سنبھالا وہ بیہوش تھے سانس نہایت تیزی سے چل رہا تھا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اسی حالت میں وہ کبھی ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے پکڑو وہ مجھے مارنے آتی ہے اور کبھی غصہ ہوتے تھے اور بُرا بھلا کہہ کر زور سے چلاتے تھے کہ میں اس کو مار ڈالوں گا اور ضرور بدلا لوں گا اور جھپٹ کر بھاگنے کی کوشش کرتے تھے ایک بجے سے کوئی چار بجے تک یہ حالت رہی اسکے بعد صبح اُٹھے تو اچھے تھے ان سے دریافت کرنے پر اُنھوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ دکھائی دیا کہ دو عورتیں جنمیں سے ایک جوان گلابی ساری باندھے ہوئے تھی نہایت انداز سے آئی یہ عورت اپنے عالم شباب میں تھی اور مجھے اسقدر حسین معلوم ہوئی کہ میں نے عمر بھر میں کوئی عورت ایسی حسین نہیں دیکھی دوسری بوڑھی عورت معمولی لباس میں تھی اور اس کی شکل نہایت خوفناک تھی۔ ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب کو جو کوئی اُنیس برس کی عمر کے اور اوسط درجہ کی شکل وصورت کے آدمی ہیں اس حسین نوجوان نے آکر جگایا اور اُس نے خواہش کی کہ وہ اُسکے ساتھ چلیں جسکے جواب میں انھوں نے وہ فقرہ کہا کہ جو ہم سب نے سُنا اس جواب پر بڑھیا نے ان کو پٹک دیا اب صاحبزادے صاحب کے لیے ڈاکٹری علاج کا انتظام کیا گیا اور جھاڑ پھونک تعویذ گنڈا سب کچھ کیا دوسری رات کو کوئی بات قابل ذکر نہیں ہوئی مگر تیسری رات کو پھر ایک بجے صاحبزادے صاحب چونکے (اُس رات کو سب لوگ نیچے صحن میں سوئے تھے) اور غصہ کی حالت میں اسی طرح کہا کہ میں نہیں جاؤں گا تم یہاں کیوں آئیں یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ چونک کر پھر دروازے کی طرف چلے مگر سب لوگوں نے ان کو پکڑ لیا۔ جب بادشاہ بے وزیر صاحب اسطرح اپنے

ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے تو انھوں نے پھر پہلے روز کی طرح گھبرانا کبھی غصّہ کا اظہار کرنا کبھی آنے والیوں کو ڈانٹنا اور کبھی کچھ خفیف سا مسکرانا شروع کیا مگر حالت میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوا۔ کوئی دو گھنٹے تک وہی حالت رہی مگر صبح کو اُٹھے تو بالکل اچھے دریافت سے معلوم ہوا کہ آج وہی گل اندام ناز و انداز سے تشریف لائیں اور پھر وہی درخواست کی۔ اگر کوئی عاشق مزاج ہوتا تو ان درخواست کرنے والی بی صاحبہ کے قدموں پر سر رکھکر اور پاؤں چوم کر ان کا غلام ہوجاتا اور ان کی درخواست تو ایک طرف خود اس سے درخواست کرتا "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" مگر صاحبزادہ صاحب نے اس مجسم حُسن کو وہی جواب دیا جو اُنھوں نے پہلے دن دینا تجویز کیا تھا گو اس دن نوجوان حسینہ کچھ زیادہ خوشامدانہ گفتگو کر رہی تھی اور بھی جاتی تھی مگر واہ رے بادشاہ بے وزیر کہ ان کے دل پر اُس کی خوشامد اسکے حُسن غرض اُس چیز کا کچھ اثر نہیں ہوا جو دنیا کو زیر و زبر کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو حُسن کی ایسی تحقیر کریں۔ نپولیں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی نگاہ میں حُسن کی کوئی قدر نہیں تھی مگر کسی عاشق مزاج سے اگر یہ کہو تو وہ تو اسکی ناکامیابی کا راز اسی حُسن کی بے قدری کو بتائے گا۔

دوسرا دن بخیریت گذرا یا یوں کہیئے کہ ان بی صاحبہ کے الطاف سے محروم گذرا تیسرے دن وہی ایک بجے پھر صاحبزادے صاحب کو دورہ ہوا اور جناب چارپائی کی ادوان پر کھڑے ہو کر جست کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ ان کو پکڑ لیا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بی صاحبہ کا بھوت انپر سوار رہا

صبح کو اُٹھے تو بدستور اچھے تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ وہ رات کو اسی طرح دوسرے رنگ کی ساری باندھ کر آئی تھی اسکے ایک ہاتھ میں ریشمی رومال تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک دونہ جسمیں بہت خوشبودار پھول تھے اور اُسکے اندر ایک عطر کی شیشی بھی تھی۔ جب انھوں نے حسب دستور اصرار اور میں نے انکار کیا تو ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے مجھے جھنجوڑا۔ جسپر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے اُن کے پیچھے بھاگنا چاہا۔ اس زمانے میں برخوردار مذکور کا ڈاکٹری علاج ہوتا رہا اور اسکے ساتھ تمام وہ علاج بھی ہوتے رہے جو عورتوں کے اعتقادات کے مطابق ایسے امراض میں ہوا کرتے ہیں۔

اس روز سے یہ تجویز ہوی کہ اُس وقت سب لوگ جاگ جایا کریں اور اس طرح دیکھیں کہ جاگتے میں بھی بی صاحبہ کی عشوہ گری اپنے فتنہ انگیز کرشمہ دکھا کر بادشاہ بے وزیر صاحب کو بیہوش کر کے خیالی عالم کی سیر کراتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ دو روز اسی علاج پر عمل کیا گیا اور یہ علاج کارگر ہوا اور معلوم ہوا کہ ان گل اندام حسن افروز کا حسن فسوں ساز عالم خواب ہی میں بے چارے نوجوان کو بیتاب کر کے بیہوش کر دیتا ہے اور ان کی توجہ اتنی قوت دار نہیں ہے جو عالم بیداری میں کسی کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے پر قادر ہو۔ تیسرے روز یہ تجویز ہوی کہ برخوردار کو سُلا دیا جائے اور گھر بھر جاگتا رہے اور دیکھے کہ کیا گذرتی ہے۔ چنانچہ دو ہی ایک بجے صاحبزادے صاحب اس نعرے کے ساتھ "نام نام نام" نیند سے چونکے اور ان کا سانس چلنے لگا آنکھوں کی وہی حالت ہوگئی اور اس روز ایک طویل مکالمہ ہوا جس کو اس افسانہ کا حل کتنا زیادہ موزوں ہے

اس مکالمہ پر توجہ کرنے کی ضرورت یوں ہے کہ بعض وہ سوالات یا جوابات جو بی صاحبہ کی طرف سے کیے گئے اور برخوردار نے دہرائے وہ تو معلوم ہی ہوگئے باقی سوالوں اور جوابوں کے لیے سُننے والے کو اپنے دماغ پر زور دے کر برخوردار کی گفتگو سے سوالات یا جوابات کا اندازہ لگانا پڑتا ہے جو الفاظ ہمارے بادشاہ بے وزیر کی زبان سے نکلے وہ یوں ہیں کہ اُنھوں نے کہا کہ (۱) اچھا تو تمھارا نام شہزادی وانداز عرف بے نظیر ہے۔ تمھاری شادی ہوگئی؟ اسکے جواب میں خبر نہیں بی صاحبہ نے کیا کہا کیونکہ اس کو برخوردار نے دُہرایا نہیں مگر تھوڑے سے توقف کے بعد انھوں نے کہا (۲) اچھا گلفام زماں ہے؟ (۳) اگر تم گلفام زماں سے خوش نہیں تو میں کیا کروں؟ (۴) اچھا تھاری اماں مجھے حیران کیوں کرتی ہیں؟ (۵) اچھا وہ مرگئیں تو اُنکا سر لاکر دکھاؤ؟ (۶) وہ کمبخت کیا اگر تم بھی مرجاؤ تو مجھے افسوس نہو (۷) اچھا ہم تم سے باتیں کریں گے (۸) اچھا تھارے باپ مرجائیں گے (۹) تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ تمھارا باپ مرجائے گا۔ (۱۰) گلفام زماں کو سلطنت ملیگی۔ (۱۱) ابھی مجھے تمھاری خدمت وغیرہ نہیں چاہیے (۱۲) میں غریب آدمی ہوں مجھے آپ کے مالامال کرنے کی حاجت نہیں (۱۳) مجھے سلطنت ولطنت کی خواہش نہیں (۱۴) گلفام زماں کو سلطنت ملے گی تو میں کیا کروں (۱۵) یہ وہی سلطنت ہے جو میرے والد نے بخشی ہے (۱۶) اس دوران میں متعدد بار یہ کہتے جاتے تھے کہ تم تو تکلف کرتی ہو اور مسکراتے بھی جاتے تھے (۱۷) میں ہرگز نہیں جا سکتا (۱۸) تم نے مجھے آوارہ سمجھا ہے (۱۹) میں تھارے لالچ میں نہیں آسکتا (۲۰) اچھا تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا (۲۱) ہرے بھرے صاحب کے مزار پر (۲۲) میرے ساتھ عورت کون تھی۔ میری آپا اور اُنکا لڑکا-

یہ فقرہ اس واقعہ سے متعلق ہے جس سے کہ اس قصے کو شروع کیا گیا ہے (۲۳) اچھا تو تمکو مجھ سے محبت ہے (۲۴) تم کو میری کیا چیز پسند ہے (۲۵) اجی میری آنکھیں دانکیں رہنے دیجیے (۲۶) ہاں ہم مکاں تو بدلنے والے ہیں (اس فقرہ کا اس واقعہ سے تعلق ہے کہ ہم لوگوں نے انداز بے نظیر اور ان کی والدہ کی عنایات سے متأثر ہو کے مکاں بدلنے کا انتظام کر لیا تھا) (۲۷) اچھا تو تم ہمارے دم کے ساتھ ہو۔ مگر خیر بہن ذرا تمیزداری سے آنا ہوگا (۲۸) میں ہرگز نہیں جا سکتا۔ تم آیا جایا کرو (۲۹) میں تمھارا نام کیا رکھوں تمھارا نام تمھارے اماں باوا نے رکھا ہے۔ اگر تم اصرار کرتی ہو تو میں تمھارا نام سنیچر رکھتا ہوں (۳۰) میرا نام بادشاہ بے وزیر ہے (۳۱) اچھا تو تمھارے یہاں عاشق ہونا ہوتا آیا ہے (۳۲) اچھا تو تم جاؤ۔ تم کہاں رہتی ہو وہاں جہاں چار انار ہیں۔ (۳۳) تم تو تکلف کرتی ہو (۳۴) اجی میں تم کو کہاں پہنچاؤں تم خود ہی چلی جاؤ (۳۵)۔ اچھا تم دور دور آتی رہیں (۳۶) کل نہ آنا اب تو ایک ہفتہ کی مہلت دو (۳۷) اچھا جاؤ۔

اس تمام گفتگو کے دوران میں سانس جلد جلد چل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے انداز صاحبہ کے جانے کے بعد کوئی دو ہی منٹ بعد انھوں نے زور سے کہا کہ پھر آ گئی تو خبیث وہ آئی بڑھیا انداز عرف بے نظیر کی ماں ۲۔ تیرا یہاں کچھ کام نہیں ہے تو نکل جا۔ ۳۔ یہاں کمبخت انداز بے نظیر نہیں آئی جا نکل جا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور تھوڑی دیر میں حالت ٹھیک ہو گئی صبح کو اٹھے تو دریافت پر انھوں نے کہا مجھے کچھ یاد نہیں دوسرے روز مکاں بدل دیا اور کوئی آٹھ روز تک انھیں سونے نہیں دیا گیا

ایک روز سلایا تھا کہ ایک بجے کے قریب ہی انھوں نے ایک دفعہ تسلیمؐ کی اور پھر اسکے بعد وہ ہوشیار ہو گئے دوسری رات کو وہ آرام سے سوتے رہے۔

اسکے چند روز بعد ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب دہلی گئے اور وہاں ان پر سوائے اسکے اور کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا کہ وہ رات کو غائب ہو جاتے تھے اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے۔ اب طبیعت میں ضرورت سے زیادہ اکھڑ پنا آگیا ہے۔ دہلی سے واپس پھر لکھنؤ آنے کے بعد سے بادشاہ بے وزیر پھر بدستور اچھے ہیں۔

(بزمی)

ہائے اللہ

یہ الفاظ یوں تو بہت سیدھے سادے معلوم ہوتے ہیں مگر جب انپر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے میں کس بلا کا درد رکھتے ہیں کونسی تڑپ ان الفاظ میں مضمر ہوتی ہے جو سننے والے کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے یہ الفاظ نہ سُنے ہوں۔

عام طور پر یہ جملہ کسی مریض مصیبت زدہ۔ یا عاشق کی زبان سے نکلتا ہے۔ گویا جملہ تکلیف اور رنج کی شہادت دیتا ہے۔ مریض اپنی شدت تکلیف کے وقت "ہائے اللہ" "ہائے اللہ" کہکر خدا سے فریاد اور مدد کی درخواست کرتا ہے۔ اسطرح ایک طالب جو اپنے مطلوب سے الگ اسکے تصور میں کہیں بیٹھا اپنے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے عالم محویت میں اسوقت جبکہ اسکے دل سے زیادہ عزیز دلدار کی یاد چٹکیں کرتی ہے اور دل پر اس خیال سے ایک گھونسا سا لگتا ہے کہ "ہم اس سے دور ہیں اور زندہ ہیں" اس گھونسے کی ضرب سے جو تکلیف اس عاشق حرماں نصیب کو ہوتی ہے اسکا نتیجہ یہی "ہائے اللہ" ہوتی ہے۔ اس ہائے اللہ کا کچھ اہل درد ہی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ محمد ابراہیم دہلوی

غزلیات

جناب منشی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

اُٹھے تری محفل سے تو کس کام کے اُٹھے ۔ دل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اُٹھے

دم بھر مرے پہلو میں اُنھیں چین کہاں ہے ۔ بیٹھے۔ کہ بہانے سے کسی کام کے اُٹھے

افسوس کہ اغیار نے کیا کیا نہ لیے ہاتھ ۔ وہ بزم سے جب ہاتھ مرا تھام کے اُٹھے

دنیا میں کسی نے بھی یہ دیکھی ہے نزاکت ۔ اُٹھتے نہ کبھی حرف مرے نام کے اُٹھے

اس بزم سے اُٹھکر تو قدم ہی نہیں اُٹھتا ۔ گھر صبح کو پہنچے ہیں کہیں شام کے اُٹھے

جو ظلم و ستم تم نے کیے سب وہ اُٹھائے ۔ اک رنج و قلق ہم سے نہ الزام کے اُٹھے

صدمے تو بہت قید میں جھیلے مرے دل نے ۔ جھٹکے نہ مگر زلفِ سیہ فام کے اُٹھے

ہے رشک کہ یہ بھی کہیں شیدا انہوں اسکے ۔ تربت سے بہت لوگ مرے نام کے اُٹھے

افسانہ حُسن اُسکا ہے ہر ایک زباں پر ۔ پردے نہ کبھی جسکے در و بام کے اُٹھے

آغازِ محبت میں مزے دل نے اُڑائے ۔ پوچھے تو کوئی رنج بھی انجام کے اُٹھے

دل نذر میں دے آئے ہم اک شوخ کو بیخود
بازار میں جب دام نہ اس جام کے اُٹھے

ارمان اگر نکلے ارمان کا کیا کہنا ۔ احسان کرو دل پر احسان کا کیا کہنا

معشوق سہی پریاں مشہور سہی حوریں ۔ انسان سے کیا نسبت انسان کا کیا کہنا

اُس بات کی ضد کیسی جو سُن نہ سکے کوئی ۔ ارمان ہے چڑ اُنکی ارمان کا کیا کہنا

پوشیدہ رہا دل میں اللہ رے ترا پردہ ۔ ہر شے میں نظر آیا اس شان کا کیا کہنا

ہے جان کا غم زاہد اس بت کی محبت میں ۔ ایمان سلامت ہے ایمان کا کیا کہنا

میں خاک میں ملکر بھی پاتا ہوں ثمر دلمیں — اُجڑے ہوے گھر میں ہے مہمان کا کیا کہنا
خط میں مجھے لکھا ہے دشمن سے ملو جا کر — قسمت کا نوشتہ ہے فرمان کا کیا کہنا
میں اُنسے شبِ وعدہ دیوانہ نہیوں کہہ کر — جب یاس گلا گھونٹے ارمان کا کیا کہنا
کیا بات ہے اُس دل کی تو جسمیں سما جائے — قربان ہو جو تجھپر اس جان کا کیا کہنا
چٹکی میں ہے تیرا ابتک چٹکی سے نہیں چھوٹا — آنکھوں میں کھٹکتا ہے پیکان کا کیا کہنا

بیخود کی دلبری سے گم ہوش ہیں قاتل کے
قدموں ہی پہ دم توڑا اوسان کا کیا کہنا

جانشین میر و غالب۔ حضرت ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی

روتے روتے شام ہوئی ہے کبتک خون بہائینگی — بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائینگی
جاتے جاتے جسم سے جائیں اہلِ خاکی جائیں گی — آتے آتے دل لینے کی تم کو گھاتیں آئیں گی
اُلٹی اُلٹی باتیں اُنکی مقصد تک پہنچائیں گی — سیدھی سیدھی راہیں مجھکو باتوں میں مل جائینگی
چونکو چونکو خواب غفلت سے ایام جوانی میں — اُٹھو اُٹھو سونے والو راتیں پھر بھی آئیں گی
اُدا اُدا قتل کے بعد اب دفن میں جلدی کا ہے کی — بیٹھو بیٹھو دم تو لے لو لاشیں بھی اُٹھ جائینگی
آئیں آئیں ساری بلائیں صدقے ہوں دیرانے کے — مٹتے مٹتے مٹنگے ہم اب کسکی خاک اوڑائینگی
لاتے لاتے دام میں اُلفت لائیگی زنجیروں کو — بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوق کمر ہو جائینگی
بھرتے بھرتے آہوں کو دل خالی کر ہی ڈالیں گے — جلتی جلتی زنداں سے اب گرم ہوائیں آئینگی
بیٹھے بیٹھے دیکھے جاؤ اُلجھن وقتِ آخر کی — چپکے چپکے میری سانسیں کچھ تمکو سمجھائینگی
ٹکرا ٹکرا کر یہ ناوک خاک سے مجھ تک آئیں گے — نیچی نیچی اُنکی نگاہیں میرا دل پا جائینگی
ہوتے ہوتے ہوگا ظالم واقف رسم الفت سے — رفتہ رفتہ میری دعائیں راہ پر اُسکو لائینگی
بگڑے بگڑے تیور اُنکے عقدۂ لاحل ہوں لیکن — بنتے بنتے اُنکی زلفیں یہ گتھی سلجھائیں گی
رکھدے رکھدے تیر و کماں کو چھد گئے دل مشتاقوں کے — نازک نازک باہیں تیری لو قاتل تھک جائینگی

سنتے سنتے میرے نالے دل انکا بھر آیا ہے
اللہ اللہ آج تو آہیں جی میں بہت اترائینگی

مخفی مخفی ظلم کیے تھے پردہ الٹا محشر نے
کیسے کیسے راز کھلے ہیں اب آنکھیں شرمائینگی

ابلے ابلے شیشے مے کے بزم میں ساقی لایا ہے
الٹے الٹے جاموں سے اب آنکھیں شرمائینگی

مانو مانو کہنا مانو آئینگے وہ خود دل تھامے
ثاقب ثاقب آہیں تمھاری کھینچکے انکو لائینگی

مومن ثانی جناب مولانا مولوی محمد عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی

شاہد کتاب عشق ہے وہم و خیال کی
تصویر کھینچ دیتے ہیں رنج و ملال کی

وقت خوشی زیادہ ہے حاجت ملال کی
ملتی ہے چھیڑ چھاڑ سے لذت وصال کی

ذکر فراق چھوڑیے شب ہے وصال کی
ماضی سے ہو سکے گی نہ گرداں حال کی

اچھا طواف تھا کہ لحد پائمال کی
ظالم کی چال نے یہ قیامت کی چال کی

تجھکو خبر ضرور ملی میرے حال کی
چھپتی نہیں چھپائے سے صورت ملال کی

آتی نہیں ہے وہم میں وسعت خیال کی
ملنے لگی فراق سے لذت وصال کی

ظالم نے جب سے میری لحد پائمال کی
گردوں زمین ہو گیا گرد ملال کی

وحشی کو تیرے ہوش ہے انجام عشق کا
سب کچھ خبر ہے بیخبری میں مآل کی

کیوں بار بار پوچھتا ہے مدعا مرا
صورت سوال ہے نہیں حاجت سوال کی

ناصح ہماری وحشت دل کو نہ کھو سکا
تردید کر سکا نہ ہمارے خیال کی

دریائے رحمت اسکا ابھی آئے جوش میں
اک بوند اگر گرے عرق انفعال کی

وہ اور میری یاد میں اور اسکو بھول جاؤں
قاصد یہ ساری باتیں ہیں خواب و خیال کی

نیرنگ ایک رنگ سے بھی آشکار ہے
جو ہجر کی ہے شب وہی شب ہے وصال کی

بالکل نظر نہیں ہے اسے میرے درد پر
مطلق خبر نہیں ہے اسے میرے حال کی

عیش اپنا اسنے ترک کیا میرے واسطے
ہر وقت فکر رہتی ہے اسکو ملال کی

اُس بدگماں سے دشت میں وحشت رہی مجھے — دیکھیں نگاہ بھر کے نہ آہیں غزال کی
اپنے مزاج اپنی طبیعت سے تنگ ہوں — کوئی گھڑی خوشی کی ہے کوئی ملال کی
جو وہ مُسکا سین واو الف لام سے کھلا — ہے ابتدا حروف ہجائے سوال کی
فرقت زدوں کا تیرے یہی زادراہ ہے — دنیا سے لیکے جاتے ہیں حسرت وصال کی
رحمت سے اُسکی ابر کرم ہے بروز حشر — تردامنی مرے عرقِ انفعال کی
خوش چشم تیری چشم سے تڑپیں نہ کسطرح — تیر نظر کے زخم ہیں آنکھیں غزال کی
کرتے ہیں اپنے روئے کتابی کا وہ ادب — تمہید ہے یہ بوسۂ رخ کے سوال کی
اپنی نظیر آپ ہے تو دیکھ آئینہ — حاجت مشاہدہ میں نہیں احتمال کی
ڈوبے ہیں بیگنہ کو بھی لے کر گناہگار — کچھ حد نہیں رہی عرقِ انفعال کی
سائل نے اپنے نفس کو مارا نہ کس لیے — تلوار کیوں نہ کھینچ لی دست سوال کی
گویا جناب یوسف ابھی تک ہیں چاہ میں — تجھ سے عیاں ہوی یہ بلندی جمال کی
سارا زمانہ حشر میں اپنی کہا کیا — فرصت نہ دی کسی نے مجھے عرض حال کی
دریا اُدھر ہی بہتا ہے جس سمت ہے نشیب — حاجت ہے دست جود کو دستِ سوال کی

جلوہ ہے اُسکا آنکھ میں بھی اور دل میں بھی
حاجت کلیم کو نہ رہی دیکھ بھال کی

لسان القوم مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

دیکھیے کیا ہم اسیروں پہ بلا آتی ہے — آج کچھ روزن زنداں سے ہوا آتی ہے
کسطرح دیکھیے زنداں میں قضا آتی ہے — روشنی آتی ہے جسمیں نہ ہوا آتی ہے
گوش مجنوں میں یہ لیلےٰ کی صدا آتی ہے — چھوڑ دو پردۂ محمل کہ ہوا آتی ہے
بستر غم پہ اگلی ذلِ بیمار کی خیر — کچھ مرے کان میں رہ رہ کے صدا آتی ہے
خون ہوکر بھی نہ بدلا دل بیتاب کا رنگ — سانس لیتا ہوں جہاں بوے وفا آتی ہے

مہرباں جو مری قسمت میں لکھا تھا وہ ہوا — آپ شرمندہ نہوں مجھکو حیا آتی ہے
پوچھنے بھی نہیں آکر سر بالیں وہ کبھی — جن کو بیمارِ محبت کی دوا آتی ہے
میرے پہلو میں ٹھہر جائے تڑپتا ہوا دل — تجھکو ظالم کوئی ایسی بھی ادا آتی ہے
ڈالئے پاؤں میں شوریدہ سروں کے زنجیر — آج پھرتا بکمر زلف رسا آتی ہے
کیجیے چل کے ذرا بتکدۂ حسن کی سیر — ذرّہ ذرّہ میں نظر شانِ خدا آتی ہے
آنکھیں سلوائی گئیں شکوۂ بیخوابی پہ — ہم نے چاہا تھا کہ نیند آئے قضا آتی ہے

رات بھر خواب پریشاں نظر آتے ہیں عتفی
نیند کیا آتی ہے گویا کہ بلا آتی ہے

جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

اثر شادی و غم کا رفتہ رفتہ یوں مٹا دل سے — ہنسی کا ذکر کیا رونا بھی آتا ہے تو مشکل سے
یہ کہکر روح نکلی ہجر میں رگہائے بسمل سے — ورق ہستی کا الٹا شدت بیتابیِ دل سے
کسے ناخواندہ مہماں کہتے ہیں پوچھو مرے دل سے — نکلوایا گیا اکثر یہ معشوقوں کی محفل سے
دیارِ عشق میں بجلی کا گرنا سب نے دیکھا ہے — کسی کی شوخیوں سے اور مری بیتابیِ دل سے
ہنسی آتی ہے تجکو چارہ سازونکی توجہ پر — سمجھ لینگے خدائی راز گویا نبضِ بسمل سے
مصیبت اپنی اپنی اہل محشر بھولے جاتے ہیں — وہ باتیں بے تکلف چھڑ گئیں مقتول و قاتل سے
فلک کے دور میں کیا جانیں کیسا انقلاب آئے — قرینِ مصلحت ہے دور رہنا انکی محفل سے
مجھے مارا تلاشِ دوست کی ناکامیابی نے — بنائی جائے تربت بھی غبارِ راہ منزل سے
جوانی کی قسم کھا کر وہ سوتے ہیں تو چونکیں گے — خدائی کانپ اٹھی فرقت کی شب بیتابیِ دل سے
غمِ فرقت کی تاثیر اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی — کہ ہم نے اپنے دلکو خود بھی پہچانا ہے مشکل سے
سفینے کو خدا حافظ نہ کہیے پھر تو کیا کہیے — کہ موجیں مثلِ پیغامِ اجل آتی ہیں ساحل سے
نکالا قدرتِ جذباتِ حسن و عشق نے مل کر — مہِ کنعاں کو اپنے گھر سے اور لیلیٰ کو محمل سے

وہ ساعت آگئی دنیا ے منقلب ہوگئی
حضور! اٹھ جائیے منہ پھیر کر پہلوے بسمل سے

مری جان تم سے سوجھتے تمہارا تیر بہتر ہے
بظاہر دشمن جان اور باطن میں ملاول سے

وہ خوش تقدیر کیونکر بیٹھنے پائے کہیں دم بھر
نہ بہچانا مزاج دوست جسنے رنگ محفل سے

کیا موسیٰ نے وہ کار نمایاں جو نہ ممکن تھا
اُبھارا نقش برق حسن کو بیتابیِ دل سے

حیات عشق میں محشر خدا وہ دن نہ دکھلائے
کہ جانا اور پھر زندہ پلٹنا کوے قاتل سے

جناب منشی نوبت رائے صاحب نظر ایڈیٹر اودھ اخبار

فرقت میں کسقدر ہم مشتاق تھے اجل کے
کیا روح خوش ہوی ہے اس جسم سے نکل کے

آوارہ کسقدر ہیں دو چار شک حسرت
رکتے نہیں یہ چلکے تھمتے نہیں نکل کے

کیا کوئی دل شگفتہ ہو اُسکی خوابگہ میں
جب غنچے ہو گئے ہوں بستر کے پھول ملکے

اے انقلاب عالم تو بھی گواہ رہنا
کاٹی ہے عمر ہمنے کروٹ بدل بدل کے

اُٹھے گی لاش میری ہمراہ ہونگے وہ بھی
بیٹھے ہیں اہل عالم گھر سے نکل نکل کے

نکلی اس جہاں سے فرقت کی بیقراری
پہنچے میان محشر ہم کروٹیں بدل کے

میرا ہی دامن اُسنے آنکھوں پہ میری رکھا
مجھسے سوا ہیں نادم آنسو مرے نکل کے

کسطرح جان دی ہے فرقت میں کیا بتاؤں
کرنا پڑے ہیں مجھکو جو کام تھے اجل کے

جو پائے صبح وصلت ہوائے نظر اگر تم
کاٹو شب جدائی کروٹ بدل بدل کے

جناب قاضی عبدالعزیز صاحب عزیز بی اے۔ ایڈیٹوریل اسٹاف اودھ اخبار لکھنؤ

میں کہتا ہوں کہ تم دل لیگئے اور دلستاں تم ہو
اگر مجھو مرے حق میں بلائے ناگہاں تم ہو

مجھے کہتے ہو جو کچھ تم سمجھ کر بزم میں کہنا
زبان تم کان تم دل تم مرے روح رواں تم ہو

مرے صحرا ترے آباد کوچے کو خدا رکھے
تمہارا نام روشن ہو دہاں میں ہوں یہاں تم ہو

شکایت مجھسے دُنیا کو شکایت مجھکو دنیا سے — مرے رنج کی دنیا تم زمین تم آسماں تم ہو
کسی سے حالِ دل کہنا عبث معلوم ہوتا ہے — دوائے درد تم، نامہرباں تم مہرباں تم ہو
ہمارے قلب مضطر کیلئے تم بھی مضطرب ہوگئے — تمہارا ہم سے رم کرنا کہے دیتا ہے ہاں تم ہو
کہوں گا رازِ دل تم نے مجھے بھی تم سے کہنا ہے — مگر یہ سوچ لو دل میں کہ مجھسے بدگماں تم ہو
نہ چھپ سکتے ہو چھپنے سے نہ کُھل سکتے ہو کھلنے سے — جو سو گھونگھٹ ہو ظاہر جو دیکھو تو نہاں تم ہو
کسی مرقد سے خاک اُٹھنا جواب اس بات کا ہوگا — ارے تم چاہنے والے مرے یوں بے نشاں تم ہو
مری حیرت نے حیرت میں انھیں خود ڈال رکھا ہے — وہ مجھسے پوچھتے ہیں دیکھنے والے کہاں تم ہو

قسم تم کو اسی سر کی کبھی دل سے ہمیں چاہا
عزیزؔ اکثر کہا کرتے ہو ہم سے دلستاں تم ہو

جناب منشی مقبول حسین صاحب ظریفؔ لکھنوی

بگولے ناچتے تھے نجد میں اور قیس عریاں تھا — یہ سب کیا تھا فقط لیلےٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا
مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصور خانساماں تھا — خیالِ یار جنٹلمین کی صورت سے مہماں تھا
جنوں اک شعبدہ تھا میرے خاک اُڑتے ہوئے دل کا — کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
اجی فرہاد تو تھا بھوٹیا اور قیس تھا کنجر — وہ رہتا تھا پہاڑوں پر مکاں اسکا بیاباں تھا

ظریفؔ
سنڈاکر ہو گیا وہ فارغ البال انکی اُلجھن سے
مرا معشوق زلفوں سے بہت اپنی پریشاں تھا

خواتین کی خدمت میں "تمدن" کی التجا

منجملہ اور خدمات کے "تمدن" نے حقوق نسواں کی حمایت کی بھی ایک خدمت اپنے ذمہ لی ہے اب تک خدا کے فضل سے اس خاص خدمت کی ضمن میں بہت کچھ کیا ہے۔ اور اسلیے ہم مجاز ہیں کہ فرقۂ اُناث سے درخواست کریں کہ وہ سابق کی طرح اپنے رشاد قلم سے "تمدن" کو مزین اور ناظرین "تمدن" کو محظوظ فرمائیں اور مجھے ممنونیت کا موقع دیں۔ امید ہے کہ فرقۂ اناث کی طرف سے بھی اسی قدر مضامین ہم کو موصول ہونگے جتنے طبقۂ ذکور کی طرف سے وصول ہوں گے۔

ایڈیٹر

تمدّن کا لکھنوی دور

ناظرین تمدن کو علم مکرم مولانا عبد الراشد صاحب الخیری کے اس اعلان سے
جو انھوں نے گذشتہ پرچہ میں کیا ہے علم ہوا ہوگا کہ انھوں نے ازراہ کرم "تمدن" کو
اس امید پر مجھے دیدیا ہے کہ میں اسکی اصلی شان کو پھر قائم کروں اور ازسر نو پبلک
کی ان امیدوں کو انشاء اللہ پورا کرنے کی کوشش کروں جو ناظرین اس چھوٹے سے
رسالہ سے وابستہ کر سکتے ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ میں اپنی تمام کوششوں میں
اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ملک کے مشہور اہل قلم اپنے
رشادِ قلم سے اس ادبی رسالہ کی امداد نہ کریں اور آپ ناظرین اسکی توسیع
اشاعت کی کوشش نہ کریں۔ ایک کام اگر دو شخصوں پر منقسم ہو اور دونوں
شخص اپنی اپنی قابلیتوں کو کام میں نہ لائیں تو وہ کام ادھورا کیا کچھ بھی نہو گا
اگر میں ناظرین سے یہ توقع کروں کہ وہ باوجود میری بے قاعدگی اور رسالہ میں
عمدہ مضامین نہ ہونے کے رسالہ کی خریداری کرتے رہیں تو یہ میری غلطی ہوگی
اس طرح اگر پبلک اور اہل قلم حضرات مجھ سے اپنے فرائض کی انجام دہی
چاہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک برسرِ حق ہوں گے۔ میں پبلک
سے توسیع اشاعت اور ملک کے اہل قلم سے مضمون لکھنے کی درخواست کرتے
وقت بھی اس امر کا متوقع ہوں کہ ثمرات ضرور میری امیدوں کے مطابق
ہوں گے اور انشاء اللہ اب یہ "تمدن" اُردو داں ہندوستان کے تمدن
ہی نہیں بلکہ ادب۔ معاشرت اور دیگر اہم باتوں کے لیے ایک راہبر
ثابت ہوگا اور اسکے ساتھ ہی ساتھ زبان اُردو زبان کی خدمت کرے گا

"تمدن" کا پرچہ ارسال خدمت ہے امید کہ ناظرین ہم کو فوراً دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔

مجھے یہ پرچہ ۳۰۔اگست کو ملا اور اس کے ساتھ دو مضمون ملے جنھیں سے ایک "تمدن" کی پالیسی کے کچھ بہت مطابق نہیں تھا۔ ۳۰۔اگست کو مجھے معلوم ہوا کہ اگست کا پرچہ مجھے نکالنا ہے۔ اس قلیل مدت میں پریس وغیرہ کے انتظام کرنے کی دقت اور لکھنؤ لانے کی مشکلوں کو طے کرکے جو کچھ کر سکا وہ حاضر خدمت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں اس پرچہ میں اپنے ان وعدوں کو پورا نہ کر سکا ہوں جو میں نے کئے ہیں مگر اس قلیل مدت اور کام دونوں کو پیش نظر رکھ کے ناظرین خود مجھے قابل معافی تسلیم کریں گے۔

"تمدن" کے دہلوی دور میں بعض اوقات دو ماہ کا ایک پرچہ نکالا گیا ہے میں نے سوچا تھا کہ میں ہرگز ایسا نہ کروں گا چنانچہ میں نے یہ انتظام کیا کہ اگست کا پرچہ ۵ا ستمبر کو نکال دوں اور ستمبر کا پرچہ ۳۰۔اکتوبر کو پوسٹ کردوں تاکہ وہ ٹھیک وقت پر ناظرین کو مل سکے اور اس طرح باقاعدہ ٹھیک وقت پر نکلنے لگے۔ ۱۵ تاریخ کے بعد تک جون اور جولائی کے پرچے جو مولانا عبدالراشد صاحب الخیری کو نکالنے ہیں نہ نکلے تو مجھے مجبوراً اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اگست اور ستمبر کا پرچہ میں ایک ہی نکال دوں اور گویا اس دن سے اشاعت ٹھیک وقت پر ہونے لگے یہ بھی خیال تھا کہ اگست کا پرچہ ۳۰ ستمبر کو نکال دیا جائے کیونکہ اس سے قبل تو وہ اس وجہ سے نہیں نکل سکتا تھا کہ اس سے چند ہی روز پہلے جون اور

جولائی کے پرچے نکلے تھے اور ۱۵ اکتوبر کو ستمبر کا پرچہ شائع کیا جائے مگر میری طبیعت دو پرچوں کو تاریخ مقررہ کے بعد شائع کرنے کی اجازت نہ دے سکی اور ایک ہی نمبر کو ناوقت ہونے کی وجہ سے دوسرے پرچے کے ساتھ ملا دینا مناسب جان کر یہ دو پرچوں کا ایک رسالہ حاضر خدمت ہے۔ گو "تمدن" کے لکھنوی دور کے پہلے ہی پرچے کا ڈبل نکلنا بہت بُرا شگون ہے مگر انشاءاللہ لکھنوی دور کا یہ ڈبل نمبر پہلا اور اخیری خود ہی ہوگا۔ وی۔ پی بھیجنے کی اجازت کا کارڈ رسالہ میں رکھدیا گیا ہے۔ براہ کرم آپ اسپر صرف نام و پتہ تحریر فرما کر روانہ کردیں پرچہ جناب کے نام جاری کردیا جائیگا ناظرین سے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پابندی وقت کا اسقدر خیال رکھیں گے کہ انشاءاللہ آئندہ کم از کم اس بات کی ناظرین کو کبھی شکایت نہ ہوگی۔

چونکہ پرچہ نسبتاً دیر میں شائع ہو رہا ہے اس سے ہم نے رعایت کے زمانے کو بڑھا دیا ہے اور اب ۳۰ اکتوبر کی جگہ ۱۵ اکتوبر تک نئے خریداروں کو پرچہ تین روپیہ چھ آنہ (عہ) کے بجائے تین روپیہ (عہ) سالانہ میں ملے گا۔

ایڈیٹر

عرضداشت

خط و کتابت کے وقت "تمدن" کا موجودہ پتہ تحریر فرمائیے۔

سفرنامہ قاری

اس تحریر میں میری اُن کوششوں کا ذکر ہے جو میں نے توفیق ایزدی سے
اشاعت اسلام کے لیے کی ہیں۔ اور تمہید کے طور پر بعض وہ حالات درج ہیں
جنھوں نے مجھے اس مقدس کام کی طرف متوجہ کیا۔

۱۹۰۸ء میں علیگڈھ کالج چھوڑنے اور کمسریٹ کے محکمہ کی نوکری اختیار
کرنے کے بعد کئی سال تک مجھے کسی بات کا خاص طور پر شوق نہ ہوا۔ سب سے
زیادہ امتیازی بات میری یہ تھی کہ میں اپنے دوستوں کو ہنساتا اور اس خوشگوار
فن کے جسقدر متعلقات ہیں اُن میں ترقی کرتا رہتا تھا۔ نظم۔ نثر۔ مذاق۔ تفریح
یہ مشغلے پیٹ کے دھندے کے بعد کسی وقت پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ حسن و عشق اور تصوف
کی باتوں سے سر سے لگاؤ تھا۔ میلے تماشوں۔ عرسوں اور قوالی کی مجلسوں
میں اکثر جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی حال بھی آتا تھا۔ چشتیہ نظامیہ فخریہ میں بیعت
ہو چکا تھا اور باوجود تفریحی مشاغل کے نماز اور تھوڑا بہت وظیفہ ضرور پڑھ لیتا
تھا۔ شادی پہلے ہی ہو چکی تھی اور کثیر العیالی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک
طرف تو اپنے ہم عمر دوستوں کی تفریحی صحبت دن رات ملتی تھی مگر دوسری طرف
بڈھوں اور بزرگان دین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مذہبی بحث
مباحثے اور فرقہ بندی کی باتوں سے طبیعت کو نفرت تھی۔ پبلک جلسوں میں
تقریر کرنے کا یا کچھ پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ کالج کے زمانے میں یونین کے
مباحثوں میں اکثر حصہ لیتا تھا اور کیمبرج سپیکنگ پرائز بھی حاصل کیا تھا
کرکٹ میچوں کی مذاقیہ نظمیں اکثر لکھا کرتا تھا۔ مشاعروں میں غزلیں بھی بہت

پڑھی ہیں۔مولودخوانی اور مرثیہ خوانی بھی کی ہے۔شاعری میں مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی کا شاگرد تھا۔اپنے وطن دہلی یعنی عربک اسکول میں جناب مولانا حالی صاحب مرحوم سے اور علیگڈھ کالج میں مولانا شبلی صاحب مرحوم اور یوروپین صاحبان میں مرحوم مسٹر بک۔مسٹر (اب سر) تھیوڈور ماریسن اور مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ رہا۔

خدا کے فضل سے بیوی بہت سیدھی سادی اور مطیع و فرمانبردار ملی تھیں خدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنت دے کبھی اللہ کی بندی نے یہ شکایت نہ کی کہ تم رات رات بھر مشاعروں اور جلسوں میں کیوں رہتے ہو۔ الغرض ایسے اُستادوں سے پڑھکر۔ایسی صحبتوں میں رہکر اور گھر کی طرف سے اسقدر آزادی پاکر میں ایک معجون مرکب بنا جس کا تھوڑا بہت اندازہ آیندہ کے صفحات سے ہوگا۔کالج چھوڑکر اور نوکری کے سلسلے سے میرٹھ آن کر ڈپٹی نجم الدین صاحب مرحوم کی صحبت میں خاص طور سے بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ان کے مکان پر نہایت پاک صحبت جمع ہوتی تھی) مولوی گل حسن صاحب مولوی عبدالحکیم صاحب مرحوم اور مولوی محمد اسمعیل صاحب کا مقدس جمگھٹا یہیں رہتا تھا۔

یہ سب بزرگ حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب رح پانی پتی کے نظر یافتہ تھے اور تصوف کا دن رات چرچا رہتا تھا۔توحید تنزیہی اور قلندرانہ رنگ کی باتیں یہاں اکثر ہوتی تھیں مگر ہر بزرگ شریعت حقہ کا تبع اور اتقا میں درجۂ امتیاز رکھتا تھا۔ان صاحبوں کی صحبت خصوصاً ڈپٹی نجم الدین صاحب مرحوم کا رنگ مجھپر چڑھنا شروع ہوا۔ڈپٹی صاحب مثنوی شریف کے حافظ اور ماہر تھے اور اکثر اُسکے نکات بیان فرماتے تھے۔ہنود کے تصوف سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے اور اکثر اپنے ہاں کی اور ہندوؤں کے تصوف کی باتیں ملاکر بیان

کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اسی مخلوط تعلیم کا شوق ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ہندو فقیروں اور سادھوؤں کی صحبت میں بھی جانے لگا۔ اور عیسائی پادریوں سے بھی ملنے لگا۔ ایک ہندو فقیر تو ایسے ملے جنھوں نے ترک حیوانات کرا دیا اور پانچ مہینے اُس غذا پر رکھا جسے ست گنی بھوجن کہتے ہیں۔ گھر والے تنگ تھے۔ سب کے لیے الگ پکے میرے لیے الگ۔ اکثر دوست عموماً اور گھر والے خصوصاً ڈرتے تھے کہ کہیں یہ ہندو نہ ہو جائے۔

ان ہی دنوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور اخلاقی ناول تصوف کے رنگ میں لکھے مگر ہر ناول میں یہ واحد خصوصیت ضرور تھی کہ طوائف مجالس رقص و سرود اور تصوف کا ذکر ہوتا تھا۔ میرے ناولوں کی دوستوں نے خوب تعریف کی۔ اس سے قدم آگے بڑھایا تو انجمنوں اور کانفرنسوں میں لکچر دینے اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ان مشاغل سے فائدہ تو ہوا یا نہ ہوا مگر اسقدر نقصان ضرور ہوا کہ مذاق آفرینی کا مادہ کم ہونا شروع ہوگیا۔ اسی زمانے میں اتفاق وقت سے چکاگو ملک امریکا میں جو عالمگیر نمائش کے موقع پر مذہبی جلسۂ اعظم ہوا تھا اُسکی رپورٹ کا ریویو میری نظر سے گذرا اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مشہور بزرگ سوامی وے ویکانند جی جنھوں نے وہاں ویدانت یعنی اہل ہنود کے تصوف تنزیہی کا وعظ فرمایا تھا وہ سب واعظوں پر فوق لیگئے اور اسلام کا وعظ جو امریکن نومسلم مسٹر رسل وب نے کیا تھا اُسپر لوگوں نے التفات نہ کیا۔ دل میں اسکی کریدنی پیدا ہوئی اور سوامی جی کے جتنے مطبوعہ انگریزی لکچر تھے منگا کر پڑھے۔ گیتا اور تھیوسوفی کی کتابیں بھی پڑھیں اور یہ رائے قائم کی کہ امریکا میں اسلام کے تصوف تنزیہی کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ کئی سال تک اس کام کے لیے ضروری

علمی تیاری کی اور انگریزی میں محاسن اسلام پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا اور امریکا کے مذہبی رسالوں میں اُسے چھپوایا۔ یہ بھی ارادہ ہوا کہ خود امریکا جاکر جابجا لکچر دوں مگر یہ ارادہ پورا نہو سکا۔ تاہم یہ خیال دل میں جگہ پکڑ گیا کہ نئی روشنی کی ضرورتوں کے موافق مذہب کا وعظ کیا جائے۔ بنا برآں متھرا کے جلسۂ مذاہب اعظم میں جو غالباً سنہ ۱۹۰۰ء یا سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا اللہ کے فضل سے بڑی کامیابی کے ساتھ محاسن اسلام پر لکچر دیا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں نوکری پر سے تین مہینے کی رخصت لے کر علیگڈھ کالج میں آکر رہا اور متعدد لکچر اسلام کی خوبیوں پر دیے۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء کی ایک یادداشت مجھے اپنے کاغذات میں ملی ہے جسمیں میں نے خدمت و اشاعت اسلام کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں ملک کے اسلامی اخبارات خصوصاً وکیل میں یہ خبریں مشتہر ہوئیں کہ ملک جاپان میں چکاگو ملک امریکا کی طرح ایک مذہبی کانفرنس کا انعقاد ہوتا ہے اور جاپانی جس مذہب کو بعد تحقیقات کے سب سے اچھا سمجھیں گے اُسے قبول کریں گے۔ جناب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب اور جناب شمس العلما مولانا مولوی محمد عبدالحق صاحب (صاحب تفسیر حقانی) کے مشورہ سے میں نے جاپان کا سفر اختیار کیا۔ اور شروع نومبر سنہ ۱۹۰۵ء رمضان شریف کے مہینے میں کلکتہ کے راستہ سے روانہ جاپان ہوگیا۔

سفر جاپان کے مختصر حالات

اس سفر کی تیاری میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آئی کہ چھوٹا بھائی اور بیوی بیمار تھیں۔ دوسرے گھر والوں کو یہ سفر بالکل بیکار معلوم ہوتا تھا

برابر کے دوستوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو میرے اس ارادے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہو۔ بہت سے لوگوں کو تو یقین بھی نہ آتا تھا کہ اسکی تہ میں کوئی راستی یا راستبازی مضمر ہے۔ مگر میں جناب باری میں نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگتا رہتا تھا اور دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میری بہترین عبادت یہ ہے کہ علوم انگریزی میں جو تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے اُسے جب موقع ملے خدمت اسلام میں صرف کروں۔ مَیں نے اس آرزو کے پورا کرنے کے لیے مزارات پر جا جا کر دعائیں مانگیں۔ جواہرالقرآن کا وظیفہ چالیس دن تک پڑھا۔ اور نوکری۔ بال بچّے داری اور تفریحات سے جو وقت بچا اُسے مطالعہ کتب میں صرف کیا۔ قوم انگریزی کی خصوصیات کا مطالعہ خاص طور پر مدنظر رکھا۔ نوکری کے سلسلہ میں دس سال تک نینی تال رہنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں اسکی واقفیت بہم پہنچانے کے بہت موقع ملے۔ پادریوں سے ملنا۔ اُنکے گرجاؤں اور جلسوں میں جانا۔ عرصۂ دراز تک شعار رہا۔ جاپان جانے کے وقت تک میرے خیالات کچھ اس قسم کے تھے کہ مذہب کی روحانیت کو بڑی چیز اور سب کچھ سمجھتا تھا۔ انگریزی تمدن اور تہذیب میں جو باتیں اچھی ہیں اُنکا دلدادہ تھا اور موجودہ پردے کی حد سے زیادہ قیود۔ اور عورتوں کے جاہل رکھنے اور اُن سے عمدہ برتاؤ نہ کرنے کو بہت بُرا جانتا تھا اور اپنے گھر کی علی زندگی میں ان معاملات میں ایک خاص حد تک اصلاح کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ حُسن پسندی کا مرض ابتک موجود تھا اور مجھ میں اور میرے متذکرہ بالا تفریحی مشاغل میں کوئی بیّن فرق نہ آیا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں مجھے کوئی شخص خالص مشنری اور سچا خادم اسلام کیونکر سمجھ سکتا تھا ریاکاری میرے بس کی بات نہ تھی ورنہ میرے ایک دوست تو یہاں تک آمادہ تھے

اور یہ تجویز انھوں نے خود اپنی طرف سے مجھے بیان کی کہ تم کو حضرت سلطان المشائخ کی سترھویں شریف کے موقعہ پر دستار باندھی جائے اور نئی روشنی کے نوجوانوں کے لیے پیر بنا دیا جائے۔

یوں تو کئی مہینے سے اخبار وکیل امرتسر اور ملک کے دوسرے اخبارات میں جاپان میں اشاعت اسلام کے بارے میں خبریں اور مضامین شائع ہو رہے تھے مگر وہ خاص مضمون جس نے مجھے جاپان جانے پر فوراً آمادہ کر دیا اور جس کی وجہ سے نہ میں نے رمضان شریف کا خیال کیا اور نہ بھائی اور بیوی کی بیماری کا حسب ذیل ہے :

ازاخبار وکیل امرتسر مطبوعہ یکم نومبر ۱۹۰۵ء مطابق ۲ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ یوم چہارشنبہ صفحات ۲ و ۳

+ + + + + + + + + +

اسلام جاپان میں

عالم ہمہ افسانہ ما دارد وما ہیچ

امریکہ کے ماہوار رسالہ "دی ورلڈ" میں مشہور امریکن سیاح مسٹر نیک رو، سیاح بلاد مشرقیہ کا ایک پر زور مضمون بعنوان "جاپان میں اسلام" شائع ہوا تھا جسکا ترجمہ ہم آگے چل کر درج کرینگے۔ اس پر رسالہ مذکور کے ایڈیٹر نے جیسا کہ مسیحی مصنفوں کی بالعموم عادت ہے کچھ جلے کٹے ریمارک کیے ہیں۔ جنسے پایا جاتا ہے کہ جب سے اقصائے مشرق میں آفتاب صداقت طلوع ہونے کے آثار عیاں ہوئے ہیں

اُس وقت سے حامیان صلیب پرستی اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں۔ اور اسکی منوّر شعاعوں کو اطراف عالم میں پھیلنے نہ دیں۔ لیکن وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ان کی صلیب کو دو ہزار سال کی مدت مدید میں اسقدر گھُن لگ چکا ہے کہ اب اس کی درستی واستحکام کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ مشرق تو مشرق خود مغرب میں بھی اسکی طرف سے بیزاری ومایوسی پھیل چلی ہے یوروپین اقوام کے جہلاء وعوام تو کس گنتی میں ہیں ان کی مذہبیت کو پہلے بھی سچی عیسائیت سے کون سا بڑا تعلق تھا؟ لیکن متوسط طبقہ کے ذی ہوش لوگوں اور نیز انکے محققین وخواص میں تو کچھ مدت سے تثلیث کی لغویت اور توحید کی وقعت وعظمت اچھی طرح گھر کرتی جاتی ہے۔ پوپوں اور پادریوں نے بائبل مقدس میں آئے دن ترمیم در ترمیم اور تحریف در تحریف کر کے ہر چند کوشش کی کہ اس بھول بھلیاں کو زمانے کی رفتار اور حوادث روزگار سے گزند نہ پہنچے۔ لیکن باوجود ان کی حیرت انگیز بیعدیل مساعی اور بیشمار مصارف کے جن کا بار محض تحفظ دین کی خاطر اُٹھایا جاتا ہے۔ افسوس کہ **طلسم صلیب** اس تہذیب وتحقیق کے زمانے میں کسی طرح.....

.... لیکن حیف ہے ان لوگوں کی عقل پر جو اپنے گھر کی حالت سے بے خبر جہاں علی طور پر صلیب مذہبی کا گویا خاتمہ ہی ہو رہا ہے دنیا کی دوسری جاہل تو جاہل شائستہ۔ فرزانہ وبیدار مغز اور محقق طبع قوموں پر بھی ابتک اُن ہی عقائد باطلہ کو پیش کیے جاتے ہیں جنھیں عقل سلیم مدتوں سے مردود ومسترد ٹھہرا چکی ہے اور جن کا نقش خود ان کے بیشمار سمجھدار ہمقوموں کے دل سے مٹ چکا ہے۔ جاپان میں تبلیغ واشاعت نصرانیت کے لیے کمتی فوج کا مشن خاص اہتمام سے بھیجا جانا اسی لیے تجویز ہوا کہ جاپانی

ایک ہونہار قوم ہے۔ اور نئے الحال دنیا میں حیرت انگیز و عالمگیر عزت و شہرت حاصل کر چکی ہے اُسے بھی تثلیث اور صلیب پرستی کی دعوت دی جائے۔ تاکہ صلیب پرستوں کی جمعیت میں جن کا سلسلہ دنیا میں پہلے ہی دور تک پھیلا ہوا ہے لاکھوں کروڑوں کا اور اضافہ ہو جائے۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جاپانی جہاں مہذب ہونہار اور مترقی ہیں اسکے ساتھ ہی کچھ عقل و خرد بھی رکھتے ہیں بلکہ ان کی اس ترقی و عظمت کا موجب ہی انکی یہ صفات ہیں۔ پھر کیونکر سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ موجودہ مسیحیوں کے مجروح معتقدات پر اندھے بن کر صاد کریں گے۔ اور آمنا و صدقنا کہہ کر ان ہی کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے۔ ع

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

برخلاف ازیں جاپان میں اسلام کا رفتہ رفتہ اس سرے سے اُس سرے تک پھیل جانا اب بفضلہ قریباً یقینی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ دراصل ایک روشن خیال اور حق جو قوم ہے۔ اسکے خواص میں دین متین اسلام سے ایک طرح کا اُنس اور اس کی جانب میلان عام پیدا ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی تفصیل بیان کر چکے ہیں جاپانیوں کی ایسوسی ایشن متعلقہ تحقیق مذاہب بھی اسلام کی پرکھ، پرتال پر متوجہ ہو گئی ہے۔

بہرحال یہاں ہم پہلے اصل آرٹیکل کا ماحصل درج کرتے ہیں۔ پھر ایڈیٹر دی ورلڈ کی رائے زاں بعد اپنی طرف سے کچھ ریمارک کریں گے۔

مسٹر روزبنیک لکھتے ہیں:۔

"باخبر لوگوں کو معلوم ہے کہ مذہب اسلام نے موسوی اور عیسوی مذاہب کے

جلد ۱۱ — نمبر ۱

اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء

تمدن

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر ایم اے قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری
محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

پبلشر محمد عباس حسین قاری — قیصر پریس دہلی میں چھپا — پرنٹر سید علی قادری

مقام اشاعت دہلی

وہ جو کوہ طور پر بھڑکا تھا۔ وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر
ہوا تھا۔ اب کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں
نمودار ہے۔ ادبی روح پھونکے گا۔ اخلاقی وعظ سنائیگا۔ نورانی
شعلوں کی تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنا دے گا۔
وہ سینے جو آتشِ محبت سے سوختہ نہیں وہ قلوب جو سوز دروں
سے خالی ہیں اس طرف متوجہ ہوں عشقِ الٰہی کی لپٹیں
گداز طبیعتوں سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہدِ حسن بے
نقاب ہو کر مشتاق آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر
ہے۔ پس شعلہ کی خریداری کے لیے جو ہر مہینہ آپ کی
دلبستگی کا بہترین مجموعہ ہے۔ درخواستیں روانہ کیجیے
لکھائی چھپائی بہت عمدہ۔ قیمت سالانہ درجۂ عام دو روپیے
آٹھ آنے (عہ) مع محصول نمونہ چار آنے کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جاتا ہے

المشتہر

منصرم رسالہ دفتر شعلہ محلہ چوڑیگران۔ دہلی

میرے بعد

دنیا کی خوشی میں، سعادت و رفاہت میں اضافہ نہیں ہوگا، مگر اندوہ و غم میں کمی ہوگی۔ ایک غم آگین دل، ایک محنت آلود وجود دنیا سے اُٹھ جائے گا سفالت و رذالت، تنعم و تعیش کی جنگ قائم رہے گی، مگر سفیل کے لیے کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائے گا۔

میرے دوست احمد جو میرے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے طیار ہیں جنکے ادعائے دوستی کی کوئی انتہا نہیں جنکے اظہار لطف کے احسان سے میری گردن دبی جاتی ہے، جنکے تیر دام، جنکے تلطیف ناقابل التیام سے میری زندگی تلخ ہو رہی ہے یہ میرے دوست احمد باہر روئیں گے اور گھر میں جاکر قہقہہ ماریں گے۔

میرا دشمن محمود، میرا کھرا دشمن محمود جسنے کبھی میرے پیچھے سے آکر مجھ پر

حملہ نہیں کیا جس نے ہمیشہ مجھکو میرے مُنھ پر بُرا کہا، جس سے جب میرے پیٹھ پیچھے میرے متعلق سوال کیا گیا تو میری تعریف نہیں کی مگر جب میری جہاں میری تعریف کی جا رہی تھی وہاں بھی چپ رہا جہاں میری برائی کی جا رہی تھی وہاں بھی چپ رہا یہ محمود! غیر متاثر لفظ [illegible] لیکن اسکی آنکھ پرنم ہوتی

رشید جس نے آج تک مجھ سے نہیں کہا کہ میں تمھارا دوست ہوں! رشید جو لاابالیانہ ڈھنگ سے میرے پاس آتا ہے اور مجھے ستا کے، ہر بات میں میری مخالفت کرکے چلا جاتا ہے، جو میرے سامنے میری ذات کے متعلق کوئی بات نہیں کہتا، لیکن جہاں میں نہیں ہوتا ہوں تو میرے لیے لوگوں سے یہ کہکے لڑتا ہے کہ "میں اُسکا دوست نہیں، اور میں اُسے اچھا نہیں سمجھتا لیکن خواہ مخواہ بُرائی بھی نہیں سن سکتا" رشید جو دوستی، رفاقت وصداقت کی ہنسی اوڑاتا ہے اور ہر جگہ کہتا پھرتا ہے کہ یہ بے معنی الفاظ ہیں جو احمقوں کے بھلانے کے لیے تراشے گئے ہیں، رشید میرے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔ پھر کہے گا کہ "یہ میرے دل کی کمزوری تھی، میں بیوقوف ہوں میں عورت ہوگیا" پھر خوب ہنسنے کھیلنے کی کوشش کرے گا، ہنسے گا کھیلے گا لیکن مہینوں کے بعد، برسوں کے بعد جب کبھی کسی محفل طرب، کسی جلسۂ عیش میں میرا ذکر آجائے گا تو رشید اُٹھ کے کسی کام کے بہانے سے باہر جائے گا تھوڑی دیر کے بعد سیٹی بجاتا ہوا، گاتا ہوا واپس آئے گا۔ لیکن آنکھیں سرخ ہونگی، پپوٹے لال ہوں گے

یہ تو سب کچھ ہوگا، مگر اے دوست! ایسے وہ کہ جسکی نگاہ لطف کے لیے میں ترستا ہوں جس کا تبسم مجھے دنیا کی نعمتوں سے بڑھکر ہے۔ اے دوست! یہ تو بتاؤ، تم بھی میرے لیے دو آنسو بہاؤ گے کہ نہیں؟

سجاد حیدر

بڑھاپے کی شادی

"پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است" جس کسی نے کہا ہے اچھا کہا ہے مگر ہمارے ہاں اُردو میں تو "بوڑھے منہ مہاسے" تحقیر کے ساتھ بولا جاتا ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ بڑھاپے کی شادیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے - ہم نے غیر ممالک کی تقلید میں عشق اور شادی کو مترادف قرار دیا ہے - یہ بالکل صحیح نہو مگر اکثر سُنا گیا ہے کہ بڑے میاں کو اپنی نو حاصل کردہ بیوی سے بہت محبت ہوتی ہے خصوصاً جب کہ آخر الذکر کا سن اپنے مقدس شوہر سے بیس پچیس برس کم ہو اور یہ بات تو بالکل نظر انداز کر دینی چاہیے کہ بیوی کو بھی محبت ہوتی ہے یا نہیں - کچھ اور لکھنے سے پہلے ہم ایک اوسط درجے کے ضعیف شوہر کا حلیہ - مزاج برتاؤ - وغیرہ وغیرہ بتانا چاہتے ہیں - بیوی کے متعلق زیادہ بہندی کی چندی نکالنے سے ہم نے ارادتاً پرہیز کیا ہے مگر ناظرین خود بہت کچھ اندازہ کر لیں گے -

ضعیف شوہر

(۱) ریش مقدس زیر بار خضاب رہتی ہے - الماری میں نوایجاد شیشیاں دو ایک پرانے نسخوں کے خضاب موجود رہتے ہیں - خضاب لگانے کا ہر قسم کا سامان بھی رہتا ہے - بیچاری بیوی کو اس ساری دوکان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں پیدا ہوتی حالانکہ وہ کوشش کرتی ہے کہ ہو جائے -

ہفتہ یا پندرہ روز میں ایک دن گھر میں خاص سانگ ہوتا ہے - یعنے جس دن بڑے میاں خضاب لگاتے ہیں - صاحب خضاب کی سج دھج اور لاؤ پیٹ کی پیچ کی زینت کے لیے تصویر لینے کے قابل ہوتی ہے - یہ تماشا دیکھیا

ختم نہیں ہوتا بلکہ دہن مبارک ڈھاٹے کی بندش سے تکلم میں آہستگی اور ناہمواری
اختیار کرتا ہے ۔ یہ سب بیچاری بیوی برداشت کرتی ہے اور سب سے بڑا ظلم یہ
سہتی ہے کہ ہنسی کو ضبط کرتی ہے ۔ ابھی تک اسکی عمر ایسی عجیب اور بے جوڑ باتوں پر
ہنسنے کی باقی ہے ! مگر شوہر کا بڑھاپا اسے نیست و نابود کرنے کے لیے کمربستہ ہے
اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ ایسے خاوند سے ایسی بیوی کو نفرت ہونی ممکن ہے تو
سوال یہ ہے کہ خضاب کے دن اسے اُن کی کیا ادا بھاسکتی ہے ۔ حقہ کی نَے ان خضاب
بستہ لبوں میں خوبصورت معلوم ہو ؟ اے بدنصیب عورت تو رو اور اپنی
قسمت کو پتھر سے پھوڑ ۔ ٹھہر جا ابھی تو چند گھنٹہ بعد خضاب کی تکمیل اور
بالوں کے بالکل سیاہ ہو جانے کی داد تجھے دینی پڑے گی ۔ اگر داد نہ دی
تو "بڑے میاں" کی بہت دلشکنی ہوگی اور وہ سمجھ لینگے کہ بیوی کو مجھ سے محبت
نہیں ہے ۔ اُن کے نزدیک محبت کا معیار اور پھر اُنکی مقدس ڈاڑھی ہی ہے!)
(۲) ایک نہ ایک چھوٹا موٹا مرض دامنگیر رہتا ہے ۔ (دور نہ جائیے ۔
صرف اسقدر تصور کیجیے کہ ایک شب کو آدھی رات کے بعد ایک پنشن آلود
پچپن سالہ کریہ آواز برابر کے پلنگ سے ایک مطیع شباب اور متوالی نیند میں
سوتی ہوئی بیوی کے کان میں پہنچتی ہے ۔ اور وہ آواز یہ ہے "بیگم ۔ میری
ڈاڑھ میں درد ہو ۔ ہائے ہے" جن مقدس ہاتھوں نے اس دلکش آواز کے
ساتھ اس سوتی ہوئی جوانی کو جھنجوڑا ہے اُسکی رگوں میں کچھ برف کا اثر ہے
اور سونے والی کو گرمی محسوس نہیں ہوتی ۔
بہرحال کئی آوازوں اور کئی جھنجوڑوں (کئی دفعہ جھنجوڑنے کے بدلے یہ
لفظ تصنیف کیا گیا ہے ۔ معاف فرمائیے) کے بعد وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی
انگڑائیاں لیتی ہوئی اُٹھی ۔ ہائے یہ دونوں ادائیں بہت کچھ مستحق قدر اور

مستحق استقبال خاص تھیں مگر شوہر کو اُنکے دیکھنے کی نہ اہلیت نہ فرصت۔ انھوں نے
فرمایا بھی تو یہ فرمایا ہے۔ "اُٹھتی نہیں"")

(۳) ایک آدھ عادت نہایت دلچسپ پڑی ہوئی ہوتی ہے (مثلاً ہمارے مع
"بڑے میاں" میں سوتے میں چوکیداروں کو مات کرنے والے خرّاٹے لینے۔ او
جاگتے میں اکثر ٹھوڑی کے نیچے کھجاتے رہنے کے علاوہ۔قبض کی وجہ سے
عادت پڑگئی ہے کہ بیچارے صبح کو پاخانہ جانے سے پہلے کوئی دس منٹ تک
اُکڑوں بیٹھ کر حقّہ پیتے ہیں۔ اگر بیوی کو ہینڈکیمرا رکھنے اور اُسکے استعمال
کرنے کی اجازت ہوتی تو مع خضاب کی تصویروں کے "بڑے میاں" کا ایک
باتصویر ایڈیشن شائع ہو سکتا۔ "بڑے میاں" کا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ میری
ادا بھی بیوی کو پسند آئے اور اُسکی محبت میں اضافہ ہو مگر ع

ایں خیالست و محال است و جنوں۔

(۴) دل مردہ ہونے کے بعد متانت کا زور ہو جاتا ہے نشست برخاست
بات چیت اور میل جول میں جوانی کی سادی اور دلکش لچک کے بدلے سختی
اور لوہاپن آجاتا ہے جو ریاضی یا سائنس کے طالبعلم کو تو غالباً فائدہ پہنچا سکے
مگر جو ایک پُر از شباب بیوی کے دل کو گرویدہ کرنے میں کماحقہ کامیابی حاصل
نہیں کرسکتا۔

(۵) کفایت کا خیال بڑھ جاتا ہے۔ (فی نفسہ یہ کوئی بُرا خیال نہیں ہے
مگر بڑھاپے میں جو کفایت سوجھتی ہے وہ زیادہ تر جوانی کی فضول خرچیوں
کی ندامت اور نقصانات کی وجہ سے سوجھتی ہے۔ اگر یہ صاحب تنہا ہوتے
یا کسی بڑھیا کا ساتھ ہوتا تو یہ کفایت شعاری کچھ بُری نہ معلوم ہوتی۔ مگر اسکا
مقابلہ کیا جاتا ہے جواں بیوی کی (بزعم خود) فضول خرچیوں سے اور یہ

بات بالکل نظرانداز کردیجاتی ہے کہ ہم بھی نوجوانی میں زیادہ اُٹھاتے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ "بڑے میاں" کو بڑے خرچ اب بھی نہ سوجھتے ہوں۔ مگراب اُنکے اخراجات کا رخ بدلگیا ہے ملاحظہ فرمائیے کہ کئی دن سے مستری کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور پکا سرداوا انہوں نے اور قبر کے ارد گرد تھوڑی بہت پھول پھلواری لگانے کے تخمینے اور نقشے تیار ہورہے ہیں۔ بیوی کا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ یہ روپیہ ہیرے کسی زیور میں خرچ ہوتا۔ مگر اُسکو یاد رکھنا چاہیے کہ اُسکی شادی ایک ضعیف العمر شخص سے کیا ہوئی ہے کہ ملک الموت سے رشتہ قریبہ قائم ہوگیا ہے اور قبرستان بھی سسرال ہی کے ایک حصّے کا نام ہے۔

(۶) اور لیجیے وصیت نامہ لکھا جا رہا ہے۔ اسقدر حرمین شریفین بھیجا جائیگا فلاں مکان یا دوکان کے کرایہ میں سے جاڑے میں محلہ کی مسجد میں تیل حسن بھروا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ وصیت نامہ بہت اچھی چیز ہے۔ مگر دن رات یہ باتیں ایک جوان بیوی کے سامنے ہوتی ہیں اور وہ ناموشی اور صبر کے ساتھ سنتی ہے۔ اُسکے حصے میں کسیقدر رقم آتا ہے جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ "بڑے میاں" کے دل کی تہ میں یہ بات چھپی ہوی ہے کہ میرے بعد اسکے میکے والے ضرور اسکی شادی کرادیں گے۔

(۷) اب بیوی کے لیے ایک آخری مرحلہ رہگیا ہے اور وہ مرحلہ وہ ہے جس کی بسم اللہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ" سے ہوتی ہے۔ اب یہ رنگین کپڑوں کے بدلے رنڈسالہ پہنے گی اور چوڑی مہندی مسی سرمہ سب کو سلام کرے گی۔ کیونکہ اُس کی شادی ایک بڈھے سے ہوی تھی۔

افسوس۔ صد افسوس۔

"نسائی"

حُسن

دنیا کے وسیع گلشن میں یوں تو ہزاروں رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں مگر حُسن مثل ایک ایسے گلاب کے پھول کے ہے جسکی خوشبو سے تمام گلشن مہک رہا ہے اسکے رنگ میں کچھ ایسی دلاویزی ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اسکی خداداد کشش سر جھکا کر چلنے والوں کے دلوں میں بھی ایسی چٹکی لے لیتی ہے کہ وہ بھی نگاہ اُٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی پوری قوت سے کام لیتے ہیں تو آنکھ کے کسی گوشہ میں نگاہیں خود اسکی طرف لپک جاتی ہیں اور اس سے ہم آغوشی کا لطف حاصل کیے بغیر قرار نہیں لیتیں۔

اسکی پنکھڑیاں بہت ہی نرم و نازک اور لطافت میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اسکے دیکھنے سے کبھی سیری ممکن نہیں اسکی بہاریں ایسی دلفریب ادائیں مضمر ہیں جن کے اثر سے انسان کا دل بے قابو اور دماغ متحیر ہو جاتا ہے۔ اسکی نزاکت اور نرمی ہر سنگ دل کو موم بنا دیتی ہے۔ زاہد صد سالہ کے تجربے خاک میں ملا دیتی ہے۔ دمِ گلگشت جب نگاہ اُٹھتی ہے تو اسی کی طرف، جب آنکھ پھرتی ہے تو اسی کی جانب حسن ایک ایسا پردہ ہے جسمیں ہزاروں عیب پوشیدہ رہتے ہیں کوئی کیسا ہی تیرہ باطن ہو لیکن اسکی سفید نقاب آنکھوں پر پردے ڈالدیتی ہے۔ حُسن ایسا نفیس لباس ہے جسکی زیبائش نگاہوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔

حُسن میں یہ بھی ایک خداداد اثر کہنا چاہیے کہ اسکے اظہار کے الفاظ بھی ثقل سے دور اور لطافت سے بھرے ہوئے ہیں مثلاً انگلش میں۔ (بیوٹی) جو حُسن کے مترادف ہے کتنا خوبصورت لفظ ہے اگر اسکے اقسام پر نظر کیجائے تو بہت ہوں لیکن ان سب

اقسام میں سے دو صورتیں ضرور قابل نوٹ ہیں جنہیں سے ایک کو حُسن ظاہری اور دوسرے کو حُسن باطنی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اور ان دونوں قسموں کا وجود ہر ایسی خوبصورت شے میں ضرور پایا جائے گا جسکو دیکھکر ہم خوبصورت یا حسین کہہ سکتے ہیں۔

پہلے تو بحالت مجموعی تمام دنیا کی خوبصورتی لیجیے کہ اسمیں زیادہ تر حصے بہت حسین اور مینو سواد واقع ہوے ہیں اسلیے ہم اسکو بھی حسین ہی کہیں گے گو صرف ایک غم کے اعتبار سے تو یہ نہایت کریہ منظر کہی جاسکتی ہے مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اسمیں حسن باطنی نہیں ہے لیکن حُسن ظاہر سے شاید کسی کو بھی اختلاف نہو۔ کیونکہ خود حُسن بھی اس دنیا کے اچھے اشیا میں سے ایک شے ہے۔ جسکے وجود کا اظہار مختلف شکلوں طرح طرح کی صورتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ جس چیز میں اسکا کم و بیش حصہ شامل نہیں ہوتا وہ دنیا کے خاص اسٹیج پر کوئی اچھا پارٹ حاصل نہیں کرسکتی۔ اور جس چیز میں اسکا زیادہ حصہ شامل ہوتا ہے وہ مقبول عام اور ہر دلعزیز ہی ہو کر رہتی ہے۔ (دنیا) ظرفیت کے اعتبار سے بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ زمین گو بظاہر کوئی بہت خوبصورت نہیں مگر اپنے فوائد اور زرخیزی کے اعتبار سے بہت حسین کہے جانے کی مستحق ہے آسمان اتنی بزرگی رکھنے پر بھی تمام دنیا کے پورے سطح پر کتنا زیب اور پیمائش نظر سے کسقدر ٹھیک دکھائی دیتا ہے۔ اسکے ماورا۔ چاند۔ سورج۔ ستارے کہکشاں برق و سحاب اور الوان مختلفہ کے اعتبار سے تو حُسن کا ایک بڑا موقع کہا جاسکتا ہے دنیا کے بحری حصے کے حُسن تمام بری حصوں کی خوبصورتیوں سے بالکل ایک جداگانہ انداز رکھتے ہیں۔

بحری حصوں کے حُسن کی دلفریبیاں اور اسکے تمام تر انداز واقعی بری حصوں

ل خوبصورتی سے میری مراد حُسن اور حُسن سے مراد خوبصورتی ہوگی۔

حُسن سے بالکل ہی علیحدہ اور متغائر صورتیں رکھتے ہیں۔
گویا یہاں بھی حسن کی دو علیحدہ شکلیں پیدا ہوتی ہیں جنہیں سے ایک بحری حصص کے لیے خاص ہے اور دوسرے بڑی حصّوں کے واسطے۔ جب ہمارا بندرگاہوں یا جزیروں میں گزر ہوتا ہے تو سمندر کے کنارے اور دریاؤں کے دھارے ہمکو اپنے حُسن سے ایسا محو کر لیتے ہیں۔ کہ ہم خشکی کے حصّوں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اور جب پُربہار میدانوں اور دلفریب صحراؤں کے سبزہ زاروں میں ہمارا گذر ہوتا ہے تو ہمکو بحری حصوں کا خیال باقی نہیں رہتا۔
خشکی کے حصّے میں جو اقلیمیں واقع ہیں ان میں سے ہر اقلیم کا ایک انداز جداگانہ ہے ہر ہر اقلیم کی خوبصورتی علیحدہ ہر حصّے کا حُسن ایک خاص ادا رکھتا ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا رہا کہ اقلیموں کی خوبصورتی کیا ہے۔ ہر اقلیم کے واسطے شہروں کی وسعت سرحدوں کا ٹھیک موقع پر واقع ہونا ہر سرحد پر مضبوط قلعوں مستحکم فصیلوں کا پایا جانا حدود اربعہ پر رسدوں اور جنگیوں کا انتظام راستوں کا خطروں اور رہزنوں سے پاک ہونا اسکا حُسن خاص ہے۔
منزلوں اور بندرگاہوں کا پاک وصاف اور ان میں ہر شئے کا مہیا ہونا پانی اور غلے وغیرہ کا اہتمام اسٹیشنوں اور کارواں سراؤں کی سجاوٹ حسب محل و موقع کارگزار [illegible] کا متدین اور خلیق ہونا۔ زمین کا زرخیز اور رعایا کا مطیع و فرمانبردار ہونا باعث امن و آسائش ہوتا ہے اور بڑے بڑے شہروں میں درحقیقت ان ہی باتوں سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے اسکے علاوہ سڑکوں کا مضبوط وصاف بازاروں کا وسیع و آراستہ ہونا نفیس اور راحت رساں سواریوں کا ہر وقت موجود رہنا انکا حُسن ہے۔ عمارت کا بلند اور اسٹیشنوں اور بندرگاہوں کا بڑا ہونا شہروں کی رونق کا سبب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ملکوں وسیع شہروں میں بحالت مجموعی ان ہی چیزوں سے

دلاویزی پیدا ہوتی ہے اور ان کا عین حسن یہی ہے۔

بادشاہوں اور فرمانرواؤں کا حُسن ظاہری چہرے پر وجاہت اور جبروت کے آثار ہوں آنکھیں بڑی اور رعب دار ہوں رخساروں میں جلالت نگاہوں میں مروت و اخلاق کے ساتھ ایک خاص قسم کی قوت اور کشش ہو۔ جس سے دوسرے شخص کو آنکھ ملانے کی تاب نہو سکے۔ خوبصورتی کے ساتھ تن ومند ہو۔ اور حسن باطنی یا حسن ذاتی میں ان اوصاف کی ضرورت ہے۔

عادل ہو ثابت ہو۔ رعایا پروری اور سیاست مدنی میں درجہ اتم ہو۔ سخی ہو۔ [illegible] ایک مذہب کا پابند ہو۔ رحیم اور بردبار ہو۔ صاحب اقبال ہو۔ وزرا کا حسن دانائی اور زود فہمی ہے۔ مشورے میں کبھی عقل خطا نہ کرے۔ اُنسے زیادہ بادشاہوں کا کوئی مطیع ہو بجاے خود بادشاہوں اور جب بادشاہوں کے سامنے پائیں۔ تو اُنسے زیادہ مطیع اور فرمانبردار کوئی نہو۔ رعایا کے مزاج سے ہمہ وقت باخبر ہوں۔ روے زمین کے نقشے پیش نظر ہوں۔ فرمانرواؤں کے حالات سے کسی وقت غافل نہ رہیں۔

سپہ سالار اور فوجی افسروں کے حُسن ظاہری کے لیے قُوا کا قوی ہونا قد و قامت کا بلند ہونا آنکھوں کا بڑا اور پُر رعب ہونا سینہ کا چوڑا اور بازوؤں میں بلندی کے ساتھ خوبصورتی بہت ضروری چیز ہے۔ چہرے پر شجاعت کے آثار اور ہیبت و اجلال کا پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے۔ اور حُسن باطنی میں انسانیت رحم و مروت نازک مزاج۔ حیادار۔ اور نیک نفس کا ہونا واجبات سے ہے

[illegible] کا حسن۔ جہالت۔ تنگ مزاجی اور صاف درونی ہے حسن [illegible] بڑی باتیں معمولات لانی ہونا چاہئیں۔ اور تلوار کا [illegible] ہونا۔

دیگر حکام اور پیشہ وروں کا حسن ظاہری تو خیر کیسا ہی ہو لیکن حسن باطنی میں جفاکشی۔ بردباری۔ قناعت۔ مستقل مزاجی۔ خوش گفتاری۔ شیریں زبانی خوش اخلاقی۔ لاپروائی ضروری اوصاف ہیں۔

علماء و فضلاء میں حسن سیرت کا ہونا واجبات سے ہے۔ اور حسن سیرت کے اوصاف زہد و تقوی۔ پرہیزگاری۔ قناعت۔ بے لوس و ریا۔ عبادت۔ شب بیداری خاکساری۔ طرز معاشرت اور تمدن و اخلاق سے باخبری اور علاوہ وعظ و پند مذہبی کے ان باتوں کی اصلاح کا بھی شوق اور ان ضروری امور پر بھی بنظر اصلاح وعظ کرتے رہنا۔ اور کسی نئی بات کا بخوف ضرر اپنی معقول دلیلوں سے روکتے رہنا۔ اور بشرط استطاعت غربا و مساکین سے بہ سلوک خود پیش آنا اور سعی و کوشش سے اُنکی حاجت براری کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ عراق عرب و عجم کے اکثر شہروں میں پایا جاتا ہے۔

حسن ظاہری۔ بروت میں شارب کا لحاظ۔ ریش بقدر یکمشت و دو انگشت چہرے پر سباحت پیشانی پر گھٹا۔ آنکھوں میں حیا اور خوف خدا رخساروں پر ایک قسم کا نور جسم کی نقاہت سے اظہار اشتیاق وصل خدا۔

طبقۂ شعرا حسن ظاہری سے تو بالکل عاری ہوتا ہے کیا بہ لحاظ لباس اور کیا بہ لحاظ صورت۔ بہ لحاظ لباس تو اس وجہ سے کہ شاعری کی بالکل قدر نہیں اور قدر اس وجہ سے نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں اسکو بالکل دخل نہیں۔ شاعر اپنی شاعری سے نہ کوئی پل بنا سکتا ہے نہ کوئی عمارت اُٹھا سکتا ہے۔ نہ ہوائی جہاز اور موٹر و سائکل کا جواب دے سکتا ہے۔ نہ انجن تیار کر سکتا ہے۔ نہ کوئی باجا ایجاد کر سکتا ہے۔ نہ کسی اخبار کے کالم بھر سکتا ہے۔ ہاں جھوٹ کے پل جسقدر جی چاہے بنائے۔ نالوں کی ہوائی کھول کر باندھے۔ اور اُن پر

خیالات کے ہوائی جہاز ہر وقت اُڑایا کرے۔ اپنی فکر کی مشین کے زور سے ہر روز نئے نئے ایجاد اور اختراعات کیا کرے۔ تو پھر اس سے کیا۔ سوائے دماغ کو راحت دینے یا بےچین ہو جانے کے کسی کے جسم کو تو راحت نہیں پہنچا سکتا۔ اور اب دماغی راحت رساں بھی پیدا ہو گیا۔ جسکا نام۔ گراموفون ہے۔ شاعر اپنی شاعری سے کوئی سواری تو ایسی ایجاد نہیں کرتا جس پر بیٹھ کر لوگ ہوا کھائیں اپنی قدر و منزلت دکھائیں۔ سواری تو درکنار کسی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اگر تھوڑی دور پہنچائے تب شاید کچھ مزدوری پائے۔

اس شاعری میں عزّ سادات بھی گئی (باقی آئندہ)

نشتر مشہدی لکھنوی

بیگم

اس نام کا ایک ماہواری رسالہ حقوق نسواں کی حمایت لڑکیوں اور بچیوں کی تعلیم امورات خانہ داری کی وضاحت کے اغراض کو مدّ نظر رکھکر انشاء اللہ جنوری سنہ ۱۹۱۶ء سے اہلیہ جناب قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان کی ایڈیٹری میں لکھنؤ پُل جھاؤ لال سے جاری کیا جائے گا حجم رسالہ ۔ ۴۸ ۔ صفحہ کاغذ و کتابت چھپائی مثل رسالہ "تمدّن" کے ہوگی۔

قیمت سالانہ عہ ۲ ۔ ۳۱ دسمبر تک جن صاحبان کے نام درج رجسٹر ہونگے اُن سے عما اور "تمدّن" کے خریداروں سے ہمیشہ کے لیے۔ عما۔ جملہ خط و کتابت و ترسیل مضامین بنام ایڈیٹرس صاحبہ رسالہ "بیگم" پُل جھاؤ لال لکھنؤ ہونا چاہیے۔

نازک امتحان

میرا خیال ہے کہ اللہ پاک نے مرد کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہو کر اور بڑھ پل کر اپنی علمی زندگی اخلاقی طرز عمل علم مجلس واصول انسانیت میں کامل طور سے ترقی حاصل کرے اپنے قول فعل چال چلن ٹھیک رکھے اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو مشیخت میں نہ ڈالے کیونکہ مشیخت ہی انسان کو تباہ اور برباد کر دیتی ہے آئندہ کے واسطے کچھ پس انداز ضرور کرے۔

(۱) کیونکہ اب جو اُسکے واسطے نئی زندگی شروع ہونے والی ہے اُس میں اُسکو کوئی دقت اور پریشانی نہ پیدا ہو۔

(۲) اگر وہ اپنے تئیں فضول خرچ بنائے گا تو بیوی بچوں کو تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔

(۳) اگر وہ بدمزاج ہو گا تو بیوی آتے ہی اُسکے مزاج کی یہ حالت دیکھ کر بددل ہو جائے گی اور شروع شروع میں ڈرے گی بھی مگر جب یہ نئے دن نکلجائینگے اور دنیا کے آگے کے واقعات پیش آئیں گے تو اور دقتیں بڑھتی جائیں گی۔ اور یہانتک نوبت پہنچ جائے گی کہ بیوی بجائے رازدار ہونے کے ضروری واقعات بھی چھپانے لگے گی اور دلوں میں فرق پڑتے پڑتے بالکل دہراؤ کے خیالات رہنے لگیں گے۔ جو آئندہ اس گھر کو بجائے راحت وعیش کے نمونہ کے وبال بنا دیں گے۔

(۴) اگر علم مجلس نہوا تو یار دوستوں میں قدر منزلت نہو گی اعلےٰ جلسوں کی چھیتے پھرینگے گھر میں کچھ روشنی تمیز وتہذیب کی نہو گی بال بچے بھی اُسی رنگ

ڈھنگ کے اُٹھیں گے بیوی بھی مردہ دل اور جیسی طبیعت کی ہو بالکل ویسی ہو جائیگی نہ اُسکا حوصلہ بڑھے گا نہ ہمت سو پھر یہ گھر کچھ روشن گھروں میں سے نہ ہوگا پسواسطے مرد کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ گھر کا سردار بیوی بچوں کا مددگار رہے اگر اسی میں کوئی کثر رہ گئی تو پھر یہ گھر جو ایک نعمت غیر مترقبہ اللہ پاک اسکو عطا کرنے والا ہے اُسکی صحیح بنیاد کیونکر پڑے گی اور وہ ٹھیک ٹھیک کیونکر چلے گا۔ عورت کو کیا کیا مشکلیں پیش آنے والی ہیں:۔

عورت کو اللہ پاک نے تو اسلیے بنایا تھا کہ وہ مرد کے دل کا پھول آنکھوں کا سرور چین اور تفریح کا باعث ہو اگر اُسکو یہ منظور نہ ہوتا تو حضرت آدم کے پہلو میں سے حضرت حوّا کو پیدا نہ کرتا کیا اُسکی قدرت میں اور طرح سے ہویدا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا وہ جسطرح چاہتا پیدا کرسکتا تھا مگر اُس نے اس رحم دل پھول کو اسلیے اسطرح نہیں پیدا کیا کہ وہ دنیا میں جاکر گلِ خاردار ہو جائے گی اور اُسکے لیے دنیا میں ایسی ایسی تکلیفوں کا سامنا ہوگا جس سے مرد بالکل مبرّا ہیں۔

جو لڑکی ہونے کے وقت کیسے کیسے نازوں سے پالی جائے کیا کیا ماں باپ اُسکے چاؤ چونچلے اُٹھائیں آج ہنڈکلیا پک رہی ہے کل گڑیا کا بیاہ ہے پرسوں چوتھی کا انتظام ہے ماں باپ ہیں کہ نہال ہیں کہ اب تو ماشاءاللہ ہماری بچی قرآن شریف ختم کرچکی جیلم رسالہ پڑھ رہی ہے میٹھے چاول پکا لیتی ہے گڑیا کے کپڑے خاصے سینے لگی ہے اب چند روز میں گھر کا۔ تھوڑا بہت کام بھی سنبھال لے گی ماں کا ہاتھ بٹائے گی باپ کو پنکھا جل کر کھانا کھلائے گی باپ کے آنے کے وقت جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوگا وہ کرے گی جانے کے وقت چھتری لکڑی دیدیا کرے گی۔

اب گڑیوں کے کپڑے سیتے سیتے اپنے پاجامے سلنے لگے اور کرتے اماں کتر دیتی ہیں

ٹی سی لیتی ہے ابتو اماں نے کرتے میں بوٹیاں ڈالدیں اور بیٹی کو دیدیں کہ اس
رح تم بھی کاڑھو اب کڑھائی سلائی پڑھائی سب کو ترقی ہو رہی ہے اور خیر سے
مر بھی تیرہ چودہ برس کی ہوگئی ہے اب کہنے والوں نے جان کھانی شروع کردی
ہے کہ لڑکی جوان ہوگئی شادی کردو - یا واکے دل میں بھی اُلجھن سی ہونے لگی
کہ لڑکی جوان ہوگئی شادی کردنی چاہیے اس پر بھی گھر والوں اور دنیا کے
تقاضے شروع ہوگئے اور اُنکو مجبور ہو کر شادی کی فکر پڑی رقعہ پرچے آنے
شروع ہو گئے کپڑے لتے سلنے لگے -

اتفاق سے جس سے نصیب لڑا تھا وہ سب کی پسند آگیا اور منہ میٹھا یا منگنی
کی رسم ہوگئی بات پکی ہو جانے کے بعد حسب حیثیت تیاری شادی کی مستقل طور
پر شروع ہوگئی اور ماں باپ بہت خوشی خوشی جو کچھ بڑی محنت اور مصیبت
سے جمع کیا تھا اُس پیاری بیٹی کے دینے کے لیے تیار کر رہے ہیں اور اسی
خیال میں لگے ہوے کہ خدا ہماری عزت آبرو رکھے اس نازوں کی پالی ہوئی بچی
کے ہاتھ پیلے کرادے - مگر اب تک یہ نہیں معلوم کہ یہ جوانجان آدمیوں اور غیر گھر
میں جارہی ہے اسپر کیا گزرے گی اور وہ اس نئے گھر میں جسکو اُس کے لیے
نئی دنیا کہنا ناموزوں نہوگا کیا کرے گی اور کیونکر اُن نئے آدمیوں میں رہے گی
لیکن اسکی تو ابھی اُنکو پروا بھی نہیں ہے ابھی تو شادی ہونے کی خوشی اور
دلھن بنا ہوا دیکھنے اور داماد آنے کا شوق دل میں بسا ہوا ہے نہ یہ خیال کہ
داماد صاحب کا مزاج کیسا ہوگا نہ یہ معلوم کہ سمدھیانہ والوں کا طرز عمل کیا
ہوگا اور ہماری بچی کے کیسا برتاؤ کریں گے - (باقی آیندہ)

ح - ج - بیگم

ضروری اعلان

اس رسالہ کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ انشاء اللہ اسے مستقل محنت اور کوشش کے ساتھ بتدریج ترقی دی جاے۔ شروع کے پرچوں میں آب وتاب اور غیر معمولی دلکشی کے سامانوں سے ارادۃً پرہیز کیا گیا ہے۔ ورنہ بہت کچھ ممکن تھا۔ بتدریج انشاء اللہ تعالےٰ اسے نہ صرف ایک اعلےٰ درجہ کا علمی و ادبی رسالہ بنانا مقصود ہے بلکہ اس سے چند اور ضروری علمی کام لینے ہیں مثلاً (۱) اُن حضرات کی قابل قدر تصنیف و تالیف کو اپنے خرچ سے چھپوانا اور شائع کرنا جو بعض مجبوریوں سے خود ایسا نہیں کر سکتے جن صاحبوں کو ہم سے یہ خدمت لینی منظور ہو وہ براہ نوازش ہم سے خط و کتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جائیگی (۲) وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوانا اور ہونہار طالب علموں کو خاص طور پر اس علمی خدمت کیطرف متوجہ کرنا اور اُنسے مضمون لکھوا کر اُنکی مالی خدمت کرنا بعض اوقات انعامی مضامین ہم خود تجویز کرینگے مگر جو صاحب کسی خاص مفید مضمون پر قلم اُٹھانا چاہیں اور ہم سے حق الخدمت کے متوقع ہوں وہ براہِ نوازش ہم سے خط و کتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جاے گی۔ (۳) خریداران "تمدّن" کے لیے ایک سرکیولیٹنگ لائبریری قائم کرنا۔ جس سے بہت کم خرچ میں عمدہ عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے گزر سکیں۔ السعی منی والاتمام من اللہ

ایڈیٹر

تبادلہ

اسوقت تک ہم کو تبادلہ میں بہت کم رسالہ جات اور اخبارات وصول ہوے ہیں جسکے یہ معنی ہیں کہ ابھی تک ایڈیٹر صاحبان نے پُرانے پتہ کی جگہ نیا پتہ "دفتر رسالہ "تمدّن" پل چھاؤنی لال لکھنؤ" اپنے تبادلہ کے رجسٹروں میں تحریر نہیں فرمایا۔ پچھلا پرچہ ہم اُن تمام رسائل و اخبارات کو بھیج چکے ہیں جو ہمارے رجسٹر تبادلہ میں درج ہیں اور یہ پرچہ بھی بھیج رہے ہیں امید ہے کہ اس پرچہ کے بعد تبادلہ کے پرچہ ہمارے دفتر میں پہنچنے لگیں گے۔ ورنہ ہم آیندہ کا پرچہ اُن رسالجات اور اخبارات کو نہیں بھیجینگے جو ہمارے دفتر میں وصول نہیں ہونگے۔ منیجر

شاعری پر اسوقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر آخر اس بحث کا فیصلہ نہ ہوتا تھا اور نہ ہوا کہ شاعری سوسائٹی کے لیے فائدہ مند چیز ہی یا نقصان دہ۔ اسوقت کسی خاص زبان کی شاعری زیر بحث نہیں ہے بلکہ عام طور پر شاعری کا ذکر کرنا مقصود ہے شاعری کی سطحی تعریف تو یہ ہوسکتی ہے کہ کسی خاص مضمون کو صاف اور سیدھی عبارت میں لکھ دینے کے بجاے اسکے تک بندی کے اصول کے مطابق اس قسم کے ٹکڑے کرکے قلبند کیے جائیں کہ طبیعت کو نثر سے زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہوں۔ مگر تھوڑے سے غور و خوض کے بعد شاعری کی نسبتاً بہتر تعریف نکل آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ مضامین نثر کو پر اثر طریقہ پر منضبط کرکے اس تقسیم کے ساتھ پیش کرنا جو دلکش معلوم ہونے کے علاوہ طبیعت میں ایک خاص جذبہ اور جوش یا اثر پیدا کرے۔ شاعری کی ایک تعریف یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کردینے کو شاعری کہتے ہیں۔ اصل میں یہ کوئی جداگانہ تعریف نہیں ہوی۔ اگر مذکورۂ بالا دونوں تعریفوں کو یکجا کردیا جاے تو بھی شاعری کی مکمل تعریف نہیں ہوتی۔

شاعری کی سینکڑوں تعریفیں ہیں ان میں ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اسکے ایک بند یا ایک شعر کے ایک مصرع میں اسقدر مضمون آجاے جو اگر نثر میں لکھا جاے تو اسکے لیے کئی صفحہ درکار ہوں۔ مگر ان کئی صفحوں کی جگہ صرف چند لفظ جو طبیعت کو متوجہ کرنے والے ایک قاعدہ کے

مطابق ملا کر رکھدیے گئے ہیں بالکل کفایت کرتے ہیں۔

ایک شاعر اپنے ایک شعر میں موجودات عالم اور اسکے عجائبات کا ذکر کرتا ہے جس سے اُن تمام چیزوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ اور اسکے ساتھ دلی جذبات کا ایک خاکہ بھی پیش نظر ہو جاتا ہے۔ گو یہ بھی شاعری کا ایک ہی رخ ہے مگر اسکے کارآمد ہونے کی اسکے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی کہ بہت سی وہ باتیں تھوڑی سی عبارت میں بیان کی جاسکتی ہیں جو اگر نثر میں لکھی جائیں تو بہت طویل ہوں۔ شاعری کی اصل صفت یہ ہے کہ شعر آدمی کے جذبات پر اتنا گہرا اور فوری اثر کرے کہ سننے والا تھوڑی دیر کے لیے تو اسکے اثر سے اسقدر مغلوب ہو جائے کہ جو کچھ مطالبہ اس شعر میں کیا جائے اسکے پورا کرنے کے سوا اسے کچھ بن نہ پڑے۔ عرب میں شعرا نے قبیلوں کو بنانے۔ بگاڑنے۔ لڑانے۔ ملانے کے لیے جو کچھ بھی کام کیے ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں۔

ایک عرب ہی پر کیا منحصر ہے تمام دنیا کے شعرا کے متعلق اس قسم کے کارنامے علم میں آتے ہیں۔ ایران کے ایک شاعر رودکی کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت امیر نصیر ابن احمد نے خراسان فتح کرلیا اور ہرات میں رہ پڑا اسوقت امرا وزرا نے رودکی سے لکھوا کر ایک قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں گذرانا اس قصیدہ نے امیر پر اسقدر اثر کیا کہ اُسی وقت ہرات سے بخارا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسی طرح انگلستان اور فرانس کے بعض شعرا کے متعلق بھی یہ ہی بیان کیا جاتا ہے۔ انگلستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جسوقت ایڈورڈ شاہ انگلستان نے

ویلز پر فوج کشی کی تو اسوقت ویلز کے شاعروں نے نظمیں لکھکر اپنی قوم کو برانگیختہ کیا جس سے شاہ ایڈورڈ کو ویلز فتح کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ ویلز کی فوج مدمقابل کی فوج سے بہت کم تھی اسی طرح دو فرانسیسی قصائد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے جو "مارسیلز" اور "پیرس" کے نام سے مشہور ہیں اور جو چارلس دہم کے مقابلہ میں قوم کی آزادی کی حمایت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے لکھے گئے تھے۔" ان مثالوں کے بعد یہ تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ شعر بیکار چیز ہے۔ بعض لوگ شاعری کو تنکار کیطرح کار بیکاران کہتے ہیں مگر کیا ایسی شاعری بیکار ہو سکتی ہے جس سے اس قسم کے نتائج مترتب ہوں اگر بیکاری کے یہ ہی معنی ہیں اور بیکاری کے یہی نتائج ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں تو کوئی ذی عقل اسکے ماننے میں حبہ بھر بھی تامل نہیں کرے گا کہ "ایسی بیکاری پر کار آمد ہونا قربان ہے۔ شاعری یا شعر نے لوگوں سے بہت کچھ لکھوایا ہے کسی نے اسکے موافق قلم فرسائی کی ہے کسی نے مخالف "مخالفت میں منجملہ اور باتوں کے ایک یہ بھی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ شعر میں بے انتہا مبالغہ ہوتا اور شعر سنتے سنتے لوگوں کی طبیعت مبالغہ آمیز ہو جاتی ہے جس سے وہ عملی کاموں کے قابل نہیں رہتے۔ جہاں تک واقعات کو غلط بیان کرنا شعر سے تعلق رکھتا ہے وہاں تک شعر کوئی عمدہ چیز نہیں ہے مگر معترض صاحب اگر تشبیہات یا باریک تمثیلات کو بھی مبالغہ میں شامل کرتے ہیں وہ ایک حد تک غلطی پر ہیں شعر پر اعتراض کرنے سے قبل اگر یہ غور کر لیا جاے کہ شاعر جو صرف ایک کام نہیں کرتا جسکے متعلق دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے جسکو اسی شعر میں

کچھ مصوری کے کرشمہ دکھانے ہیں کچھ موجودات قدرت مستقل کرشموں مثلاً جنگل پہاڑ وغیرہ کا ایک نظارہ پیش کرنا ہے اور اسکے جلو میں قدرت کے وہ جلوہ بھی دکھانے ہیں جو مستقل نہیں ہے یعنی برسات۔ بجلی۔ گرج پہاڑ۔ خزاں۔ گرمی۔ سردی وغیرہ وغیرہ اور ان چیزوں کی ہی ایک جھلک وہ نہیں دکھاتا بلکہ وہ ان مختلف سینریوں میں سے بیشتر کو اکٹھا کرتا ہے اور اگر صرف حُسن اور عشق ہی کو لے لیجیے تو اس سب کے درمیان ایک ہیروئن کو اپنی کسی خاص ادا سے بیٹھا ہوا دکھاتا ہے۔

شاعر جسکو یہ سب باتیں دکھانی ہیں وہ آخر کیا کرے کہ ان سب باتوں کو بھی دکھائے اور اس میں سائنس یا ریاضی کی طرح روکھا پن موجود ہو۔ اگر شعرا ریاضی دان بھی ہوا کرتے تو غالباً ریاضی وہ ریاضی نہوتی جو آج ہے اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر ظاہرا حالت میں یا یا الفاظ کے لحاظ سے کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں معلوم ہوتا مگر جو کچھ اثر مضمر ہوتا ہے وہ انسان کو اس واقعہ کے سب پہلو دکھاتا ہوا اُس سے کچھ آگے لیجاتا ہے۔ مثلاً کسی کے حُسن کی تعریف میں ایک شاعر پری کا لفظ استعمال کرتا ہے یا پری سے تشبیہ دیتا ہے۔ گو یہ مبالغہ اور سخت مبالغہ کہا جا سکتا ہے مگر کیا سُننے والے کی آنکھوں کے سامنے بہترین حُسن انسانی کا نقشہ نہیں کھنچ جاتا؟ یہ ممکن کہ انتہائی حُسن انسانی کے ساتھ اسکی نظر کے سامنے بھونڈا سا پری کا خاکہ بھی کھنچ جاتا ہو مگر اس پری کے خاکہ سے شاعر کا مقصد فوت نہیں ہوتا اور وہ سُننے والے کو بہترین حُسن انسانی کا ایک نقشہ دکھا دیتا ہے۔ بڑے بڑے مصوروں نقاشوں۔ واعظوں۔ ایکٹروں۔ اور خداداد حسینوں پر جدا جدا ہر شخص

کچھ نہ کچھ اعتراض کر سکتا ہے۔ مگر ایک وہ شخص جو ان سب چیزوں کو چند لفظوں میں مکمل کر کے آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے اسپر تو جتنے بھی اعتراض ہوں کم ہیں۔

بعض لوگ شاعری کو میجک لنٹرن سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری بھی جتنی در پردہ (تاریکی) کی حالت میں ہوتی ہے اسی قدر زیادہ اچھی اور پسند یدہ معلوم ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ جوں جوں حقیقت کھلتی جاتی ہے اُسی قدر شعر کا لطف کم ہوتا جاتا ہے شلاً فردوسی نے رستم کی بابت جو کچھ لکھا اب اُسے بہت کم لوگ سچ سمجھتے ہیں۔ظاہرا یہ بات جی کو لگتی ہوی معلوم ہوتی ہے مگر اسکے ساتھ اگر زمانے کی ترقیوں اور لوگوں کے خیالات پر غور کیا جاے تو کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے کا کوئی شاعر بھی اس طرح کے مبالغہ سے کام لے گا جس سے فردوسی نے کام لیا آج اگر کسی شخص کی بہادری کی تعریف کرنی ہوگی تو وہ آج کے مذاق کے مطابق ہوگی ۔کون یہ کہہ سکتا ہے کہ فردوسی اگر آج ہوتا تو وہ ہی کہتا جو اُس نے شاہ نامہ میں کہا۔

دوسرے یہ کہا جاتا ہے کہ جوں جوں حقیقت کھلتی گئی طلسم ٹوٹتا گیا انسان کے متعلق ایسی کونسی جدید تحقیقات ہوی ہی بلکہ جدید تحقیقات سے تو یہ ہی معلوم ہوا کہ انسان (رستم) کی قوت کے متعلق فردوسی جو کچھ لکھ گیا وہ در اصل واقعیت سے کم ہے کیونکہ اب انسان خود اگر سوا سومن کا گرز نہیں اُٹھا سکتا تو وہ سب کام کر گذرتا ہے کہ جو فردوسی بیچارے کے انتہائی جدت طراز اور دور بین تخیل والے دماغ میں نہیں آسکتے تھے یہ سارا کھیل مذاق طبیعت کا ہے اب لوگوں کا مذاق مبالغہ سے واقعیت کی

طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے۔

شاعری کے خلاف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تشبیہات اور استعارات کم ہوتے جاتے ہیں۔ کم ہوتے جانے کی ایک تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ استعارات وغیرہ ایک عرصہ سے استعمال ہو رہے ہیں اور وہ عام طور پر ایسی ہی چیزوں سے لیے جاتے ہیں جو انسان کی نظر سے گذر سکیں اسلیے ان میں بار بار دُھرائے جانے کی وجہ سے دلکشی نہیں رہی یا یہ کہ استعارات و تشبیہات عام طور پر ناممکن الوقوع یا کم از کم مبالغہ کے تحت میں آنے والے اور مشکل دائرہ میں سے لی جاتی ہیں اور اب جیسا کہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں جو غیر امکانی معلوم ہوتی تھیں دائرۂ امکان میں آنے لگیں اس لیے جسقدر ناممکن باتیں کم ہونے لگیں اوسی قدر استعارات اور تشبیہات کا دائرہ کم ہوتا گیا۔ پہلی دلیل کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا نے یا دنیا میں رہنے والے انسانوں کے دماغوں نے اسوقت تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ انکو تمام کائنات قدرت کا حال معلوم ہو گیا ہو۔ اور اس لیے ابھی دنیاوی اور سماوی چیزوں میں اسقدر گنجائش باقی ہے کہ ان سے کام لیا جائے۔ دوسری دلیل کا جواب بھی یہی ہے مگر دوسری دلیل کے لیے یہ ہی جواب تجویز کر دینے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے ایجادات کرنے والے دماغ غیر امکانی چیزوں کی طرف جب ہی منتقل ہوئے جب شاعروں نے انھیں کچھ ایسی باتیں سجھا دیں جو انسان کے مطلب کی ہوں اور ہم انسانوں سے اتنی مناسبت ضرور رکھتی ہوں کہ شاعر اسکو بطور کسی وصف یا حالت کی معراج کے تشبیہ کے طور پر استعمال کر سکے۔ اب میں سوال کر سکتا ہوں کہ وہ

چیز جو ایجادات کرنے والے دماغوں کو ایجاد کی طرف منتقل کرلے سوسائیٹی کے لیے مضر ہوسکتی ہے؟۔

شاعری کی اس طرح حمایت کرنے سے اُس شاعری کی حمایت مقصود نہیں جو در اصل شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہے یعنی محض گل و بلبل کی شاعری۔

ایڈیٹر

استدعاے خاص

مَیں اپنے جملہ احباب اور اولڈ بوائز کی خدمت میں خاص طور پر سفارش کرتا ہوں کہ وہ بچھپر عنایت کرکے رسالۂ "تمدّن" کو ترقی دینے میں کوشش فرمائیں جو احباب قلمی معاونت فرما سکتے ہیں۔ وہ براہ نوازش مضامین نظمیں۔ اور غزلیں عنایت فرمائیں۔ دیگر احباب خریدار بن کر اور خریدار پیدا کرکے ممنون فرمائیں۔ ایک علمی رسالہ جاری کرنے کا مجھے خیال عرصۂ دراز سے تھا۔ مگر میری مجبوریاں ابتک مانع ہوئیں۔ اب اللہ نے اپنے فضل سے میرے بڑے لڑکے عباس حسین سلمہ کو اس کام کے قابل کردیا اور بمصداق ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ رسالۂ "تمدّن" برادرم مولوی عبد الراشد صاحب سے لے کر جاری کیا گیا۔ اب یہ جملہ محبان علم اور خصوصاً میرے ذاتی احباب کی توجہ کا محتاج ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میری اس درخواست پر توجہ فرمائی جائے گی۔

خاکسار

سرفراز حسین قاری (علیگ) دہلوی

چاند

چاند کو کون نہیں جانتا - چاند اجرام فلکیہ کا وہ قابل قدر کرۂ نور ہے جو روشنی میں سورج سے دوسرے درجہ پر ہے اور دنیا کی الٹ پھیر کے ایک مساوی حصہ کا سرتاج ہے - سورج دن کو اکیلا نظر آتا ہے مگر چاند جسکے نام میں کچھ محبت کا اثر ہے وہ سورج کی طرح اکھل کھرا نہیں ہے وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ اس نیلگوں تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے -

چاند کے نام میں خبر نہیں کیوں اسقدر کشش ہے ؟ اسکے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چاند کے سایہ میں کیونکہ طالب و مطلوب کے یکجا ہونے کا سین باوجود اس چرخ کجرفتار کی ناہنجاریوں کے بعض اوقات دکھائی دے جاتا ہے اس وجہ سے چاند میں اس محبت کا کچھ عکس پہنچ گیا ہے اگر اس دلیل کو چاند کی طرفداری میں پیش کیا جاسکے تو اسکی مخالفت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شب فراق بھی تو اس چاند کے سایہ میں بسر ہوتی ہے - اور جو عاشق ناکام رات بھر کروٹیں بدلتا اور چاند کی طرف دیکھتا ہے - اسکی مایوسی اور مایوس کن نظر کا اثر چاند پر کیوں نہیں پڑتا -

اس نظر کا اثر تو ہمارے پہلے دعوے کے مطابق ہی ہوتا ہے - کیونکہ گو شب فراق سہی - مگر شب فراق کی تڑپ جدائی کی مایوس نظر دونوں معشوق کی محبت میں ڈوبی ہوی ہوتی ہیں اور وہ اسی طرح چاند میں بھی محبت یا کشش کی قوت پیدا کر دیتی ہیں جس طرح ایک کامل پیر جس طرف نظر ڈالتا ہے اور جو اسکی نگاہ کی زد میں آجاتا ہے اسکے قلب کو منور کر دیتا ہے

چاند میں دلفریبی ہوتی ہے! مگر سورج میں اسکے خلاف نظر کو پیچھے ہٹانے کی قوت ہوتی ہے۔ سورج میں ایک جلالی شان ہوتی ہے اور چاند میں جمالی شان کے علاوہ ایک اور قوت ہوتی ہے جسکو میں دلکشی سے تعبیر کر چکا ہوں

چاند کی طرف اگر آپ دیکھیں تو اسکو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے اور بالکل یہی بات حسین انسان میں ہوتی ہے۔ میں خدانخواستہ یہ منوانا نہیں چاہتا کہ معشوق اور چاند دونوں برابر کی چیزیں ہیں حضرت حافظ شیرازی اسکا بہت پہلے فیصلہ فرما گئے ہیں کہ چاند کو معشوق سے کیا نسبت ہے

عارضش را بہ مثل ماہ فلک نتواں گفت
نسبت دوست بہ ہر بے سر و پا نتواں کرد

ہمارے ایک اردو شاعر نے بھی گو بہت صاف اور کھلا لکھا ہے مگر اپنی بساط کے موافق خوب لکھا ہے۔

چاند سے جو تجھ کو دے تشبیہ بے انصاف ہے
اسکے منہ پر چھائیاں ہیں تیرا مکھڑا صاف ہے

ان لوگوں کے لیے بیشک چاند سے معشوق کو تشبیہ دینا باعث ہو سکتا ہے جو اپنے معشوق کو چاند سے کمتر یا اسکے برابر سمجھتے ہوں۔ چاند کو اس دلنواز چیز سے تشبیہ دینے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ خدانخواستہ چاند اوصاف معشوقیت میں افضل یا برابر ہے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کرنے کے بعد جو ہمارے نزدیک اس قسم کی تشبیہات دے کر معشوق کو چاند سے کمتر سمجھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ کی طرف رجوع کرنے سے چاند.. کو

معشوق سے کوئی نسبت نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاند کی صرف اس وجہ سے وقعت کرتا ہے کہ چاند میں ان اوصاف میں سے چند کی ایک جھلک پائی جاتی ہے جو بدرجۂ کمال معشوق میں موجود ہوتے ہیں غرض اس تمام بحث سے جو کچھ بھی نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ دونوں فریق خواہ وہ چاند کو اپنے معشوق سے برتر خیال کریں یا بدتر وہ چاند کی اسی وجہ سے وقعت کرتے ہیں کہ چاند میں وہ اوصاف ہیں جو معشوق میں ہوتے ہیں۔ غرض محبت کے بندے چاند کو اس عالم موجودات کی بہت سی کیا بلکہ سوائے ایک کے سب چیزوں سے زیادہ قابل وقعت خیال کرتے ہیں اور یہی اسکی دلکشی کا راز ہے۔

محمد ابراہیم دہلوی

"میں تم کو متنبہ کرتا ہوں کہ کبھی یہ خیال مت کرو کہ امارت کا لازمی نتیجہ خوشی ہے اور غربت کا رنج۔ کبھی اپنی زندگی کو یہ خیال کرکے شروع نہ کرو کہ تم کو دلی خوشی بھی حاصل ہوگی جب کہ تمھارے پاس دولت ہے۔ ایک آدمی کی خوشی زیادہ تر اس کے مزاج پر منحصر ہے اگر اس کا مزاج اچھا ہے تو امارت اسکے لیے خوشی پیدا کرنے کا باعث ہوگی اگر اسکا مزاج خراب ہے تو وہ رنج پیدا کریگی۔"

"ڈیمپیر"

رسوم

کوئی قوم کوئی ملک کوئی ملت ایسی نہیں جسمیں رسوم کا رواج نہ ہو
رسم ہے کیا؟ رسم اُن رواجوں کا نام ہے جو ایک عرصہ تک کسی ملک میں جاری
رہنے کے بعد لوگوں پر اسقدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ انکو مضر سمجھنے کے
بعد بھی ان سے پیچھا چھڑانا دشوار کیا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے خصوصیت
کے ساتھ ان رسوم کو ترک کرنا جنکو بالواسطہ یا بلا واسطہ مذہب سے منظوری
حاصل ہوتی ہے۔

رسم پر ہندوستان کے اُردو رسائل اور اخبارات میں بہت کچھ لکھا جاچکا
ہے اور جہاں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو رسم کی پابندی کو وضعداری
خیال کرتا ہے وہاں اُس گروہ کے افراد بھی کچھ کم نہیں ہیں جو رسم کو
ایک مہمل حرکت خیال کرتے ہیں۔ رسم کی پابندی کے معاملہ میں جو طبقہ
زیادہ پابند وضع ہے وہ عورتیں ہیں قریب قریب ہر گھر میں مردوں کو
یہ شکایت ہوتی ہے کہ عورتیں رسوم کی پابندی کے لیے بیجا زور دیتی
ہیں اور بعض اوقات تو یہاں تک ہوتا ہے کہ گھروں میں لڑائی کی
بنا یہی رسم کی پابندی ہو جاتی ہے۔ خاوند صاحب رسم کی پابندی حرام
خیال کرتے ہیں بیگم صاحبہ رسم کو چھوڑنا کفر۔ اس چھوٹی سی بات پر آپس
میں شکررنجی ہو جاتی ہے۔ اسوقت تک جو بحثیں اس مسئلہ پر ہوئی ہیں وہ یہ
بتاتی ہیں کہ تنو میں سے نوے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ رسوم محض لغو
ہوتی ہیں مگر تعجب اور رونا تو اس بات کا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ گروہ جو

رسم کو کفر اور اسکے کرنے والے کو قریب کافر سمجھتا آنکھوں دیکھے
کنوئیں میں گرتا اور رسموں کو پورا کرتا ہے۔ رسوم قبیحا کو چھوڑنے کا وعظ
کہنے سے پہلے ہمکو ان باتوں پر غور کرنا چاہیے جو رسم کو چھوڑتے نہیں
دیتیں۔ کیونکہ مرض کی تشخیص ضروری ہوتی ہے اور جب مرض تشخیص ہوجاتا
ہے جب کہیں مرض کے لیے دوا تجویز ہوسکتی ہے یہ تو بالکل ظاھر
ہے کہ رسوم کو چھوڑنے کے لیے جو چیز مجبور کرتی ہے۔ وہ یا تو کفایت کا
خیال یا نفقت کی پریشانی اور تکلیف سے بچنے کی ضرورت یا اس رسم کا
عام تہذیب کی ترازو میں پورا نہ اترنا۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو
رسم کی پابندی سے آزاد کرنا چاہے تو وہ کم از کم اس وقت تک اس سے
سبکدوش نہیں ہوسکتا جب تک پہلی مرتبہ وہ اپنے مقصد کو فوت نہ
ہوجانے دے۔ بادی النظر میں یہ ایک معمولی رائے ہے جو ان لوگوں کے
لیے دی گئی ہے جو دنیا۔ کنبہ قبیلہ اور لوگوں کی طعنہ زنی کا حد درجہ
خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس خاص پابندی سے معرا خیال
کرتے ہیں وہ بالکل آزاد ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ رسوم کو چھوڑ کر اپنے
آپ کو تکلیف سے بچالیں اور کفایت کا ضروری مقصد بھی حاصل کرلیں
مگر وہ لوگوں سے اپنی تقلید نہیں کرا سکتے۔

ہندوستان میں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں
میں نوے فیصدی آدمی ایسے ملیں گے جو نہ تو خود کفایت کرتے ہیں
اور نہ کسی دوسرے کو کفایت کرتا ہوا دیکھکر خوش ہوتے بلکہ اسکو حقیر
سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر شخص خواہ کسی حیثیت اور کسی مرتبہ کا کیوں نہ ہو
فطرتاً وہ اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی فرد بھی اسے بے وقعت

سمجھے اور اسی لیے وہ رسوم کو چھوڑنے کے فوائد کو محض اس لیے قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ کہیں لوگ اسے بے وقعت خیال نہ کرنے لگیں اس لیے اس شخص کے لیے جو رسوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہے لازم آیا کہ وہ ابتدا میں کفایت اور اپنی تکلیف کے خیال کو نظرانداز کرے۔ جب وہ دو چار دفعہ کے بعد اپنے اصل مقصد کو پورا کر سکے گا اور رسوم کی اصلاح ہونے لگے گی۔

جہاں میں رسوم کی اصلاح کا مدعی ہوں وہاں میں یہ نہیں کہتا کہ رسوم کو یک قلم ترک کر دیا جائے کیونکہ ہندوستانی عورتوں کا ملنا جلنا بہت کچھ ان رسوم پر مبنی ہے اور اس ملنے جلنے سے بہت سے ضروری کام مثلاً لباس وغیرہ کی اصلاح۔ سلیقہ شعاری اور طریقہ برتاؤ کا علم اور شادی بیاہ کے متعلق ابتدائی معاملات سرانجام پاتے ہیں۔

ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں تخفیف کرنے کا خیال کرنا میرے نزدیک سوسائیٹی کے لیے مُضر معلوم ہوتا ہے اور اس مضمون کے لکھنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ رسوم بھی رہیں اور ان میں ایسی سہولتیں بہم پہنچ جائیں جو خوبی اور لطف کے مقابلہ میں حد سے زیادہ تکلیف دہ نہوں اس خاص مسئلہ پر ملک کے اہل قلم اپنی اپنی رائے دیں۔ کہ موجودہ رسوم میں کس طرح اصلاح ہو سکتی ہے اور ان کی تکلیف دہ باتوں کی جگہ کیا کیا ایسی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جو سہل العمل بھی ہوں اور نسبتاً پر لطف بھی۔

اخلاق حسین

جون جولائی - جو صاحبان جون جولائی کے پرچے ہمسے طلب فرماتے ہیں اُنکی خدمتمیں التماس ہے کہ جون جولائی کے پرچے تمدن پریس دہلی سے شائع ہوئے تھے اور ان کے متعلق انکی پتہ پر خط و کتابت ہونی چاہیے۔

منیجر

مرد۔ عورت

ذیل کے دونوں مضمون "خطیب" دہلی میں شایع ہوئے ہیں۔ ہم ناظرین تمدن کی دلچسپی کی غرض سے انہیں نقل کرتے ہیں۔ پہلا مضمون "عورت سے" سید ظفر حسن صاحب علوی ناظم دائرۃ الادب دہلی کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا ایک عورت کا لکھا ہوا ہے جو حضرت نیاز فتحپوری کے توسل سے خطیب تک پہنچا ہے۔ ایڈیٹر

عورت سے

او سراب نشاط! تیری فتنہ سامانیوں نے، خدا جانے، کیا کیا بلاخیز ہنگامے راحت بخشی کے پردہ میں اب تک برپا کئے ہیں، اور کون جانتا ہے کہ ابھی تیری عجیب و غریب ذات سے کیا کیا مظالم و مصائب افسانے ہونگے، مجکو ابتک تیری سب سے پہلی نوازش یاد ہے جبکہ تیرے لئے میرے بائیں پہلو کو چاک کیا گیا تہا اور تو نامعلوم و غیر محسوس طریقہ سے میرے پہلو میری سکون نصیب خلوت پر قابض تھی۔

او فریب نشاط "ہابیل و قابیل کی سب سے پہلی عداوت میں تیرے ہی رخسار آتشین کا جلوہ تھا"

او ہنگامہ خاموش "بنی اسرائیل میں فسادات کی ابتدا تیرے ہی نگاہ فسوں ساز سے روبراہ ہوئی تھی۔

او شربت سم آلود "او میٹھی چھری۔ تیری ہی نامعلوم دہار برسوں مصر کے قید خانے میں ایک معصوم کی آزادی پر پھرتی رہی کیا تو وہ نہیں ہی جس نے ہفت خانہ بناکر ایک نبی کی عصمت اور ناموس الٰہی کو پھسلا کر لوٹ لینا چاہا تہا"

او زاہد فریب "شیخ دصنعا، کا طویل، ہ کسی نے بہ یک اشارہ ابرو تمتہ کیواسطے پامالکرڈالا۔

ارے کیا تو نہ تھی۔

او برش ہیم یہ غریب فرہاد کا خون اب تک تیری فقرے بازیوں کا نوحہ خواں ہے۔

او مقابل مجہول یہ اچھا ابتلا ہے لنکا، کسکے نام پر راکھ کا ڈھیر بنائی گئی اور بخیر فراغت کیا تجکو یاد نہیں رہا غریب رتن سین پر تو نے کیا کیا مصائب ڈالے اچھا وہ کون تھا جس نے نل سے حکومت چھڑائی۔ او تیش سرد یا شیر افگن کا رخت ہستی۔ کسکی چنگاری سے خاک ہوا

او تصویر قیامت یہ تجکو دفعہ ملنا شرط ہے پہر تو بلائے ناگہانی ہے جام غفلت ہے وزد صبر ہے مرگ ہوش و حواس ہے زندان آزادی ہے غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو ابتلائے عظیم کے لئے درکار ہونا چاہیئے۔

او پھسلانیوالی گڑیا، بظاہر نہایت بہولی بہالی، غریب صورت، ترحم خواہ "بے کس" نازک یا نحیف کمزور، دل ہلانیوالی یا ہے مگر اُف تو بڑی ظالم و جابر ہے تو سراپا [illegible] ہے۔ تیرے قبضہ میں لاکھوں حیات سوز اداؤنکا "خون خوار نا قابل ہزیمت لشکر ہے جنکے پاس ہلالی ابرؤن کے دوہرے تیغچے ہیں جنکے نشانوں پر شہ زوروں کی مشکیں کس لینیکو ہزاروں کمندیں ہیں۔ جن کے پاس مسموم کردینے والی "گیس (شمیم زلف) ہے جنکے پاس قلوب کے سنگین حصاروں پاش پاش کردینی والی دبتی او (برق تبسم) ہے جنکے پاس سرچ لایٹ (رخ روشن) اپنے شکار کو دور سے دیکھہ لینے کے لئے ہے۔

تیری ان آنکھوں میں مد اور رس کہاں ہے انمیں تو دجالیت ہے جسکو چاہتی ہیں زندہ کرتی ہیں جنکو چاہتی ہیں مار ڈالتی ہیں۔

او قیامت صغرا خدا جانے یہ تیرے پر آشوب سینہ پر کن عالمگیر آتش زن مادہ کا ڈھیر ہے۔ شاید آتش فشاں پہاڑ ہی ہیں۔

تیری چتون کا بل، وہ بل نہیں جو قسمت میں کبھی پڑجاتا ہے اور کبھی نکل جاتا ہے

بلکہ یہ وہ بل ہے جو کہیں حسام زہر بنکر حلق میں اتر جاتا ہے اور کہیں **خنجر جانستان** بنکر کلیجہ میں تیر جاتا ہے۔

او فریب محبت تیری لگاوٹیں۔ آہ **خون کو سفید کر دیتی ہیں قدرتی محبتوں کو** توڑ دیتی ہیں **پانی میں آگ لگا دیتی ہیں**۔

او تقوی شکن جب تو چاہتی ہے انسانوں سے۔ خدا کو بھلا دیتی ہے۔ تیری شراب التفات کو اسقدر پر زور ہے اسقدر تند ہے کہ ناچیز انسان اس جبار و قہار کی قدرت کی پرواہ کو بھو جاتا ہے۔

او خوبصورت بلا "جب تو اپنی طرف بلاتی ہے پھر اسکے جسے تو نے بلایا کوئی قوت رک نہیں سکتی۔ خواہ اسکے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ لائی جائے۔ یا مواج سمندر۔ یا مہیب و دشوار گذار پہاڑ۔ یا سنسان و وحشت خیز جنگل۔ وہ ضرور تیرے مشق ناز کیلئے تیرے پاس ہوتا ہے۔

او صبح کاذب "جب تیری زبان سے۔ کسی کے واسطے **ہاں** نکل جاتی ہے تو پھر نہیں "نہیں ہوتی نہیں ہوتی" خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

او سفید جھوٹ "جب تو چاہتی ہے بڑے بڑے گھرانوں کی عزتیں ...... کھڑی ہو جاتی ہے کیا تو وہ نہیں ہے جو راتوں کو شیطان کی پرستش کرتی ہے اور صبح کو نہیں شرماتی۔

او اکال الامم "امویوں کو تو نے کھویا عباسیوں کو تو نے برباد کیا ایرانیوں کو غارت کیا ہندوستان کو تباہ کیا۔ افریقہ کو غارت کر رہی ہے "خانہ ادہ حالات میں تیری لگائی ہوئی آگ اب تک نہیں بجھی باوجودیکہ لاکھوں بہادروں نے اپنی عزیز و پاک خون سے بھائی غریب بے زبان پارسیوں پر توبے پڑھے جن کیطرح سوار ہے۔ یورپ کو عنقریب .... والی ہے۔ وہ کونسی ریاست ہے جسکا دامن تیرے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپٹ سے بچا ہوا ہے

پناہ بخدا! الحذر الحذر، اچھا بتلا، تو کس طمانیت پر ہم سے چاہتی ہے کہ تجھ پر بھروسہ کیا جائے، یورپ نے تجھ پر بھروسہ کیا۔ کیا پایا۔ آج تیرے ہاتھوں وہ اسقدر مجبور ہیں کہ تیرے خلاف آواز بھی نہیں نکال سکتے۔ مشرق میں جو کچھ تو نے کیا۔ اگر وہ بھول گئی ہو۔ تو جا اور روا شلیم کی چتا سے پوچھ یا سعدی کی قبر سے دریافت کر۔ یا ملا حسین سے معلوم کر۔ یا عنایت اللہ کی گور بے نام نشان سے سن۔ یا یورپ ہی میں تجکو پوچھنا ہو تو ٹنکسپیر سے پوچھ۔ پوچھتے ہوئے شرماے تو ایڈیسن کے کارخانہ میں جا جہاں فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ چشم عبرت کھول اور اپنے سیاہ کارنامے دیکھ اپنے مظالم کی کہانیاں سن اپنی فتنہ پردازیوں کی داستانیں پڑھ اور شرما اب ہمارے پاس تیرے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ گو تیری چلتی ہوئی تدبیریں اب بھی بے پناہ ہیں۔

کس ضمانت پر ہم تجکو آزادی دیں۔ کیا تو یہ چاہتی ہے۔ تجکو دوستوں کو۔ عزتوں کو۔ نیکو نکو تباہ کرنیکے واسطے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ تو اب یہ چاہتی ہے کہ تیرے عالم آشوب چہرہ سے نقاب اسلئے دور کر دیا جائے کہ قتل عام میں تجھی آسانیاں ملجائیں۔ یا تو اس سرے سے اُس سرے تک اطمینان کے ساتھ آگ لگا سکے۔ اب چار دیواریوں سے تو کیا اس باہر انا چاہتی ہے کہ ہماری رہی سہی زندگی کا بھی خاتمہ کرے۔ او ظالم اسقدر تاب گسل مظالم پر بھی تجکو صبر نہ آیا۔ اب بھی تیری پیاس نہ بجھی۔

گو تیرے سحر میں محسور "لاکھ دھوکے دیں۔ تربت اولاد نعیم اولاد تکمیل تہذیت ترقی تمدن کے لاکھ افسانے گائیں لیکن جنہیں خدا نے عقل دی ہے۔ وہ تیری سرشت کو تیری انعام کو خوب پہچان گئے ہیں۔ اب تو چاہے علیگڈہ میں اپنی تعلیم و تہذیب کا ڈاکہ الصیف کر یا لکھنؤ میں تیرے لئے سلطانی کا یہ فیصلہ ہو اگر نیک بودے سرانجام زن۔ زماں رامزن بودے نہ زن بالکل درست ہے تو اسی کی مستحق ہے۔ جا سامنے سے دور ہو اور کسی پاگل کو تہذیب و تعلیم کا تازہ فریب دے۔ تو جن کیلئے مایۂ ناز ہے انہیں کے سروں پر سوار ہو۔ اور انہیں کو

اپنی شرارتوں کا آلہ بنا۔ کوئی عقل مند تجھکو منہ نہ لگائے گا۔ تو غضب الٰہی کی متحرک تصویر ہے
مرا دامن چھوڑ، چھوڑ، معاف کر۔ (باقی آیندہ)

(ظفر حسن علوی)

مرد سے

اے احسان فراموش ،، اے تو وہ کہ تجھے کبھی حقیقت کے انکار کرنے سے شرم نہین آئی اور اے تو وہ کہ تجھے کبھی صداقت کو دنیا سے مٹا دینے کے لئے اپنی جسارت سے شیکایت نہیں ہوئی، دیکھ مجھکو اپنے اُن کارناموں کی یاد نہ دلا، جو ہر چند تیرے ناصیہ کا ذیب کے لیے طرۂ فخر و امتیاز ہوں، مگر ہماری جنس کی تباہی اور بربادی کی سخت و روح فرسا المناک داستانیں ہیں، **اے حق ناشناس** ، آج تو اپنے بائیں پہلو کے چیرے جانیکی شکایت کرتا ہے، مدعا یہ ہے کہ میری اولین آفرینش کو بھی اپنے لئے باعث تکلیف ثابت کرے، حالانکہ تجھے یاد ہوگا کہ تو باوجود ایک وسیع فضا والی پُر بہار جنت کے مالک ہونیکے بھی افسردہ و مضمحل تھا۔ تو جنت سے بیزار تھا، تو نے اللہم سے فریاد کی کہ خلد سونی کیوں ہے؟ خدایا باوجود تمام اسباب راحت و نشاط کے مہیا ہونے کے یہ ایک غیر ممکن ویرانی سے کیا ہے، فردوس جسے حقیقتاً گلشن ہی کہنا چاہیئے کیوں اُجاڑ سا نظر آتا ہے، کیا ان لہلہانے والے پھولوں، تر و تازہ پھلوں، شاداب درختوں، ان سکون نظر نہروں کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے جو باغ جناں میں نہیں ہے، اگر ہے تو وہ کیا ہے،، جب بارگاہ قدس میں اس تیرے غم و الم اس بیقراری و اضطرار کو فرشتے لے گئے، تو تیرا دکھ یا ہوا سکون جس کے لئے تو تڑپ رہا تھا، تیری وہ حقیقی طمانیت و راحت جسکا عوض جنت کی کوئی چیز نہ ہو سکتی تھی تجھے میری صورت شکل میں عنایت ہوئی

اب چاہے تو پہلو کے چیرے جانے کی فریاد کرتا پھر یا کوئی اور الزام خدا پر دے، کیونکہ
(جیسا آگے میں ظاہر کروں گی) تو الزام رکھنے میں بڑا مشاق و شاطر ہے، مگر یہ تو سمجھ کہ
تجھے (بقول تیرے) اس عمل جراحی کی ضرورت تھی یا نہیں، اگر ہم مان بھی لیں کہ جب تیری
پسلیاں ایک دوسرے سے جدا کی گئیں تو تجھے تکلیف ہوئی، لیکن اے کم فہم کیا تجھے
اس تکلیف سے یہ سبق نہیں ملا کہ دنیا میں تجھے کوئی راحت کوئی لذت نہیں حاصل ہو سکتی جب تک
تو پہلے صعوبتوں کو نہ برداشت کر لے اور اسی کے ساتھ کیا یہ تیری فطرت نہیں ہے
کہ ہر اس چیز کی تو زیادہ قدر کرے جو زیادہ محنت و مصیبت سے ہاتھ آئی ہے۔ لیکن اے
تو وہ **فریب مجسم** کہ جب تک کوئی چیز تجھے دستیاب نہ ہو سراپا عہد و پیمان ہے اور جب
مل جائے تو تو یکسر غفلت و نسیان، تجھے یہ بات تو یاد رہ گئی کہ میں تیرے لئے جراحت
پہلو تھی، لیکن یہ بتا کہ راحت پہلو کون تھا۔ اگر احسان بھلا دینا تو اپنی خو نہ کر لیتا، اگر
احسان کرنے والے کو ٹھکرا دینا تیری زندگی کا مہتم بالشان کارنامہ نہ ہوتا، اگر حمیت
و غیرت کے الفاظ تیرے لغت میں اصطلاحات مہملہ نہ ہوتے، اگر تو نکتہ شناس ہوتا
تو اے **خیرہ چشم**، تو سمجھتا کہ میرا تیرے پہلو سے پیدا کیا جانا سوائے اس کے کوئی
معنی رکھتا ہی نہ تھا کہ تو مجھے ہمیشہ اپنے پہلو سے لگائے رکھتا اور تو قدر کرتا کہ میں تیرے
اس پہلو کا جزو لطیف ہوں جہاں اے ظالم تیرا دل اب بھی تیری بے رحمیوں پر سر دھن رہا
اے **صداقت نواز**، اے تو وہ کہ **کذب و افترا** کا تنہا مالک بنا بیٹھا ہے، ہابیل
و قابیل کی پہلی عداوت کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتا ہے، بنی اسرائیل کی تباہی میرے سر تھوپتا
ہے، شاہان سلف کی بربادیاں میری وجہ سے بتاتا ہے، زاہدوں کی لغزش کو
میری خطاؤں میں شمار کرتا ہے، مجھے ہنسی آتی ہے (حالانکہ میرا ہنسنا بھی تیرے
نزدیک جرم عظیم ہے) اور عجب نہیں جو اتنا کہہ دینے سے اپنے کسی اور گناہ کو بھی جس کا
ذکر نا تو پہلے بھول گیا ہو، اب اس میری ہنسی کی وجہ سے بتلائے۔ لیکن میں ہنسوں گی

اور کیوں نہ ہنسوں، جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ تو نے اپنے زعم باطل پر اعتماد کرکے غریب تاریخ کو بھی مجروح کر لئے ہیں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا جسکی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ بھی بد قسمتی سے مونث ہی بولی اور لکھی جاتی ہے، کیا تجھے خبر نہیں کہ تیرے بھائی قابیل کی قربانی خدا نے رد کر دی تھی اور ہابیل کی قبول کر لی تھی۔ کیا تجھے علم نہیں کہ قابیل و ہابیل کی باہم عداوت کی وجہ یہ تھی، مگر جب تیری انشا میں کسی پر بہتان رکھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، تجھے کیا تو کہدیگا کہ "اگر قربانی کا جھگڑا تھا تو کیا ہوا۔ قربانی بھی تو آخر مونث ہی ہے"

بنی اسرائیل کی تباہی میرے سر تھوپتا ہے۔ اے کافر نعمت، من و سلویٰ کھاتے کھاتے لہسن پیاز کو مرا ہی جی للچایا ہوگا، موسیٰ جب کوہ طور سے لوٹے ہونگے تو گوسالہ سامری کی پرستش کرتے مجھی کو دیکھا ہوگا، احکام خدا و رسول سے سرتابی میں نے کی ہوگی، تباہ و برباد ہوا اپنی نافرمانی سے اور الزام رکھے مجھ پر مگر کہدے کہ "نافرمانی بھی تو مونث ہی ہے۔"

بنی امیہ کی بربادی کا سبب مجھے بتاتا ہے۔ بنی عباس کا زوال میری ذات سے متعلق کرتا ہے۔ مگر جب تو نے مجھکو جھوٹا گردانے میں تاریخ کی ورق گردانی ہوگی، تو کیا تیری نگاہ سے یہ نہ گذرا ہوگا کہ بنی امیہ کی سلطنت حسین کے خون سے قائم ہوئی اور اس لئے وہ سلطنت جو ایسے حادثہ کبریٰ سے شروع ہوئی ہو، اور جس کے تمام افراد نے بنی فاطمہ کے تباہ کرنے میں بیجا ظلم و ستم اپنا شعار کر لیا ہو وہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی، ہشام بن عبدالملک کا حال پڑھ جو ایک قوی تاجدار اس خاندان کا تھا اور سمجھ کہ کیوں اس کے مرتے ہی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا اور کیوں ۹۲ برس کی مختصر مدت سلطنت حکومت زوال سب ہی کچھ ختم ہوگیا۔ بنی عباس اور بنی فاطمہ جو دونوں ایک دادا کی اولاد تھے، چاہیے تھا کہ بنی امیہ کے بعد ملکے زندگی بسر کرتے، مگر نہیں وہ باہم صلح و آشتی سے نہیں رہ سکتے تھے

کیونکہ وہ مرد تھے جنکے خمیر میں باہم جنگ و فساد موجود ہے، بنی عباس نے بھی بنی فاطمہ پر وہی بلکہ اس سے زیادہ ظلم توڑے جو بنی امیہ نے کیے تھے۔ کیا عبداللہ نبیرہ حسن بن علی کو منصور عباسی نے قید کر کے مار نہیں ڈالا، کیا عبداللہ کے تیسرے بیٹے یحییٰ کو ہارون الرشید نے زہر سے نہیں مروا ڈالا، کیا خلیفہ ہادی عورت تھا جس نے حسن مثلث پوتے حسین کو موضع فخ میں تہ تیغ کر دیا، کیا خلیفہ معتصم مرد نہیں تھا جس نے عمر بن علی بن حسین کے پوتے محمد کو قید میں گھلا گھلا کر مار ڈالا، کیا ہلاکو تیری جنس کا ایک بہادر فرد نہیں تھا جسنے خلافت عباسیہ کا تختہ بغداد میں جا کر اولٹ دیا، مگر تو جواب دیگا کہ بنی امیہ تباہ ہوئی بنی فاطمہ کی بغاوتوں سے، بنی عباس برباد ہوئی اس وجہ سے کہ اخیر وقت میں وزرا سلطنت بنی فاطمہ سے ملگئے تھے اور چونکہ بنی فاطمہ، فاطمہ کی اولاد تھے اسلئے تیرا الزام پھر بھی وہی رہا کیونکہ فاطمہ بھی عورت ہی تھیں۔ باقی دارد

صبح کا ستارہ

از جناب نذر محمد صاحب انور سیالکوٹی

بظاہر دیکھنے میں تو بہت حیران ششدر ہے
حقیقت میں ہزیمت خوردہ فوج سکندر ہے

بھلا تو ہی بتا دے تیری غم میں کیسی حالت ہے
تجھے کس کی محبت ہے تجھے یہ کسکی فرقت ہے

خموشی ہی خموشی دہر میں ہر سو برستی ہے
تری تاب تکلم کہنے سننے کو ترستی ہے

چلا ہے آخر شب تو وطن سے بیوطن ہو کر
چمن کو چھوڑتا ہے درد سے زیب چمن ہو کر

طیور بوستاں فرقت میں تیری محو گریانی
ترے جانیسے لیلائے فلک کی ہو گی عریانی

جو سمجھا باغباں شبنم یہ آنسو ہیں نہیں شبنم
کسی کا درد خاطر ہے کسی کا گریہ پیہم

ابھی آیا ہے محفل میں ابھی یاں سے رواں ہوگا
ترے پیچھے رواں تاروں کا سارا کارواں ہوگا

مکالمۂ زبان و قلم

از جناب حسن مرزا صاحب شرر مشہدی لکھنوی

پھر گلفشان زبان گہر افشاں قلم ہے آج — پھر مجھکو باغ و گنج مضامین بہم ہے آج
پھر سامنے تجمل طبل و علم ہے آج — پھر دست زور وار میں تیغ دو دم ہے آج
پھر ہے شرر کے نام کا جھنڈا اگڑا ہوا
پھر معرکہ ہے کلک و زباں میں پڑا ہوا

دعوی قلم کا ہے کہ میں شاہ سخن بھی ہوں — دنیا میں عطر کل ہوں مگر صف شکن بھی ہوں
بے انتہا کریم بھی ہوں سر نگن بھی ہوں — میں منکسر مزاج بھی ہوں تیغ زن بھی ہوں
کس طرح متصف ہوں نہ لاکھوں صفات سے
ہے انتظام ملک سخن میری ذات سے

گویا ہے یوں زباں مرہمسر کوئی نہیں — مجھ سے حجاب و شرم میں بہتر کوئی نہیں
میری طرح سے صاحب جوہر کوئی نہیں — مجھ سے نہ کام لے تو سخنور کوئی نہیں
ہر بات میں بشر کو مری احتیاج ہے
سن لے قلم کلام کو مجھ سے رواج ہے

کہتا ہے کلک میرے لئے ہے ایاغ علم — میں نے کیا زمانہ میں روشن چراغ علم
میری شمیم سے ہے معطر دماغ علم — دریا دلی سے میری ہے سرسبز باغ علم
سب جانتے ہیں وجہ بقائے بیاں ہوں میں
دست کدیور چمن بے خزاں ہوں میں

یہ قول ہے زباں کا خلمے سے دمبدم — میری ہے احتیاج بہت اور تیری کم
شامل اگر نہوں تو نہ کچھ ہو سکے رقم — میرے بغیر تو بھی ہے بیکار اے قلم

بلبل اشد یہ رکھتی ہے مجھ سے ترانے میں
محتاج ہے ہر ایک زبان کے زمانے میں

کہتا ہے اب قلم یہ زباں سے بہ انکسار　　میری ضرورتیں بھی ہیں دنیا پہ آشکار
تحریر میں کروں تو بیاں کا ہو اعتبار　　میرے سبب سے ہے ترے ہر قول کو قرار
آئے نہ پایا فرق کبھی میری بات میں
سب ہیں قلم کے دست نگر کائنات میں

کہتی ہے یہ زبان کہ عبث کر نہ قیل و قال　　کیونکر کلام تو نے کئے یہ تو کر خیال
میری طرح سے اپنے بیاں کر گیا کمال　　اس بات کے لئے کوئی صورت نہیں محال
قوت سے میری قدر نہ اپنی بلند کر
تو اپنے حسب حال خموشی پسند کر

خامہ کا ہے یہ قول تجھے کیا خیال ہے　　یہ مجھ میں اسکی شان سے طرفہ کمال ہے
دعویٰ کروں زباں کا مری کیا مجال ہے　　لیکن مجھے خموش کرے تو محال ہے
سمجھوں شریک کیوں تجھے اپنے کلام میں
قوت کو اپنی آنے نہ دے میرے کام میں

بس اب خموش ہو تجھے لازم ہے انفعال　　تو ہے زباں دراز بہت او زبوں خصال
قادر ہے بات بات پہ وہ رب ذوالجلال　　مجھکو عطا کریم نے کی ہے زبان حال
رتبے خواص کے ہیں زیادہ عوام سے
بہتر ہے خامشی کہیں طول کلام سے

ہے یہ بیاں زباں فصاحت شعار کا　　سب مجھ سے ذکر کرتے ہیں پروردگار کا
کہتی ہوں حق سے حال دل بیقرار کا　　دیتی ہوں ساتھ عابد شب زندہ دار کا
جو ذی حیات ہے مرا احسان مند ہے

تسبیح خواں مجھی سے ہر اک حق پسند ہے

گر میں نہوں تو علم بھی حاصل نہ ہو سکے　　گر میں نہوں تو حل کوئی مشکل نہ ہو سکے
گر میں نہوں تو ایک بھی قائل نہ ہو سکے　　گر میں نہوں تو حلِ مسائل نہ ہو سکے

جنبش ہو کیوں لبوں کو جو منہ میں زباں نہو
تقسیم نقطۂ دہنِ شاہداں نہ ہو

گر میں نہوں تو پھر نہ مقرر کا نام ہو　　کیونکر کوئی کسی سے بھلا ہم کلام ہو
میرے بغیر کام ہر اک ناتمام ہو　　کس طرح سے حصول ثوابِ سلام ہو

مجلس میں آکے کوئی کرے پھر خطاب کیا
سب لاجواب ہوں تو کوئی دے جواب کیا

میں ہوں کلید قفل دہن لب گواہ ہیں　　ہر اک کے کام آتی ہوں میں سب گواہ ہیں
شاہد ہے علم اور مخاطب گواہ ہیں　　میرے بیاں کئے ہوئے مطلب گواہ ہیں

آگاہ گوش دل سے ہوں نہ کیوں ہر سعید کے
معنے سنے ہیں مجھ سے کلام مجید کے

ناطق اگر نہ میں ہوں تو انساں کوئی نہ ہو　　ذکر مصائب شہ ذیشان کوئی نہ ہو
میرے بغیر حق کا ثناخواں کوئی نہ ہو　　گر میں نہوں تو حافظ قرآں کوئی نہ ہو

باعث ثواب ذکر کلام خدا کی ہوں
میں نردباں بلندئ ذہن رسا کی ہوں

دنیا میں لطف زیست کی صورت مجھی سے ہے　　ہر بات کی زمانہ میں زینت مجھی سے ہے
عالم میں کل علوم کی شہرت مجھی سے ہے　　جاری تمام علم قرات مجھی سے ہے

صحت حروف کی مرے دم سے بیاں میں ہے
ترتیل کا رواج مجھی سے جہاں میں ہے

مجھکو ہر ایک عاقل و دانا سے پوچھ لو　　ہر بات میں شریک ہوں دنیا سے پوچھ لو
نغموں کو میرے بلبل شیدا سے پوچھ لو　　مُردے جلا دیے ہیں مسیحا سے پوچھ لو

مرغوب کردگار بھی ہے التجا مری
مقبول بارگاہ صمد ہے دعا مری

قوت وہ کی عطا مجھے رب کریم نے　　مانا جسے ہر ایک عقیل و فہیم نے
ایسی بنائی بات غفور الرحیم نے　　پایا مجھی سے نام جناب کلیم نے

دیکھی مرے بیاں کی رسائی جو دور تک
حد ہوگئی کہ جل گیا خود کوہ طور تک

ہے یہ کلام اب قلم مشک بار کا　　ہر سو ظہور ہے مرے نقش و نگار کا
راقم ہوں حُسن صانع فصل بہار کا　　چہرہ کشا ہوں قدرت پروردگار کا

باغ جہاں میں نقش مرے جزو کُل پہ ہیں
سو رنگ کے خطوط ہر اک برگ گُل پہ ہیں

چاہا جو میں نے قطرے کو گوہر بنا دیا　　ذرہ کو مثل خسرو خاور بنا دیا
ضو دے کے ایک نقطہ کو اختر بنا دیا　　اکثر عروس نظم کا زیور بنا دیا

حرفوں کو حُسن طرۂ لیلی پہ فوق ہے
جو دائرہ ہے وہ گُل مضموں کا طوق ہے

طالب کو اپنے میں نے سخنور بنا دیا　　جاہل کو عالموں کے برابر بنا دیا
دے کر زر علوم تو نگر بنا دیا　　ادنیٰ کو بادشاہ کا ہمسر بنا دیا

میں نے کب اہل علم کو رتبہ دیا نہیں
فضل خدا سے میری قلمرو میں کیا نہیں

جسکو ہے میری یاد وہ عالی خیال ہے　　جو میری ذات سے [illegible] ہے

وہ شمع ہوں کہ جسکی ضیا لازوال ہے　　روشن مجھی سے مجلس اہل کمال ہے
کٹتا ہے سر تو اور بھی بڑھتی ہے ضو مری
سمجھے ہیں لوگ جسکو زباں ہے وہ لو مری

شہرے تمام خلق میں ہیں جا بجا مرے　　رتبے بہت بلند رہے ہیں صدا مرے
چلتا ہے کون کاغذ زر پر سوا مرے　　کہتے ہیں جنکو حرف وہ ہیں نقش پا مرے
حاصل یہ بات مجھکو خدا کے کرم سے ہے
جو فیضیاب ہے وہ مرے دم قدم سے ہے

حاصل ہے مجھکو قرب بھی رب غفور کا　　میں نے لیا ہے حال رقم کوہ طور کا
سب کو نشاں بتاتا ہوں اہل قبور کا　　زندہ مجھی سے نام ہے ہر ذی شعور کا
میں رہ چکا ہوں دست جناب امیر میں
تاثیر لفظ تم کی ہے میری صریر میں

میں فضل کردگار سے عالی صفات ہوں　　باغ جہاں میں باعث لطف حیات ہوں
ہر علم کے لیے میں ہی وجہ ثبات ہوں　　سب جانتے ہیں منتظم کائنات ہوں
چلتا ہوں پہلے لوح پہ پیک اجل سے میں
فرمانروائے خلق ہوں روز ازل سے میں

عالم پہ آشکار ہے جاہ و حشم مرا　　ہر معرکہ میں رہتا ہے آگے قدم مرا
تابع ہر ایک ہوتا ہے وقت رقم مرا　　چلتی ہے لے کے فوج مضامیں علم مرا
روشن مجھی سے ملک سخن میں چراغ ہے
سلطاں وہ ہوں کہ جس کا خزانہ دماغ ہے

ہوں سربلند مشک فشاں اسمیں شک بھی ہے　　مجھ سے گل سخن میں رنگ اور مہک بھی ہے
رتبہ میں مجھ سے پست کہیں عرش تک بھی ہے　　روشن مجھی سے نام دبیر فلک بھی ہے

شاہد ہے آسماں مرا شہرا کہاں نہیں
ہے شین کی کشش کہکشاں نہیں

غزل ظرافت

نتیجہ فکر جناب سید ظریف حسین صاحب ظریف متوطن قصبہ تسہ ضلع مظفر نگر وارد حال دہلی

تمہاری چاہ مبارک رہے عدو کے لیے ۔۔۔ اگر یہ چاہنے والے ہیں آخ تھو کے لیے
پڑھی نماز تیمم سے ہم نے دلّی میں ۔۔۔ ٹکے کو آتی ہے بہشتی یہاں وضو کے لیے
بتائیں کیا تمھیں صرف کثیر شوق جمال ۔۔۔ ہزار جوتیاں ٹوٹیں اک آرزو کے لیے
ازل سے تم نے نہ کی اپنے فائدہ پہ نظر ۔۔۔ کہ جتنے چاہنے والے لیے وہ بھو کے لیے
ملو جو غیر سے تو اُس سے پوچھنا یہ بات ۔۔۔ چکن کے چوک سے کسکے لیے شلو کے لیے
تمہارے لال کا دامن نکل گیا مریم ۔۔۔ منگا کے سوزن عیسیٰ رکھو رفو کے لیے

ظریف ہے یہ تمنّا ظریف کو دیکھیں
تڑپتا رہتا ہے دل اپنا لکھنؤ کے لیے

گھریلو شاعری

محبت اپنی بیوی سے یہ دروازہ ہے ایماں کا ۔۔۔ بھٹکنا چار سو اچھا نہیں ہوتا ہے انساں کا
مچلتے مارتی ہے اُسپہ بچے پیار کرتے ہیں ۔۔۔ تعلق کسقدر گہرا ہے بلّی اور انساں کا
بہت ہی سخت ہے پردہ کے بارے میں مری ماما ۔۔۔ ڈپٹتی ہے اگر دیوار سے بچے نے بھی جھانکا
جہاں بخیہ کیا ہے سارے دامن میں محبت سے ۔۔۔ لگا دو اچھی بھابھی تم گریباں میں بھی اک ٹانکا

بھلا منجھلی بہو کیونکر نہ سب کے دلمیں گھر کریں
اطاعت انکی دیکھو اور غصہ نانی اماں کا

جذبۂ عشق

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

دل بدست دگر دادن و حیراں بودن

عشق اگرچہ حکمائے متقدمین ان تین حرفوں کی بس اتنی فلاسفی کرکے خاموش ہوگئے ہیں کہ دل و دماغ کے ضعیف ہونے سے اک مرض پیدا ہو جاتا ہے جو اکثر انسان کو عمر بھر پریشان رکھتا ہے۔ انہیں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اسکو ایک لطیف ترین جوہر شرافت کا اثر کہتا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ عشق کی کنہ ذات کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ فی الاصل یہ اگر کوئی مرض ہے تو اسکے لیے کوئی نہ کوئی مداوا ہونا لازمی تھا کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں ایسا مرض کوئی بھی نہیں ہے جسکی دوا نہ ہو۔ بخلاف عشق کے کہ اکثر اسکے مریضوں کو مجنوں اور لاعقل تصور کرکے لا علاج چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو ان کے لیے اُلٹا اثر پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ متذکرۂ بالا جملے کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ جب کلیّہ یہ ٹھہرا کہ ہر مرض کی کوئی دوا ہے تو عاشق کے لیے بھی اُسکی معشوق کا وصال بہترین نسخہ ہے۔ مگر ہم لکھ آئے ہیں کہ دنیا میں دوا کا پیدا ہونا لازمی ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ مثال کے لیے لے لیجیے کہ ایک شخص عاشق الٰہی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حکیم کوئی طبیب اُس دوا کو اُسکے لیے مہیا کرسکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس مثال میں ہمیں ایک نئی بات پیدا کرنی پڑے گی۔ کہ عاشق الٰہی کی دوا۔ دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔ کسی طبیب سے اُسکا مداوا محال ہے۔ کسی ترکیب سے اُسکا علاج۔ یعنی وصال الٰہی مشکل ہے۔ البتہ یہ دردِ عشق ہی اُسکی دوا ہو جائیگا اگر ممکن ہے تو یہی ممکن ہے کہ جوں جوں عشق الٰہی ترقی کرتا جائے گا۔ اور صفات

اور ذات واجب الوجود میں عاشق صادق کو انہماک اور استغراق ہوتا جائے گا۔ اُسی طرح وہ اپنے معشوق حقیقی سے قریب ہوتا رہے گا۔ گویا اس جگہ ہمیں مرزا غالب کا شعر ماننا پڑے گا ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا

تو اس سے ثابت ہوا کہ کبھی کبھی درد بھی درد کی دوا ہوجاتا ہے۔ اور یہ غیر ممکن ہے۔ اور اس سے دور لازم آتا ہے۔ اسکو ختم کرنیکے بعد ہم دوسرے مقولہ پر نظر ڈالتے ہیں کہ عشق شرافت انسانی کا ایک بہترین جذبہ ہے " اگر اسکو تسلیم کرلیا جائے تو اس بات پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہوگی کہ عوام الناس انکے اس مقولہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے اور وہ ایسے اشخاص کو جنکے جذبات بہترین شرافت انسانی تسلیم کیے گئے ہیں بیکار اور لاشئے سے کیوں تعبیر کرتے ہیں اور کیوں عاشقوں کی کوئی وقعت نہیں کیوں اسکی باتیں دیوانہ پن کی بے تکی بڑ ہیں۔ اُنکے کام لااُبالی۔ اُنکے حرکات مجنونانہ تصور کیے ہیں۔ آخر یہ کس الزام پر۔ کیا خارج میں کوئی دوسری مثال بھی ایسی مل سکتی ہے کہ انسان اپنی کسی انتہائی شرافت کے جذبہ کے استعمال سے مجنوں اور سودائی کہلانے کا مستحق ہو۔ ممکن ہے کہ اسپر یہ خیال کیا جائے کہ عشق اختیاری شئے نہیں ہے اور انسان کی عزت اور وقعت اُسی ہنر اور اُسی شرافت کے اعلےٰ جوہر کی وجہ سے کی جاسکتی ہے جو اختیاری ہو۔ اور جو مادّہ اختیاری نہیں ہے وہ کچھ اہمیت نہیں پاسکتا اور اہل جہاں اُسکو وقعت نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسی ایک خاص صفت کے ماسوا اور صفات انسانی کے جو فطرتاً اور خلقتاً نیچر کی طرف سے اُسے عطا ہوی ہیں کیوں انسانیت کا بہترین جزو تسلیم کی جاتی ہیں۔ مثالاً شاعری کو لیجیے ظاہر ہے کہ شاعری ایک ایسا مادّہ اور ایک ایسا علم ہے جو سکھانے سے نہیں آتا بلکہ قدرت کے فیاضانہ جود و عطا کے

سبب اس کو تفویض ہوتا ہے۔ یا یہ الفاظ دیگر یوں کہیے کہ ایسا مادہ ہے جو خود
بخود اُمڈا آتا ہے مگر یہی شاعری اگر کسی میں حدِّ کمال کو پہنچی ہوی ہے اگر کسی شاعر کو
یہ قدرت حاصل ہے۔ کہ وہ اپنے ایک مصرعہ یا اپنے ایک شعر یا ایک نظم سے سامعین کو
اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے اگر اُس میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کے غصّے اور ترحمانہ
صفات کو جوش میں لا سکتا ہے تو وہ صرف قابل عزت ہی نہیں بلکہ اپنی قوم اپنے
ملک وغیرہ کی نظروں میں عزیز تر مانا جاتا ہے مااینکہ کلّیہ بالا کے لحاظ سے عوام بلخواص
کی طرف سے اسکے واسطے یہ محبت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ ایسے ہی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں
مگر آہ عاشق ان سب باتوں سے محروم ہے تو ہمیں ضرور فرض کرنا اور ماننا پڑیگا کہ عشق
ان دونوں شے میں سے کچھ نہیں ہے وہ کوئی اور ہی چیز ہے جو ہمارے حواس خمسہ کے
حدود سے باہر۔ اور بالا ہے۔ ان دونوں باتوں سے عشق کا بری ہونا۔ ہمیں یہ جرأت
دلاتا اور ہمیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہم عشق کی ہستی ہی سے انکار کردیں۔ مگر ساتھ ہی جب
یہ ارادہ کرتے ہیں تو دلی احساس یہ بھی نہیں کرنے دیتا۔ کیا معنی کہ سریلی آواز خوشنما
چیز خوبصورت انسان کو دیکھکر کوئی شے کانٹے کی طرح ہمارے دل میں کھٹک جاتی
ہے جس سے مجبور ہو کر کچھ دیر کے لیے دل و جگر پر ہاتھ رکھنے پڑتے ہیں۔ مگر ہماری سماعت
اور بصارت اور ہماری تمام قوتیں اسکو دیکھ۔ سُن۔ اور پا نہیں سکتیں۔ کہ وہ شے کیا ہے
اور کیسی ہے۔ ہاں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔

خامشی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

اور یہ حالت ایک انسان ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ ذوی العقول کے سوائے
غیر ذوی العقول۔ اور غیر ذوی العقول کے سوائے غیر ذی روح تک اسکے اثر اور اس
جذبہ سے بری نہیں ہیں۔ بچہ لاعقل محتاج۔ بے اختیار پیدا ہوتا ہے اُسوقت
ظاہرا سوائے تکلیف شاقہ کے کوئی بہتری کی اُمید اُسکی ذات سے نہیں کی جا سکتی مگر

کوئی شے ضرور ایسی ہے کہ ماں باپ کو مجبور کر کے اُسکی بزرگداشت پر متعین کر دیتی ہے بچے کی تکلیف ان کی تکلیف اور بچے کی راحت انکی راحت ہو جاتی ہے اسمیں اتنی گنجایش باقی ہے کہ کہدیا جاے یہ ساری باتیں اُس سے آیندہ کی بہتری۔ اور مستقبل کے فوج کی امید کراتی ہے مگر جب غیر ذوی العقول جانوروں کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو اسوقت یہ کنایہ بھی باطل اور بے معنی ثابت ہوتا ہے کیونکہ ظاہراً انھیں کوئی ایسی اُمید نہیں ہے جس میں ان کی آیندہ کی بہتری متصور ہو۔ کیونکہ ساری اُمیدیں صرف عقل پر منحصر ہیں۔ وہاں عقل کا لطیفہ جوہر ہی موجود نہیں۔ تو پھر امید کیسی اس رتبہ اور اس درجہ سے بھی بالاتر وہ درجہ ہے جو انھیں لایعقل جانوروں میں ہمیں نظر آتا ہے ممکن ہے کہ بچے کا عشق اُسکی نگہداشت صرف اسوجہ سے کیجاتی ہو کہ وہ ایک مدت معینہ کی تکلیف کا ثمرہ اور اپنا جزو بدن ہے۔ مگر جب ہم چکور کو چاند پر دوڑتے۔ بلبل کو گل کی طرف بار بار چکر لگاتے۔ بھونرے کو کلیوں کے اردگرد منڈلاتے دیکھتے ہیں تو یہ خیال بھی کافور ہو جاتا ہے اور فوراً سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بزرگداشت یہ حفاظت وغیرہ نہ اپنے جزو بدن کے لحاظ سے ہے نہ محنت کے سبب ہے۔ بلکہ کوئی اور نشتر ہے جو بار بار دل میں چبھتا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب انگیز وہ جذبہ ہے جو غیر ذی روح میں پایا جاتا ہے سورج مکھی کا سورج کے رُخ پر پھرنا کنول کے پھول۔ یا گل نیلوفر کا چاند کی صورت دیکھتے ہی خوشی سے کھل کھلانا چاند کو دیکھتے ہی کتاں کا پارہ پارہ ہو جانا۔ کاہ وکہربا کا عالم۔ مقناطیس کی کشش وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جنھیں دیکھکر کامل یقین ہوتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ہے اور۔ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ ہم ایک درخت کے ہرے بھرے پودے کو ایک خشک جگہ سے کھود کر نہایت احتیاط کے ساتھ کسی کھاد کی جگہ لگا دیتے ہیں۔ اور جسقدر خدمت ہم سے ہوسکتی ہے کرتے ہیں۔

مگر کچھ مدت گذرے بغیر وہ پودا سرسبز و شاداب نہیں ہوتا بلکہ بعض اشجار سوکھ جاتے ہیں حالانکہ جس جگہ یہ اب ہے وہ جگہ اسکے لیے پہلی جگہ سے ہر طرح موزوں اور مناسب ہے۔ مگر لاکھ تدبیر کریں وہ چند روز بغیر نشو و نما کے اداس کھڑا رہے گا۔ ثابت ہوا کہ اسے اُس پہلی جگہ سے کوئی نہ کوئی خاص لگاؤ تھا جس سے جدا ہونا اسے بیحد شاق گذرا۔ اسی فن باغبانی کے جاننے والے لوگ ان گھڑت باتوں سے بہت سا حاشیہ چڑھا سکتے ہیں مگر ہم اسلیے اوپر ہی لکھ آئے ہیں کہ نہایت احتیاط سے اکھیڑا جائے کہ اُسکے تنہ اُسکی بیخ و بُن کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اُسے اپنی پرورش کے لیے پہلے سے بہتر سامان میسر ہو۔ بہرحال معلوم ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ مگر وہی شے دل سے بیان نہیں کر سکتی قوت مدرکہ اُسکو پاتی ہے مگر کوئی قوت اسکے بیان اور دوسروں کو وہ کیفیت دکھانے کے قابل نہیں ہے۔

ایک زبردست حکیم کا قول ہے کہ یہ درجہ انسان کو اُسوقت نصیب ہو سکتا ہے جب حواس خمسہ کی محدود آگاہی سے بالا ہو۔ مگر یہ درجہ نصیب ہونا مشکل ہے جنھیں کسی طرح حاصل بھی ہو گیا وہ اسکے بیان کرنے سے قاصر ہیں ؎ آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اسی عشق کا ایک نام محبت بھی ہے جسے مذہب و ملت بھی ضروری مانتا ہے اور فی الاصل اگر اُسکو ضروری نہ تسلیم کیا جائے تو دنیا سے ہمدردی اُٹھ جائے اور فوراً نظام عالم درہم و برہم نظر آئے۔ پہاڑوں کا زمینوں پر دباؤ۔ سبزہ اور اشجار کا زمین پر لہلہانا یہ سب باتیں ایسی ہیں جنسے عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر یہی عشق جب تک بیغرضانہ ہے عشق اُسکا نام ہے جسوقت کہ اس درجہ سے نکلکر کسی غرض میں شامل ہو گیا وہ عشق نہیں رہی یہ بات کہ عشق کیونکر پیدا ہوتا ہے اسکے اسباب ظاہر میں کسی اچھی شے کے دیکھنے۔ یا سُننے سے عشق کا دلمیں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس شے کا اثر دل پر پڑے وہ معشوق کے نام سے تعبیر کی جائے گی۔

(باقی آئندہ)

عبدالباری آسی

غزلیات

مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

وہ آئیں گے یہ قیامت تک اعتبار نہ تھا — سکون دل کا بہانا تھا انتظار نہ تھا

فقط مقدمہ اضطراب دل تھا سکون — جسے قرار سمجھتے تھے وہ قرار نہ تھا

بہار آنے سے پہلے بھی دل ہی تھا مگر — جنوں کے ناخن سرتیز سے فگار نہ تھا

جھلک رہا تھا وہ کیفیت شباب کا رنگ — نشیلی انکھڑیوں میں یار کے خمار نہ تھا

اک آبلہ سا جو دل ہو رہا ہو سینہ میں — وہ اسطرح سے فلک لائق فشار نہ تھا

گناہگاروں کو پوچھا جب اُسکی رحمت نے — بہت خفیف ہوا جو گناہگار نہ تھا

ہوائے کوچۂ جاناں ذرا ادھر آئی — ادھر ہمارے دل تنگ میں غبار نہ تھا

وہ دل جو تھا بھی تو کیا تھا ہمارے پہلو میں — جب اُسپر زور نہ تھا کوئی اختیار نہ تھا

ہزار شکر کہ شبنم نے آبرو رکھ لی — کوئی بھی گور غریباں پہ اشکبار نہ تھا

پڑھا نہ فاتحہ احباب نے کبھی آکر
مگر مزار ہمارا صفی مزار نہ تھا

کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھریاں دیکھا کیے — کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے — آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے — شعبدے تیرے یہی اے آسماں دیکھا کیے

ہوں نہ یارب دیکھنا دشمن کو بھی وہ دن نصیب — جو فراق یار میں ہم نیم جاں دیکھا کیے

دل تہ و بالا جو تھا سودائیاں زلف کا — گہ زمیں دیکھا کیے گہ آسماں دیکھا کیے

جب اسیر دام ہو کر ہم چلے سوئے قفس — دور تک مڑ مڑ کے اپنا آشیاں دیکھا کیے

چشم ہمدردی صفی جن سے تھی وہ بیٹھے ہوے
اشک کی جا خون آنکھوں سے رواں دکھلا گیے

فخر المتقدمین و متاخرین ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب۔ سائل دہلوی داماد حضرت فصیح الملک داغ

اصول کائنات عاشقی ہے داستاں میری
پھر انداز بیاں میں خوبیِ طرز زباں میری

کبھی ہونٹوں پہ پپڑی ہے کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں
چھپاؤں کیا پریشانی ہر صورت سے عیاں میری

مرے دستِ جنوں کی چارہ گر بھی داد دیتا ہے
کہ پوری پوری سب زخموں پہ آئیں دھجیاں میری

بہار جامۂ گلگوں نہیں دیکھی تو اب دیکھو
کھلا دیتی ہے کیا گل لالۂ چشم خونفشاں میری

مرا احوال یوں کہدے تو کہدے نامہ بر اُن سے
دہن میں کاٹ کر اپنے لگا لے گر زباں میری

ادھر گلچیں کی نیت ہے ادھر صیاد کی نظریں
جھکی جاتی ہے بارِ گل سے شاخ آشیاں میری

ملاقاتوں کی شکلیں ہیں یہ اپنی اپنی مرضی ہے
جہاں تیری وہاں تیری جہاں میری وہاں میری

مرے دلمیں ہی رہنے دو شکایت ہائے دشمن کو
نہ رسوا ہے جہاں تم ہو نہ کھلواؤ زباں میری

وہ کہتے ہیں کہ بدلو نام سائل ورنہ تم جانو
نبھے گی تم سے مشکل سے سراج الدین خاں میری

جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

ہمت شکن جہاں میں جفا ہے جمال کی
ہوتے ہی عشق پڑ گئی عادت سوال کی

ہیں اور صبح ہے یہ تمنا محال کی
جتنی مری حیات ہے شب اتنے ہی سال کی

اک کیف بیخودی میں کٹی شب وصال کی
اچھا ہوا خبر نہ ہوی اپنے حال کی

ممنوں لطف خانہ بدوشی ازل سے ہوں
جس جا پہنچ گیا وہی منزل خیال کی

شاکی ہیں خاک ڈالنے والوں کے اہل قبر
مٹی میں دب گئی ہے خبر اُنکے حال کی

ہے کون سا یہ صید کہ دم توڑتا ہے یوں
صیاد ٹوٹتی ہیں رگیں تیرے جال کی

ہر قطرہ خون دل کا ہے قاتل سے زور دار
یارب دراز عمر ہو دردِ سوال کی

روک اپنی آہ گرم کو بس عندلیب بس | اُڑنے لگی ہے باغ سے سبزی نہال کی
تارِ کفن بھی گل گئے کیا جاؤں حشر میں | اے دل تو ہی اوڑھا دے ردا انفعال کی
جز رنج و غم کچھ اور نہ دیکھا تمام عمر | راحت بھی تھی مگر وہی خوابِ خیال کی
برباد میرے بعد نہ ہو کائناتِ دل | کوئی جگہ نکال دو میرے ملال کی
بند آنکھ کر کے بیٹھ کہ پہلو میں دل رہے | عالم نظر فریب ہے دنیا ہے جال کی
رہنے کو آشیانہ بنایا تو کیا ملا | تنکوں نے دل کے کھینچ دی تصویر جال کی
ٹھوکر سے خاک میں بھی ملا دو تو خوب ہے | مٹی نہ ہو خراب دلِ پائمال کی
غش کا پیام ضعف میں لائی نسیم صبح | ٹھنڈی ہوا نے اور طبیعت نڈھال کی
برسوں سے صاف کرتا ہوں اشکوں سے لوحِ دل | تصویر چاہتا ہوں رخِ بے مثال کی
خود رفتگیِ عشق میں کیا کام دل سے لوں | گم ہیں حواس بند ہیں راہیں خیال کی
طے کر رہا ہوں کب سے تجھے اے شبِ فراق | اب کتنی دور رہ گئیں راتیں وصال کی
سجدے میں جا کے سر کو اٹھانا پڑا مجھے | رحمت نے بات رکھ لی مرے انفعال کی
ہر رگ لہو اگلتی ہے منھ اپنا کھول کر | اک زخم ہو تو فکر کروں اندمال کی

اترے ہوئے ہیں قافلۂ ہستی و عدم
ثاقب عجیب وسیع ہے منزل خیال کی

محفل سنوار لی مرے دل نے خیال کی | تصویر کھینچ کر ترے حسن و جمال کی
حیران ہوں کدھر سے بلا آئی جال کی | دھوکا دیا زمیں نے کہ گردش نے چال کی
کب سے ہے غم خبر نہیں کچھ ماہ و سال کی | گنتا ہوں ایک عمر سے گھڑیاں ملال کی
سب کو ہے تیرے ساتھ خبر میرے حال کی | یا داستان عشق کی ہے یا جمال کی
اپنا سا زور کر کے تھکے منعمان دہر | مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی
اچھے نصیب تھے کہ گلستان دہر میں | دو دن کی زندگی بھی غموں نے وبال کی

داغِ چمن کے ساتھ ہزاروں ہی زخم ہیں ۔ دل میرا چھان ڈالا ہے چادر نے جال کی
یادِ مریض ایک مرض ہے خدا بچائے ۔ بھولے سے پوچھیے نہ خبر میرے حال کی
اتنا بدل دیا تھا مرا رنگ ہجر نے ۔ منھ دیکھتی رہیں مرا راتیں وصال کی
سُنیے کہ جاگ جاگ کے برسوں کیا ہے یاد ۔ یہ داستان غم نہیں خواب و خیال کی
ہاں پائے حرص روک کے قارون کے مرکز دیکھ ۔ کشتی زمیں میں ڈوبتی جاتی ہے مال کی
جس دل میں زخم تھے وہ لہو ہوکے بہہ گیا ۔ اچھا ہوا خلش تو مٹی اندمال کی
تم کو جواب دینے لگا کیوں خرامِ ناز ۔ سبزہ تھا یہ کہ قبر کوئی پائمال کی
آؤ تو ہم دکھائیں تمھیں اک نیا جہاں ۔ آباد ہے خیال میں دنیا مثال کی
الزام قید سب ہوسِ زندگی پہ ہے ۔ صیاد کی نہ کوئی خطا ہے نہ جال کی
یکجا ہوئے ہیں دور سے آ آ کے اہلِ قبر ۔ دل ہو تو دیکھ آئیے محفل خیال کی
کس سنگدل کا در ہے کہ ملتا نہیں جواب ۔ ٹکرا کے پھر رہی ہیں صدائیں سوال کی
بھر جائینگے کبھی نہ کبھی خاک قبر سے ۔ زخموں کو احتیاج نہیں اندمال کی
بدلا مزاج دہر ۔ مٹا دل تھکے طبیب ۔ حالت وہی رہی مرض لازوال کی
اوراقِ شامِ غم شبِ تربت سے جا ملے ۔ آخر کتاب ختم ہوئی میرے حال کی
کیوں آؤ ۔ دور ہی سے سنو میری سرگذشت ۔ تم کو خدا دکھائے نہ صورت ملال کی
کچھ آگے بڑھ چلے ہیں شفیعان روزِ حشر ۔ تاثیر تو ضرور ہوئی انفعال کی

پہنچا دیا کلام کو ثاقب نے عرش پر
تقلید کرکے میرے صاحب کمال کی

جناب منشی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی مدظلہ العالی

پامالِ نعش کیوں نہو مجھ خستہ حال کی ۔ تعلیم دے رہے ہیں قیامت کو چال کی
کھٹکے گی بعد مرگ بھی حسرت وصال کی ۔ نکلی نہ تم سے پھانس کسی خستہ حال کی

رہ رہ کے یاد آئی ہے شوخی جو چال کی — مٹ مٹ گئی ہے قبر ترے پائمال کی
ہمکو نہیں ہے تجھ سے ضرورت سوال کی — خود منھ سے بولتی ہے تمنا وصال کی
آئینہ کیا بتائے گا مجھ سے ملاؤ آنکھ — میری نظر کسوٹی ہے حسن و جمال کی
ہم کیوں یہ سمجھیں ہم بھی ہیں عالم میں ہم کہاں — اپنا خیال ہی غلطی ہے خیال کی
پہرے لگے ہوئے ہیں تصور میں غیر کے — رہتی ہے روک ٹوک ہمارے خیال کی
پردے کی بات کے لیے پردہ ضرور تھا — پہلو میں دل ہے دلمیں تمنا وصال کی
اے دل ہماری بات سنے اب تری مجال — ہے دھن لگی ہوی تجھے اُنکے وصال کی
ارمان وہ نکالنے آئے ہیں نزع میں — کیا لوٹ مچ رہی ہے مسافر کے مال کی
دل میں وفا ہے درد ہے الفت ہے سوز ہے — فہرست لکھ رہا ہوں یہ میں اپنے مال کی
غصے میں بھی تو اس نے نچھوڑی ادائے حسن — ماتھے کی ہر شکن میں ہے صورت ہلال کی
ہم نے جتا دیا تھا کہ دشمن ہے بے وفا — تم سمجھے اس نے جوڑ چلا اس نے چال کی
برسوں رہے ہیں حضرت موسیٰ کے ہوش گم — دیکھی تھی اک جھلک تہِ حسن و جمال کی
بچنا تمام عمر تم اس فتنہ مست سے — دیکھو عدو کی آنکھ ہے بھوکی جمال کی
دل میں کبھی چھپے کبھی آنکھوں میں چھپ گئے — ہوتی ہے اُن سے آنکھ مچولی خیال کی
تم چھپ کے سات پردوں میں مجھسے نہ چھپ سکے — آنکھوں سے دور ہیں ہیں نگاہیں خیال کی
جو ابتدا میں رنگ تھے وہ انتہا میں ہیں — تفریق عشق میں نہیں ماضی و حال کی
میں کشتۂ نگاہ تغافل شعار ہوں — پرسش نہ ہوگی حشر میں بھی میرے حال کی
سب بھید اُسکے کھول لیے جس سے جا ملی — اس شوخ کی نگاہ بھی ہے کس کمال کی
کچھ اس ادا سے وصل میں روٹھے ہیں آج وہ — برسوں رہے گی ہم کو تمنا ملال کی
دھوکے میں پہلے حضرت واعظ نے پی تو تھی — جب نشہ کھل گیا تو بہت قیل و قال کی
ہم تجھ سے اور تیرے سوا کیا طلب کریں — منظور کب ہے قدر گھٹانی سوال کی

یہ ابر یہ ہوا یہ جوانی یہ فصل گل — زاہد ابھی سے تجھکو پڑی ہے مآل کی
ظلم و ستم کے شکوہ پہ شوخی تو دیکھیے — صورت بنائے بیٹھے ہیں وہ انفعال کی
ویران کرکے دل کو اسے ڈھونڈتے ہیں ہم — صحرا میں جستجو ہے رمیدہ غزال کی
بچتا مریض ہجر کا کچھ کھیل تو نہ تھا — برسوں رہا علاج بہت دیکھ بھال کی
جو تجھ پہ مٹ گئے جنھیں تو نے مٹا دیا — وہ لوگ لوٹ لے گئے دولت وصال کی
کچھ ایکے گرکے برق نے تنکے جلا دیے — کچھ آگ آشیانے میں تھی پچھلے سال کی

بیخود کی خامشی کا سبب ان سے پوچھیے
اسکو تو کچھ خبر ہی نہیں اپنے حال کی

آغا غلام حسین ارشد قزلباش مدظلہ العالی

ہوں وہ مجنوں جسے فکر سر و ساماں ہی نہیں — غیر از چاک جگر چاک گریباں ہی نہیں
تھا کبھی حسن بتاں سے جو پرستاں جہاں — آج اس دل سا کوئی خانۂ ویراں ہی نہیں
زخم شمشیر زبان زخم سناں سے بھی ہے تیز — یہ وہ ہے درد کہ جو قابل درماں ہی نہیں
ہے عبث فکر مداوائے دل زار حکیم — عشق کا درد تو منت کش درماں ہی نہیں
کنج خلوت کے برابر نہیں جلوت کے مزے — ساز یہ وہ ہے جسے حاجت ساماں ہی نہیں
اثر نالۂ شبگیر ہو پیدا کیونکر — اب وہ پہلو میں ہمارے دل نالاں ہی نہیں
واہ رے ضبط کہ دل غنچہ صفت خوں ہے مگر — کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پریشاں ہی نہیں
ہے وہ پہلی سی کہاں کیفیت جوش جنوں — اب وہ لیلا نہیں وہ قیس و بیاباں ہی نہیں
ذبح بے تیغ کیا انکی ادا نے میں نثار — اور اس ناز کے قرباں کہ پشیماں ہی نہیں
کیا کریں اس بت کافر سے نبھائیں کیونکر — جسکو کچھ پاس وفاداری پیماں ہی نہیں
کیا ہوا دل ہے اگر محو جمال خوباں — بندۂ حسن پری زاد سلیماں ہی نہیں
ہاتھ پھیلا کے جنوں عشق میں یہ کہتا ہے — جو نہیں چاک وہ عاشق کا گریباں ہی نہیں

کیا وہ آکر مرے تابوت کو کاندھا دیگا — جس ستمگار کا دل خوگرِ احساں ہی نہیں

وائے ناکامیِ قسمت کہ وہ آئے لیکن — ضعف سے قوّت پابوسیِ جاناں ہی نہیں

زخمِ دل ڈھونڈھ رہا ہے کوئی سامانِ طپش — دستِ قاتل میں مگر آج نمکداں ہی نہیں

اپنی ہُو حق ہی کیا کر تو خدا کے بندے — تجھکو صوفی خبرِ مستیِ رنداں ہی نہیں

مفت میں اسکو تڑپنے کا مزا ہی کیا ہے — جس کلیجے میں ترے تیر کا پیکاں ہی نہیں

ہے وہ پتھر نہیں جس دلکو بتوں کی الفت — بندۂ عشق نہیں ہے جو۔ وہ انساں ہی نہیں

چمنِ دہر کے نظارہ کو نرگس کی طرح — پاس کچھ اپنے بجز دیدۂ حیراں ہی نہیں

محرمِ ذوقِ تبسم ہو تو کیا غنچۂ دل — وائے قسمت کہ میسّر لبِ خنداں ہی نہیں

عندلیب اپنا کہیں اور ٹھکانا کر لے — ناز تھا جسپہ تجھے اب وہ گلستاں ہی نہیں

ہوں وہ شبنم کہ فنا ہوتا ہوں میں آپسے آپ — تابِ منّتِ خورشیدِ درخشاں نہیں نہیں

ہے تری تیغ کے مانند جہاں تشنۂ خوں — اک مری جان کا دشمن ترا درباں ہی نہیں

راز الفت کا نہ دو دن بھی چھپا یا ارشد
تجھ سا کمبخت جہاں میں کوئی ناداں ہی نہیں

عرضداشت

جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

جانشینی میرو غالب کی کہاں اور میں کہاں
وہ خدائے فن تھے اُنسے مجھکو نسبت کچھ نہیں

ہوگئے مشق سخن کرتے ہوئے پینتیس[۳۵] سال
اور ابتک حاصل [illegible] شفقت کچھ نہیں

دوست اپنے حسنِ ظن سے مجھکو جو چاہیں کہیں
واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں قابلیت کچھ نہیں

آپ نے مجھکو برا سمجھا بہت اچھا کیا
آپ نے تعریف کی تو اسکی حاجت کچھ نہیں

نازشِ فن کیا ہے کہتے ہیں کسے دعوای نظم
اعتراف بے سوادی ہے رعونت کچھ نہیں

آگیا ہوگا کہیں سے میر و غالب کا مذاق
اپنے دلمیں تو بجز ذوق جہالت کچھ نہیں

خاطر عزلت گزیں ہے دشمن نام و نمود
مرمٹی ہے جسپہ دنیا اس سے رغبت کچھ نہیں

اپنے لطف طبع کے باعث ہے شغل شاعری
آپ خوش ہوں سنکے اسکی بھی ضرورت کچھ نہیں

چپ رہی محفل تو شان بے کمالی کیا گھٹی
داد وا کا غل ہوا بھی تو فضیلت کچھ نہیں

جوہر قابل ہے۔ جسکو مان لیں اہل مذاق
خود وحید عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں

مجھکو دنیا نے نہ پہچانا۔ غنیمت ہے یہی
شکر ہے اس ناشناسی کا شکایت کچھ نہیں

ذوق فطری چھیڑتا ہے جب تو کہہ لیتا ہوں کچھ
وہ بھی جز افشائے اسرار محبت کچھ نہیں

دل نے سمجھایا مجھے ثاقب یہ مفہوم خطاب
دوستوں کی بذلہ سنجی ہے حقیقت کچھ نہیں

خیر مقدم ہے "تمدن" کا بھی لازم اسجگہ
یہ تو اپنا ہی جگر ہے اجنبیت کچھ نہیں

اے خوشا اقبال ما۔ خوش آمدی۔ خوش آمدی
یہ نہ کہنا لکھنؤ کو ہمسے الفت کچھ نہیں

ہائے تم کب آئے جب اپنا بھرا گھر لٹ گیا
خاک اڑتی ہے یہاں سامان راحت کچھ نہیں

خیر آؤ۔ ہم بھی ہیں موجود خدمت کے لیے
پیشکش ہے نقد دل حاضر میں حجت کچھ نہیں

ساتھ اصولاً کسی بات میں اختلاف نہیں کیا۔خواہ وہ امور عبادات سے تعلق رکھتے ہوں یا معاملات اور احکام جزا و سزا سے۔ بلکہ بہت غور و خوض اور تجربہ کے بعد مجھے تو یہ ثابت ہوا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد دیگر مذاہب سے کہیں بڑھکر پائدار اور قوی اصولوں پر رکھی گئی ہے کیونکہ دین مسیحی جو اسلام سے صدیوں پہلے دنیا میں ظاہر ہوا۔ اور بہت زور شور کے ساتھ پھیل بھی چکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دنیا میں اپنے نام لیواؤں کی جمعیت عظیم کو اس حالت میں چھوڑ گیا کہ اُنھوں نے اُس مذہب کو بالکل ترک کر دیا اور اسکے زرّیں اصول کے خلاف عملدرآمد کرنے لگے تھے۔ گو وہ جہالت اور تاریکی کا زمانہ تھا لیکن جوں ہی اسلام کی شعاعیں عالم معمور میں پھیلیں طبیعتوں نے اُنھیں ذوق و شوق سے قبول کرنا شروع کر دیا جس شخص کو یہ معلوم ہے کہ مذہب اسلام کے ابتداءً ماننے والے وہ لوگ تھے جو فہم و فراست اور زبان آوری میں دنیا کی تمام معاصر قوموں پر فائق۔ شاعرانہ خیالات کے سب سے بڑے مرد میدان اور اعلےٰ درجہ کے ذہن و ذکاوت میں فرد تھے۔ وہ لامحالہ کہہ اُٹھے گا کہ اس پاکیزہ دین کے حقائق پر ایک غائر اور محققانہ و منصفانہ نظر ڈالنا ہر شخص کا فرض ہے۔

چونکہ مجھے مذاہب عالم کی تحقیقات کا خاص طور پر شوق تھا۔ اور مَیں اِس بارہ میں لوگوں کی زبانوں سے سُنی سُنائی باتوں پر وثوق نہ کرکے اُن مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ اور ان سے ذاتی رائے قائم کرنے کے واسطے مصالحہ بہم پہنچاتا تھا اس لیے مَیں نے فارس کے ایک مشہور زبردست عالم سید حسن بزرگ سے مدد لی۔ جنسے میں شہر خراسان میں ملا تھا۔ اور ہم دونوں میں نہایت گہری دوستی ہوگئی تھی۔ کیونکہ اُنھوں نے معقول بحث کے ذریعہ سے میرے خیالات اور حالات کا پتہ لگایا تھا۔ نہ کہ عیب جو جاسوس بن کر۔ بدیں وجہ

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شناسائی میری خوش قسمتی کا باعث ہوئی - میں ان کی خدمت میں پورے ڈیڑھ سال تک رہا - اس اثناء میں ہمارے مابین بہت سے اسلامی مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی - اور اُن مباحثات کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس بات کو بخوبی سمجھ گیا کہ مذہب اسلام صرف ایک خدا کو پرستش کے قابل بتاتا ہے - اور توحید باری کے ایسے قوی دلائل پیش کرتا ہے جن کو مسیح علیہ السلام کے متبع لوگ بالکل جانتے بھی نہیں نیز یہ کہ اسلام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کی نبوت کا اقرار اور انکی تعظیم بدرجۂ غایت کرتا ہے - وہ اگلوں کے قصے پچھلوں کو صحیح صحیح اور بوضاحت سُناکر بدیوں پر معقول عبرت انگیز سزائیں تجویز کرتا ہے اور اُن باتوں کا مرتکب فوراً اُن سے متنفر ہو کر نیکیوں کا شیدا بن جاتا ہے -

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام پاکیزگی ظاہر و باطن مروت اور جوانمردی کا مذہب ہے - وہ اپنے پیروؤں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ جبتک دوسرا آدمی تمکو نہ ستائے - تم اُسپر ہرگز کوئی جفا نہ کرو - وہ شجرِ علم کی خوشہ چینی کا حکم دیتا ہے چاہے وہ درخت آبادِ دنیا کے انتہائی گوشہ پر ہی کیوں نہ ہو - اسکے علاوہ مذہب اسلام محتاجوں اور مسافروں کی خبرگیری - یتیموں پر مہربانی اور بددیانتی اور دروغگوئی سے بچنے کا حکم دیتا ہے -

ہاں میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ خوبیوں کی مشترک روح جیسی مذہب اسلام میں ہے ویسی ہی اور مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے - لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اسلام میں فلسفہ عمرانیہ[1] کا باب بہ نسبت اور ادیان کے کہیں بڑھکر وسیع ہے -

اور چونکہ انسان کو اپنے عمران[1] کے آغاز - اُبھار - اور اُٹھان کے زمانہ میں ہر ایک چیز کے مطالعہ اور جانچ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور وہ دنیا کے اسرار پر اس نظر سے

[1] مذہب کی وہ اصولی خصوصیات مراد ہیں جو قوم کے بننے اور ترقی کرنے میں موثر ہیں - (ایڈیٹر)

واقف ہونا چاہتا ہے کہ حقیقی اور اصلی باتوں کی پیروی اور لغو باتوں کو ترک کرے اس لیے جاپانیوں کی جدید زندگی کی رفتار بھی ایسی ہی واقع ہوی ہے۔ اور جیسا کہ ہم کو پچھلے دنوں جاپانی رسالہ شیوکیہ یا سے معلوم ہوا ہے "ناگاساکی" مجلس مذاہب نے دین اسلام کی چھان بین شروع کردی ہے۔ خاصکر جب سے ٹوکیو کالج کے تعلیم یافتہ چینی مسلمان حسان ٹیوشن نے جاپانی زبان میں اپنی تازہ ترین تالیف (جسکا ذکر وکیل میں آچکا ہے۔ ایڈیٹر) شائع کی ہے اسوقت سے تو مجلس مذکورہ کی تحقیقات میں اور بھی زیادہ سرگرمی پیدا ہوگئی ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کا نام "کاردیاما" (یعنی یکتا مذہب) رکھا ہے۔ اور اسمیں فضائل اسلام سے بحث کی ہے جاپانی قوم کو اس دین پر غور کرنے کے لیے اُبھارنا اور اُسکے قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ یہ پاک مذہب اسلام سعادت دنیوی و اُخروی کا ضامن اور انسان کو جوانمردی میں شیر ببر اور اخلاق میں ملکوتی صفات بنادینے والا ہے ؎

مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جاپانی لوگ جو ہر معاملہ میں چھان بین کرنے کے بیحد شائق ہیں۔ عنقریب اپنی خوش فکری کی قوت سے اس مذہب کے اسرار میں کوئی ایسا مسئلہ حل کریں گے جسکو سُنکر ہم لوگ بھی خوش ہوجائیں۔ کیونکہ ہم (یوروپی عیسائیوں) کو اس مذہب کے ساتھ خواہ مخواہ بغض للّٰہی پیدا ہوگیا ہے بلکہ ہم نہایت بدمزاجی اور جھلاہٹ کے ساتھ اسکے دشمن بنگئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اکثر مدبر اور دانشمند اس دین سے محض ناواقف ہیں۔ اور اسکو گالیاں دینے اور عیب لگانے اور طرح طرح سے متہم کرنے میں صرف اُن لوگوں کے بیانوں کو سند بناتے ہیں جنھوں نے ممالک مشرق میں جاکر کوچبانوں۔ گدھے والوں۔ اور کمینوں کے سوا اور اعلےٰ طبقہ کے لوگوں سے ملاقات تک نہیں کی۔ بجائیکہ جن لوگوں سے وہ ملے ہیں انکو اس مذہب کے سمجھنے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اور یہ پاک دین ایسے

لوگوں سے بالکل بری ہے۔

میں نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر میرے امریکن بھائی سیدھے اور شایستہ طریقے سے اس مذہب کی تحقیقات کرینگے اور ایسے معاملہ فہم اور باخبر مسلمانوں سے اسکے مسائل حل کرینگے جو اُنھیں، ہماری ہی زباں میں اس دین کی حقیقت کی طرف رہنمائی کرسکیں۔ تو وہ بہت کچھ فائدہ اُٹھائیں گے۔ اور اس سے ویسے ہی واقف ہوجائیں گے جیسا کہ میں واقف ہوگیا ہوں۔ اگرچہ ابتک میں اس مذہب کے بعض حقائق مثلاً تعدد ازدواجات اور میراث کی نسبت۔ جو دونوں بہت کچھ قابل غور اور بحث طلب ہیں۔ پورا اطمینان کرنے اور باقی ماندہ شبہات رفع کرنے کے لیے کوشش کررہا ہوں مجھکو اس بات کا ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ مسلمان لوگ اپنے دین حق کے ثابت کرنے اور اسکو غیر مذاہب والوں کے حملوں سے بچانے میں کمی کرتے ہیں۔ اور یہ بے حسی کی حالت جو آجکل اُنکے اوصاف میں داخل کی جاتی ہے اسے دین اسلام کے احکام سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ . . . .

. . . . جو ان کے قابل قدر افراد کو اُبھرنے نہیں دیتے۔ ورنہ جمہوریت اور شوریٰ اور ملکی انتظام کو بہترین طریقے سے نباہنا اسی مذہب کا حصّہ ہے۔ اگر یہ مسلمان لوگ اسلام کی خدمت پر کمربستہ ہوں اور اسکی تعلیمات کے اچھے عالم اسکی نصرت کریں۔ کیونکہ جہانتک میں نے دیکھا اسکی تعلیمات بیحد شستہ اور دلپسند ہیں تو انکی جماعت جاپان کی جانب روانہ ہوکر شہر نگاساکی میں داخل ہو جسکی طرف میں خود بھی عنقریب سفر کرنے والا ہوں۔ تو میں بھی اُن سے مل کر وہاں کام کرونگا اور اس دین کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے وہ جاپانیوں کو بھی سمجھاؤں گا اسوقت میں علمائے اسلام سے تعدد ازدواجات اور میراث کے مسئلوں پر بحث کرکے اپنے شبہات اور شکوک مٹا رہا ہوں۔ اور جسوقت یہ دونوں مسئلے میں اسی

اندازہ سے سمجھ لوں گا جس طرح اور مسئلوں کو سمجھ چکا ہوں اور ان کی صحت کا قائل ہو جاؤں گا تو بیشک میں خود بھی مشرف باسلام ہو کر اُن کا دست و بازو بنوں گا۔ اور پھر انشاء اللہ مذہب اسلام کا تعارف جاپانیوں سے بخوبی تمام کر دوں گا۔"

اس مضمون پر رسالۂ مذکور کے ایڈیٹر نے یہ نوٹ دیا ہے :۔

ہم مسٹر بنک روز کی دماغ سوزی کے قائل ہیں۔ مگر اس مضمون میں انھوں نے اپنے قلم کو حد اعتدال سے بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ اسلام جو ایسی وحشی اور جاہل قوموں کا مذہب ہے جنھیں باوجودے کہ ان دنوں ہم نے بہت کچھ انکی رہنمائی و اعانت کی ہے پھر بھی وہ زندگی کے معنوں سے سراسر بیخبر اور ہمارے ہی دست نگر ہیں ایسے مذہب کو قابل مضمون نگار نے اتنے اعلےٰ مرتبہ پر پہنچا دیا کہ کوئی مذہب دنیا میں اسکے ساتھ مل کر ٹکر ہی نہیں کھا سکتا۔ ہماری رائے میں جاپانی اس مذہب کی طرف ہرگز مائل نہ ہونگے۔ کیونکہ وہ بڑے روشن خیال ہیں۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ایسے مذہب کو قبول کریں جسکے پیروؤں کے تنزل اور ضعف نے اسکی کمزوری اور اسکے اصول کی لچریت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہو۔ مسٹر بنک روز اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی تردید کے واسطے جو سمجھتے ہیں کہ انکے معدودے چند دماغ دنیا کے تمام عیسائیوں کے دماغوں سے فائق ہیں اتنا ہی لکھنا کافی ہے تاکہ وہ آیندہ ایسی باتوں کے سُنانے سے ہمارا دماغ پراگندہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ کیونکہ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین اس مضمون کو نظر توجہ سے دیکھنا درکنار اسے پڑھکر ہی مضمون نگار کی حماقت پر قہقہہ لگائیں گے۔"

"ڈی ورلڈ" کے ایڈیٹر نے اس نوٹ میں اپنی کمظرفی کا پورا ثبوت دیدیا ہے۔

"از کوزہ ہماں بروں تراود کہ درو ست" اس نے اسلام یا مسلمانوں پر جو داغ لگانا چاہا ہے دین اسلام اُس سے بالکل بری ہے۔ اُسے خبر نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وخستہ حالی محض ان کی غفلت اور احکامِ اسلام کو پس پشت ڈالدینے کے وجہ سے ہے۔ مذہب کا اسمیں کچھ قصور نہیں۔ اور اڈیٹر کے خیالات کی تردید کے لیے صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ اگر اسلام ایک فطری مذہب اور عبادات و معاملات وغیرہ کے بارہ میں توفیق و سعادت کی مستحکم تریں بنیادوں پر مبنی نہ ہوتا تو یہی چند سال جنہیں ....

.... اسلام اور اہل اسلام دونوں کو فنا کردینے کے لیے بس تھے۔ یہ اس مذہب کی صداقت ہی کا زور ہے کہ باوجود مسلمانوں کی اسکے احکام و اصول سے خلاف ورزی کے اسکی اشاعت میں بجائے کمی کے روزافزوں ترقی ہے۔ اور منصف مزاج وروشن خیال یوروپین فاضل خود بخود اس کی جانب مائل ہوتے جاتے ہیں۔ جنہیں سے ایک مسٹر نیک روز بھی ہیں۔ مسٹر نیک روز کے خیالات کی داد دینا ہمارے امکان سے خارج ہے۔ ہم انکے لیے حق سُبحانہٗ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انکو راہ راست دکھا کر اپنے سچے دین کا پیرو بنائے۔ اور اسلام کو جبکی خدمت موجودہ مسلمانوں سے نہیں بن پڑتی ایسے ہی نئے مردان غیب کے ہاتھوں قوت وعظمت عطا کرے۔ آمین۔

مسٹر نیک روز نے مسلمانوں کے بغرض اشاعت اسلام ہاہاں جانے کی جو رائے دی ہے یہ ایک ایسا امر ہے جسکے واسطے ہم نے مدت تک قومی دولتمندوں کو اُبھارا اور اُنھیں اپنی خدا داد دولت میں سے کچھ حصہ اسلام کی حمایت کے لیے دینے پر آمادہ بنایا مگر ہنوز روز اول ہے۔ کاش خدا سے کریم ہمارے دولتمند بھائیوں کو آنکھیں دیتا کہ وہ دنیا کی حالت اور اسلام کی

ضرورتوں کو دیکھتے۔ اور اپنا سرمایہ ایسے کاموں میں لگاتے جن کا بے حساب اجر اسی کریم کے دربار سے ملے گا جسکے خزائن رحمت بیحد و بے پایاں ہیں۔

الغرض میں سر پر پاؤں دھر کے روانہ ہوگیا۔ جاڑے کا موسم شروع تھا۔ موٹی روئی کا لحاف اور کپڑے جلدی جلدی سلوائے۔ پسے ہوے مصالحے اور مرچیں اور بیسیوں خاک بلا دوائیاں ساتھ لیں۔ میرے جانے کا اعلان وکیل مطبوعہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳ پر ان الفاظ میں ہوا:

سفر جاپان ہمارے دوست قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی جن سے پبلک ایک حد تک واقف ہے۔ اپنی فرلو کا ایک حصہ جاپان میں صرف کرنے کی غرض سے ۱۱ نومبر ۱۹۰۵ء کو جہاز لائٹننگ پر سوار ہو کر کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔ اُن کا پتہ فی الحال معرفت ڈاکخانہ نگاساکی ملک جاپان ہوگا۔ ؎

بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

ہمیں امید ہے کہ قاری صاحب اپنے سیر و سفر میں جاپان کی مذہبی حالت کا مطالعہ کریں گے اور اپنی قابل قدر تحقیقات کے نتائج سے وقتاً فوقتاً وکیل کے کالموں کو مزین فرماتے رہیں گے۔*

"خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را" کے ثبوت میں اپنا یہ ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں کہ کلکتہ پہنچنے کے وقت تک میں جاپان میں کسی شخص کو نہیں جانتا تھا محض خدا کے توکل پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کلکتہ میں اتفاقاً ایک بمبئی کے سوداگر سے ملاقات ہوی۔ اُنھوں نے سنگاپور میں مسٹر ابراہیم بھائی (منبرگان سر فاضل بھائی کریم بھائی) کے منیجر کے نام خط تعارف دیا۔ وہاں پہنچنے پر اُنھوں نے

اپنے ہانگ کانگ کے منیجر (سمار بھائی) کے نام چٹھی دی سمار بھائی بڑی عنایت سے پیش آئے اور اُنھوں نے اپنے شنگاہی کے منیجر کے نام چٹھی دی - پھر انھوں نے اپنے کوبے کے ایجنٹ کے نام چٹھی دی - مگر مجھے ناگاساکی جانا تھا جو جاپان کا پہلا بندرگاہ ہے اور کوبے اُسکے آگے دوسرا بندرگاہ ہے - بہرحال اسقدر ڈھارس بندھ گئی تھی کہ کوبے میں پاؤں ٹیکنے کو جگہ ہے -

---

الغرض دوشنبہ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو میں ناگاساکی پہنچا - میرے اُس شہر میں وارد ہونے کی اطلاع وہاں کے مشہور انگریزی اخبار "ناگاساکی پریس" نے اپنے ۱۳ دسمبر کی اشاعت میں حسب ذیل الفاظ میں شائع کی :-

ترجمہ

ناگاساکی پریس ۱۳ دسمبر ۱۹۰۵ء

"محمد سرفراز حسین نامی ایک صاحب پیر کو جرمن میل اسٹیمر سے ہندوستان سے یہاں وارد ہوئے ہیں - وہ جاپان بدھ مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور وہ خوش ہوں گے اگر کوئی صاحب ان سے تمام مذاہب کے متعلق عموماً اور اسلام کے متعلق خصوصاً تبادلۂ خیالات کریں - نیویارک کے کسی اخبار میں ایک نامہ نگار نے شائع کیا تھا کہ مذاہب کی معلومات کی ایک ایسوسی ایشن ناگاساکی میں منعقد ہونے والی ہے اور اس خبر کو ہندوستان کے اخبار نے نقل کیا تھا - محمد سرفراز حسین یہاں چند دنوں ایسوسی ایشن کے ممبروں سے خط و کتابت کرنے کے لیے قیام کرینگے - وہ ہندوستانی گورنمنٹ کے ایک افسر ہیں اور اپنی فرلو کے زمانہ میں جاپان آئے ہیں - انکا موجودہ پتہ جاپان ہوٹل ہے"

اصلی حسن افزا صابون

معزز اصحاب و حکمائے یونان کے ہزاروں سارٹیفکٹ موجود ہیں
خبردار ہوشیار رہنا ایسا نہ ہو کہ دھوکہ کھا جاؤ کیونکہ بہت سے
جعلی اشتہار حسن افزا صابن کے نام سے شائع ہو رہے ہیں

جو گورے و خوبصورت ہونے کی بے نظیر ایجاد ہے۔ تازہ تازہ پھولوں اور طبی ادویات سے
تیار کیا جاتا ہے جو حسن کو دوبالا کرتا منہ اور ہاتھوں کو آئینہ دار شفاف بنا دیتا ہے۔
اور جلد کی تمام جھائیاں جھانسے۔ داغ۔ دھبے۔ پھوڑے۔ پھنسیاں زائل کر دیتا ہے اور
جلد کو مخمل کے مانند ملائم اور گلاب کی پتی کی طرح خوبصورت بنا دیتا ہے صرف سات روز
مل کر نہانے سے کالا رنگ کملایا ہوا چہرہ صاف ہو کر بدن گورا و خوبصورت نکل آتا ہے
بدن پر شنجرف کی سی سرخی نظر آنے لگتی ہے۔ معزز رئیسوں اور خاص بیگمات نے پسند فرمایا ہے
قیمت بھی معمولی ہے یعنی فی بکس تین ٹکیہ مع ایک نفیس صابون دانی کے صرف ایک روپیہ (عہ)

روغن دل بہار گیسو دراز

یہ نفیس تیل جو اپنی خوشبو میں لاجواب ہے۔ اس کو خواتین نے خاص طور پر پسند فرمایا ہے۔ اس کے استعمال
سے روح کو تازگی اور دل کو فرحت ہوتی ہے خشکی دماغ کو رفع کرتا ہے اس کے استعمال سے
بال لمبے و سیاہ اور باریک ہو کر ریشم کی طرح ملائم ہو جاتے ہیں۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے
دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ طبیعت ہر وقت مسرور اور ہشاش بشاش رہتی ہے۔ قیمت
فی شیشی دس تولہ ایک روپیہ (عہ)۔ دواخانہ کی بڑی فہرست مفت طلب کرو

پتہ: حکیم محمد یعقوب خاں مالک دواخانہ
نور تن دہلی بازار فراش خانہ

رجسٹرڈ نمبر ۔ ا ۔ ۷۵۱

قسم اوّل

... اسلامیہ دہلی

جلد ۱ نومبر ۱۹۱۵ء نمبر ۲

تمدّن

معاشرتی ۔ تمدنی ۔ ادبی ۔ فلسفی ۔ اخلاقی ۔ تاریخی ۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ایم ۔ اے قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری

محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

پبلشر محمد حسن قادری

انامی پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر نواب علی

قیمت سالانہ قسم اول ۵ ۔ مقام اشاعت پل بجھاؤ لال لکھنؤ قیمت سالانہ قسم دوم ۴

شعلہ

وہ جو کوہ طور پر بھڑکا تھا۔ وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر ہوا تھا۔ اب کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں نمودار ہے۔ ادبی روح پھونکے گا۔ اخلاقی وعظ سنائیگا۔ نورانی شعلوں کی تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنائے گا۔ وہ سینے جو آتشِ محبت سے سوختہ ہیں وہ قلوب جو سوز دروں سے خالی ہیں اسطرف متوجہ ہوں عشق الٰہی کی لپٹیں گداز طبیعتوں سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہد حسن بے نقاب ہوکر مشتاق آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر ہے۔ بس شعلہ کی خریداری کے لیے جو ہر مہینہ آپ کی دلبستگی کا بہترین مجموعہ ہے۔ درخواستیں روانہ کیجیے لکھائی چھپائی بہت عمدہ قیمت سالانہ درجۂ عام دو روپیہ آٹھ آنے (عہ۲/۸) مع محصول نمونہ چار آنے کے ٹکٹ پر بھیجا تا ہے۔

لکھنوی تمدن

شکر ہے کہ یہ پرچہ پورا لکھنوی "تمدن" کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ اب یہ چھپے گا
بھی لکھنؤ میں اور شائع بھی لکھنؤ سے ہی ہوگا۔ اسوقت تک "تمدن" وقت پر شائع
نہیں ہوتا تھا ہم نے چاہا تھا کہ یہ ہمارے ہاتھ میں آتے ہی باقاعدہ ہوجائے مگر
"مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال" کی مستند ضرب المثل نے ہم پر بھی وار کیا اور دہلی
میں چھپنے کی وجہ سے ہم "تمدن" کو وقت پر شائع نہ کرسکے گو پچھلی حالت اور اب کی
حالت میں فرق تو ضرور رہا کہ اب کم از کم ہر مہینہ ایک پرچہ شائع تو ہونے لگا۔
اس کلیہ کے مطابق نومبر نمبر اکتوبر نمبر کے پورے ایک ماہ بعد آپ کی خدمت میں
حاضر ہے۔ اور یہ بھی پوری ایک ماہ کی دیر سے شائع ہوا ہے۔ دسمبر کا پرچہ البتہ
وقت پر جناب کی نظر سے گذرے گا یعنی دسمبر کے اخیر ہفتہ سے کچھ قبل ہی وہ جناب
کی خدمت میں باریاب ہوگا اور آئندہ انشاءاللہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ و

"تمدن" جو عرصہ سے بے قاعدہ رہ کر اپنی ہستی کو بھی پورے طور پر قائم نہ رکھ سکا تھا اپنے ناظرین کی خدمت میں ہر ماہ کی ٹھیک ۲۰ تاریخ کو روانہ کر دیا جائے گا۔ اسوقت تک جو تاخیر اسکی اشاعت میں ہوتی تھی اس کا الزام بہت کم ہم پر لگایا جا سکتا ہے آئندہ جو کچھ بھی دیر ہوگی، اگر خدانخواستہ ہوئی، تو وہ حقیقت میں ہماری طرف سے ہوگی اور اسکے لیے ہم قابل الزام ہوں گے۔ ہم نے "تمدن" کے سب سے پہلے پرچہ میں جو ہمارے ہاتھوں شائع ہوا۔ وہ مضامین شائع کیے تھے جو حضرات لکھنؤ کی خدمت میں ہماری طرف سے بطور التماس بالخصوص پیش کیے گئے تھے مگر شومی قسمت سے وہ نمبر لکھنوی نمبر نہ ہوا اور اسکا فخر اس نمبر کو حاصل ہوا۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرات لکھنؤ کی قدردانی کی توقع پر "تمدن" کو اب "لکھنوی تمدن" کہا گیا ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ ہماری یہ توقع پوری کی جائے گی۔

"تمدن" کے نقل مکان کے متعلق دو رباعیات اور ایک شعر حضرت واسطی نے عنایت کیا ہے ہرچند انکے چھاپنے سے ہم اپنا ڈھنڈورہ آپ پیٹنے کے مجرم قرار دیے جا سکتے ہیں مگر ہم انکی محبت سے لکھی ہوئی چیز کو نہ چھاپنا بھی کفران نعمت خیال کرتے ہیں اور اسلیے بے کم و کاست ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

رباعی

حالات "تمدن" کا ہوا جب احساس — دلّی سے اسے لکھنؤ لائے عباس
اللہ عطا کرے ترقی شب و روز — پورب کی اسے آب ہوا آئے راس

نکلا تو ہے اب "تمدن" اپنے گھر سے — جب لطف ہے بہتر یہ بنے بہتر سے
جو دیکھے جگہ دل میں اور آنکھوں پر دے — اور گھر میں ایڈیٹر کے سدا ہُن برسے

"تمدن" مایۂ نازش نہ ہو کیوں لکھنؤ بھر کا
ہے اس کے سر پہ سایہ قاری سجاد حیدر کا

حضرات لکھنؤ میں سے حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی نے چند شعر عنایت کیے ہیں جو عرضداشت کے عنوان سے خیر مقدم کے ذیل میں زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ہم انکو اور حضرت شرر مشہدی لکھنوی کے نثر خیر مقدم کو جو انھوں نے "دلی کا تمدن لکھنؤ میں" کے جواب میں ہمیں عنایت کیا تھا شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

خیر مقدم

(۱)

خیر مقدم ہے "تمدن" کا بھی لازم ہے جگہ — یہ تو اپنا ہی ہے گھر ہے حیثیت کچھ نہیں
اے خوشا اقبال ما خوش آمدی خوش آمدی — یہ نہ کہنا لکھنؤ کو ہم سے الفت کچھ نہیں
ہاے تم کب آئے جب اپنا بھرا گھر لٹ گیا — خاک اڑتی ہے یہاں سامان حسرت کچھ نہیں
خیر آؤ ہم بھی ہیں موجود خدمت کے لیے — پیشکش ہے نقد دل حاضر بجز حسرت کچھ نہیں

(۲)

خیر مقدم۔ یاد لکم

خوش آمدید

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اے ہمارے پیارے اور ہر دلعزیز مہمان ہم تیری تشریف آوری کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ہم بہت خوش ہیں کہ تو نے از راہ کرم ہمارے کاشانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشی اور ہمیں شکرگذاری کا موقع عنایت کیا۔

ہماری شادمانی کی کوئی حد نہیں ہماری مسرت کا اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے کیونکہ تجھ ایسے معزز اور ہر دلعزیز مہمان نے ہم پر کرم کیا۔ ہم جہانتک اپنی خوشی کا اظہار کریں کم ہے ہم تیرے لیے اپنی آنکھیں بچھا دینے کو تیار رہیں۔ ہم تیری خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا گناہ خیال کرتے ہیں ہمارے جذبات دلی کے تقاضے تو بیحد ہیں جنکے پورا کرنے کے لیے ہم کو شاید کافی وقت بھی نہیں مل سکتا اور ہم بالکل مجبور لاچار ہیں تاہم ہماری ہمت کو تیری آمد کی خوشی نے اسقدر مستقل کر دیا ہے کہ ہمیں ہر مشکل آسان معلوم ہوتی ہے اور ہم تیری مہمانداری سے اپنے مکان کی رونق دوبالا پاتے ہیں۔ ہماری سیروں کی رونق تو درکنار تو نے ایک مدت سے ہمارے دلوں کو اپنی طرف ایسا گرویدہ کر لیا ہے کہ ہماری مشتاق آنکھیں تیرے دیدار کی بہار لوٹنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

جب تو نے پہلے پہل دہلی میں قدم رکھا تو تیری عالمگیر شہرت نے ہم کو ایسا مشتاق بنایا کہ جب تجھکو دیکھا تو فوراً دل میں جگہ دی اور آنکھوں سے لگایا اور یہ جذبات ہم میں محض تیری دلاویزیوں سے پیدا ہوئے تھے لے تمدن اور لے ہمارے نئے مہمان اب سے چند سال پہلے ہمکو یہ امید کب ہو سکتی تھی کہ تو ہندوستان میں قدم رکھتے ہی ایسی شہرت اور ایسی ناموری حاصل کریگا اور تیرے جملہ مضامین دلکش اور تیرے سارے انداز ایسے نرالے ہونگے۔ کیونکہ ایسا دارالسلطنت جسکے زوال کو سالہا سال گذر چکے ہوں اسمیں کہاں یہ امید باقی رہ سکتی ہے کہ تیری داشت اور تیری نگرانی کامل طور پر انجام پذیر ہو سکے گی۔ لیکن خدا کے نیک اور مستعد بندے اللہ کے فضل اور اپنی ہمت پر بھروسہ کرنیوالے سب کچھ کر سکتے ہیں اور ہر طرح

اس بات کو دکھا دیتے ہیں کہ دیکھو کسی بات کی ابتدا یوں کرتے ہیں اور یوں انتہا تک
پہنچا دیتے ہیں جیسا کہ پہلے مخزن سے ظاہر ہو۔ اور پھر وہی جلوہ "تمدن" میں۔ جھلک
اُٹھا اور اسکی چمک نے سب کی آنکھیں جھپکا دیں اور اسکی روشنی نے سب کو باخبر
کر دیا کہ دیکھو میں بھی وہ مشتعل مشعل ہوں کہ جو دنیا کو روشن کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں ہی
وہ آفتاب ادب ہوں جسکی ابتدائی دھیمی شعاعیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو جگمگا دینگی
اور میری گرمی افسردہ خون میں بغیر حرارت پیدا کیے ہوئے نہ رہے گی اور واقعی
ایسا ہی ظہور پذیر ہوا ابھی چار پانچ برس تک جس آب و تاب کے ساتھ یہ ادبی رسالہ
نکلتا رہا وہ اظہر من الشمس ہے خوبی اقبال اور قادر ذوالجلال کے کرم سے جو نعمتیں اسکو
نصیب ہوئیں اسکے گواہ عالی خود اسکے مضامین ہیں جنکی قدر و قیمت ابتک وہی
ناظرین جان سکتے ہیں جنکی خدمت میں حضوری کا شرف حاصل ہو چکا ہے آئندہ
وہ حضرات بھی باخبر ہونگے جنکی خدمت میں اب اسکو شرف حضوری حاصل ہوگا
یہ بھی خدا کی عجیب نعمت ہے کہ یہ اپنے گھر سے چلا اور اپنے ہی گھر میں آیا عالیجناب
قاری عباس حسین صاحب جو پہلے خود دہلی سے تشریف لائے اور لکھنؤ کو اپنے قیام
سے رونق بخشی بعدہ (تمدن) آیا اور انھیں کا مہمان ہوا اور اب تو اصل میں ہمارا
مہمان ہے اور ہم اسکے میزبان۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسکی خاطر داری میں کوئی
دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور نہ کرنا چاہیے کیونکہ خدا کی عنایت سے ایک ایسا معزز
مہمان آیا ہے جسکی ہمکو ضرورت بھی تھی اور تمامی لکھنؤ چشم براہ تھا۔ حالانکہ جب وہ
دہلی دہلی نہ رہی تو وہ لکھنؤ لکھنؤ کیونکر رہ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ اپنی مہمانداری اور مدارات
ہی کی وجہ سے دنیا کے ہر حصہ میں مشہور ہے (چنانچہ میں نے خود ایران کے سب سے
بڑے ہوئے شہر یعنی خراسان میں جو روس سے بہت ہی قریب ہے اسکا نام بازدیوں
میں ایرانیوں کی زبان سے سُنا اور بہت تعجب ہوا) اور اس گری ہوی حالت میں

بھی بہت کچھ سامان فراہم کرسکتا ہے بلکہ بسروچشم اسکی خدمت کے لیے حاضر ہے لیکن مجبوری اور سخت مجبوری تو صرف اسقدر ہے کہ اتبو ہماری قوم ہی اس نازک حالت میں ہے کہ کسی ترقی پذیر امر کی برداشت سے قاصر ہے پھر ہم کس مُنھ سے دعوی کریں کہ ہم سے اسکی داشت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہوگا۔ اور رہم اسکی تواضع میں پوری کامیابی حاصل کرسکیں گے مگر اس قاعدے کی روسے کہ جو مہمان کسی کے یہاں فروکش ہوتا ہے تو اُسکے جملہ احباب اُسکو دعوت دیتے ہیں اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوے اسکی تشریف آوری کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں اسلیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ لکھنؤ کیا تمام ہندوستان میں اسکی ضیافت طبع کے سامان بہم پہنچاے جائینگے اور یہ ہمیشہ خوش و خرّم رہے گا۔

علے الخصوص لکھنؤ جسکو "تمدّن" نے اپنے پہلے اشتہار میں ایک بزرگ مانا ہے اور اظہار خلوص و سعادت مندی کرتے ہوے سرپرست جانا ہے۔ اسکی نگرانی و بہبودی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گا اور حتی المقدور اسکی بھلائی اور کامیابی کی کوشش کرے گا اور اس کی ہمیشہ یہ دل سے دعا رہے گی کہ خدا اس نونہال کو سرسبز و شاداب رکھے اور یہ پھولے پھلے اس کے سایہ میں لوگ آرام پائیں اور اس کی داشت کرنے والے اپنی ریاضت کے پھل کھائیں آمین ثم آمین۔

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

شرر مشہدی لکھنوی

خط وکتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیے۔ منیجر

یادِ رفتگان

ہمارے کرمفرما جناب غلام محمد صاحب طورؔ ایم۔اے نے یہ نظم ہمکو عنایت کی ہے جو انھوں نے قلعہ لاہور کی سیر سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اسمیں ان مختلف محسوسات و سوز و گداز کا اظہار ہے جو بالطبع ایک شاعر کے لیے (جسکے دل میں اپنے ملکی اور قومی آثارِ قدیمہ دیکھنے سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے سرمایۂ ناز کہے جا سکتے ہیں) لاہور کے قلعہ کی سیر سے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آج اسکے مکین کہاں ہیں؟ وہ دنیا کی تمام قیود سے آزاد ہو کر عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہیں۔ حضرت طورؔ نے خصوصیت کے ساتھ اسی خیال کو نظم کیا ہے۔

ایڈیٹر

کیسی دشواری ہے مجکو آج اے میرے خدا — ہے اکیلی جان میری اور سینکڑوں رنج و بلا

آج کیوں اندوہ و غم نے آکے گھیرا ہے مجھے — آج اوساں کس لیے میرے خطا ہونے لگے

یاس و حسرت کیوں اُمنڈ آئے ہیں مجھ ناشاد پر — ہو رہی ہے کس لیے اقلیمِ دل زیر و زبر

کیوں ڈبونے کو ہے مجکو موجِ بحرِ اضطراب — کیوں بہا جاتا ہوں اس دریا میں مانندِ حباب

بیقراری کیوں گلوئے یار کا میرے ہار ہے — درد میرے پیارے دل کے واسطے کیوں خار ہے

سینہ کاوی دلخراشی جانکنی ہے کس لیے — ہائے ننھی سی مری جاں پر بنی ہے کس لیے

کیوں پسینوں پر پسینے ہیں مجھے یوں آ رہے — ضعف ہم آغوش ہے مجھ سے الٰہی کس لیے

کس لیے لحظہ بلحظہ مجکو آتی ہے غشی — ایک حالت جا رہی ہے ایک حالت آ رہی

کیوں تلاطم میں ہے اے دریائے چشمِ خونفشاں — تیرے ہر قطرے میں ہے سامانِ بحرِ بیکراں

بے طرح میری طبیعت ہو رہی بیتاب ہے

دل مرے پہلو میں ہے یا ماہیِ بے آب ہے

ہوں ترا دلدادہ اے احساس یادِ رفتگاں　　شوق سے آ، او رہے پہلو میں مرے چٹکیاں

میری قسمت میں ازل سے ہی لکھا سوز و گداز　　میرے سینے میں خدا نے ہے بھرا سوز و گداز

برقِ خرمن سوز حسنِ اولیں کی مجھ میں ہے　　آتشِ عشق اک مہِ پردہ نشیں کی مجھ میں ہے

درد کہتے ہیں جسے میں اسکی اک تصویر ہوں
درد کی یعنی بنا ہوں، درد کی تعمیر ہوں

عالمِ عقبیٰ کو جانیوالو! ہو دل شاد تم　　قیدِ ہستی کی سلاسل سے ہو اب آزاد تم

تم کو اب گلگشتِ فردوسِ بریں سے کام ہے　　رات دن تمکو میسر راحت و آرام ہے

کینہ و بغض و حسد سے اب تمھیں خطر نہیں　　دشمنوں کی دشمنی کا اب تمھیں کھٹکا نہیں

تم غرور و کبر و خود بینی سے کوسوں دور ہو　　ایک ہی صہبائے وحدت کے نشہ میں چور ہو

اب تمھاری جان کو خوفِ ریاکاری نہیں　　جامۂ یاری میں پنہاں یعنی غداری نہیں

اب ہوا اور حرص اور لالچ تمھیں اصلا نہیں　　سیم و زر کے جمع کرنے کا تمھیں سودا نہیں

فکرِ اسبابِ معیشت سے رہا ہو تم رہا　　ہے یہ دامنگیرِ اہلِ عالمِ اسباب کا

جد و جہدِ زندگی سے تم کو فرصت ملگئی　　یعنی دنیا کے مشاغل سے فراغت ملگئی

مدح و ذم سے تم کو استغنا ہوا اچھا ہوا　　آفریں کی ہے تمھیں پروا، نہ نفریں کا گلا

زندگی بھر کے تمھارے عیب اور جرم و خطا　　رحمتِ باری نے دامن میں لیے اپنے چھپا

اب عروسِ دہر کے ناز و ادائے دلنشیں　　گھر تمھارے خانۂ دل میں بنا سکتے نہیں

اب زمانہ کے تغیر اور جہاں کے انقلاب　　کر نہیں سکتے تمھیں غرقابِ بحرِ اضطراب

چرخِ گرداں لاکھ گھومے کچھ تمھیں پروا نہیں　　گردشِ گیتی سے اندیشہ تمھیں اصلا نہیں

اب ستارے بھی فلک کے کھوئی قسمت کی کتاب　　کر نہیں سکتے تمھاری آنکھ سے کافور خواب

عالمِ بالا کو جانیوالو خوش رہو اور شاد تم　　خوب عشرت اور عافیت کی اب دو داد تم

پھر خدا معلوم کیا دوراں ہمیں دکھلائے گا
دل میں راحت لائے گا یا سر پہ آفت ڈھائیگا

طور

مرد-عورت

گذشتہ سے پیوستہ

تو نے فرہاد و مجنوں، رتن سین کا بھی دکھڑا رو دیا لیکن میں اس پر التفات نہیں کرتی کیونکہ مجھے کیا خبر کہ انھیں کوئی تکلیف تھی بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ جسے تو ناکامی سمجھ رہا ہے اُن کے لیے کامرانی ہو اور جس سے تو اب نفرت کر رہا ہے وہ انکے لیے باعث محبت و راحت ہو تو ان باتوں کا کیوں ذکر کرتا ہے جس سے تجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور اُسکو یہ حال کیا بتاتا ہے جس سے تو نابلد ہے۔ زلیخا کا ذکر یوسفؑ سے کرکے پوچھو کہ پیغمبری کیونکر ملی ہی کافی ہے۔ اے گندم نما جو فروش یہاں تک تو مختصراً جواب تھا۔ تیرے ہر کیک الزاموں کا اب سُن کہ جن کی تو شکایت کر رہا ہے وہ تیرے کسقدر شاکی ہیں اور جن کی داستانِ ظلم تو نے سُنائی ہے وہ کتنی دُکھ بھری کہانیاں اپنے دلوں میں لیے ہوئے ہیں۔

عورت کی جنس اس لحاظ سے کہ وہ انبیا کی ماں تھی۔ اولیا اور فقرا کی ماں تھی ساری دنیا کی ماں تھی اُسکا احترام کیا جاتا۔ لیکن اے مرد کہ تو نے ہمیشہ عورت کے نام سے زہر اُگلا۔ تو ایک ماں کی بھی عزت کیوں کرتا اور تو یوں کیا عزت کرتا۔ تو نے یہ بھی تو گوارا نہ کیا۔ کہ خدا کی دی ہوئی عزت اُسکے پاس باقی رہے عیسےٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے یہ معجزہ تھا مریمؑ کا۔ لیکن تو نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک عورت حامل معجزہ ہو اسلیے آج دنیا میں کوئی مریم کا نام اس لحاظ سے نہیں لیتا۔ اور یہ شرف بھی عیسےٰؑ کو

دیدیا گیا۔ ایران جس کی تباہی کا تو نے دکھڑا رو دیا۔ ہندوستان جس کے تباہ ہونے پر تو نے ماتم کیا۔ کیا تجھے خبر ہے کہ وہ کیوں برباد ہوئے۔ اور کیا تجھے علم ہے کہ وہاں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا۔ ایران میں تو تیری جنس نے بیوی بہن کی تمیز اٹھا دی تھی۔ اور ہندوستان میں ایک عورت تمام بھائیوں کے تصرف میں رہتی تھی۔ کیا تو ایسا کرنے پر بھی دنیا میں جینے اور باقی رہنے کی تمنا کرتا ہے۔ میری جنس کی وہ رہبانیں جن کی لغزش کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جاتا ہے۔ تجھے خبر ہے کہ اُن کی خانقاہیں اُن کے معابد کیا تھے۔ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے یورپ چلے جاؤ اور اُن سے کھدوا کر دیکھو اب بھی تہ خانوں میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے ججمے اُن معصوم بچوں کے مل جائیں گے۔ جو ماؤں کی گودوں سے چھین کر زندہ دفن کرا دیے گئے تھے صرف اس لیے کہ دنیا میں تیرے عیب ظاہر نہ ہونے پائیں۔ اور تو رہبانوں کا ویسا ہی زاہد بنا ہے ہزاروں لڑکیاں جو تیرے تقدس مآب گروہ کے پاس طالب آخرت رہ کر توبہ و سلوک کے لیے آتی تھیں پھر گھر جاتی تھیں کنواریاں۔ اور لوٹتی تھیں زبردستی مائیں بن کر۔

کیا تو نے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ نہیں دیکھی جہاں آئے دن ہزاروں عورتیں ایک ایک مقدس راہب کے ادنی اشارے پر ستاہراہوں پر ذبح کر کے ڈال دی جاتی تھیں۔

[illegible]ء میں پاپائے روم کے حکم سے میری جنس کی ہزاروں عورتیں صرف اس شبہ پر گرفتار ہو کر سولی پر چڑھا دی گئیں کہ انہیں سحر آتا ہے۔ کیا سترھویں صدی کے وسط میں غریب عورتیں اس بیہودہ اعتقاد کی

بنا پر گرفتار رہوتی تھیں تو وہ اقرار نہ کرلیتی تھیں صرف اس ڈر سے کہ اگر انھوں نے انکار کیا تو ناخنوں میں کیلین کس سے ٹھکوائی جائیں گی۔ گرم لوہے کے داغ کس سے کھائے جائیں گے۔

اے مرد تیرے الزاموں کا کچھ ٹھیک ہے انگلستان کی لانگ پارلیمنٹ کے زمانے میں کیا تو نے ایک عورت پر یہ الزام رکھ کر کہ وہ اپنی جرابیں اُتار کے اور صابون میں گھول کر طوفان برپا کر رہی ہے۔ پہلے اُسکے نو برس کے معصوم بچے کو اور پھر اُسے سولی پر نہیں چڑھایا کیا تو نے اُس سال ایک خاص قانون عورتوں کو پکڑ پکڑ جلانے مار ڈالنے کا نافذ نہیں کیا تاریخیں اُٹھا اور اپنے کارنامے دیکھ دیکھ کر خوش ہو کر تو نے کوئی قیامت ہماری جسمانی و اخلاقی تباہیوں کے لیے اُٹھا نہیں رکھا مگر وہ خدا جس نے تجھے اور ہمیں اس دنیا میں یکساں حقوق دے کر بھیجا تھا۔ زیادہ عرصے تک اس طوفان عدوان بغاوت کو نہ دیکھ سکا۔ اور اس سرزمین عرب سے ایک ایسے شخص کو پیدا کیا جس نے سب سے پہلے ہماری خراب حالت پر دل دُکھایا اور اپنی تعلیمات سے اپنی عملی زندگی سے دنیا کو بتایا کہ عورت دنیا کی محبوب ترین اشیاء میں سے ہے۔

اے ظالم اگر تو عورت پر ستم کرنا روا رکھتا ہے تو تجھے کیا حق حاصل ہے کہ تو عورت سے محبت و لطف کا طلبگار رہے لیکن نہیں۔ تو ان تمام زیادتیوں پر منفعل ہو گا۔ شرمائے گا اگر کبھی تجھے ہمارے دل کی حقیقی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ کہ ہم تو اسپر بھی کچھ نہیں کہتے اور تیری اطاعت فرض جانتے ہیں مگر تو اُن چھالوں کی جو تیرے لیے چکی پیسنے میں پڑ جاتے ہیں تو اُن بیداریوں کی جو تیری پرورش و خیال میں غریب عورت کی ندامت زندگی ہیں۔ قدر

کرینگے اہل نہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ تو اس قابل تھا ہی نہیں کہ تیرے لیے اتنا دُکھ درد برداشت کیا جاتا۔ تو میری بیوفائیوں کی شکایت کرتا ہے لیکن کیا تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی جبکہ وہ تمام باتیں جو میرے لیے باعث ننگ و عار قرار دی جاتی ہیں تیری بے حمیت زندگی کے لیے مایۂ نشاط ہیں اور اسی لغزش میں تو عورت کو گھر سے نکال دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اُسی طرح کی ہزاروں لغزشوں سے تیری ہر رات معمور ہوتی ہے۔ مگر عورت تجھ سے یہ بھی سوال نہیں کر سکتی کہ۔ بہ بر کہ بودی امشب۔

اگر میں یہ کہوں کہ کائنات کی ساری رونق گیتی کا یہ بازار عمل سب میرے دم سے ہے تو تو فوراً انکار کر دے گا۔ کہ مرد کا بھی اسمیں برابر کا حصہ ہے لیکن تیرا انکار خدا کے فیصلہ سے انکار کرنا ہو گا جس نے مریمؑ کے پیٹ سے عیسٰےؑ کو پیدا کر کے یہ دکھلا دیا کہ اگر تو دنیا میں نہ ہوتا تو بھی یہ ساری آبادی یوں ہی تیار ہو سکتی تھی۔ اب تو کوئی مثال ایسی بتا کہ (بغیر عورت کے) صرف تو نے کبھی کوئی بچہ جنا ہو۔

میں بھی اگر تیری طرح الزامات لگانا چاہوں تو کہہ سکتی ہوں۔ کہ ابلیس جس نے سب سے پہلے خدائے انحراف کی بنیاد ڈالی۔ مرد ہی تھا وہ کوئی ابلیسہ نہ تھی۔ اگر تھی تو قرآن حدیث تاریخ سے تلاش کر کے مجھے بتا۔ کہ کبھی کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ یہ تیری ہی انانیت ہے کہ اُس نے تجھ سے یہ فقرہ تخت جبروت پر بیٹھ کر انا ربکم الاعلیٰ کہوایا۔ اور یہ تیری ہی سرکشی و نافرمانی تھی کہ مسیلمہ کو کذّاب و دجّال کا خطاب عنایت کرایا۔

تو شکایت کرتا ہے کہ تو میرے ہاتھوں سے تنگ ہے۔ حالانکہ تو اس سے

زیادہ ظلم اور کیا کرسکتا تھا کہ تو نے مجھ سے میری انسانیت چھین لی۔ تو نے چاہا کہ تو ہی وہ سب کام کرے جو تو نہیں کرسکتا تھا۔ تو آزادی کا الزام عورتوں پر رکھتا ہے۔ حالانکہ تو ہی وہ تھا جس نے سب سے پہلے ہماری طبیعتوں کے خلاف۔ ہماری فطرت کے منافی ہمارا پردہ توڑنا چاہا لیکن اے نٹ کھٹ پہلے تو خود ہی میرے چہرے سے نقاب نوچ کر پھینک دیا۔ اور پھر خود ہی بگڑ بیٹھا۔ کہ یہ نقاب کیوں جدا ہوا۔ اللہ رے تیری ستم آرائیاں۔

تو تو اُس دیوانے کی طرح ہے جو خنجر و شمشیر سے اپنی حالت صحت میں کام لینا اچھی طرح جانتا تھا لیکن جب تیرا دماغ پھر گیا اور ان کا استعمال بھول گیا اور اس طرح اپنا ہاتھ آپ کاٹ لیا۔ تو تلوار توڑ ڈالی کہ سارا قصور اسی کا ہے خنجر پھینک دیا۔ کہ اسی نے میرا ہاتھ زخمی کیا۔ مگر کیا کوئی ذی فہم صرف اس وجہ سے تلوار اور خنجر کو بُرا سمجھنے لگے گا۔ تجھی کو الزام دے گا کہ تو اُن کا اہل نہیں رہا۔

سُن اور کان کھول کر سُن :-

میں ایک نغمۂ نشاط ہوں۔ اگر تو قرینہ سے رہے لیکن یہ کتنا ظلم ہے کہ وہ نغمہ جو تیرے کانوں کے لیے ہے تو اسے پکڑ کے کانوں میں رکھنا چاہتا ہے۔ اے دیوانے۔

میں ایک نکہت دل آویز ہوں اگر تیرے حواس خراب نہوں لیکن یہ کیسی قیامت ہے کہ وہ شمیم جو صرف تیری شامہ کے لیے ہے۔ تو اسکو اپنی آغوش میں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا آرزومند ہے۔ اے پاگل۔

میں ایک پھول ہوں اگر تجھے کچھ تمیز ہو۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ وہ پھول

جس کی خوشبو اور رنگینی صرف تیرے دل کو مسرور بنانے کے لیے ہے اسکی پنکھڑیاں الگ الگ کرکے تو اسے کھا جانا چاہتا ہے۔ اے بد دماغ۔

مَیں ایک نورانی تسلی ہوں اگر تجھ میں کچھ عقل ہو۔ لیکن یہ کیسا غضب ہے کہ وہ سکون جو صرف تھکے ہوئے دماغ اور کسلمند طبیعت کے لیے تھا تو اس سے طمانیت نہ پانے کی شکایت کرتا ہے حالانکہ تیرے دماغ نے کوئی کام نہیں کیا کہ وہ تھک جائے اور پھر میری تلاش کرے تیری طبیعت محنت سے کسلمند نہیں ہوی کہ اسے میرے وجود کی ضرورت ہو اگر تو میری حقیقی وقعت کرنی جانتا اور تجھے میری لذتوں کا علم ہوتا تو تو رات دن کام کرتا محنتیں کرتا۔ دنیا میں بیکار نہ رہتا اور پھر جب تجھکو شگفتگی اور تازگی کی ضرورت ہوتی تو میری جستجو کرتا اور پھر تازہ دم ہو کر کام میں لگ جاتا۔

تو شاعر ہے یعنی اپنے جذبات کے ساتھ میرا ذکر کرنا تیرا شعار ہے لیکن تجھے شرم نہیں آتی کہ کسقدر خلاف واقعہ تو میری توہین کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ تو محافل میں میری برائیاں بیان کرتا ہے میری اُن بے وفائیوں کا ذکر کرتا ہے جو مجھ میں نہیں ہیں اور تو نے کبھی ان مظالم کا حال بیان نہیں کیا جس سے تیری زندگی نے تربیت پائی ہے تو سمجھتا ہے کہ عورت صرف سلسلۂ تناسل کا ذریعہ ہے لیکن اے خیرہ نگاہ تجھے یہ خبر نہیں کہ میرا احترام کرنے میں حقیقی راز ترقی کا نہاں ہے۔ مجھے بتا کہ اس عورت سے کسی مرد نے کوئی اچھی صحیح الدماغ اور تنومند و توانا اولاد پیدا کی جس سے اس نے نفرت کا اظہار کیا؟

اے بے خبر وہ صرف عورت کی معاشرت پر موقوف ہے چاہے دنیا میں تیری نسل کو بگاڑ دے چاہے بنا دے۔ دیکھ اسقدر بیزاری کا اظہار نہ کر

تجھے معلوم ہوگا کہ لوط کی قوم نے مجھسے بیزار ہو کر کیا ثمرہ پایا۔ اللہ نے وہ بستی کی بستی اُلٹ دی جسمیں وہ نابکار مردود و ملعون قوم عورت سے نفرت کرنے والی رہتی تھی تو کہتا ہے کہ "میرا دامن چھوڑ" میں کہتی ہوں کہ چل ہٹ مجھ سے بات نہ کر کہ تجھ سے بوئے خون آتی ہے۔ تو نے اپنی عاقبت بگاڑی تو میں کیوں تیرے پیچھے اس عذاب میں مبتلا ہوں جو تیرا انتظار دست خدا میں کر رہا ہے۔

ریویو

ہمارے پاس ایک کتاب بعنوان "گوکھلے بحیثیت انسان" ریویو کے لیے آئی ہے یہ کتاب مسز سروجنی نائیڈو کی انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہے جو نہایت قابلیت سے سید خورشید علیصاحب نے کیا ہے۔ کتاب میں مسز سروجنی اور مسٹر گوکھلے آنجہانی کی ملاقاتوں اور خط وکتابت کا ذکر ہے جس سے مسٹر گوکھلے کے ہمدرد انسان اور محب وطن ہونے کا ثبوت ملتا ہے سید خورشید علیصاحب نے اصل کتاب کے ساتھ ایک دیباچہ لگایا ہے جس میں مسٹر موصوف کی زندگی کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ خورشید علیصاحب نے ہم کو لکھا ہے کہ جو قیمت اسکی فروخت سے وصول ہوگی وہ "گوکھلے میموریل فنڈ" میں دیدی جائے گی یہ ۷۲ صفحہ کی کتاب بقیمت ۴ر سید خورشید علیصاحب خورشید کاٹیج حیدرآباد (دکن) سے مل سکتی ہے۔

چالیس سال میں ایک ہی موقعہ

دسمبر ۱۹۱۵ء میں اخبار نیر اعظم مرادآباد کی عمر کا چالیسواں سال پورا ہوتا ہے اسکی خوشی میں خدا کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ پبلک کو کوئی خاص رعایت دینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں نیر اعظم بک ایجنسی کی تمام نایاب زمانہ کتب علاوہ خرچ روانگی کے ایک تہائی قیمت پر دی جائیں گی۔ صرف اُن درخواستوں پر یہ رعایت دی جائے گی جو ۳۱ر دسمبر تک ڈاک میں ڈالی گئی ہوں۔ تازہ فہرست کتب جس میں اصلی قیمت درج ہے فوراً مع نمونہ اخبار طلب فرمایئے۔ اسی کے ساتھ نیر اعظم بھی نصف قیمت میں دیا جائے گا۔ ایکروپیہ سے کم فرمایش نہو

المشتہر نیر اعظم بک ایجنسی مرادآباد۔ یو۔ پی

(۲)

شاعر اگر اپنی بدقسمتی سے اُکتائے تو بس اتنا کہہ سکتا ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے

شہرت جسقدر بھی جی چاہے حاصل کرے حالانکہ اسمیں بھی شرط حتی المقدور کی ضرور ہے۔لیکن خیر پھر بھی اسکو لوگ گوارا کر سکتے ہیں۔

لیکن چاہیے اس سے اسکو کچھ مالی منفعت ہو یہ غیر ممکن۔ایک صنعت و حرفت والا دن بھر کام کرکے جب اُٹھے گا تو اُسکو کم از کم دو چار روپیے ضرور مل جائیں گے۔

مگر جب ایک شاعر دن بھر فکر کرکے اُٹھے گا تو اُسکے ہاتھ میں سوائے چند پرچوں کے کچھ نہو گا۔یا گھر کی اور بال بچوں کی فکر دامن گیر ہوگی۔ اس کے وجوہ اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا پہلا قوی سبب اپنے ہم زباں حکام کا نہونا ہے۔دوسرے شاعری کوئی ایسا آلہ نہیں جو سوائے دماغی ضرورتوں کو پورا کرنے کے جسمانی راحت و آرام کے سامان مہیا کر سکے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ شاعر وہی سمجھا جائے گا جس کا دماغ ہر چیز سے بے نیاز نہ ہوچکا ہو لیکن دوسروں کے خیالات کو فائدہ رسانی میں کامل ہو۔ ماورا اسکے سوائے چند دور کے ہر دور میں شاعری کی قدر زیادہ نہیں ہوی ہے۔ہاں موجودہ زمانہ میں یہ بات اپنی حد کو پہنچ چکی ہے۔اور آیندہ

اُردو شاعری کا وجود بھی باقی نہ رہے تو کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ اردو شاعری کیلیے سب مشکلات موجود ہیں الحاصل جب شاعر اپنی شاعری سے روپیہ پیدا نہیں کرسکتا تو وہ بیچارہ اچھا لباس کہاں سے بنائے۔ موٹر کیونکر اڑائے۔ ہوائی جہاز تک کس طرح سے جائے۔ کیونکہ اسکے پاس پر پرواز تو ہیں ہی نہیں بقول سعدی۔ (جامہ ندارم دامن از کجا آرم)

اب بہ لحاظ صورت شاعر میں حسن اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ فکر تو ہر وقت اُسکے دل ودماغ کا خون چوستی رہتی ہے اور جسم میں خون پیدا کرنے والی چیزیں اس سے بھاگتی اور نفرت کرتی ہیں۔ وہ روز بروز دُبلا اور لاغر ہو جاتا ہے اور آخر میں تھک کر یہ کہنے لگتا ہے۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

شاعر کے حُسن ظاہری اور حُسن باطنی دونو ہی کا ست کھچکر اُسکی شاعری میں آجاتا ہے۔ اور وہ یا کچھ اسکا دماغ دنیا میں برات نام زندہ رہتا ہے اور چند روز کے بعد وہ بھی خاک میں مل جاتا ہے۔ مگر اُسکی شاعری میں اُسکے حُسن کی جھلک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

طبقۂ حکماء کا حُسن ظاہری در صورتوں میں نظر آتا ہے موجودہ زمانہ نے حکماء یونان اور حکماء انگلستان کے لباس اور وضع ظاہری میں بھی بیّن فرق پیدا کردیا ہے پُرانے زمانہ کے حکیموں کے لباس میں پنج گوشیہ ٹوپی۔ انگرکھا۔ ڈھیلے پائچوں کا پائجامہ گھیتلا جوتا فنس کی سواری رائج تھی جو اُن کے پیشہ کے مناسب اُنکا حُسن ظاہری کہا جاسکتا ہے مگر اب اس وضع کے حکماء بھی بہت کم نظر آتے ہیں موجودہ زمانہ کے

حکیموں اور طبیبوں کے لباس میں بہت کچھ تبدیلی آگئی ہے۔

فی زمانہ ایرانی یا ترکی ٹوپی۔ شیروانی یا چکن قمیص۔ کالر علیگڈہ کاٹ کا پائیجامہ۔ موزہ اور بوٹ۔ ہاتھ میں چھڑی۔ سواریوں میں فٹن پالکی گاڑی تانگہ رائج ہے اور یہی وضع اُن کا حُسن ظاہری کہے جانے کی مستحق ہے۔

اسیطرح حُسن سیرت میں بھی تھوڑا سا فرق رفتار زمانہ نے پیدا کردیا ہے۔ پہلے حکیموں کے لیے زہد و ورع۔ عبادت۔ شب بیداری۔ رحم دلی۔ استغنا کفایت شعاری پرہیزگاری مس ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا مگر موجودہ زمانہ نے ان باتوں میں بھی بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کو دخل دیا ہے جس سے حُسن سیرت میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے۔

فلاسفر اور سائنیس داں طبقہ کے لوگ اونچی ٹوپی کو زیادہ پسند کرتے ہیں ڈاکٹروں کے حُسن ظاہری میں بھی اونچی ہی ٹوپی مزیب سمجھی گئی ہے۔ مگر یوروپین طبقہ کا لباس قریب قریب ایک ہی اُن میں ڈاکٹر ہوں یا بیرسٹر حکام ہوں یا فلاسفر سب ایک ہی طرح کے لباس میں نظر آتے ہیں شکل و شمائل اور رنگ وغیرہ میں بھی کوئی زیادہ فرق پایا نہیں جاتا۔ سواریوں میں موٹر۔ موٹر سائیکل دو پہیہ رائج ہے اور یہی حالت مجموعی اُن کا ظاہری حُسن سمجھا جاتا ہے۔

حسن سیرت میں خوش اخلاقی۔ مستقل مزاجی۔ وعدہ وفائی۔ پابندی اوقات۔ نیک چلنی۔ کفایت شعاری۔ انصاف پسندی سب سے اچھے اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔

اب رہا وہ حُسن جس سے محض خوبصورتی مراد لی جاتی ہے اور طبقۂ نسوان کے لیے خاص کر استعمال کیا جاتا ہے اور اُسکے اثرات سے لوگ

متاثر بھی ہوتے ہیں اُس میں بہت کچھ جذب وکشش اور دلی تعلقات کو دخل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بجائے خود حُسن ایک ایسی مستقل اور با اثر شے ہے جس کے کیفیات اور جس کے جذبات کی کوئی حد میں ہونا مشکل اور بہت مشکل ہے لیکن حُسن سیرت کا مرتبہ اُس سے بالا ہے اور بغیر حُسن سیرت کے حُسن صورت محض ایک تکلیف رساں اور ضرر رساں شے سمجھی جاتی ہے جس سے انسان تھوڑی دیر متاثر ہونے بعد اپنے دلی خیالات کا بھی مخالف ہو جاتا ہے اور اپنے ہی دل کی طرفداری اُسے سخت ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہانتک کہ خود اپنے دل کا دشمن ہو جاتا ہے اور دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور اگر حُسن صورت کے ساتھ حسن باطنی بھی موجود ہے تو ایسا حُسن والا دوسرے کو ہمیشہ کے لیے اپنا سچا چاہنے والا اور سچا عاشق بنا سکتا ہے۔ درحقیقت (بیوٹی) چند قدرتی مناسبات اور تناسب اعضا کا نام ہے جو تمام افراد میں سے کسی کسی کو ودلیعت ہوتا ہے یہ حسن ہر ایک کا حصہ نہیں ہاں کم و بیش تقسیم اسکی تمام موجودات میں ہوی ہے۔ اور یہی حال حُسن سیرت کا بھی ہے خواہ حسن صورت کیسا ہی ہو۔

مَیں نے حُسن کے مناظر ترک اور ایران میں بہت دیکھے لیکن سیرت کی جانچ پرتال کا موقع بہت کم ملا اور جہانتک ملا اُسکی نسبت مَیں کہہ سکتا ہوں کہ حُسن سیرت بھی بہ نسبت ہندوستان کے بہت زیادہ ہے۔

کئی ماہ چلنے کے بعد میرا ایک ایسے مقام میں گذر ہوا جہاں کے لوگ پردے کو جانتے ہی نہ تھے کہ پردہ کیا چیز ہے۔ اور حُسن بھی بدرجۂ اتم تھا وہاں کا لباس بھی قابل الذکر ہے۔ تمام عورتیں سر پر سیاہ سیلے باندھے ہوئے تھیں جن کے شملے ساق پا تک لٹکے ہوئے تھے۔ بر میں بہت لانبے نیلے رنگ کے

کُرتوں پر ایرانی مخملی کوٹ ڈٹے ہوئے تھے۔ اور وہ سب شل مردوں کے طرز معاشرت میں یکساں شامل تھیں۔ یہ دیکھکر مجھے بہت تعجب ہوا کہ ان پر بے پردگی کا کوئی بھی بُرا اثر نہیں ہے حالانکہ شرع کے بالکل خلاف آزادی کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔

الحاصل حسن کی یہ دو قسمیں یعنی حُسن ظاہری اور حُسن باطنی جنکو حسن صورت اور حُسن سیرت کہہ سکتے ہیں کم و بیش ہر شے میں موجود ہیں مگر کسی میں حسن صورت بہت زیادہ ہے اور حسن سیرت بہت ہی کم۔ ایسا حُسن نہایت ضرر رساں اور خوفناک ہوتا ہے۔ کسی میں حسن سیرت زیادہ ہوتا ہے اور حُسن صورت بالکل ہی نہیں۔ ایسا آدمی اُس سے کہیں زیادہ اچھا ہے جس میں حُسن ظاہری تو ہے مگر حُسن باطنی کا حصہ بہت کم ملا ہے۔

اور جس میں یہ دونوں صفتیں نہیں ان کا شمار جمادات میں ہے ایسا شخص آدمی یا انسان کہے جانے کا مستحق بالکل ہی نہیں۔

اور جس میں یہ دونوں صفتیں پائی جائیں وہ تمام افراد میں فرد کامل کہا جائے گا۔ مگر ایسے افراد ہر زمانہ میں بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ (غالب) کے اس مطلع سے ظاہر و ہویدا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

احسن مرزا قمر مشہدی
لکھنوی

پردہ اور
تعلیم نسواں

مجھے بحیثیت عورت ہونے کے ضرورت محسوس ہوتی ہے بلکہ ہمدردی ہمجنس تقاضا کرتی ہے کہ ضرور میں بھی پردہ کے اہم مسئلہ پر قلم اُٹھاؤں اور اپنی جنس کو پردہ کے نقصان و مفاد سے آگاہ کردوں۔ جبکہ پردہ اُٹھا دینے کے مضامین کی بوچھاڑ نے قوم کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہماری قوم کے بعض مرد۔ مرد تو ایک طرف ہمارے ہاں کی بعض عورتیں کیوں اسقدر بے چینی سے مخالفت پردہ پر کمر بستہ ہو کر اس بیچارہ کے پیچھے پڑ گئی ہیں اور کیوں اسکو غیر ضروری سمجھ کر عضو بیکار خیال کیا جارہا ہے اور پردہ اُٹھا دینے پر آمادہ نظر آرہی ہیں۔ پھر طرّہ یہ ہے کہ کچھ دور ہی نہیں جاتے قرآن مجید سے پردہ نہ ہونے کا جواز ثابت کرتے ہیں میری عقل اس جولانگاہ میں سرگرداں ہے کہ وہ کونسی آیات سے پردہ نہ ہونے کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ قرآن یا شریعت کے سر تو یہ الزام روا نہ رکھیں بلکہ یوں کہیں کہ ہماری خواہشات پردہ نہ ہونے کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ چونکہ قرآن تو پکار پکار کر پردہ کرنے کا حکم دے رہا ہے دیکھو آیۂ کریمہ حجاب تفسیر بیضاوی جزو؟ ہیجدہم سورۂ نور قل للمومنین یغضوا ابصارھم ویحفظوا فروجھم" ترجمہ اے محمد صلعم کہدے مومنیں مردوں کو کہ بند کریں آنکھیں اپنی نامحرم عورتوں سے (یعنی نامحرم عورات کو دیدہ دانستہ چھپ کر یا کسی دیگر طریقہ سے دیکھنا ممنوع ہے) اور حفاظت کریں شرمگاہوں

انیوں کی بدکاری سے۔(۲) و قل للمومنات یغضضن ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن تا آخر آیات۔ ترجمہ اے محمد صلعم کہدے عورات مومنات کو کہ نہ نظر کریں طرف نامحرم مردوں کے اور محفوظ رکھیں شرمگاہوں اپنی کو بدکاری سے اور نہ ظاہر کریں زینت اپنی کو مگر آنچہ ظاہر ہو اُن دونوں سے یعنی مُنہ اور ہاتھ اور چاہیے کہ سر سے پاؤں تک اپنے اوپر چادریں ڈالیں اور نہ آشکارا کریں زینت اپنی کو نامحرموں پر لیکن واسطے شوہروں اپنے کے وغیرہم۔

اب آیات متذکرۂ بالا میں بہت اختلاف پڑ گیا چونکہ کہیں تو اللہ تعالےٰ ایک دوسرے سے آنکھیں بند کرنے کا حکم فرماتا ہے اور کسی جگہ دست و رخساروں کو دیگر بدن سے مستثنےٰ کرکے کھولنے کا حکم دیتا ہے اور سارا دار مدار مونہ ہاتھوں پر منحصر ہے دیگر ایک ہی آیات میں دُو دفعہ زینت کو بیان فرمایا گیا ہے جو خلاف فصاحت و بلاغت ہے حالانکہ کلام الٰہی فصیح و بلیغ تسلیم شدہ ہے کیا کوئی صاحب عقل تسلیم کرسکتا ہے کہ ایک جگہ تو آنکھیں بند کرنے کو فرمائے اور پھر دوسری جگہ مُنہ کھولنے کا حکم فرمائے حاشا و کلّا۔ جاننا چاہیے کہ و قل للمؤمنات الا ما ظھر منھا آیات ایک ہے مگر دو جملے ہیں و لا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا میں واو حالیہ یا بیانیہ ہے اور الا حرف استثنا کا ہے جو باقی بدن سے مُنہ ہاتھوں کو مستثنےٰ کررہا ہے۔ اے پردہ اُڑانے کے شائق بھائیو! و بہنو! یہ آیات جنمیں دیگر بدن سے مُنہ ہاتھ مستثنےٰ کیے گئے ہیں نماز کے واسطے نازل ہوی ہے چونکہ نماز میں تمام بدن اور زینت چھپانے کا حکم ہے مگر منہ ہاتھ اگر

چھپے ہوئے ہوں تو نماز صحیح نہیں ہے دیگر گھر کی چار دیواری میں محارم کے سامنے بھی ننگے سر اور دیگر جسد کا ننگا رکھنا جائز نہیں ہے اس لیے اِلّا مُنہ ہاتھوں کو مستثنیٰ کر رہا ہے تاکہ نامحرموں کے سامنے مُنہ کھولنے کے واسطے نیز دوسری آیات کے سیاق سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آیت متذکرہ نماز کے واسطے نازل ہوئی ہے اگر یہ آیت نماز کے واسطے نہ ہوتی تو دوسری جگہ اللہ تعالےٰ ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن تا آخر نہ فرماتا کیونکہ پہلے بھی تو ذکر زینت کے چھپانے کا ہوا ہے اور مُنہ اور ہاتھوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور پھر دوسری جگہ بھی زینت کے چھپانے کا حکم فرمایا گیا ہے اور پھر یہاں بھی اِلّا حرف استثنا کا ہے جو محارم کو نامحرموں سے مستثنیٰ کر رہا ہے اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ نہ ظاہر کرو تم زینت اپنی کو نامحرموں پر مگر واسطے محرموں اپنے کے پھر دوسری جگہ فرماتا ہے ملاحظہ ہو تفسیر مذکور جز بست و دوم سورۂ احزاب یاایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین۔ ترجمہ۔ اے پیغمبرؐ کہدے تو اپنی ازواج مطہرات و دختران کو اور عورات مومنین کو کہ چادریں ڈالیں اپنے اوپر یہ نزدیک زیادہ ہے تاکہ شناخت کی جائیں غیر مسلم عورتوں و فاحشہ عورتوں سے تاکہ بدمعاش ان کو فاحشہ و آوارہ گرد سمجھکر ایذا پہنچانے کی جرأت نہ کرسکیں عرب کے موجودہ پردہ کی تقلید کرنا مناسب نہیں ہے چونکہ موجودہ عرب کا پردہ نہ شریعت کے شرائط کو پورا کرتا ہے اور نہ مخالفین پردہ کی خواہش پوری کرتا ہے کیونکہ شرع نہ مستورات کو قیدی پردہ کا حکم دیتی ہے اور نہ آوارہ گردی کی اجازت دیتی ہے۔ عرب کا مروجہ پردہ اسلیے مخالفین

پردہ کی خواہش کو پورا نہیں کرتا کہ عورات عرب اعلیٰ نسب سے لے کر ادنیٰ
تک نقاب منھ پر ڈالے رہتی ہیں اور شرع کے شرائط کو اسواسطے پورا نہیں
کرتا کہ عرب کی مستورات بعض اوقات بلا ضرورت کے بازاروں میں
پھرتی نظر آتی ہیں کیا ہمارے مسلم بھائیوں کی غیرت یہی
تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی مستورات کو ایسی حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں
کہ وہ نامحرموں کے ساتھ اہل مصر - قاہرہ - بیروت وغیرہ کی عورات کے
مانند قہوہ خانوں ہوٹلوں اسٹیشنوں سڑکوں پر دست بدست ہو کر ماری ماری
پھریں - ہماری دلی دعا ہے خدا وہ وقت نہ لاوے کہ ہماری شرمگیں نگاہیں
نامحرموں سے چار ہوں بعض بھائی عفت کو عورت کی سرشت میں بتاتے
ہیں اور بعض پردہ کے احاطے میں محدود کر دیتے ہیں میں یہ کہوں گی کہ
عورت کی عفت پردہ میں محفوظ ہے لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ مرد عورت کے
واسطے بے عفت ہونے کا کہیں جواز ثابت نہیں ہے ہمارا موجودہ مروجہ
پردہ ہمارے ہندوستان کے واسطے نہایت موزوں ہے ہرگز
اسمیں تخفیف نہ کی جائے یعنی ابھی شرعی پردہ کا زمانہ بہت دور ہے
اور جب تک کہ ہر دو فریق مہذب نہ ہوں اسوقت تک موجودہ پردہ کو
بدستور قائم رکھا جاوے میں یہ پوچھتی ہوں کہ ہمارے بہی خواہ ہم کو
بے پردہ کر کے ہم سے کون سا کام لینا چاہتے ہیں کیا وہ ہم سے ریلوے
کمسریٹ وغیرہ کی ملازمت کرانا چاہتے ہیں کیا انتظام خانہ داری ہمارے
واسطے کچھ کم ہے؟ یا ہمیں بے پردہ کر کے جلسوں پارٹیوں میں داخل کرنا
چاہتے ہیں کیا قومی جوش یہی رہگیا ہے کہ وہ پارٹیوں میں اپنی قومی بہنوں
کو نامحرموں کے پہلو بہ پہلو بیٹھکر غیروں سے بیرا جلاس گفتگو کرتے دیکھیں حیف ہے

ایسی قومیت پر۔ ہاں جن بہی خواہ حمایت کنندگان تعلیم نسواں کا یہ خیال ہے کہ پردہ میں بیٹھ کر کما حقہ تعلیم حاصل نہیں ہوسکتی، جس تعلیم کی ہمیں ضرورت ہے اور جسکا حکم شرع دیتی ہے وہ ہمیں پردہ میں رہ کر بخوبی حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن میں یہ پوچھتی ہوں کہ ہمارے خیرخواہ ہمیں کونسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس کے واسطے ہمارا پردہ ہارج ثابت ہو رہا ہے کیا وہ ہمیں بی۔اے کی ڈگریاں پاس کراکے چیف کورٹ کا وکیل بنانا چاہتے ہیں یا ججی کی کرسی پر ممتاز فرمانا چاہتے ہیں" العلم فریضة علیٰ کل مسلم ومسلمة ولو با العین۔ اسکا مفہوم یا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کو اسکولوں۔ کالجوں میں داخل کراکے انگریزی سائنس وغیرہ کی تعلیم دیجائے بلکہ اس حدیث سے وہ تعلیم مراد ہے جسکے واسطے ہمارا پیغمبر مبعوث کیا گیا ہے یعنی اسلامی تعلیم۔ اے میرے محترم بھائیوں اگر تم تعلیم نسواں سے مفاد اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے اُن کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کروتاکہ اُنکا رجحان طبع اپنے پاک اسلام کی طرف مائل وراغب رہے اور وہ حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ کہلا سکیں۔ نیز یہ بھی لازم ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم پورے طور پر کما حقہ دی جائے ناقص تعلیم بھی بُرے نتائج پیدا کرتی ہے میں انگریزی تعلیم کی بھی مخالف نہیں ہوں مگر اُسوقت تک جب تک کہ اُنکے دماغ میں اسلامی تعلیم نشو ونما نہ پائے پھر اگر بقدر ضرورت انگریزی تعلیم دی جائے تو چنداں مضر نہیں۔ لیکن پردہ بیچارہ کا قصور معاف کریں یہ کسی کو بخیال مخالفین پردہ اگر فائدہ نہیں پہنچاتا تو نقصان بھی نہیں دیتا۔ اگر میری بعض قومی بہنیں اور بھائی پردہ اُٹھا ہی دینے کے درپے ہیں اور اسی خبط میں وہ بیچین و سرگرداں ہیں تو بسم اللہ چشم ما روشن دل ما شاد"

والدۂ ممتاز حسین

کیوپڈ و سائک

حضرت نیاز فتحپوری نے نقاد کے آخری پرچہ میں جو خدا کرے آخری نہ ہو اور ملک پر ناقدردانی کا بدنما دھبہ نہ لگائے یہ مضمون شائع کرایا ہے یہ مضمون بہت دلچسپ اور ادبی حیثیت سے بہت کچھ قابل داد ہے۔ گو اسمیں بعض جگہ ایسے جذبات کا اظہار بھی کیا گیا ہے جو ہندوستان کی اخلاق و تہذیب کی میزان میں پورے نہیں اترتے تاہم ہمارے بعض قابل قدر نامہ نگاروں اور خریداروں کا اصرار ہے کہ اسکو "تمدن" کے فائل میں جگہ دیجائے۔ چنانچہ ہم نومبر اور دسمبر میں اس مضمون کو نقل کرتے ہیں اور ان حضرات سے تاخیر کی معافی چاہتے ہیں جنکے مضامین دفتر میں وصول ہو چکے ہیں۔ (اڈیٹر)

میں نے ایک دفعہ "تصاویر متحرکہ" میں یہ افسانہ دیکھا تھا مجھے نہیں معلوم کہ انگریزی یا یونانی لٹریچر میں اسکو اس شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے یا نہیں۔ بہرحال میں نے اسے نہیں دیکھا اور خود اپنے جذبات کو جو کچھ بھی ان تصاویر کے دیکھنے سے پیدا ہوئے قلمبند کرلیا امید ہے کہ وہ حضرات جو ادب لطیف سے دلچسپی رکھتے ہیں اسمیں کہیں کہیں غیر معمولی لطیف تاثرات کا اظہار پائیں گے اور یہی میرا مدعائے سخن ہے۔ نیاز فتحپوری

یوں تو "یونانیوں کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود ایک حسن آباد" تھا لیکن "سائک" کے شباب نے جس رعنائی حسن کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً "عورت کی دنیا" میں ایک اعجاز تھا۔ حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر ایک مشاق ترین مصور کا قلم بھی صفحۂ کاغذ پر کوئی ایسی تصویر پیش نہیں کرسکتا تھا جسکو "سائک" کے حسن عالم افروز کے ساتھ کوئی نسبت دیجاسکتی۔ یہ صرف خدا کی شان ہے کہ ملکۂ "یونان" کی دو بیٹیاں علاوہ "سائک" کے

اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اُسکے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی اور (اکثر ایسا ہوتا) تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج "سائک" باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

اگلارس و کیوپڈس بھی کوئی معمولی حسین لڑکیاں نہ تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری تصویر حُسن و شباب "سائک" اور نہ ہوتی تو اسمیں کلام نہیں کہ اگلارس و کیوپڈس بھی وہ چیز تھیں کہ دنیا انھیں کے لیے ترستی انھیں کے لیے تڑپتی۔ پھر اگر وہ اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں، علے الخصوص اسوقت جبکہ اُن کے حُسن کا مہ چار دہ بھی بیداغ تھا، تو کوئی جاے عجب نہیں، لیکن اُن کی شادی ہونے والی تھی، دو حسین نوجوان لڑکے اُنکے لیے منتخب ہو چکے تھے اور اس لیے وہ اپنی تسلی اسی خیال سے کر لیتی تھیں کہ گو "سائک" زیادہ حسین و جمیل سہی لیکن کم از کم ابھی وہ اُن لذات سے تو آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں" ———— کیا واقعی "سائک" کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی؟ ———— اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی ایک فکر تھی جس میں وہ رات دن مستغرق رہتا۔

دنیا کے ہر گوشے سے پیغام آئے خدا جانے کتنے شاہزادوں اور سرداروں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں، لیکن "سائک" کے لیے کیونکر کوئی منتخب کیا جاے؟ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آتی تھی۔

"سائک" اب کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ بُرے بھلے کی اُسے تمیز نہ ہوتی۔ اور یوں آسانی کے ساتھ وہ کسی ایک کے سپرد کر دی جاتی وہ پوری جوان تھی اور اس لیے انتخاب شوہر کی حس جو عورت کی پُرشباب زندگی کی تنہا حس ہے، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی اوّل تو بہت سی تصویریں اُسکے سامنے پیش ہی نہ کیجاتی تھیں اور چند اسکی کنیزوں کے ذریعہ سے پہنچتی بھی تھیں، تو سواے اسکے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایکبار تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی

لانے والے کو نہایت غور سے سرتا پا دیکھ لیتی! ہاں اُسے اپنے حسن وجمال پر ناز تھا، اپنی جوانی اور بانکپن پر غرور تھا، بارہا ایسا ہوا کہ اُس نے اُن تصویروں کی پشت پر یہ لکھکر واپس کردیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اُسے کیا خبر تھی کہ اس فقرے سے اپنی آیندہ زندگی کے لیے ایک سچی پیشین گوئی کرتی تھی۔ وہ بہرحال اسے اچھی طرح محسوس کرتی تھی کہ اُسکے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور اس لیے جب اسے معلوم ہوگیا کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اُسکے حُسن کا چرچا ہو رہا ہے تو اُسکی زندگی میں ایک نمایاں فرق ہوگیا۔

وہ کسی شاعر کی تصنیف اُٹھا لیتی اور جذبات حُسن و عشق کے بیان میں یہانتک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اُسکے ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ یہی سمجھا کرتی کہ میں اب بھی اُسے دیکھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سمجھ رہی ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا کہ جب وہ کتاب دیکھتے دیکھتے اپنی اُسی حالت انہماک میں کسی پھول کو دیکھنے لگتی تو وہ شرما جاتی اور پھر اُٹھکر ٹہلنے لگتی غرضکہ اُس کی تنہائی کی کوئی گھڑی ایسی نہ تھی، خلوت کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جسے وہ اپنے ہی حُسن کی رنگینی سے معمور نہ پاتی ہو اور اسکا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جسکا اختتام حجاب و انفعال پر نہوتا ہو چونکہ قریب قریب نصف حصہ اُس کے اوقات کا اسی تخیل میں گذرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں جنمیں وہ خود کسی کا ڈھونڈھنا اپنے تئیں کسی سے ڈھونڈھا جانا پسند کرتی یہانتک کہ بعض دفعہ جب کوئی اور نہ ہوتا تو وہ مہندی کی بھول بھلیاں میں گھُس جاتی اور اس طرح وہ آپ اپنی تلاش کرتی) اسلیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائیک نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گذر گئے، یہانتک کہ سائیک کا شباب سکر، اور سکر سے سرشاری کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اسوقت تک کوئی فیصلہ انتخاب بر کے متعلق نہو سکا چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا جسکی زمین کی نسبت فرش گل کا

تخئیل ایک ادنیٰ تخئیل ہے سا ایک باغ کے ایک تاریک کنج میں بیٹھی ہوئی تھی، کیونکہ اب وہ اپنی زندگی سے جیسے وہ صرف ایک طویل دن سمجھتی تھی یہانتک بیزار ہوگئی تھی کہ اکثر تاریک خلوتوں میں وقت صرف کرنا پسند کرتی، مگر وہ دیکھکر کسقدر گھبراتی کہ ہر تاریکی اُسکے لیے روشنی ہے اور اُسکی ہر رات چاندنی،

وہ کنج کے اندر فرشِ سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کے آنیوالی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اُٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کیے ہوئے شعر گن گنا رہی تھی اور گُن گُنا کیا رہی تھی اپنا درد کہہ رہی تھی شکایتیں کر رہی تھی کہ:-

"اے چاندنی تو تو آسمان کی سا ایک ہے آسمان ہی میں رہ دنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک سا ایک سے بیزار ہے اگر تجھے بھی کسی کی تلاش ہے تو مایوس ہوجا، کیونکہ زمین جبمیں اب مرد کی جنس پیدا ہونا بند ہوگئی ہے سنسان ہے لیکن نہیں تو مجھے اپنا پتہ بتا، تو تو روز یہاں آکر ڈھونڈھ جاتی ہے، میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں"

"چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے، میں اُسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے ہی بھونرے کو گرفتار کرلوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اُٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں یعنی جب شمع نہ ہوگی تو پتنگے کیا کرینگے، کلیاں نہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے، لیکن اے چاندنی میں تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری اُنگلیوں کے سرے چراغ کی جوت ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ مگر آہ، میری وہ گردن جسپر سرخوں کی گردنیں فدا ہوتی جاتی ہیں آنکھ جسپر جنگلی گایوں کی آنکھیں جان دیتی ہیں ہونا چاہتی ہیں اور میرا وہ چہرہ جسپر اے چاندنی ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے مضمحل و افسردہ ہے کیونکہ دنیا میں

کوئی مصور ایسا نہیں جو میرے بعد میری یادگار حسن کو قائم رکھے کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے اور کوئی مغنی ایسا نہیں جس کے بربط کے تار میری تعریف میں پوری طرح کانپ سکیں۔ پھر اے آسمان کی اچھی سایک تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کے طوفان کو لکھ سکے اور جو نکہت کو گا سکے کہاں ملیگا؟

سایک جیسی حسین و جمیل تھی ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی اور اسلیے وہ اسی بات کی خواہشمند تھی کہ اسکی زندگی کا ہمدم بھی ویسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بےمثل نقاش ہو۔

وہ دیر تک اپنے بناے ہوے گیت گاتی رہی اور بربط اٹھا کر بجایا کی، یہانتک کہ وہ کچھ تھک سی گئی اور ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار دیر تک گونجا کیے اس نے بربط کو پھینکدیا اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، ایک انگڑائی لی اور وہیں لیٹ گئی۔

وہ سونا چاہتی تھی، یعنے اسکی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیمخواب رہتی تھیں اب بالکل غافل ہو جانا چاہتی تھیں ——— اور غافل ہوگئیں ——— اب ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں اک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اتر رہی تھیں سو رہی تھی مگر آہ، سکوتِ خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سایک کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے سو رہا تھا ——— آہ تیجر اس حالت کو گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

بایان کار چڑیوں کی شیریں موسیقی شروع ہوگئی، یعنی صبح جاگی: ہر شاخ پھول ہی پھول ہوگئی، ننھی کلیاں جاگ اٹھیں اور سایک نے بھی آنکھیں کھولدیں یعنی کنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اٹھا۔

وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی اور نہ اسے یہ گمان تھا کہ وہ اسقدر جلد یہاں

سو جائے گی اور اگر سو جائے گی تو اتنی دیر تک سوتی رہے گی، لیکن اسے کیا کیا جائے
کہ اُسکی نزاکت موسیقی کا بار نہ اُٹھا سکی کیونکہ اسکے ہر اُتار چڑھاؤ میں گویا اُسکا شباب
صرف ہو رہا تھا، گیت کے بول اُسکو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے، کیونکہ وہ
حقیقتاً اُسکے حسیات لطیف تھے جو اُسکی عمق روح سے نکل رہے تھے۔ چنانچہ وہ سو گئی
اور انھیں تمناؤں، شگافتیوں اور بیزاریوں کو لیے ہوئے سوئی جو اُسکے اجزائے روح تھے
ہمیں نہیں معلوم کہ اُسکی پیاری پیاری آنکھوں نے تب ہونے پر کیا دیکھا، مگر ہاں جب
اُٹھی تو اُسکے اعضاء دکھ رہے تھے اس کا سارا بدن خستہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ
اُلٹ کر اپنی کافوری پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے گورے گورے بازوؤں کو اپنے
ہاتھ سے ایک آدھ دفعہ مڑوڑ کر، اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی اُٹھنے کو تیار ہوئی
اور فوراً کنج سے نکلکر آہستہ آہستہ روشوں پر چلنے لگی۔

چھریرا بدن ہوا اور لوچیدار کمر تو رفتار میں لچک کا پیدا ہونا ضروری ہے لیکن
اگر رفتار کا لوچ صرف نزاکت کمر ہی کا تخیل نہیں بلکہ کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی
صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں بلکہ کوئی حد احُسن ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے
کہ سوائے سایک کی چال کے اور ہمکو کسکی چال کی تعریف کرنی چاہیے۔ نغمہ کا کوئی
نقش نہیں مگر ہوا اس سے معمور ہے۔ بھنبھیری اُڑ کر نکل گئی مگر اُسکا رقصِ خرام
اب بھی نگاہوں میں تھرتھرا رہا ہے۔ سایک کنجوں میں غائب ہوگئی لیکن اُسکی رفتار کا
ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔

وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور جس دروازہ کو کھولکر وہ بغیر کسی کے
علم کے رات کو باہر نکل آئی تھی اُسی میں پھر داخل ہوئی اور اپنی سیج پر گر پڑی اُسنے
سمجھا کہ بدن کا درد اعضاء کی دکھن عدم آسودگیِ خواب کی وجہ سے ہے اور اس لیے
اُس نے چاہا کہ میں پھر سو جاؤں، لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی کہ نسرین جو

سائیک کی محبوب مطربہ تھی اپنا زریں بربط لیے ہوئے آئی اور بائیں کی طرف فرش پر
بیٹھ گئی اُس نے بربط کی طربیں اپنی نازک اُنگلیوں سے درست کیں اور یہ دیکھکر کہ
شاہزادی سائیک کی رات شاید کرب میں گذری اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے اُس نے
یہ افسوں خواب نہایت نرم و شیریں لہجے میں گانا شروع کیا:-

"اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملادے کہ ابھی اُن میں کچھ نشہ باقی ہے۔ اے
نیند آ، اور آنکھوں کو پھر نیند کردے کہ ابھی اُن میں کچھ خمار ہے۔ والیِ یونان کی بیٹی فشردۂ
انگور سے بے نیاز ہے دن کو نہیں مگر ہاں جب رات ہو جائے تو دیکھ کہ اسکا شباب
ایک شراب ہے۔ میں نے تو چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر اُسے ٹہلتے دیکھا
اور اگر کسی رات کو وہ مجھ سے چھپکر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اُسکے
نشاناتِ قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اسکی لغزش رفتار کو نہ پہچان سکے
اے نیند آ جا کہ ابھی سورج کی کرنیں تو ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ سائیک کروٹیں لے رہی
ہے، اُسکا بدن شاید دُکھ رہا ہے۔ آ کہ ابھی رات کی شراب اچھی طرح آسودہ ــــــ

"نسرین، خاموش۔ اس افسوں خواب کو ختم کر میرا جی گھبراتا ہے" ــــــ
سائیک اُٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن، ایک ہلکی سی موج بلوریں ڈالے ہ
کچھ سوچ رہی تھی۔ آخرکار اُس نے نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا، اور یونہی بغ
کسی نظام و اصول کے تاروں پر اپنی اُنگلیاں آہستہ آہستہ چلانے لگی نسرین
خاموش مودب کھڑی ہوئی سائیک کی اس خلاف معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی
حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل اح
اور ضروریات صباحی کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ سائیک
اُن میں سے دو کنیزوں کو غور سے دیکھا اور وہ سر و گردن جھکا کر اُلٹے پاؤں وا
چلی گئیں۔ اُسکے بعد حکم نگاہ سے دو اور چلی گئیں اور باقی کنیزیں بھی رخصت کر دی گ

نسرین کو قریب بلا کر سائیک نے اُسکے شانہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ:-

"اے نسرین، آج تو ایسی بات اپنے منھ سے نہ نکال، جسپر کل تجھے افسوس کرنا پڑے تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر جب مجھے اُنسے تکلیف پیدا ہونے لگے - اب تو، تو کچھ ایسی باتیں کر ایسے گیت گا کہ میرے بھولے ہوئے دن پھر میرے سامنے آجائیں، مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری اُن راتوں کا ذکر نہ کر جنمیں مَیں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں بلکہ تو مجھے وہ لوریاں سُنا کہ مَیں پھر ایک بار بچہ ہو جاؤں اور اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لیے ناقابل برداشت ہے - اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگین ہیں تو کیا؟ اگر والیِ یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اُسے خود نہیں معلوم کہ اُسمیں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو ایک ایسی صدا ہے جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے حالانکہ آواز وہی جو وادیوں سے ٹکرائے اور جواب پائے، زندگی وہی جسکی لذت کا علم کسی دوسرے کی لذت سے وابستہ ہو - پھول اگر اپنی نگہت سے مست ہو سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر فریفتہ ہو سکتی ہے تو ہزار دفعہ وہی گا جو ابھی تُو نے گایا، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں اُتار دے، نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ اور میرے ساتھ کر اہ ... ... "

قبل اسکے کہ سائیک اپنی گفتگو ختم کرتی وہی دونوں کنیزیں جنکو سب سے پہلے کوئی حکم دیا گیا تھا آئیں اور سائیک نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر اُن کے ساتھ چلدی۔

ٹھیک دوپہر کو ریحانہ غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی - آج اسکی سترھویں سالگرہ تھی اور اُسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعرا، سلطنتوں کے شہزادے سفیر، مغنی، سبھی موجود تھے اور دربار میں سائیک کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا، شام کو سائیک کتان کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا چاند سا بدن چھپائے اور اُسی رنگ کا ایک ہلکا نقاب اپنے چہرے

ڈالے برآمد ہوی، اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

اسکے بعد رسم نذر شروع ہوی۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اُسکے ایک ہاتھ میں گلدستے اور بے
گلدستے ہار ہوتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں وہ چیز جو نذر کے لیے تھی پہلے اُسکے قدموں
پہ پھول ڈالے جاتے تھے اور پھر نذر پیش کیجاتی تھی چنانچہ تھوڑی دیر میں ساایک کے قدموں
پر پھولوں، معدنوں کی بہترین پیداوار اور صناعت انسانی کے نازک ترین ہدایا کا انبار
لگ گیا۔ شعرا نے اپنے قصاید شروع کیے مغنیوں نے ساز چھیڑے یہانتک کہ اختتام دربار کا
وقت قریب آگیا جسکے لیے ہر شخص بیتاب و بیقرار تھا اور جس لمحہ کے لیے یہ سارے تکلفات
تمہیدی برداشت کیے گئے تھے۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا تھا تو اُن ہدایا کی اظہار پسندیدگی میں
ساایک کو ایک لمحہ کے لیے اپنا چہرہ بے نقاب کرنا پڑتا تھا اور غالباً اسی برق پاش ادا کا
یہ اثر تھا کہ ساری دنیا میں ساایک کی غائبانہ پرستش ہونے لگی تھی۔ سنا ہے کہ جسوقت
ساایک پوری بارہ برس کی ہوگئی اور اول اول دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اسقدر
ہجوم نہ تھا لیکن اسکے بعد ہر سال لوگونکی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا یہانتک کہ جب پانزدہ
سالہ ساایک کی سالگرہ ہوی تو تمام اقطاع عالم میں اُسکے حُسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی
ہوا اس سال جبکہ اُسکی جوانی پورے سترہ سال کی تھی اتنی تعداد میں زائرین جمع ہوئے
کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا بھی ہجوم کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

الغرض وہ ساعت آئی اور نقیبوں نے اپنی آواز دل سے گویا لوگونکو آگاہ کر دیا کہ

رضا دہید نیاراج ہوش اے یاراں

کہ بزم یار رسید آمد نقاب یکشودہ

[illegible] لیکن یونتو سکوت انتظار کا وہ عالم تھا کہ لب باہم وصل ہو کر
رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخر کار سا ایک اُٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے پکڑ کے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لیے اور اپنے سحرِ حُسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لیے پتھر کا بنا کر چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا تو کچھ بیجا نہ تھا، کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہوتا گویا خدا ہوتا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ اُنھوں نے بھی وینس کی دیوتائی مان کر اُسکی پرستش شروع کر دی۔ بت تراشوں نے اُسکے مجسمے تیار کیے، مصوروں نے اُسکی تصویریں بنائیں، شعرا نے اسکے حُسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اُسکے ترانہائے جمال سے دنیا کے بسنے والوں کو خوب گرمایا۔ مگر یہ پرستارانِ حُسن (اللہ ان قدیم باشندگانِ یونان پر نزول رحمت کرے) اس سے بھی زیادہ وسیع خیالات رکھتے تھے اور اس لیے آخر کار اُنھیں مُنھ کے بل اُسکے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ:۔

"اے ملکۂ حُسن تیرے مجسمے باوصف اسکے کہ صنعت کا نازک ترین لوچ ان میں صرف ہوا ہے بھدے ہیں تیری تصویریں باوصف اسکے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں اُنکی تیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں نادرست ہیں ہمارے قصائد جنمیں حُسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات پیش نظر رکھکر تیری تعریف کی گئی ہے نامکمل ہیں اور ہمارے راگ جنکو ہم بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانۂ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانۂ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں کمزور و ناقص ہیں پھر اے تو وہ کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے" اے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے اک مرغ پر شکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کون ہے۔ تو جو بھی ہے ہمیں یہ دکھا کہ تو کہاں ہے اور کیسی ہے"

یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا عالم کی فتادگی کا حال
وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سر پر جو سما میں چمکتی تھی آج بھی شاید
اسی انداز سے درخشاں ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اُسے حسن کی دیوی سمجھ کر اُسکی پرستش
کرتے تھے اور ہم اُسے ایک کرۂ غیر آباد یقین کر کے اُسکی پرواہ بھی نہیں کرتے (علم و دانش
بھی کسقدر رہا دم لذات ہے!)

یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آباد رہا ہو اور وینس وہاں کی ملکہ ہو اور اگر
نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اسوقت اُس ملک کی حکمران ایک نہایت
ہی حسین و جمیل عورت تھی جو ہر چند طبقۂ انسان سے نہ تھی مگر طبقۂ انسان میں اسکا
ذکر ضرور تھا اور اُس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا جو سایک نے زمین پر۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں مگر ہمیں نہیں معلوم کہ
اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں۔) بہرحال ایک جزو زمانہ کا واقعہ
ہے۔ وینس اپنے کاشانۂ بلوریں میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشہ غسلی دیکھ رہی تھی اور نہایت
مسرور تھی۔ ایک بلوریں حوض جسکی زمیں اور کنارے صیقل کیے ہوئے آئینہ کے تھے
نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی تھیں اور
ایک دوسرے کو چھیڑ رہی تھیں۔ چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی
اسلیے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اُسکے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ
یہ بھی تھا۔ غرضکہ اسیوقت جبکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جد و جہد کا تماشہ
دیکھ رہی تھی ایک کنیز نے کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وینس اُٹھکر باہر چلی گئی۔

ادونس شہوت کی دیوی جو اس سے قبل کئی بار کرۂ ارض کا سفر کر چکی تھی
اور وینس کی بہت معتمد درباریوں میں تھی وینس سے ملنے آئی تھی۔ وینس پہنچی اور
نہایت تپاک سے اُسکی پذیرائی کر کے اسکی نئی سیاحت دنیا کے متعلق سوال کرنے لگی

لیکن اردوٹس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے ونیس میرے حالات سفر کے
تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر، کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں
تیرے لیے باعث اضمحلال و افسردگی ہو"

ونیس نے متغیر ہو کر کہا کہ "اے اردوٹس آخر وہ کونسی بات ایکبار تو دیکھکر
آئی ہے جو ونیس کو تکلیف پہنچانے والی ہوگی مجھے یقین ہے کہ تو نے کرۂ ارض کے اُن
ذلیل باشندوں میں جنکو اگر ہوا نہ سنبھالے تو مُنھ کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی
بات ایسی نہ پائی ہوگی جسکو سُنکر ونیس جلے۔ کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات
مجھ سے نہیں کہے اور میں یہ سُنکر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہوگئی کہ انسان اپنے جسم کو
ناخنوں سے جانوروں کی طرح کھجاتا ہے اور جب کھجاتا ہے تو اس کے جسم
پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں اے اردوٹس کہہ اور نہایت آزادی سے
کہہ جو کچھ تو نے دیکھا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے"

اردوٹس جو نہایت ہی متین و سنجیدہ دیوی تھی یہ سنکر کچھ چین بجبیں ہوئی
اور بولی کہ "اے ونیس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور وہاں کے رہنے والے جنکی
تعمیر کا جزو اعظم خاک ہے، ذلیل ہیں لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ اسی کرۂ ارض میں ایک
ملک یونان بھی ہے جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب تو نہیں
مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سُن، میں بتاتی ہوں اور مذاق کرتی
ہوں کہ والی یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائیک ہے ایسی حسین ہے کہ اگر
اُسکی خاک پامل جائے تو ونیس کو چاہیے کہ اُسکا غازہ بنائے اور فخر کرے کل
اُسکی سالگرہ کا دن تھا اور میں بھی اُس تقریب میں شریک تھی لیکن اے ونیس
یقین کر میں جو اسوقت اتنی دیر سے ونیس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں اور جس نے
اس سے قبل ہزاروں دفعہ دیکھا ہے اُس اک لمحہ کی تاب نہیں لاسکی جب سائیک نے

اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا۔ اسے دنیس میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ میں انسان ہوئی جو اُسکی محبت کی آرزو تو اپنے دلمیں پیدا کر سکتی ۔"

دنیس جسکے نزدیک اس سے قبل اسکا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس سا حسین ہو سکتا ہے یہ سُنکر کہ سایک اس سے زیادہ حسین ہے چونک پڑی اور اُسکے غرور حسن کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ اُسکا چہرہ تمتما اُٹھا اور بولی کہ :-

اے اروٹس ٹھہر جا، میں ابھی طلسمی آئینہ میں سایک کی صورت دیکھتی ہوں اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے تو یہ یقین کرلے کہ دنیس جس طرح حُسن خدمات پر انعامات کی بارش کر سکتی ہے اُسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے۔

اُس نے اروٹس کو رخصت کیا اور کنیزوں سے وہ طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوری میز پر رکھوایا اور سب کو علنحدہ کرکے تنہا اُسکے روبرو آنکھیں بند کرکے خاموش بیٹھ گئی (یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا) کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی لیکن اُسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا جو دنیس کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھی اُسکی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں، آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر رہ گئی۔

پورے دو گھنٹہ ہو چکے تھے اور دنیس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً ایک تدبیر اُسکے ذہن میں آئی اور بیتابی میں نسبتاً کچھ کمی پیدا ہوگئی ——— "

بیشک میں سایک کے حُسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی۔ اس لیے مجھے وہ چیز تلاش کرنا چاہیے جو اسکے حُسن کو جلد زائل کردے اور اُسکی رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اسکو جلد سے جلد درس عشق دینا چاہیے اور عشق بھی نہایت شدید۔ سخت ناکام و مایوس" یہ کہتی ہوئی وہ اُٹھی اور اپنے پائیں باغ کی طرف نہایت تیزی سے جلدی۔ کیوپڈ (دنیس کا بیٹا)

شانہ پر کمان اور ترکش میں بہت سے تیر لیے ہوئے اور اپنے بازوؤں کو سمیٹے روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر بہت سی ڈھیریاں بنا رہا تھا کہ ان پر مشق تیر اندازی کرے (ہر چند اسوقت بھی ہمیں کیوپڈ کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی کی صورت میں دکھائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اُسکا عنفوان شباب تھا اور اسلیے اسکی ناوک اندازی کی کچھ انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اُسکے پاس پہنچی اور بیٹے کا مُنہ چومکر کہنے لگی :-

"اے کیوپڈ" میں نے سُنا ہے کہ جب تو تیر و کمان لیکر باہر نکلتا ہے تو ملک کی نوجوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اے کیوپڈ جی چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چلنی کر دے لیکن خدا کے لیے پاؤں میں زنجیر محبت نہ ڈال، کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیر محبت سے زیادہ آسان ہیں، پھر کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ تو اُن تیروں سے کیونکر وہ زنجیر محبت تیار کر سکتا ہے۔ کرہ زمیں میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سایک تیری تابع نہیں، جا اور اُسکو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز اور غرور شکن ہے"

کیوپڈ یہ سُنکر بھڑک گیا، نئے شکار کا حال معلوم کرکے اُسکی چٹکیاں بیچین ہو گئیں کمان شانہ سے اُتر کر ہاتھ میں آ گئی اور تیر ترکش سے نکل کے کمان میں۔ اسکے پر ونکی شکنیں کھلیں اور دفعۃً نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سایک کی رسم سالگرہ جس نے اُسکے شباب میں ایک سال کا اضافہ اور کیا ختم ہو گئی اور سارا عالم پھر ایک سال کے لیے اس لمحہ عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، جسکو وسیع دیکھنے کی تمنائیں اسدرجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مان بھی لیا جاتا تو سایک کے بے نقاب چہرے اور نگاہ بے محابا کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور وہ ڈھیر

تمام عمر کے لیے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی، لیکن اُسکا حُسن تو رفتہ رفتہ حیات کو
دنیا سے اُٹھانا چاہتا تھا اور لوگوں کی روح کو بند ریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا
دنیا سے اب یہ خیال اُٹھتا جاتا تھا کہ سایک واقعی نوعِ انسان میں سے ہے اور یہ خواہش
کہ کم از کم ایک ہی رات ایک ہی ساعت ایک ہی لمحہ اسکے حسن و شباب میں فنا ہونے
کے لیے میسر ہو جائے، آہ، یہ خواہش تو اک ایسا خطرۂ قلب تھا جو اب کفر میں داخل تھا
کیونکہ اسکے حُسن نے اب لوگوں کے دلوں میں ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار
کر لی تھی اور اُسکے ساتھ محبت کرنے کا مفہوم سوائے اسکے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اُسکی
پرستش کرنے لگے عالم اُسے پوجنے لگے سایک کا نام لیا جائے، تو لوگ مسجدوں میں گر پڑیں
اور جب اُسکا واسطہ دلایا جائے تو قزاق رحم کرنے لگے قاتل کی تلوار جہانتک اُٹھ چکی ہے
وہیں رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیماں قابل اعتبار سمجھا جائے جو سایک کی
قسم پر قائم ہو۔ غرضکہ رئیس یونان کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اب سایک کی شادی
ہونی بہت دشوار ہے، کیونکہ اگر کوئی شوہر منتخب بھی کیا جاتا تو اُسکو یہ خبر کیونکر پہنچائی جاتی
کہ وہ سایک کا شوہر ہونے والا ہے اور اگر پہنچائی بھی جاتی تو یہ یقین کس طرح ہوتا کہ وہ یہ
سُننے کے بعد پھر زندہ بھی رہ سکے گا اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً سایک
کی خلوتوں میں موزوں ہمدم سمجھا جاتا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ امر بالکل یقینی تھا کہ سایک کے
حُسن کی برداشت اسکے امکان سے باہر ہے۔ بہرحال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں
یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا، لیکن افسوس ہے کہ اسمیں بھی کوئی
کامیابی نہیں ہوی سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سایک اپنے باغ میں حوض پر
بیٹھی ہوی تھی اور رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ پانی کے اندر دیکھ رہی تھی وہ شاید
چند لمحوں کے لیے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی سایک ہے جسکی رسم سالگرہ ابھی
دو دن ہوئے ختم ہوی ہے اور وہ یہ برس بھی اپنے شباب کو اُسی بے مزہ خلوت و

مجبوری میں بسر کرنے پر مجبور ہے ۔ ورنہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اسکی افسردگی کا یہ عالم تھا کہ دنیا کی تمام لذتیں اُسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور اک ذرا حسین ہونا ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں اُس نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ غذا تو بقاے حیات کے لیے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کراتے کراتے جی اُلجھا تو اُٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منھ پھیر لیا کہ تا ایک ہمال کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یونہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اُس نے نہیں پہنے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید گجرے کوئی اپنے لیے نہیں پہنتا، اس لیے گردن میں نہیں ہوتے کہ انکی نکہت کو صرف ہوا اُڑاے لیے پھرے پھر اُن سے یہ مقصد نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینہ کے اوپر پڑے پڑے سوکھ جائیں، بلکہ شاید اُن سے مدعا یہ ہے کہ کوئی دوسرا انکی خوشبو سے بیقرار ہونے والا ہو اور انکی جنبش اک دھڑکتے ہوے دل کی جانب اس بیقراری کا جواب دینے والی ہو ورنہ یونتو افسردہ سینہ اک مزار ہے اور مزار پر چڑھاے ہوے پھول کیا! اُس نے گانے میں دلچسپی نہیں لی کیونکہ لحن میں وہ کچھ نقصان محسوس کرتی تھی، سازوں کی نسبت اُسے یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید تاروں میں کسی تار کی کمی ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اُسکی سمجھ میں یہ بات کسی طرح آتی ہی نہ تھی کہ اگر موسیقی ایک لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے اگر گانا سکون ہے تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو تڑپاے دیتا ہے ۔ غرضکہ اپنے سارے محبوب مشاغل اُسنے ترک کر دیے کیونکہ ان میں سے کوئی اُسکے حسیات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا وہ راحتوں اور عشرتوں سے اب بیزار تھی وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے، وہ نازک کمر وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی کمر، چاہتی تھی ۔ ....

وہ چاہتی تھی کہ نزاکت و دوشیزگی کا کوئی ....

اسکا وہ غرورِ حسن باقی نہیں رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں دُم پھیلائے ہوئے دیکھتی تھی تو بے .... اور ہنس کو گردن اُٹھائے اور سینہ نکالے ہوئے پانی میں دیکھتی تھی ۔ ....

...... حقیقت یہ ہے کہ اُسکی اول تمکنت نے معاملہ کی صورت کو ایسا اہم بنا دیا تھا کہ اب چارہ کار سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ وہ صرف ایک دیوی ہی کی زندگی بسر کرے مگر، آہ، کسے خبر تھی کہ وہ دیوی جس کو دنیا اسقدر معصوم جانتی ہے کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لیے ہوئے ہے۔

بہر حال، وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوی تھی اور نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی کنیزیں پھولوں کے پنکھے لیے ہوئے اُسے ہوا پہنچا رہی تھیں اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سرود لیے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی کہ سایک دفعتہً چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کرکے کہا کہ "یہ تو کیا گنگنائی پھر کہہ اور ذرا آواز سے کہہ سانسے اور گا کہ اسوقت مجھے کچھ لطف آیا"

نسرین جو سایک کی افسردگی سے بہت فکرمند تھی خوش ہوگئی اور اُسنے نہایت ہی غمیریں لہجہ میں گانا شروع کیا :-

وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانے میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، گئے، وہ راتیں جب میں سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کرا ہا کرتی تھی، گذر گئیں، اب تو جی چاہتا ہے کہ پھر وہی چاندنی ہو اور وہی بے نقاب چہرہ جنھیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انھیں دکھنا نصیب نہ ہوتا تھا وہ فضائیں افسردہ تھیں کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ محروم تھیں، راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغمے نے انھیں عرصہ سے روشن نہ کیا تھا لیکن اب ــ لے صبح اپنا دامن پھیلا

اور کرنوں کو جمع کرے گرہیں پھر بے نقاب ہوتی ہوں اے شام اپنے تئیں خوب بسالے کہ
پھر بہرے بال تیرے اور کھلے ہوئے ہیں اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج پھر میری نازک
انگلیوں میں تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے میری آنکھیں اگر جادو ہیں
تو وہ جادو ہی رہیں گی، انھیں مسحور ہونا نہیں آتا۔ میرا حسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اُسکی
پرستش ہی کی جائے گی وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو۔ دنیا اگر میرے لیے تڑپ رہی ہے
تو تڑپے میں کسی کے لیے کیوں تڑپوں۔ میری رعنائی اک مستقل استغنا ہے اور تمام دنیا
کی حیات اُسکے ایک جلوہ گریزپا کا ادنیٰ خراج ہے"

سایک یہ سُنکر جوش میں آگئی اور اک عجیب شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ سیاہ
ریشمی چادر جو اسکی گداز رانوں سے لپٹی ہوئی اور کمر کی نزاکت کو اور نمایاں کرتی سر تک
پہنچ گئی تھی ڈھلک گئی، شانے کھل گئے، بیاض گردن سینے کی عریانی سے مل گئی سیاہ ریشمی
بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر رہ گئے کھنچی ہوئی ابروئیں اور تن گئیں۔ مست آنکھیں اور متوالی ہوگئیں

ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم

کہ کیوپڈ تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سایک
پر خالی کر دے گا۔ لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لیے کیوپڈ نے نگاہ بھر کے سایک کو
دیکھا ہی تھا کہ چٹکی ڈھیلی پڑ گئی، تیر گر پڑا کمان ہاتھ سے چھوٹ پڑی، چلّہ اُتر گیا اور
کیوپڈ غش کھا کر زمین پر آ رہا۔

کاش اسوقت کوئی سایک کو بتا دیتا کہ جس محبت کی اُسکو جستجو تھی وہ اب خود اُسکی
متلاشی ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ خود اب اسکا تمنائی ہے، صیاد خود اُس کا
شکار ہے، عشق خود اسکا دیوانہ ہے۔ اور تیر خود اسکی نگاہ کا زخمی ہے۔ اے کیوپڈ تو نے
لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہونگے، خدا معلوم کتنے سینہ تو نے مجروح کیے ہونگے، لیکن وہ
تیر جو حُسن کے ترکش میں ہیں وہ ناوک انداز یاں جو صرف ایک حسین کی دوشیزگی کا

حصہ میں تیری ناوک فگنی سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔ جا، تیرا تیر اب صرف اک شمشیر ہے
بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ، جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، اب اُس کا
کوئی علاج نہیں۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا حوروں نے اپنے کاشانوں میں
معلوم کر لیا کہ:۔

"دنیس کا بیٹا سائیک کے باغ میں بیہوش پڑا ہے"

(۴)

دنیس کو یقین تھا اور ایک دنیس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال
سُن چکا ہے سوائے اسکے اور کیا سمجھ سکتا ہے کہ ایک سائیک کیا اگر ویسی ہزار ہوں تو وہ
اپنی چٹکی کی ادنیٰ جنبش سے اُن کے دلوں کو ہزار ٹکڑے کر سکتا ہے؛ مگر فطرت کے
پاس ایک تیر اور تھا، جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام نہ تھا مگر اُن سے زیادہ کارگر تھا۔
اور جس وقت سائیک اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اُسکی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا
گیا، کیوپڈ کو تو زخمی کرنے کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی اہتمام و انصرام درکار تھا کہ
کمان میں تیر رکھے، کمان کو ایک دفعہ کھینچے اور پھر چٹکی ڈھیلی کرے لیکن سائیک کی مست
آنکھوں کو یہ ہوش کہاں نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھی نہ اہتمام کو، نہ کسی ارادہ سے
واقف تھی اور نہ انصرام سے۔ ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش
شروع ہو گئی۔ وہ تو اسقدر سادہ اور بھولی تھی کہ اگر کوئی اس سے یہ کہتا تو سہم کر رہ جاتی
غرضکہ کیوپڈ وہاں سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ وہ اپنے سارے تخیلات کو بیقرار
جراحت پاتا تھا۔

وہ اسی عالم اضطرار و اضطراب میں تھا کہ دنیس آئی اور خلاف معمول اُسے اسقدر
مغموم و افسردہ پا کر متحیر ہو گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے
ناکام و نامراد واپس آ سکتا ہے، چہ جائیکہ اسکا مضمحل ہو کر لوٹنا وہ کچھ سمجھی اور سمجھ کر ٹھٹکی،

ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی اور ایک خاص تحکمانہ انداز سے بولی "اے کیوپڈ، مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اُسے خالی پاکر خوش ہوں۔ ہاں، ہاں میں سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرے گا کہ کیوں سایک کو زخمی کیا ہاں وہ ایسی ہی حسین ہے کہ افسوس ہو اور اے کیوپڈ یہی وجہ ہے جس نے اُسکی تباہی و بربادی کو لازم کردیا تھا۔

اے کیوپڈ بول، جلدی خبر دے کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں خراب وخستہ پھر رہی ہے" کیوپڈ سایک کی نسبت تباہی و بربادی کے الفاظ نہ سُن سکا اور بولا کہ "ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکی بھی دکھتی ہے کیا میرے لیے یہ کافی عذر نہیں؟ میں سایک کے مجروح ہونے پر تاسف نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وہ وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے تو تنہا نہیں ہے۔ کیونکہ جب کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی، تیر پھینکدیے تو اُس کے لیے اُس سے اچھا شغل اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ سایک کے درد و مصیبت میں شریک ہو کر اپنی عمر کاٹ دے اے ونیس مجھے ملامت نہ کر کیونکہ سایک فن تیراندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور اور تجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے زیادہ تیر کھانے میں لطف ہے اور وہ تیر میرے دل میں پیوست ہے۔ آہ! اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لیگا تو میں اُسے اس حال میں کہ وہ خون سے رنگین ہوتا اولمپس اور ٹیلس پہاڑوں کی چوٹی پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا، مگر نہیں وہ میرے پہلو میں ہے اور رہے گا اگر سایک اندمال جراحت کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تو میں اسپر بھی راضی ہوں کیونکہ کیوپڈ کو اس سے زیادہ کسی اور تمنا پیدا کرنے کا حق بھی نہیں ہے"

غالباً اسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ونیس پر اسکا کیا اثر ہوا وہ ایک انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی اور سب سے پہلا حکم جو اُس نے

واپس آکر دیا یہ تھا کہ فوراً سامان سفر درست کیا جائے۔

پریاں نہایت انہماک کے ساتھ تیاری میں مصروف ہوگئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لیے آمادہ. ہزاروں پردار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دم اور ایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے جمع ہوگئے اور وینس اپنے زریں رتھ پر سوار ہوکر جس میں ۱۱ گھوڑے جتے ہوئے تھے مع اپنی کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے ایک دفعہ بادل کی طرح جو سما میں چھا گئی اور تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہوکر غائب۔

(۵)

سارا یونان آج چراغاں ہورہا تھا اور یونان کا ہر گھر بزم رقص و سرود، اک سیلاب مسرت تھا کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی اک طوفانِ نشاط تھا کہ ہر دل اسمیں ڈوبا ہوا تھا ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہورہی تھی شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔

آگسٹس والیِ یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا فیاض و سیر چشم تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس سے زیادہ رعایا کا خیرخواہ شاہانِ یونان کی فہرست میں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کوئی بہانہ ڈھونڈھا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس لیے ایسے دل والے بادشاہ کو اس سے بہتر موقع اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا مل سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا۔

سارا دربار زرنگار تھا۔ اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔ یونان کے تمام سردار

جمع تھے اور پایہ تخت کی ہر حسین لڑکی، جو اگلاریس اور کیوپڑس سایک کی بہنیں تھیں، سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دُلہن بنی بیٹھی تھیں اور اُنکے خوش نصیب شوہر اُنکے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری والماسی گلاسوں میں جھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا، جشن و طرب کی یہی حالت تھی، مسرتوں کی یہی فراوانی تھی، آگسٹس اپنے شاہانہ لباس میں تخت پر جلوہ افروز تھا کہ دربار کا ایک دروازہ زور سے کُھلا، کوئی چیز اندر آکر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ ایک سخت پُر اضطراب کراہ کے ساتھ تخت کے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے، مسرتیں منغض ہو گئیں، مُنہ کُھل گئے، آنکھیں پھٹ گئیں، سکوں کی جگہ اضطراب نے لے لی، طمانیت پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بُری طرح کراہ رہا تھا، ہاتھ سینے پر تھا، آنکھیں شدت درد سے اُبل پڑی تھیں اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے۔ ملکہ چیخ مار کر بادشاہ سے لپٹ گئی، کہ خدایا یہ کیا ہوا، اسکا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر ایک وینس جو لوگوں کی نگاہوں سے غائب تھی یہ کہتی ہوئی چلدی کہ "یہ ابتدا ہے انتقام کی۔ سایک وینس کے بیٹے کو بیقرار کر کے زندہ رہے ناممکن ہے۔"

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گیا ہے لوگ دوڑ پڑے، ماہرین طب نے اپنی ساری تدابیر ختم کر دیں شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے، لیکن درد میں ذرا تخفیف نہ ہوئی اور اسلئے بالآخر بکار تمام اراکین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کرنی چاہیے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اُس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت

پیش آتی تھی اور جملہ انسانی تدابیر بے سود ثابت ہوتی تھیں تو دیوتاؤں کی روح سے استمداد کی جاتی تھی اس عرض والتجا کے لیے ایک خاص مقام مقرر تھا جہاں ایک پتھر نصب تھا اس غرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نمودار ہوتی تھی جو نہ صرف واقعات آئندہ کو ظاہر کرتی تھی بلکہ دفع بلا کی تدابیر بھی بتاتی تھی چنانچہ ایسے وقت میں جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اُسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا، سوائے اسکے اور کیا چارہ تھا کہ سنگ مقدس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ ملکہ مع امراء دربار، ارکین سلطنت اور اپنی دونوں دولہن بیٹیوں کے روانہ ہوگئی اور سائیک کو بادشاہ کے پاس تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا۔

لوگ وہاں پہنچے، جملہ مراسم عبودیت جو ادا کرنا چاہیے ادا کیے گئے، مگر آہ، کسے خبر تھی کہ دیوتاؤں کے ہاتھ نے اِس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے جسکے دیکھنے اور سننے کے لیے ویسے ہی سینہ کی ضرورت تھی۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہوگئیں، تو ملکہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے وہ پردہ ہٹایا جو سنگ مقدس پر پڑا ہوا تھا فیصلہ کا مفہوم یہ تھا:-

رئیس یونان بیمار ہے، لیکن اُسکی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے۔ ساری دنیا کے اختر شناس جمع کرو، مگر وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ مرض کہاں سے آیا کیونکہ وہ کوئی بیماری نہیں جو طبیب بتا سکے، وہ کسی ستارہ کی نظر بد نہیں، جو نجومی معلوم کر سکے۔ وہ اک قہر ہے جو بہشت کے مالک دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر نے اس پر نازل کیا ہے وہ اک آفت ہے کہ اگر جلد اس سے پناہ نہ مانگی گئی تو سارا یونان اسمیں مبتلا ہو جائے گا۔ اگر یونان کی ملکہ یونان کے امراء یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی

صحت اور آئندہ امن وسکون کے آرزومند ہیں تو انکو چاہیے کہ شاہزادی سائیک کو اولمپس کی سب سے اونچی چوٹی پر لیجائیں اور شاہ بلوط کے درخت میں باندھکر چلے آئیں جیوپٹر اس قربانی کو اپنے کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرلیگا اور بادشاہ صحت پا جائے گا، اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی، تو پھر ہزار سائیک کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور کرسکیں گی"

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امرا متحیر رہ گئے، اور ساری کنیزیں اپنا سر پیٹنے لگیں مگر اس غمگین جماعت، اس حلقۂ ماتم میں دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جنکی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا اور جنکے لیے سنگ مقدس کی یہ ظالم تحریر ایک شعر سے زیادہ پر لطف، اک نغمۂ صباحی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلارس اور کیوپڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور جلدی جلدی ہوش میں لاکر واپس چلنے پر مجبور کیا اور کہا کہ "اے ملکہ، اٹھو خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہوگا ہرچند ...... جیوپٹر کا فیصلہ بہت سخت ہے، لیکن اسکا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہوگا، اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہیں کیا گیا"

بہرحال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن ایسے روح فرسا غم کا بوجھ لیے ہوئے کہ خود اسکو اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی تو وہ اسکے مقابلہ میں نہایت خوشی سے برداشت کرلیتی، مگر نہیں فطرت اسوقت اسکے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی اور وہ غریب سخت کشاکش میں مبتلا تھی۔ شوہر اسکا دل تھا اور بیٹی اسکی جان اور اسلیے کوئی قوت اسے اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے یا جان کو دل پر، کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے۔ مگر کس کو دے اور کسکو نہ دے؟ یہ وہ معما تھا جسکو حل کرنے کے قواس وہ اپنے میں نہ پاتی تھی۔ جب وہ آئی تو بادشاہ کے

کرب میں اُس نے اور اضافہ پایا، لیکن، جب اُس نے سایک کو باپ کے پاس سخت
حالت افسردگی میں بیٹھے ہوئے پایا تو وہ "ہائے سایک" کہکر زمین پر گر پڑی اور
بیہوش ہوگئی ہمیں خبر نہیں کہ وہ کبتک اس عالم میں رہی اور کن شدائد میں مبتلا
رہی، مگر ہاں جسوقت صبح کو اُسکی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اُڑا ہوا تھا، آنکھوں میں
حلقے پڑے تھے اور اتنی سکت بھی اسمیں نہ تھی کہ کسی کے سہارے ہی سے اُٹھ سکتی اُس نے
آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گذر چکا سب خواب تھا،
مگر جب اُس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا . . اور بند کیا تو اُسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت
تھی اور ویسی ہی جگر خراش جیسی اس نے اپنے نیند میں بحالت بیہوشی پائی تھی۔ نہ صرف
اُمراء دربار و ارکین سلطنت پریشان تھے بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھیے ملکہ کس نتیجہ پر
پہنچتی ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ ایسا کریم النفس حکمراں یونان کو کبھی
نصیب نہیں ہوسکتا، اسلیے جسقدر بھی اُسکی زندگی خریدی جاسکے، ارزاں ہے۔ اور بعض
کو یہ تمنا تھی کہ جو کچھ بھی ہو سایک کو زندہ و سلامت رہنا چاہیے کیونکہ بادشاہ تو ضعیف
ہے اور ایک نہ ایک دن بہرحال اُسے جانا ہے اور یونان کو اس مفارقت کا صدمہ اُٹھانا
ہے لیکن سایک جس نے ابھی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جسکی ذات پر
ساری زمین فخر کرسکتی ہے۔ روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔ لیکن اسی حالت منتظرہ میں
دفعتہً بادشاہ کی خوابگاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہی
ملکہ نے ایکدفعہ آنکھیں کھولدیں اور نہایت ہوش کے ساتھ اُٹھ بیٹھی لیکن اس سکوت کو
توڑنے کے لیے جو اسوقت سارے دربار میں چھایا ہوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے
جسکے متعلق یونان کا ہر متنفس بیتاب تھا وہ اُٹھی اور اک عزم کے ساتھ اُٹھی ایک استقلال
لیے ہوئے اُٹھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تاثرات سے جنگ کرکے فتح حاصل
کرچکی ہے اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے . . . . ، اسپر تاسف کرنے کیلیے

تیار نہیں ہے اسنے سمجھ لیا کہ ساایک بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اسلیے مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ مالک کو اک مملوکہ شے سے نفع نہ اُٹھانے دوں اگر ساایک کو ہاتھ سے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی واپس لے سکے گا تو اُسکی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے، پھر میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایسا کرنے والے کو کون شخص مجرم قرار دے گا اور کون ہے جو ایسا نہ کرکے جان دینے والے کو بیوقوف نہ سمجھے گا۔ وہ یہ سوچکر اپنے مریض و جاں بلب شوہر کے بستر علالت دو رو پڑ گئی اور سب کے سامنے ساایک کو مخاطب بنا کر کہا :۔

"اے بیٹی تیار ہو جا، میں تجھے اجازت دیکر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور تو اسکی تعمیل کرکے اپنے فرض کو ادا کر۔ اے ساایک، ہرچند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی، لیکن جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ اگر مجھے اپنی ہی جان نذر کرنی پڑتی تو کیا مجھے پس و پیش کرنا چاہیے تھا، تو پھر تیرے نہ رہنے سے اور کوئی بات زیادہ نہوگی لے میرے جگر کے ٹکڑے، دیکھ اپنی کمزوری سے اسوقت میرے ارادوں میں اضمحلال پیدا نہ کر دینا، تو گھبرا نہ، کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آملے گی۔ اور پھر کبھی جدا ہونے کے لیے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی"۔ اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ اُمنڈ کر آنے لگے اور اُسکی آواز کانپنے لگی، یہانتک کہ اُسکی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً اُسے ہاتھ کے اشارہ سے آنکھ پر رومال رکھکر کہنا پڑا کہ "بس اب لیجاؤ دیر نہ کرو" ہم نہیں کہہ سکتے کہ ساایک نے اوّل اوّل اس خبر کو کہ وہ قربانگاہ پر چڑھائی جائے گی کسطرح سُنا، اور پھر اس حالت انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، کیونکر کاٹا، مگر ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جسوقت اسکی نسبت قطعی رائے قائم کرلی گئی اور اُسکو پہاڑ پر لیجانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو وہ بالکل مردہ سی تھی اور اُسکے قواء نے بالکل جواب دیدیا تھا۔ جان دینے سے گریز و احتراز بالکل فطری امر ہے اور اس لیے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ساایک جان دینے

نہ ڈرتی تھی، لیکن اسمیں کلام نہیں کہ جس غم نے اُسے گونگا بنادیا جس صدمہ نے اُسکی آنکھوں سے آنسو تک جذب کر لیے وہ صرف اس خیال پر مبنی تھا کہ "میری جدائی کو ماں کیونکر برداشت کر سکے گی" اُسنے اپنے ہاتھ پاؤں ڈالدیے، بدن ڈھیلا کر دیا اور اس طرح گویا اجازت دیدی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لیجاؤ۔

اگلاس وکیو پٹرس نے جلدی سارا انتظام روانگی کر لیا اور غریب سایک کا نیم جنازہ ایک گاڑی میں ڈال کر وہ آلونڈ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

سوگواراں جسکی حالت دیکھ دیکھ لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے، ساتھ ساتھ تھی اور لوگوں کا اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ (سایک) کو گھیرے ہوئے تھا ایک کہرام تھا کہ سارے شہر میں برپا تھا، اک قیامت تھی کہ ہر گھر میں قائم تھی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہو، اور کوئی دل نہ تھا جو تڑپ نہ رہا ہو، یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات اسوقت پلٹ دی جانے کو ہے اور سارا آسمان ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے۔ ایک گھنٹہ سے کم میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں سایک کی قربانی چڑھانی تھی اور جلدی جلدی تناور بلوط کے اُس درخت سے باندھ دیا جو سب سے نمایاں چوٹی پر تھا۔

اُسکی نازک کلائیاں جو ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں پس پشت رسی سے بندھی ہوئی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لیے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے تنے سے کس دی گئی تھی اُسکی وہی ریشمی چادر جسکو وہ نصف باندھ لیتی تھی اُسکے جسم پر تھی، لیکن وہ نقاب جو پانچ سال سے اُسکے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا اسوقت جدا تھا کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جسکی قربانی کیجائے اُسکا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

سایک کا یہانتک لایا جانا، اُسکی کلائی اور کمر کا باندھا جانا یہ سب عالم بیہوشی میں ہوا، لیکن جسوقت اُسکی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اُسکی پیشانی پر دیا تو سایک کی

آنکھیں کھل گئیں چونکہ اب وہ ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے) قدموں پر نہ گر سکتی تھی (کیونکہ وہ کس دی گئی تھی) کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اُسکے حلق و زبان خشک تھے اسلیے اُسکی ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضا سے کیجا سکتی تھیں اب صرف اُسکی آنکھوں میں کھچکر آ گئی تھیں اور اسلیے اس عالم یاس میں اُسکی آنکھوں کا طلب رحم کرنا حقیقتاً اک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جسکی تاب غریب ماں کیا لا سکتی تھی۔ لوگوں نے اُسکو اُٹھایا اور سایک کو یونہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر ایک درخت سے بندھا ہوا چھوڑ کر چلدیے۔ مگر آہ! وہ سایک کا کسمسا کر اک آخری نگاہِ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اسوقت اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے ایسا دردانگیز نظارہ تھا کہ اگر وینس بھی وہاں ہوتی تو اُسکا کلیجہ پھٹ جاتا۔ مگر آہ! نہ وینس وہاں تھی کہ شاید اُسی کو کچھ رحم آجاتا اور نہ ماں وہاں تھی کہ پھر ایکبار کھینچکر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشتناک جنگل کی خاموشی جسکی ساکن و وسیع فضا میں سایک کی نگاہ واپسیں گم ہو گئی یعنی اُسکی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ خود ایک طرف کو گردن ڈال کر بیہوش۔

(۶)

"اے خواب کی سلطنت کی دیوتی (مارفیس) جا، اپنے نرم ہاتھوں سے اُسے جا کے تھپک اور اُسکے منتشر حواس کو اک شیریں سکون کے ساتھ جمع کر دے، اور تو بھی اے نسیم کی دیوی (زیفر) اُٹھ اور اُسکی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے، کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا دلدوز و ساحر حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا، جلد جا اور جلدی کر کیونکہ میرا دل اُسکی محبت میں پھنک رہا ہے۔"

کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سُنا اور اُسکے ساتھ ہی [illegible]

چوٹی پر پہنچ گئیں جہاں ایک شاہ بلوط کے تنے سے ماہ نخشب طلوع ہو رہا تھا۔ شاخوں میں جنبش شروع ہوی، پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نگہت بیز ہوانے سارے کوہ الوند کو معطر کر دیا۔ سایک کا دماغ بھی اس سے متاثر ہوا اور اُسکی آنکھیں جھپک گئیں اُسکا محو خواب ہونا تھا کہ بادنسیم نے اُسکے بند جدا کر کے اپنے ہاتھوں پہ سنبھال کر وہیں فرش پر لٹا دیا۔

سایک غافل پڑی سو رہی تھی، چادر اُسکے سر و سینہ سے جدا تھی اور اُسے یہ ہوش نہ تھا کہ اک حریص آنکھ اُسے دیکھ رہی ہے اسلیے اپنا عریاں حصۂ جسم چھپا کر اُسے سمٹ جانا چاہیے۔ اُسکے بال ہوا سے اُڑ اُڑ کر پیشانی اور چہرہ پر آ رہے تھے اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ اک اجنبی نگاہ اس دلفریب منظر سے لطف اُٹھا رہی ہے اور اسلیے اُسے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائک کو باغ میں دیکھا، تو وہ بے نقاب ضرور تھی مگر محو خواب نہ تھی، لیکن وہ غریب کیا جانتا تھا کہ جب حُسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔ وہ خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو اجا رہا تھا، یعنی اگر حُسن بیہوش تھا تو عشق بھی اپنے حواس کھو رہا تھا۔ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ سایک کی صرف کھلی ہوی بلوری گردن کو دیکھا کرے، یا صرف اُسکے عریاں یاسمنی سینہ کو، اسکے یاقوتی پتلے پتلے ہونٹوں پر جان نثار کرے ....

.... یا اُسکی کشادہ کافوری پیشانی پر۔ اُسکی حالت اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ وہ سایک کے سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اُسکی متوالی آنکھوں سے، وہ متحیر تھا کہ اُسکی ناک پر جان دے یا اُسکی کشیدہ قامتی کے انتہائے تناسب پر وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سایک کا

رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے، وہ اُسکے قدموں پر گر پڑا، اُسکے رنگیں تلوؤں سے اپنی آنکھیں ملیں اور ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اُٹھ بیٹھا کہ :۔

اُے سائیک، میں تجھ سے محبت نہیں کرونگا، تجھے پیار نہیں کرونگا ———— تجھ سے عشق نہیں کرونگا، کیونکہ یہ بھی اک ناقص طریقہ تیرے اعتراف حُسن اور اپنے اظہار جذبات کا ہے، تیں تیری عظمت کرونگا، تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈرونگا ———— اک ایسا ڈر اپنے دل میں بسے ہوے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھ میں پیدا نہیں ہوا تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا بدن کی اُس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے جسم پر طاری نہیں ہوی۔ میں تجھے اک ملکہ، نہیں اک دیوی، آہ یہ بھی نہیں۔ خدا جانے کیا سمجھونگا اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا خادم، نہیں اک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ اک خوار گدا، اک ذلیل بھکاری اور اس سے بھی زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا، جسکے ظاہر کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں" مارفیس وزفر نے سائیک کو اُٹھایا اور اپنے پروں پر رکھکر شاداب کوہ اولمپس کے اُس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور سے ایک قصر سائیک کے قیام کے لیے تیار کرایا تھا۔ وہ ایک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نیند اُسکی آنکھوں سے لیکر زفر کے ساتھ غائب ہوگئی۔

سائیک اپنی آنکھیں ملتی ہوی اُٹھ بیٹھی اور اپنے تئیں اک طلائی برج کے اندر جواہر کا فرش پر پاکر مبہوت و متحیر ہوگئی۔ اُس نے پھر آنکھیں بند کرلیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہو اور پھر کھولدیں کہ کاش خواب نہو۔ مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہو سکا اور نغمہ شیریں آواز اُسنے سائیک کے کانوں میں پہنچائی کہ :۔

"اُے سائیک یہ خواب نہیں حقیقت ہے"

اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے سونے کی بوچھاروں میں چھپا ہوا حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "اے سایک، متعجب کر متحیر نہ ہو تیرا غلام تیرے سامنے کھڑا ہے، اُسے کوئی حکم دے،" اک شاہانہ لہجہ میں اُس سے کچھ کرنے کو کہہ کیونکہ اب اُسکی زندگی صرف تیری خدمت ہی اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں جسکے لیے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی۔ اور اگر تو برہم نہو تو تیرے تمام خواہشات قلب کو مہیا کرے۔"

سایک کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ جب اُسکی قربانی پیش کیجائیگی تو ایک بدصورت، مردم خوار عفریت اُسکا شوہر بنے گا، لیکن وہ اپنے سامنے ایک ایسے حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی جو کبھی اسکی فکر سے پہلے نہیں گذرا تھا اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا، لیکن اعضا کا تناسب جسم کا کندنی رنگ کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے اک نہایت ہی خوبصورت اور پرشباب چہرہ چھپا ہوا ہی۔ اُسکے مُنھ سے "خواہشات قلب" کے الفاظ سُنکر وہ چونک پڑی اور اُسکے تمام حسیات جو یُونان میں مردہ ہو چکے تھے دفعتہً زندہ ہو کر پھر اسکی حیات میں دوڑنے لگے اسکا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا، انفعال سے بھیگ گیا، یعنی اُس گلاب پر پھر وہی شبنم آگئی جس سے اُسکا کندنی رنگ اور بھی دمکنے لگتا تھا وہ آخر کار اپنی مسرت سے مغلوب ہو کر اُٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ "اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا یہی حاصل ہی کہ اُن آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے جن میں مجھے اپنے جذبات کی وسعت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں اُن سے محبت کرنا سکھوں گی گو انھیں مجھ سے محبت نہو، اپنی بہترین ہدایائے عشق اُنکے سامنے پیش کروں گی خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائیں جائیں۔" یہ کہتے ہوئے سایک نے اُسکا نقاب نوچنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اُسکی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت نرم لہجہ میں بولا کہ: "اے سایک میں تو تیرا ادنیٰ غلام ہوں، تو مجھے جو چاہے سمجھ تیرا لطف ہی، مگر اے سایک مجھے اُس بات کے کرنے پر مجبور نہ کر جسکو میں نہیں کر سکتا، اگر تو ایک نقاب پوش ہستی پر صرف اسلیے

رحم کرسکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جسکی نسبت وہ تیر افگن ماننے کے لیے تیار نہیں تو تو رحم کر، ورنہ لے سایک بھر میں تجھ سے چمٹ جاؤنگا اور مرجاؤنگا یہ سایک کچھ تو اُسکی تقریر کی نرمی سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیاں پاکر رُک گئی، ٹھہر گئی، اور وہ ایسا محسوس کرنے لگی گویا اُسکے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اُسکے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اُسکی طرف کھنچی جارہی ہے آخر کار اُس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ کیوپڈ پر ڈالدیا، اپنے تئیں اُسکی آغوش میں سونپ دیا اور اُس لذت سے مست و سرشار ہوکر جو اس سے قبل اُسکو کبھی نصیب نہوئی تھی اور جسکے لیے وہ سراپا جستجو بنی ہوئی تھی۔ آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے اختیار گر پڑی۔

ہرچند ملک، وطن، ماں باپ کو اسطرح یکایک چھوڑ دینے کا رنج ایسا معمولی رنج نہیں جسے کوئی انسان خاص کر ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع اسقدر جلد فراموش کرسکے لیکن بات یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جسکا تعلق صرف اسکے شباب سے ہے ممکن ہے کہ وہ ایک وقت دیگر مشاغل حیات میں منہمک ہو، مختلف اسباب تفریح میں دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے ذات سے وابستہ ہونیوالے تعلقات میں یکسر محویت و استغراق ہوجائے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ اسکے حسیات شباب کے متعلق کوئی بات اسکے کان میں پڑے اور وہ دنیا بھر کی تمام مصروفیت کو چھوڑ کر اسطرف متوجہ نہو جائے کیونکہ عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھکر بھی کبھی نہیں ہوتی حالانکہ وہ گھنٹوں اسکے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اُسکی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو اور اخلاق و عادات سے ذرا بحث نہو۔ وہ اپنے تئیں "شوخ اور چلبلی" سُنکر خوش ہوسکتی ہے مگر اپنے شباب کے متعلق صلاح و تقویٰ کی نسبت سُننا پسند نہیں کرسکتی، کیونکہ شوخی اور چلبلے پن میں تو اُسکے شباب کے اقتضاء کا ذکر ہے اور زہد

و عبادت ایک طور سے اُسکے شباب کی توہین ہے۔

ہم نے مانا کہ ساٹک کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اُس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ الفت یہ جاں نثاری، یہ شیدائیت اُسی وقت تک تھی جب تک کوئی اسے چاہنے والا کوئی اسکا دیکھنے والا کوئی اُسکے حسن و شباب کی تعریف کرنے والا نہ تھا، لیکن اب جو اُس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا اور اُسکی وارفتگی، فدا کی اور پرستاری خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کانوں سے سُن لی اور ہاتھوں سے چھو لی، تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کو ماں باپ کی وسیع خلوت میں سوائے حیاتِ معاشقہ کے اور کوئی چیز اُسے نظر نہ آتی تھی اور اُسکی سمجھ میں سوائے اسکے اور کوئی بات نہ آتی تھی کہ وہ اپنی جوانی کے بوجھ سے خستہ ہو کر جس خستگی کو وہ برسوں سے برداشت کرتی چلی آتی تھی کیوں نہ آنکھیں بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے اس نے سمجھ لیا کہ کیوپڈ نوجوان ہے حسین ہے اور مہربان ہے اس لیے اُسنے مطلق پرواہ نہ کی اگر اُسکا چہرہ بے نقاب نہ تھا اُس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کے لیے آمادہ ہے اور اسلیے ذرا خیال نہیں کیا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟

خود کیوپڈ کی کیا حالت تھی؟ وہ ساٹک کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ یہ ایسا سوال ہے جس سے خود اُسکا جواب پیدا ہو رہا ہے، کبھی وہ ساٹک کی آنکھیں چومتا تھا کبھی اُسکے بال سونگھتا تھا اور کبھی اُسکے ہاتھ، غرضکہ وہ بالکل دیوانہ تھا پاگل تھا اور وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا ساٹک بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے کوئی سیر ہو سکے۔ اُس نے ساٹک کے شاداب لبوں پر اپنے لب رکھ دیے اور مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا اور بیہوش ہو گیا۔

عجیب و غریب منظر تھا کہ حسن عشق کی آغوش میں بیخبر پڑا تھا اور عشق حسن کی آغوش میں

باقی آیندہ

نیاز فتحپوری

جناب مولانا حسرت موہانی مدظلہ العالی

تھا مژدۂ بخشش الٰہی — پیغام نسیم صبحگاہی
درپے ہے مرے وہ حق فراموش — ثابت ہوئی میری بیگناہی
ہے دل کی صلاح جانفشانی — از راہ کمال خیر خواہی
کچھ ربط جمال و شوق کا حال — معلوم نہ ہو سکا کماہی
روز و شب ہجر میں نہیں اب — کچھ فرق سپیدی و سیاہی
جاری ہے دیار عاشقی میں — فرمان ہلاکی و تباہی
دیباکش حسن دلبراں ہے — یہ کم نگہی یہ کج کلاہی
از روئے خلوص ہو تو لاریب — دنیا طلبی ہے دیں پناہی

دیتی ہے نگاہ یار حسرت
آگاہی راز کی گواہی

جناب مولانا عزیز لکھنوی مدظلہ العالی

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا — نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
لو اسی بات پہ مرتے ہیں کرو تو زندہ — تم کو دعویٰ تو بہت کچھ ہے مسیحائی کا
دل کے زخموں میں جو ناسور کے فوارے ہیں — عشق کو شوق ہوا ہے چمن آرائی کا
اُف ترے جلوۂ مستانہ کی پُرزور کشش — نور سب کھینچ لیا چشم تماشائی کا
گل جو گلزار میں ہیں گوش برآواز عزیز

مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شیوائی کا

حضرت مولانا کلیم لکھنوی مدظلہ العالی

تلاش یار میں ہر دم نہ کیوں راحت ملے دل سے ۔۔۔ مسافر کی تھکن سب دور ہو جاتی ہے منزل سے
سزائے جرم الفت مل رہی ہے ہاے قاتل سے ۔۔۔ دل آنکھوں سے ہے شرمندہ حجاب آنکھوں کو ہے دل سے
میں اس مجمع میں کیوں آیا خدا سمجھے مرے دل سے ۔۔۔ قیامت کیوں نہیں اُٹھتی ہے ظالم تری محفل سے
نہ ہوگی پردہ پوشی زخم دامن دار کی دل سے ۔۔۔ اُڑے گی خون کی چادر ہو لے تیغ قاتل سے
سمجھ لے فاصلہ ملک جنوں کا اپنی منزل سے ۔۔۔ رہِ الفت کی پیمائش کرے مجنوں سلاسل سے
نہ کیوں جامہ دری پر اپنی دیوانہ رہے ہر دم ۔۔۔ ہوئی ہے پردہ پوشی قیس کی لیلیٰ کی محمل سے
الم ہے صدمہ ہے ایذا ہے غم ہے درد ہے دکھ ہے ۔۔۔ نظر سے آنکھ سے جاں سے جگر سے روح سے دل سے
شریک غم نہیں عالم میں کوئی سوگوار اصلا ۔۔۔ بجھی ہے شمع محفل جب دھواں اُٹھا ہے محفل سے
نہیں دست جنوں پر دسترس زور نقاہت کا ۔۔۔ رہا آزاد دیوانہ ترا قید سلاسل سے
خضر کیطرح کس کا زندگی پر دم نکلتا ہے ۔۔۔ چلے کیا رہنمائی رہروان کوے قاتل سے
غشی نے کر دیا تھا مضطرب تیمارداروں کو ۔۔۔ تسلی ہو گئی سب کو مری بیتابیِ دل سے
کسی دن تیغ کے گھاٹ اُتر یگی کشتیٔ عمر اپنی ۔۔۔ کنارہ کش سفینہ رہ نہیں سکتا ہے ساحل سے
اگر میری طرح دیوانگی مجنوں میں آجاتی ۔۔۔ نکل آتی گریباں پھاڑ کر لیلیٰ بھی محمل سے
خیال زلف پُر خم ضبط گریہ کا سبب ٹھہرا ۔۔۔ ترے دیوانہ نے دریا کو باندھا ہے سلاسل سے
ہوئی میری شہادت زندگیٔ خلق کا باعث ۔۔۔ بریدہ ہو گئے دست اجل بھی تیغ قاتل سے
مری آنکھوں کو دیکھیں اور مرے دل پر نظر ڈالیں ۔۔۔ جناب خضر کیوں پھرتے ہیں بھٹکے بھٹکے منزل سے
ہمیشہ سے ہے میخواروں کا بیڑا پار اے واعظ ۔۔۔ نہ دریا سے غرض ہے کشتیٔ مے کو نہ ساحل سے
نہ کچھ ہستی رہی ہستی میں یا ہستیِ مسیحا کی ۔۔۔ یہ اُٹھا لطف مجکو زندگی کا تیغ قاتل سے
ہو تیری دید بھی اسطرح پہلو میں ترے بیٹھوں ۔۔۔ مزا آنکھوں کا آنکھ سے ہے لذت دل کی ہے دل سے

ستارہ پست ہے میری لحد کے ذرہ ذرہ کا | کدورت آسماں کو ہے زمیں کے قاتل سے
جنوں میں بھی وفا سے باد فا غافل نہیں رہتے | نہ الجھا دست وحشت پائے مجنوں کی سلاسل سے
اگر اغیار پر تلوار اپنی آزمائے گا | امید قتل بھی پھر قطع ہو جائے گی قاتل سے
ہزاروں آنکھوں میں چھپ سکتی نہیں ہے آنکھ چاہت کی | نگاہیں ڈالتے ہی راہ دلکو ہوتی ہے دل سے
قیامت ہے ہر اک اس بانکپن پر جان دیدیگا | زمانہ بھر میں تلواریں چلینگی تیغ قاتل سے
جہاں چاہے پھرے وہ جلوہ افگن آنکھ ہی رہتی | ہوا کب آب دریا کو فراق آغوش ساحل سے
جنوں میں بھی یقینی ہوش رہتا بدگمانی کا | چھپا تا منہ کو مجنوں جھانکتی لیلے جو محمل سے
نصیبوں کی وہ خوبی وہ عنایت مہربانوں کی | تمہارے دل سے پوچھے یا کوئی پوچھے مرے دل سے

کلیم اُس کا نظارہ بھی ہے دشمن ہمنشینی کا
جب آیا عشق تو اُٹھوایا گیا میں اُسکی محفل سے

حضرت مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

تار ہیں ساز شکستہ کے وہ دمساز نہیں | ہمنشیں ہو کے جو احباب ہم آواز نہیں
جان اسے مرگ مفاجات کا پیغام اے دل | کسی کافر کی نگاہ غلط انداز نہیں
صبح جبتک نہوئی میں یہی سمجھا شب وصل | آج دور فلک تفرقہ انداز نہیں
نام روشن کیا پروانۂ دل سوختہ نے | ابتو اتنا بھی کوئی عاشق جانباز نہیں
ورنہ توبہ بھی ہوا بند الٰہی توبہ | میں ابھی شغل مناہی سے مگر باز نہیں
حسن کے واسطے ہیں شوخ ادائیں لازم | ورنہ بیرنگ ہی جس نقش میں پرداز نہیں
کافر عشق سب اس کا کلمہ پڑھتے ہیں | حسن میں کیا ہے اگر قوت اعجاز نہیں
باندھ صیاد جفا کار نہ للہ انھیں | جن تھکے بازوؤں میں طاقت پرواز نہیں
طپش دل جو یہی ہے تو رہائی معلوم | طائر قبلہ نما قابل پرواز نہیں
اب رہائی کی خوشی ہے نہ اسیری کا ملال | جانتا ہوں کہ مجھے طاقت پرواز نہیں

جنبشِ ابروِ صیاد پہ رہتی ہے نظر — شغل جز حسرتِ بال و پر پرواز نہیں
ٹوٹنے پر بھی دلِ تنگ کے پھوٹے گی نہ بو — نگہتِ غنچۂ سربستہ مرا راز نہیں
دلخراش اسقدر انداز نوازش کب تھا — کیوں مجھے چھیڑتے ہو غیر سے گر ساز نہیں
جامۂ حسن یہ جس رنگ کا چاہے پہنے — گل میں وہ طرز ادا وہ روش ناز نہیں

ترک دنیا پئے عقبیٰ جو ہے اک حسن طلب
بے نیازی پہ صفیؔ اپنی ہمیں ناز نہیں

حضرت مولانا ثاقب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

غزل مشاعرہ میور سنٹرل کالج الہ آباد منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۱۵ء لکھنؤ کے مشاعرہ کی غزل آئینہ پرچہ میں چھپے گی

خموشی پر مری کیوں یہ گمانی ہے مرے دل سے — وہ کیا نالے کرے جو سانس بھی لیتا ہو مشکل سے
کسی بسمل کو جو حاصل ہوا شمشیرِ قاتل سے — وہی مجکو مزا ملتا ہے اس دکھتے ہوئے دل سے
محبت ہوگئی تھی عشق کو اتنی مرے دل سے — کہ نکلا قاتل و مقتول میں کچھ فرق مشکل سے
فروغ حسن انکا ہیں تو میں پتھر بھی کہدیگا — وہ عالم ہے کہ آئینہ نہیں ہٹتا مقابل سے
نمایاں ہو بہت کچھ عشق کی منزل میں آسانی — مرے دل کی تمنا جب نکل سکتی ہو محمل سے
نصیبوں میں اسیری ہو تو کوئی اور کیوں چھیڑے — قفس ہو اور میں بیٹھا ہوا باتیں کروں دل سے
مرے دل کا سفینہ ہو اس آفت خیز دریا میں — جہاں چلتی ہیں طوفانی ہوائیں ذکر ساحل سے
دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو — بہت کانٹے نکل آئے مری ہمراہ منزل سے
سوادِ ظلم مظلوموں کا ماتم آپ کرے گا — بجھی ہیں جب کبھی شمعیں دھواں اٹھا ہے محفل سے
نہیں معلوم نقش بوریا بگڑا کہ باقی ہے — اسی کو چھوڑ کر بستر اٹھا تا کوئے قاتل سے
یہ بیتابی کا عالم ہے کہ کوئی تھم نہیں سکتا — لہو فریاد بنکے اوڑ رہا ہے دامن دل سے
حدِ ہستی بہت کچھ نیستی تک کھینچ لایا ہوں — ملا دوں گا کسی دن دیکھنا منزل کو منزل سے
کنارے بحرِ ہستی کے پہنچ کر غرق ہوتا ہوں — مجھے کشتی ڈبونے کی نہ تھی امید ساحل سے

ستمگاران عالم رحم کے ہاتھوں سے مٹی دو — وہ ارماں ساتھ ہیں میرے جنھیں پالا تھا مشکل سے
دیا کرتے ہیں تو ہر وقت جنکی قبر کے پتھر — یہ شمعیں گُل ہوئیں کیونکر ہوا سے تیغ قاتل سے
فقط اک اہل زنداں کیا انھوں نے بھی سُنے ہونگے — مرے نالے بہت اونچے گئے شور سلاسل سے
مرے چھوڑے ہوئے صحرا کی گرد ابتک نہیں بیٹھی — ندا دیتا ہے ہر ذرہ کہ میں گذرا ہوں منزل سے

وہی مطلب سمجھتے ہیں مری فریاد کا تاقب
جو آسانی سے مرتے ہیں مگر جیتے ہیں مشکل سے

حضرت محشر لکھنوی مدظلہ العالی

مدتیں ہو گئی ہیں چپ رہتے — کوئی سُنتا تو ہم بھی کچھ کہتے
جل گیا خشک ہو کے دامن دل — اشک آنکھوں سے اور کیا بہتے
بات کی اور مُنھ کو آیا جگر — اس سے بہتر یہی تھا چپ رہتے
ہم کو جلدی نے موت کی مارا — اور جیتے تو اور غم سہتے
دل کے ناسور کی یہ حد دیکھی — ہو گیا بند بہتے ہی بہتے
منتظر ہے سال امکاں — باقی ایام ہجر کیا رہتے

سبھی سُنتے تمھاری اے محشر
کوئی کہنے کی بات اگر کہتے

حضرت قاضی عبدالعزیز صاحب عزیز منصورپوری مدظلہ العالی

آئینہ سیکے کبھی آپ دو حیراں نہوا — صاف اس سے بھی غبار دل جاناں نہوا
تو اگر ہنس کے گلے کاٹتا اچھا ہوتا — اب ہے اتنا کہ ترے پاس نمکداں نہوا
موت کے بعد بھی احساس رہا الفت کا — ترے خنجر سے ترا کشتہ بھی بے جاں نہوا
اصل دونوں کی وہی سوزِ محبت ہے، مگر — نالہ محفل میں تری دود پریشاں نہوا
ایک جگنو ہوں کہ جلتا ہوں ضیا سے اپنی — جوں چراغِ شب عشرت تہِ داماں نہوا

روئے بھی چپ بھی رہے عشق کی تسکیں نہوی — یعنی خود وہ ستم ایجاد پشیماں نہوا

آسماں کو ہے مری نگہ توحش سے گلہ — وسعت دیدہ کو کافی جو بیاباں نہ ہوا

ماہ وخورشید چمکتے ہیں چمکنے دیجیے — تو کبھی گھر میں مرے شمع شبستاں نہوا

نام تیرا؟ کہ حلاوت سے جدا لب نہ ہوسے — کام میرا؟ کہ بذاق لب و دنداں نہوا

تھا تغافل وہ محبت سے کہ بے مہری سے — یہ وہ پردہ ہے کہ حیرت سے بھی عریاں نہوا

زلف تو؟ کہ سر مصحف ہے دلیل اسلام — جس نے کافر تجھے جانا وہ مسلماں نہوا

وہ بھی تو مرد خدا ہوں گے خدا کے بندے — جو سمجھتے ہیں کہ اُن سے کبھی عصیاں نہوا

رو دیا میں تو ہنسے تم یہ ملاقات ہوی! — پرسش حال ہوی! ابر بہاراں نہوا

ابر رونے کو چمن ہنسنے کو میں کیا نئے ہوں — کبھی خنداں نہوا میں کبھی گریاں نہوا

عشق کیا عشق جو آوارۂ دیدار نہیں — حسن کیا حسن جو نشتر ہوا پیکاں نہوا

پاے قاتل میں ہے سر اور کفن چاک تمام — حشر میں مجھسا کوئی بے سر و ساماں نہوا

ذوق و غالب نے کہا میں بھی یہ کہتا ہوں عزیز
جو رہا تیر سے بے فیض سخنداں نہ ہوا

التماس

نومبر کا نمبر آخری نمبر ہے جو دیر میں شایع ہوتا ہے اب اسکے بعد آیندہ ہر پرچہ انگریزی ماہ کی ۲۰ تاریخ تک شایع ہوجایا کرے گا ہم امید کرتے ہیں کہ "تمدن" کے بہی خواہ "تمدن" کی توسیع اشاعت میں کوشش فرمائینگے - اہل قلم سے استدعا ہے کہ وہ اپنے مضامین پرچہ شائع ہونے کے ۱۰ یوم بعد تک عنایت فرمادیں جب وہ اشاعت قریبہ میں شائع ہو سکیں گے - ہم نے اسوقت تک صرف قسم اول کا رسالہ شایع کیا تھا اور اسکی قیمت (عہ) کے بجاے (ے) کردی تھی مگر اکثر صاحبان کی درخواستیں قسم دوم قیمتی (عہ) کے لیے آئیں اسلیے ہمنے اس ماہ سے قسم دوم بھی جاری کردیا ہے - آیندہ جو صاحب خریداری منظور فرمائیں وہ قسم اول و دوم کا حوالہ ضرور دیں - منیجر

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

ستائیس برس سے سارے ہندوستان میں استعمال میں آرہی ہیں

(۱) دما جسے زور سے اُچھلتا ہو اس دوا کے دوایک موتا دہی سے دب جاتا ہے۔

(۲) نیا ہو اور اس دوا کا استعمال کیا جائے تو دما جڑ سے جاتا ہے۔

(۳) پورانے دما والے یا جنکا دما دم کا ساتھی ہو گیا ہے وہ بھی اس دوا سے صحت پاتے ہیں۔

دمہ کی دوا } محصول ڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵ آنہ قیمت ایک شیشی ایکروپیہ چار آنہ (عہ)

مقوی گولیاں } ڈاکٹری میں طاقت دینے والی دوائیوں میں مشہور دوائیں فاسفورس اسٹکینا اور ڈمینا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں۔ مغز ریڑھ رگ ساس اور خون کو یہ طاقت دیتی ہے اس لیے انکی کمزوری سے پیدا ہوئے معمولی کمزوری ہول دل۔ یاد بھولنا۔ ہاتھ پیر کا نپنا۔ لقوہ۔ وغیرہ ان گولیوں سے آرام ہوتے ہیں۔ دو ہفتہ کی خوراک تیس گولیوں کی شیشی قیمت ایکروپیہ (عہ)۔ ڈاک محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ۔

امراض مستورات کی دوا } یہ ہر ایک اقسام کے امراض مستورات کی دوا ہے۔ ہر طرح کا رحم کی بیماری پر ورد رگ حمل کی کمزوری پیٹ جانگ میں درد وغیرہ کو مٹا کر اس دوا کے استعمال سے رحم کی خرابی تمام دور ہو کر جسم قوی ہوتا ہے ایک دفعہ اس دوا کی بھی آزمائش کیجیے۔ قیمت ایک شیشی ایکروپیہ (عہ) (۱۶) خوراک محصول ڈاک ۶ر

ان دوائیوں کی مفصل حالات معہ سرٹیفکٹوں کی پوری کتاب بلا قیمت ملتی ہے منگا کر پڑھیے

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن

نمبر ۵ و ۱۰ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

نوٹ۔ ہمارے ایجنٹ آغا منصب علی کشمیری دروازہ دہلی میں ہیں۔

فرمائش کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔

رجسٹرڈ نمبر ۔ اے ۔ ۱۵۷ قسم اوّل

جلد ۱۱ نمبر ۳

دسمبر ۱۹۱۵ء

تمدّن

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر ایم اے قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری
محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

پرنٹر محمد عباس حسین قاری
ان ۔ ا ۔ ئی ۔ پی پریس لکھنؤ میں چھپا
پبلشر نواب علی
قیمت سالانہ قسم اول ہے
قیمت سالانہ قسم دوم عہ
مقام اشاعت چتلی قبر (؟) جامع مسجد
کتب خانہ انجمن (؟) اسلامیہ دہلی

وہ جو کوہ طور پر بھڑکا تھا۔ وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر ہوا تھا
اب کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں نمودار ہے۔
ادبی روح پھونکے گا۔ اخلاقی وعظ سنائیگا۔ نورانی شعلوں کی
تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنائے گا وہ سینے
جو آتش محبت سے سوختہ نہیں۔ وہ قلوب جو سوز دروں سے
خالی ہیں اسطرف متوجہ ہوں عشقِ الٰہی کی لپٹیں گداز طبیعتوں
سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہد حسن بے نقاب ہو کر مشتاق
آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر ہے۔ پس "شعلہ" کی
خریداری کے لیے جو ہر مہینہ آپ کی دلبستگی کا بہترین مجموعہ
ہے۔ درخواستیں روانہ کیجیے لکھائی چھپائی بہت عمدہ
قیمت سالانہ درجہ عام دو روپیہ آٹھ آنے (عـ۸ر) مع
محصول نمونہ چار آنے کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جاتا ہے۔

المشتہر

منصرم رسالہ دفتر "شعلہ" محلہ چوڑیگران۔ دھلی

تمدّن

اگر میں مرد ہوتی

انسان ہونے کی حیثیت سے مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ وہ بھی انسان۔ یہ بھی انسان۔ خدا کی طرف سے ان دونوں کے کام کسیقدر مختلف ہیں مرد کے ہاتھ پاؤں زیادہ مضبوط اس لیے بنائے ہیں کہ وہ محنت و مشقت زیادہ کرے عورت کو کمزور اس لیے بنایا ہے کہ وہ صبر اور پتہ مارنے کی زیادہ عادی ہو یہ تو ظاہر کا فرق ہے۔ ان دونوں میں باریک فرق یہ ہے کہ مرد دماغ سے زیادہ کام لینے کے لیے بنایا گیا ہے اور عورت دل سے۔ اسیلے اگر مجموعی حیثیت سے انسان پر نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ مرد انسانیت کا دماغ ہے اور عورت دل۔

دنیا میں مردوں نے جو دماغ سے کام لیا ہے وہ ہر طرح تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔ دنیا کا انتظام۔ پیشوں اور ہنروں کی ترقی۔ علم۔ نئی نئی ایجادیں

غرض جو کچھ ترقی کے نام سے منسوب ہو سکتا ہے وہ مردوں نے دماغ ہی کی بدولت کیا ہے۔ مگر اسکے ساتھ کچھ اُن میں ہما ہمی ایسی تھی کہ کسی نہ کسی بہانے وہ ہمیشہ لڑتے رہے۔ شروع میں جانوروں کی طرح کھانے پینے کی چیزوں پھر رہنے سہنے کے سامانوں۔ حتّٰی کہ عورتوں پر لڑتے رہے آگے بڑھے تو ملکوں کو فتح کرنے اور سچ یا جھوٹ مذہب کی طرفداری میں لڑتے رہے۔ شاید ہ شدہ موجودہ تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا۔ اسمیں پہلی قسم کی لڑائیاں مذموم سمجھی گئیں مگر قومیت اور ملکیت کے خیال نے دماغوں پر تسلط کر لیا اور اب عرصۂ دراز سے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی بڑی قوموں کے درمیان جو لڑائیاں ہوتی ہیں وہ انھیں وجوہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ فلسفہ سائنس اور معمولی علوم نے جسقدر دماغ کو شستہ کیا اسیقدر باریک بینی مصلحت اندیشی اور انسانیت سے لڑائیاں ہونے لگیں۔ غالباً سلسلہ اسی طرح چلا جائے گا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہو گا کہ جبتک مرد کا دماغ بالکل آزاد ہے تب تک لڑائیاں بند نہوں گی۔ قدرت مرد کی اس خصوصیت سے واقف تھی اور اسی لیے اُس نے عورت کا جوہر لطیف مرد کی زندگی میں ملا دیا تھا۔ اگر ہر کام میں مرد کا دماغ اور عورت کا قلب شامل کر لیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ انسان کی زندگی امن اور آسایش سے گذرنے لگے۔

نہ مَیں یہ کہتی ہوں کہ مرد اور عورتیں ہر بات میں بالکل برابر ہیں نہ مَیں یہ طلب کرتی ہوں کہ عورتونکو بالکل وہی حقوق ملیں جو مردوں کو حاصل ہیں مَیں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ مرد تسلیم کریں کہ صرف دماغ بغیر قلب کی رہنمائی کے ہما ہمی اور اُسکے بُرے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُدھر عورتیں خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم کاموں کے محرک۔ اصلی چلانے والے

(یعنی بنیڈ یا بیل) اور خود مختار منتظم نہیں ہیں۔ بلکہ جسطرح دل کا کام دماغ کو نازک اور نفیس پیرایہ میں مدد پہنچانا اور اُسکی تیزی اور خشک روی کو سمونا ہے اُسی طرح عورت کا کام مرد کو عمدہ طور پر نرم باتوں اور نفاستِ مزاج۔ رحم اور عدل۔ درگذر اور جود و سخا کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر ماں اپنے بچے میں یہ نفیس اثر نہ پیدا کرسکی تو اُس نے اپنے فرائض کو پورے طور پر انجام نہ دیا۔ اگر بیوی اپنے شوہر میں یہ پھلجھڑیاں نہ چھوڑ سکی تو اُس نے زندگی کے ایک بڑے مقصد کو پس پشت ڈالدیا۔ مردوں نے اگر عورتوں کے دل کے خدا داد نفیس تبرکات کی قدر نہکی اور اُن کو سر آنکھوں پر نہ رکھا تو وہ ضرور خدا کے یہاں جوابدہ ہوں گے۔ اور دنیا میں بھی اُن کی زندگی تلخ رہے گی۔ مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کو اپنا خالص اور خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا مددگار سمجھیں اور اُن سے مدد لیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس مدد پہنچانے کا اہل ثابت کریں۔

یہانتک تو خشک بحث تھی اب میں یہ بتاؤں کہ اگر میں مرد ہوتی تو کیا کرتی۔

سب سے پہلے میں ایک عجائب خانہ بنوائی اور اُس میں مختلف مزاجوں اور مختلف شانوں کے مردوں کو علٰحدہ علٰحدہ پُر تکلف کمروں میں رکھتی مثلاً:۔

کمرہ نمبر ۱ اسمیں چھانٹ کر نمونے کے دو چار مرد ایسے رکھتی جو در اصل بدصورت ہیں مگر اپنے تئیں خوبصورت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی انھیں خوبصورت سمجھیں۔ کوئی آئینہ میں اپنی صورت دیکھکر خوش ہو رہا ہے۔ کوئی خواہ مخواہ مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔ ایک صاحب اپنے ڈاڑھوں کو مل رہے ہیں۔ تو دوسرے صاحب اس زعم میں کہ میں خوش گلو ہوں گنگنا رہے ہیں تیسرے صاحب جب اپنی محبوبہ کو نیم مصنوعی خط لکھ رہے ہیں اور اس خوشی میں پھولے نہیں سماتے کہ اسکا ایک ایک فقرہ

پڑھنے والے کے دل کے پار ہو جائے گا اور وہ ع سارباں چاک ہو دل پردۂ محمل کیسا
کے مضمون کے موافق سیر کلمہ بھرتی ہوئی گھر سے نکل آئے گی۔

کمرہ ۲ ۔ اس کا نجی حوض میں ایک درجن یا اس وہ معزز حضرات ہوتے جو
عورتوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن کو سوائے چکی چولھے اور بچوں کے
گُوموت کے اور کسی مصرف کا نہیں سمجھتے۔ جنھوں نے گھر کو صرف ایک سرائے
متصور کر رکھا ہے اور جو سوائے آرام پانے کے اور ہر وقت اپنے ہی کام کاج کی
مصیبت ڈالنے کے گھر سے اور کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ جنھیں بیوی بچے نہیں
اور اُن کے اخراجات وبال معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بیشتر وہ ہیں جنکی تفریحات
گھر سے باہر وابستہ ہیں۔ کچھ خدا رسول کا خوف کچھ دنیا کی شرم۔ زیادہ تر اپنا آرام
صرف یہی باتیں انھیں بادل ناخواستہ گھر کے کھونٹے سے باندھتی ہیں ورنہ
اصلی دل ہر وقت باہر ہی پڑا رہتا ہے اور ع

سن ایسی کیا جائے نہ اس گلی کی
چھٹے اور غائب نکلے اور نہ دارد

تیسرا کمرہ حمام نما سنگ مرمر کے فرش کا ہوتا اس میں جو صاحب ہوتے اُن
سب کے سر مُنڈے ہوئے ہوتے اور اُن پر پانی کی مشکیں چھٹتی ہوتیں۔ یہ وہ بزرگ
ہوتے جو سرے سے شادی کرنا ہی برا سمجھتے ہیں۔ ان کی آزادی میں فرق آتا ہے
ان کو ایک خاص حد تک لباس سے بھی معرا کر دیا جاتا۔ کیونکہ لباس کی ہمکہ بندش
اور اس کے طول طویل اہتمام سے بھی آزادی میں فرق آتا ہے۔ ہر قسم کے جانوروں
کی خوراکیں اُن کے لیے بہم پہنچائی جاتیں تاکہ صرف انسانی غذا کھانے سے
آزادی میں فرق نہ آئے۔ اوڑھنا بچھونا کچھ نہ دیا جاتا۔ پیشاب پاخانہ کے
معاملہ میں قانون تہذیب سے مستثنیٰ ہوتے کیونکہ ستر قدم پر کہ آزادی میں فرق نہ آئے

چوتھا کمرہ کسی قدر تقدس کا رنگ لیے ہوئے ہوتا۔ اسمیں وہ بے دست و پا صابر شاکر زندہ درگور روحیں ہوتیں جو بیوی کا دانہ کھاتی ہیں۔ بیوی کی اپنی آمدنی ہے تو میاں اب ہاتھ نہیں ہلاتے۔ طرہ یہ ہے کہ بیوی کو اور جھکنا پڑتا ہے کہ میاں کو ناگوار نہ گذرے کہ میں جو نہیں کماتا تو میری حقارت کی جاتی ہے۔ غرض عورت ہر طرح مری۔

آخری کمرہ۔ اور یہی کمرہ اُس مکان کیا بلکہ سارے جہان کی جان ہوتی ہے جسمیں چند وہ لوگ مع اپنے بیوی بچوں کے راحت گزین ہوتے جنکے دل گواہی دیتے کہ ہم دنیا میں بھی سرخرو ہیں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو فطرت کے جید اور پاک قانون سے واقف ہیں۔ جو عورتوں اور بچوں کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ جو محبت اور رواداری کے فرشتے بن کر ہماہمی اور نفسانیت کے شیطان کو پا بہ زنجیر کرکے اپنے مقدس گھروں سے نکال دیتے ہیں اور جو محنت مشقت۔ محبت کفایت شعاری۔ اور میانہ روی سے گھر کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ بیوی بچوں کے لیے بھی نمونہ جنت بنا دیتے ہیں۔ اولٰئک ھم الفائزون (یہی کامیاب ہونے والے ہیں)

بیگم نسائی

ایک زنانہ رسالہ جنوری ۱۹۱۶ء سے اہلیہ جناب قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان کی اڈیٹری میں نکلنے والا ہے جو صاحبان رعایت سے فائدہ اُٹھانا چاہیں یعنی ع۱۲/ سالانہ قیمت کی جگہ عہ میں رسالہ خریدنا چاہتے ہیں وہ ۱۵/۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء تک نام درج رجسٹر کرالیں "تمدن" کے خریداروں کو بھی یہ رسالہ عہ میں ملے گا۔ پتہ دفتر رسالہ بیگم۔ پُل جھاؤ لال لکھنؤ۔

برقع اور مستورات

دنیا کا بھی عجب حال ہے۔ ایک طرف تو نو ایجاد برقعوں کی بھرمار ہو رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ عورتوں کو وقت بے وقت باہر چہل قدمی کرائی جائے تاکہ اُن کی صحت عمدہ ہو۔ اور وہ چار دیواری میں گھُٹے رہنے کے سبب سے پژمردہ اور مریض نہ رہیں۔ مگر دوسری طرف برقعوں اور عورتوں کی جائز مشی پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ مندرجۂ ذیل مضمون جو ایک صاحب نے بڑی عرق ریزی سے لکھا ہے اسی قبیل کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر نسائی صاحب کی یا اُنکی طرح کسی اور خاص طرف دار صنف لطیف کی نظر پڑ گیا تو کیا تعجب ہے کہ وہ آئندہ بے ڈھنگی ڈاڑھیوں۔ انوکھی موچھوں۔ بھیانک عینکوں۔ گنبد نما توندوں وغیرہ کے خاکے کھینچیں۔ (سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۷)

ایڈیٹر

رباعیات

کیفِ مئے پندارِ سے مدہوش نہ ہو
خاطر سے بشر کسی کی حق پوش نہ ہو
کیا عرض کروں کیا ہو نہ کیا ہو انساں
جو کچھ بھی ہو احسان فراموش نہ ہو

تقریر میں وصفِ خوش بیانی نہ رہا
تحریر میں رنگِ نوجوانی نہ رہا
تصویر ہوں یک پیری و صد عیب کی میں
افسوس کہ لطفِ زندگانی نہ رہا

کیا کیا نہ پڑے رنج ستا یا ہے مجھکو
دن رات رہے جان کے لالے مجھکو
مرکر چھوٹا ہوں قیدِ غم سے صد شکر
اے خاکِ لحد! اب تو چھپالے مجھکو

(حضرت ...)

تمہید - شریانِ صدر رنگ اسفلی

خانۂ اسد

قبیلہ عطارد

قبیلہ چرخ

چیوں

قبیلہ سن سن

سن سن

قبیلہ بوم
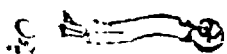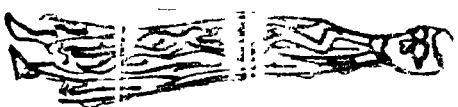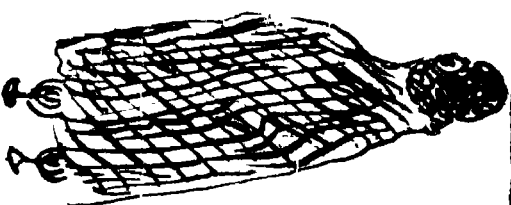
یہ ڈمدار سیارے کثرت سے حجاز کی طرف گرا کرتے ہیں جہاں ان کی نموداری کا وقت آج ہی کل ہے۔ مگر ہماری دنیا میں بھی مناسب وقت پر فرداً فرداً یا مجموعی طور پر دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ رنگ گیردا یا بھنگ میلا جو کہ چند روز میں اندرونی ابخرات کی وجہ سے اُداس ہو جاتا ہے مگر اس سے جذبات اور کششات پر اثر

نہیں پڑتا۔ ایسی صورت میں اُسکی طرف نگاہ اُٹھانے سے طبیعت کو مالش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ حکما مریض کو اس سیارے کو دکھا کر استفراغ کراتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مکھیاں اس موجودہ حالت میں اسکی طرف بہت رغبت سے رجوع ہوتی ہیں جہلا اسکو سریا سرنگی کہتے ہیں چونکہ ہر سہ اقسام آخری اُنکے زیر نظر گذرتے ہیں

قبیلہ سَن سَن ومِن مِن۔ ہندوستان کے بڑے شہروں کی تاریک گلیوں اور کوچوں میں رات کو آٹھ بجے پھرنے سے کبھی کبھی اسکی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسمیں پھُرتی زیادہ ہوتی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ کسی ستارے کی کشش اسکو سرعت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ مگر ٹکرا کر ٹوٹتا اور گرتا نہیں دیکھا

قبیلہ چیں چرخ اور چوں۔ یہ شاید ایک ہی قبیلہ ہے۔ دن کو شارع عام پر حرکت کرتا ہے اور نیز میلے اور مجمع میں جیسا کہ عید گاہ یا کربلا کے نزدیک۔

قبیلہ عطارد واسد۔ یہ پریزاد و دیوزاد سیارے ریل کے سفر میں محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی چمک مریخ اور زہرہ کو خیرہ کرتی ہے۔ چونکہ صرف دوربین سے دیکھے گئے ہیں اس لیے ابھی پوری واقفیت انکی ماہیت وغیرہ کی نہیں ہوئی۔ مگر بعض کا قول ہے کہ ان کی نیش زنی اور گڑگڑاہٹ قیامت کی ہے۔ اگر کسی وقت ہماری زمیں سے ٹکرا گئے تو آفت کا سامنا ہوگا۔ (سلسلہ کے ملاحظہ ہو صفحہ ؟)

---

(۱) "درحقیقت دنیا میں کفایت ہے مگر سب سے اچھی کفایت وہ ہے جو قابل فہم ہو۔"

(۲) "ہر کام کی خوبی کام کرنے والے کی غرض پر منحصر ہوتی ہے"

(۳) "زہد سب سے زیادہ مستقل نیکی ہے اور بدترین بدی بدخوئی ہے۔"

(۴) "عہد کی وفا میں مستقل رہو قبل اسکے کہ میعاد ختم ہو جائے مبادا عدول وفا سے تمھیں نقصان پہنچے"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تہذیب یوریشیائی کی جھلک ۔ قدرت کے عجیب نمونے کوہستان میں
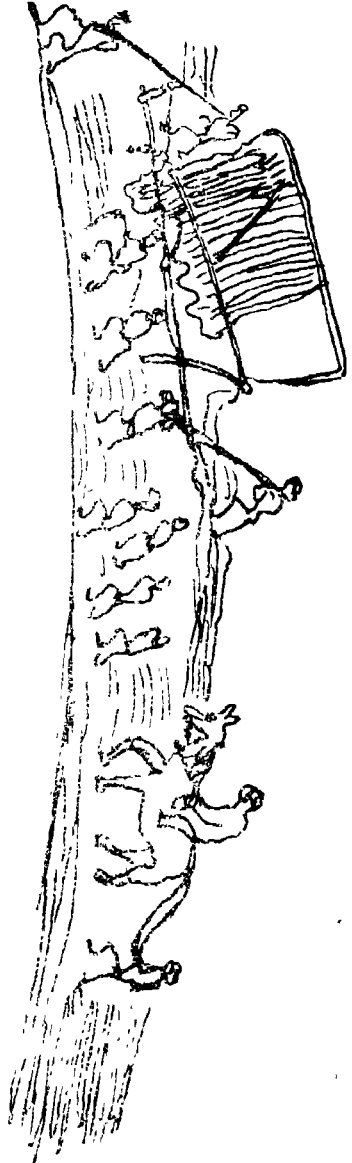
۲ تا ۵ بجے ... روز یعنی ہفتہ میں تین روز نکالا جاتا ہے

مقصود عبرت نہیں حسرت ہے

بی بی مٹکیلہ
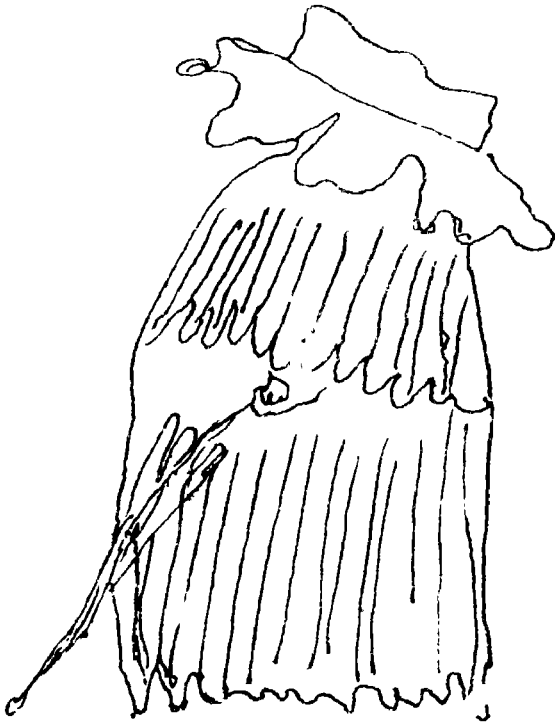
یہ عجائب المخلوقات قدرت کا نمونہ ہے۔ مسٹر ایچ جی ویلس کی کتاب "فوڈ
آف دی گاڈس" میں جس غذا کا حوالہ دیا ہے اُسپر اس بی بی کی پرورش
ہوئی ہے۔ عمر کا اندازہ صرف ٹوپی اور فراک سے ہوتا ہے۔ باقی اثر غذائیت کا
ہے کہ جس سے مشرق اور مغرب میں تفاوت کا امتیاز ذرا مشکل ہوجاتا ہے اگر
مصور اپنے حقوق اور ناظرین کی امید کو ملحوظ رکھکر چھیتری سے کام نہ نکالتا۔
موٹر پر بولیٹر کی ضرورت نہ۔ ڈانڈیوں اور رکشا والے کانوں پر ہاتھ
رکھتے ہیں۔
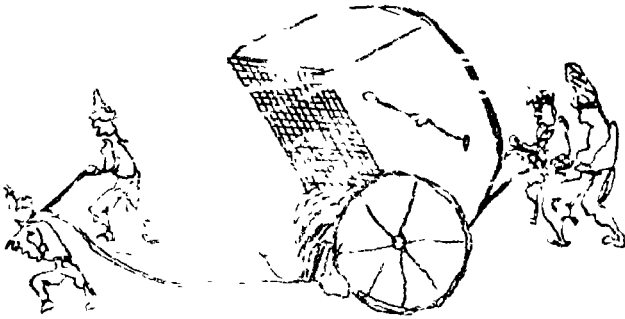
قصاب کی دوکان صبح و شام گھومتی پھرتی ہے میونسپلٹی کے قواعد کے بموجب
چلمن ڈالدی گئی ہے مگر اندر قسم قسم کے پارچے موجود ہیں مثلاً سیڈل - لائن - گک
ہمپ شولڈر - ہوائی - قیمہ - سر - توخیز - بوڈھا - حلوان -

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴

انتخاب زوج

تمدن سے اس کتاب کو خصوصیت اسلیے ہے کہ یہ ان مضامین کا مجموعہ جو تمدن میں شائع ہو چکے ہیں یہ مضامین دہلی کی ایک خاتون کے قلم سے نکلے تھے جو آج کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں - اس کتاب میں بے مرضی کی شادی اور خاوند کے انتخاب میں لڑکی کا دخل نہ ہونے کی خرابیاں دکھائی گئی ہیں کتاب ایک ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے جسکی زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے جسمیں شوہر کے غلط انتخاب کیوجہ سے سوسائٹی کی ایک نوجوان خاتون کی زندگی کی تباہی کا فوٹو کھینچ کر دکھایا گیا ہے اور رسوم قبیح پر کاربند رہنے والے لوگوں سے پُر درد اپیل کی گئی ہے کہ وہ ایسے الم ناک نتائج سے سبق لے کر سوسائیٹی کو تباہی سے بچائیں - ۱۶×۲۲ تقطیع پر بہ صاف لکھائی چھپائی کی کتاب صرف ۲ر قیمت پر ناظم دایرہ الادب سے مل سکتی ہے -

سر پا اکیلا

یہ عجیب درخت ہے جو ہمدوستان میں ہے پادر لگڑ لطیفہ گرنی تحصیل حاصل ہے۔

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴

چتر لوریشیائی المعروف بہ "بول سگ" یعنی مشروم

یہ نباتات تازہ صحرائی ہے۔ یعنی صحرا میں پہنچکر تازہ صورت پیدا کی ہے۔
بالیدگی اچھی ہے مگر قبل از وقت اگر شادابی نہ پہنچی تو سوکھکر رہجائیگا۔ باغبان نے نمایش کا خیال کیا
مگر ضرورت کو نہ سمجھا امید نہیں کہ انعام پائے کیونکہ ممتحن ہر چیز کو کاٹکر دیکھتے ہیں صرف موٹاپہ نہیں جانچتے

حمزہ خیل

شعرائے عرب
اور
اُنکا سالانہ مشاعرہ

جسطرح تمام افراد انسانی باعتبار اتحاد ذات وذاتیات وبلحاظ ماہیت مشترکہ ایک
کلی نوع کی تحت میں حیثیت مساوات رکھتے ہیں اسیطرح تمام طبقات عالم کے شعرا بلحاظ
فلسفہ شاعری وہی نسبت آپسمیں رکھتے ہیں جو ایک نوع کے افراد میں اتحاد نوعیت کے
لحاظ سے ہونی چاہیے اور بعینہٖ اُسی قسم کا تفاوت باہم شعرا میں بھی ہے جسطرح کا تفاوت
نوع انسان کے افراد زید عمر بکر میں باعتبار تشخصات مختصہ کے اور زنگی و رومی و
عراقی و حجازی میں بلحاظ اصناف کے مادہ شاعری میں تمام افراد شعرا اسیطرح
متحد ہیں جسطرح ماہیت انسان کے مختصر یہ کہ صرف تشخصات یا اصناف زبان
میں تفاوت ہے ورنہ بادہ شاعری میں سب متحد ہیں میرا اس تمہید سے صرف اسقدر منشا
ہے کہ ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ کے جذبات شاعرانہ پر پورے طور سے روشنی ڈالنے
کا حق حاصل ہو عام اس سے کہ ارباب فارس کے خیالات شاعری ہوں یا عرب کے
سنسکرت ہو یا بھاشا - انگریزی ہو یا یونانی - لاطینی ہو یا رومی - اگر اردو ادب کے
پرچوں میں ان سب کے ادب شاعری پر روشنی ڈالی جائے تو بجائے قابل اعتراض
ہونے کے نہایت مفید ہوگا وسعت نظر کے ساتھ ہی ساتھ وسعت تخیل کا فائدہ پہنچیگا
علوم کیطرف رغبت ہوگی جن کمالات اخلاقی علمی و تمدنی واقعہ نگاری وغیرہ سے
ابھی تک اُردو کی شاعری بے خبر [illegible] ہے ممکن تھی کچھ توجہ ہو - مجکو اس تمہید
کے بعد اولاً یہ دکھانا ہے کہ مادہ شاعری جو تمام افراد شعرا میں ماہیت مشترکہ کی طرح
پایا جاتا ہے شعراء عالم کے مختلف اصناف میں سے کن کن اصناف میں یہ مادہ

زیادتی وکمال کے ساتھ پایا جاتا ہے اور کسی اصناف میں کمی ونقصان کے ساتھ موجود ہے
دنیا کی تاریخ پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح اعراب نے تمام قوائے مشترکہ
انسانی میں مثل علم وعقل وجودت وذہانت وحافظہ وعلم الاخلاق وتمدن وصنعت وحرفت وغیرہ کے
مقابل میں اپنی افراد نوعی کے سب سے زیادہ حصہ پایا دوسیطح اور شاعری میں بھی انکا نمبر سب سے زیادہ
رہا اور رکیف شاعری بھی سب سے زیادہ پر وہ عدم سے ہمراہ لئے ہوئے ہیں لیکر آئے چنانچہ فن شاعری میں
عربوں نے ایسی ترقی کی تھی کہ رسالتمآب کے زمانہ کے بہت ہی قبل بلکہ صدیوں پہلے انہوں نے ایک
سالانہ مشاعرہ قصبہ عکاظ میں جو کہ معظمہ سے غالباً تین دن کی راہ ہے قرار دیا تھا اس مشاعرہ میں
عربستان کے کل اطراف وجوانب سے شعراء آ آ کر شریک ہوتے تھے اور ہر ایک دوسری کو کمال نکتہ بینی
کے ساتھ داد سخن دیتا تھا صرف زبانی داد تحسین پر ہی مشاعرہ کا خاتمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انصاف
تنقیدی نظر سے تمام شعراء کے کلام کو جانچنے کے بعد جو کلام سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا
اور درحقیقت وہ اس مشاعرہ میں سب سے بہتر ہوتا بھی تھا وہ نہایت بیش بہا
چیزوں پر سونے کے حرفوں سے لکھکر نہایت ادب و احترام کے ساتھ خانہ کعبہ میں آیندہ نسلوں
کے واسطے لٹکا دیا جاتا تھا ہمکو دنیا میں کہیں دوسری مثال ایسی شعر میں ڈھونڈے نہیں ملتی
ممکن ہے کہ کسی صاحب نے پائی ہو اس سے تو عربوں کی شاعری میں کمال کا درجہ میری محدود
نظروں نے نہیں دیکھا ہے اور خدا معلوم ایسے سالانہ مشاعرہ کے علاوہ اور کتنے مشاعرے
ماہوار وہفتہ وار منعقد ہوتے ہونگے کیونکہ اس زمانہ کا بڑھا ہوا مذاق اور عربوں کی بیچین
طبیعتیں سال بھر کی مدت مدید کے انتظار میں ہرگز ساکت وخاموش نہیں رہ سکتیں -
لیکن افسوس کہ ہم کوئی اسکا تاریخی ثبوت نہیں دے سکتے کیونکہ عرب یمن اور دیگر حصص عربستان
کا پرانا ادب ہم لوگوں تک نہیں پہنچا ہے اور تاریخ بالکل اس زمانہ کے ادب کے متعلق
ساکت ہے ہاں اگر ہم کو ملتا ہے تو سنہ عیسوی کے ابتدائی اور سنہ ہجری کے ماقبل کا کلام
ملتا ہے جسکا کچھ حصہ عشق میں ہے اور کچھ حصہ جنگ کے متعلق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ دونوں اعراب کے قدیمی مذاق ہیں جو اسوقت تک اتنے ہی دلچسپی کے ساتھ اُن میں
موجود ہیں ہمکو اُس کلام میں عرب کے جو اُنکے زمانۂ جاہلیت کا ہے لطف استعارات و
کنایات زائد ملتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اُنکے شاعرانہ جذبات کا تعلق بنسبت تخیلات کے
محسوسات کیطرف زائد تھا بالفعل مَیں اُن سات مشاعروں میں سے کسی کے متعلق کچھ لکھنے کا
ارادہ کرتا ہوں جو سبع معلقات کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں یہ وہی مشاعرہ ہیں جو قصبہ
عکاظ میں سنہ ھ کے بہت قبل زمانۂ جاہلیت میں منعقد ہوتے تھے ان مشاعروں کا بھی حال
شاید ہم تک اور یہ کلام نہ پہنچتا اگر یہ اس حیثیت کے ساتھ خانۂ کعبہ پر آویزاں نہ کیے جاتے
یوں تو عرب میں ہر زمانہ میں شعرا پیدا ہوتے رہے اور شاعری کا چرچا گرما گرمی سے ہوتا رہا
مگر تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کو ایسا زور و عروج کبھی نہیں ہوا
جیسا زمانۂ جاہلیت میں تھا عرب کا ہر خطہ و گروہ اسکے ہر طبقہ کے لوگ یہانتک کہ فلاسفر
اور ریاضی داں و مدبرین تک یہانتک کہ اطباء بھی اس سے خالی نہ تھے اور کم و بیش یہ
جوہر لطیف بحیثیت جزئیت پایا جاتا تھا میری رائے میں یہ شعراء عرب کی شاعری کے
مدارج الکمال تھے کہ فقہ و فلسفہ و جبر و مقابلہ کو بھی نظم ہی کے قالب میں ڈھال کے سمجھے جاتے
تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے شعرا ایک طرف اور شعراء عرب کے کلام ایک طرف
ہم ان مشاعروں میں جو جو شعرا شریک ہوتے تھے یا جو جو اکابرین عرب یہاں سے بغرض
سماعت آتے تھے اُنکی تفصیلی فہرست دینے سے افسوس کہ مجبور ہیں ہم نے بہت کوشش کی
لیکن تاریخ اس وادی میں آکے بالکل رُکی ہوی ہے کیونکہ ہم یہ واقعات کم سے کم سنہ ہجری
سے ایک صدی قبل کے لکھ رہے ہیں ہاں ان مشاعروں میں کامیابی کا سہرا جن شعرا
کے سر رہا ہے اُنکا ضرور ذکر کرینگے اور انشاءاللہ انھیں کے کلام پر روشنی بھی ڈالیں گے
بشرطیکہ ناظرین "تمدّن" کو اسکی طرف کچھ توجہ و دلچسپی بھی ہو۔ (باقی آئندہ)

سید علی آشفتہ لکھنوی

عالمِ تصور کے چند لمحے

او اندھیاری رات تو چاہے کتنی ہی بھیانک بن، ہاں، مان لیا تو طارمِ مجنوں سے ہم آغوش ہو چکی ہے لیکن میری سیہ بختی سے تیری تاریکی و ظلمت کو کیا نسبت، کہاں کوہ کہاں کاہ،

تیرے لیے آخر میں پیغام نور ہے جو تیری چوٹی کی سو باف میں پوشیدہ طور پر لپٹا ہوا ہے مجھے اطمیناں ہے کہ تیری افشاں کا سب سے بڑا ستارہ پھر چمکنے والا ہے۔

لیکن میرے لیے تیری پر کرب طولانیوں میں پیام نور کہاں۔

تجکو اگر اپنے وحشت خیز سکوت میں شب زندہ دار کی ہولناک (ہُو) پر کچھ ناز ہو تو ادھر دیکھ میری جگر سوز خاموشی اور تاب شکن خودداری (جواب نصیب دشمناں شاید کسی کے پیان وفا کی طرح چور چور ہو جائے گی ")کوئی آہ (ہزاروں روک کے بادلوں کو ہوا کی طرح چیرتی ہوی) مضطرب قلب سے بیزار ہو کر لب نا مانوس فریاد جب اپنی غیر محسوس اور نہ نظر آنے والی مستی بجاتی ہے اور ساتھ ہی غیر آباد ویران پہلو سے ہُوک غولِ بیابان کی طرح اُٹھکر جگر کو کباب سیخ بنا کر کام و دہن کو خشک کر کے کسی سرمست جفا پیشہ کی طرح۔جب اُس مستی کو چھڑاتی ہے " تو لاکھوں وحشتیں ہیں جو تجکو وہم بھی میسر نہیں آسکتی ہیں میرے چہرے کی بلائیں لیتی ہیں۔

تیری تمام کائنات میری ہی زلف برہم کی طرح شانہ شعاع خورشید سے برہمی پذیر ہے تو اس سے کیا اتراتی ہے جو جلوۂ خورشید بھی شرمندہ نہ ہو جسکو تیرا سایہ اور دامن خورشید یکساں ہو شاید تجکو اسپر ناز ہو کہ

تیرے پردہ میں اکثر دل گرفتہ سنسان جنگلوں میں بانسری " کی زبان میں اپنا درد دل سُنا سُنا کر سمندر منزل دلوں میں آگ لگا یا کرتے ہیں -
لیکن تجکو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سب میرے ہی ماجرا درد کے ترجمان ہیں - آہ درد جان سے پیارا درد جہاں کہیں بھی ہے میرا رشتہ دار ہے -
تجھ واژگوں پیکر کا اس میں کیا ہے -
اب تو آئی ہے تو خیر آ تو کچھ نہ سہی تاہم میں تجکو اپنی خلوت میں جگہ دیتی ہوں - افسوس میری طرح تو بھی گھبرائی ہوئی ہے آ تجھ سے دو باتیں کرکے تیرا دل بہلا دوں - لیکن یہ یاد رکھنا کہ میری باتیں تیرا دکھڑا نہیں ہیں جنکو تو نیاز یا خلیقی و سحابی سے کہتی پھرے - یہ کتاب دل کی شرح ہے - جو صرف اسی کو سنائی جائیگی " جسکو اتبک تو میں ہی جانتی ہوں.

(۲)
شب تارسے دو دو باتیں ،
میں کیا تھی

جیسے چینی کی مورت کسی خوشنما طاق پر باریاب ہوکر طرۂ آرایش ہوا کرتی ہے ایسے ہی میں بھی آغوش مادر میں چلتی پھرتی بولتی چالتی سونے کی نہایت نظر فریب مورت تھی -
میری بلا کو خبر تھی کہ خندۂ خورشید میں کسقدر فرحتیں مخلوقات عالم کے لیے قدرت ارزانی فرماتی ہے اور لیلی شب کے تبسم سے کسقدر بجلیاں گداز دلوں پر کوندا جایا کرتی ہیں - ناگاہ یہ بھولی دنیا میرے بالے پن کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کو عالم یاد میں سدھارے گی اور مجھکو ایک ایسے ہولناک میدان میں مسافرانہ غریب الوطن ہوکر آنا پڑا جس سے میں واقف نہ تھی -
(باقی آیندہ) خلد حسن علی

اخلاق نتیجہ ہے وجود بشری کا — آفاق میں باعث ہے یہی ناموری کا
مغرور میں کیوں عیب نہو کج نظری کا — بدلا یہ ملا ہے اُسے شوریدہ سری کا
کج خلق کوئی شہرۂ آفاق نہیں ہے
انساں نہیں جو صاحب اخلاق نہیں ہے

ذکر روش اہل جہاں ہو نہیں سکتا — کچھ حال زمانہ کا بیاں ہو نہیں سکتا
وہ درد ہے دلمیں کہ نہاں ہو نہیں سکتا — مجبور ہیں اب ضبط فغاں ہو نہیں سکتا
رنج اُن سے ہے جو صاحب انصاف نہیں ہیں
دعویٰ تو صفائی کا ہے پر صاف نہیں ہیں

افسوس بہت سرد ہے بازار محبت — کمیاب ہیں عالم میں خریدار محبت
پاتے جو نہیں دار وئے آزار محبت — بے موت مرے جاتے ہیں بیمار محبت
مملو زر اخلاص ہی سے صدر نہیں ہے
وہ کیا ہیں محبت کی جنھیں قدر نہیں ہے

ہے رشک قمر چہرۂ زیبائے محبت — دل لیں وہی دل ہے جو ہو شیدائے محبت
وہ آنکھ نہیں جو نہیں جویائے محبت — وہ سر نہیں جسمیں نہیں سودائے محبت
خالی ہے وہ سینہ کوئی حسرت نہیں جس میں
پہلو ہے وہ کیا درد محبت نہیں جس میں

دنیا میں ہیں جو واقف اعزاز محبت — وہ دلمیں چھپائے ہوئے ہیں راز محبت
پاتے ہیں جو کچھ ذائقۂ ناز محبت — دل سے ہیں وہ دلدادۂ انداز محبت
دنیا کے ہنر اسمیں ہیں عیبوں سے بری ہے

جو شیشہ دل میں ہے نہاں یہ وہ پری ہے

اس جنس گرانقدر کے ماہر ہیں بہت کم — جو حاصل الفت ہو بہ از عیش ہے وہ غم
کہتے ہیں قسم کھا کے محبت ہی کی اب ہم — ہے اسکے طلبگاروں کا اک دوسرا عالم
مغموم کسی حال میں دیکھا نہیں اُن کو
بستی ہو کہ صحرا کوئی پروا نہیں اُن کو

ہے دوست کی الفت بھی یہی دوست عجب دوست — بنجاتی ہے خلوت میں دم رنج وتعب دوست
لیکن ہیں فقط نام کے دنیا میں تو سب دوست — پر دہر میں ملتا ہے کسی کو کوئی کب دوست
جو دوست ہیں باہم عجب اوصاف ہیں اُنکے
آئینے بھی ہیں گرد وہ دل صاف ہیں اُنکے

پی لیتے ہیں آپس میں محبت کا جو بادہ — ہو جاتے ہیں اس نشہ سے ہشیار زیادہ
کرتے ہیں جو کچھ کہنے کا باہم وہ ارادہ — بن جاتا ہے قصد انکا دلوں کے لیے جادہ
کر دیتی ہے حال اسکا بیان سب نظر اُسکی
ہو جاتی ہے اس دوست کو فوراً خبر اُسکی

لیکن وہ محبت کہ غرض جسمیں ہو شامل — ہرگز نہ پسند اسکو کرے گا کوئی عاقل
مطلب سے جو خالی ہو وہ ہے الفت کامل — پھر کیوں نہ محبت کو کہیں عقدۂ مشکل
ہر طرح بشر نور کا گنجینہ بنا دے
یوں دل کو کرے صاف کہ آئینہ بنا دے

دعوائے محبت ہو تو پروانہ کو دیکھے — شاکی نہ کسی زلف کا ہو شانہ کو دیکھے
گر عشق بڑھے قیس سے دیوانہ کو دیکھے — انصاف سے خود قلب کے پیمانہ کو دیکھے
ہو درد اگر شوق فغاں سینے میں رکھے
بلبل کی طرح سوز نہاں سینے میں رکھے

شعر مرشدی لکھنوی

جان گئی

شہر لکھنؤ میں گومتی کے کنارے والی سڑک پر ایک نوجوان نہایت عمدہ انگریزی لباس زیب تن کیے کسی خاص خیال میں محو چلا جاتا ہے صورت شکل نہایت موزوں اور اسقدر موزوں کہ حسین کہلائے جانے کی مستحق۔ فاختائی رنگ کے سوٹ پر یہ ٹبدار کیوں والی بو کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس سڑک پر یہ نوجوان کوئی آدھی دور گیا ہو گا کہ رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور کچھ سوچ کر لوٹا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس نوجوان کو لاٹوش روڈ پر ایک بنگلہ میں بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اپنے دل سے اسطرح گفتگو کر رہا ہے۔

یہ مانا کہ اس نے انکار کر دیا کہ آپ میرے حال پر عنایت کرنی چھوڑ دیں مگر میں کیا کروں اس دل نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آخر تو کیا چاہتا ہے۔

دل۔ میں بیچارہ تو نہ تم سے کہتا نہ سنتا اگر یہ آپ کی رفیق آنکھیں آپ کے لیے یہ سامان راحت پیدا نہ کر دیتیں۔ آنکھوں نے آپ کی مس صاحبہ کو دیکھا اور اسکے بعد میری منت خوشامد کی کہ میرا کام جو کچھ تھا وہ تو ہو چکا اب جب تک حضرت دل آپ میری مدد نہ کریں گے جب تک میرا کام نہیں بنے گا۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں فاقہ مر جاؤں گی آپ ہی بتائیے کہ میں ان بیچاریوں کی کیوں نہ مدد کرتا جب یہ اپنی

لاچاری ظاہر کرکے میری مدد کی طالب ہوتی تھیں - مگر مجھے ہرگز یہ
نہیں معلوم تھا کہ یہ آنکھیں مار آستین کا کام دیں گی اور ان کی یہ
سازباز مجھے ہی تباہ کرنے والی ہوگی - اب گو آنکھوں کا بھی آپ پر
تقاضا رہتا ہے کہ ہم تو مِس صاحبہ کو دیکھیں گے مگر میرا تو ایسا سخت
حکم آپ پر لگتا ہے کہ اگر آپ اسکے خلاف کریں تو آپ کی زندگی ہی
طے ہو جائے - اب مقطع کا بند یہ ہے کہ گو آپ نے بہت ذلتیں سہیں
یہانتک کہ صاف جواب مل گیا کہ یہاں آنا چھوڑ دو مگر ایک دفعہ
اور چل کر کوشش کرو -

جناب دل - میرے تڑپانے والے دل میں بھی یہی سوچ رہا تھا
کہ ایک دفعہ تو اور تقدیر آزمائی کرنی چاہیے - اچھا چلو اب ہمارے
نوجوان پھر اُٹھے کپڑوں پر برش کیا بائیسکل اُٹھائی اور چل نکلے
مِس صاحبہ کے بنگلے پر پہنچے اپنا کارڈ بھجوایا اس وقت مس صاحبہ اُن
حضرت کی ملاقات میں مصروف تھیں جن پر انکی نئی نظر عنایت ہوئی تھی -
ہمارے نوجوان کا کارڈ دیکھکر مس صاحبہ بہت ناراض ہوئیں
اور نوکر سے کہدیا کہ " ان سے بول دو کہ اب ہم کو دق مت کریں " نوکر
نے آن کر ان کو یہ جواب دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گول کمرہ میں
... صاحب سے باتیں کر رہی ہیں -

یہ دونوں پیغامات سُنتے ہی ہمارے نوجوان کی حالت متغیر ہو گئی -
چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں - اور خجالت کے مارے عرق عرق
ہو گئے کہ کاشکے وہ لکھکر یہ پیغام دیتیں کہ تم نہ آیا کرو تو یہ ذلت نہ
ہوتی - خیر جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا ایسی زندگی سے موت بدرجہ بہتر ہے -

اب یہ یہاں سے روانہ ہوئے اور اپنی کوٹھی پر پہنچے۔ ان کے والد صاحب کو جو یہاں ڈسٹرکٹ جج ہیں اس امر کی اطلاع ہو چکی تھی انھوں نے ان کو بلایا اور ڈانٹنا شروع کیا۔ اور اس سال بی۔ اے میں فیل ہو جانے کا ذکر کیا اور کہا کہ کاشکے ایسی اولاد ہونے سے میں لاولد ہوتا۔ ڈوب مرنے کی بات ہے کہ باپ تو بی۔ اے میں یونیورسٹی میں اوّل آئے اور بیٹا اور ایسے باپ کا بیٹا فیل ہو جائے اگر میں اسکی جگہ ہوتا تو زہر کھا لیتا اور دنیا میں منھ نہ دکھاتا۔

ہمارے نوجوان تو وہاں کے نکالے ہوئے اور زخم خوردہ تھے والد صاحب کے اس غصّہ نے مرے پر سو دُرّوں کا کام کیا۔ اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اور چاروں طرف کے کواڑ بند کر کے پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگے اور آخر کو یہ فیصلہ کیا کہ اب دنیا میں زندہ رہنا بے کار ہے۔

مرنے کا قطعی ارادہ کر کے پہلے بہت دیر تک روتے رہے اسکے بعد مس صاحبہ کے خطوط نکال کر سب کو پڑھا اور ان کو انگیٹھی میں رکھکر جلا دیا۔ اسکے بعد میز پر آئے اور یہ لکھا۔

"کہ مَیں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب زندہ رہنا بیکار ہے اور اس لیے مَیں اپنا خاتمہ کرتا ہوں"

یہ خط لکھکر اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئے اور انکی الماری میں سے ریوالور نکال کر اپنے دل پر رکھا اور بسم اللہ کہکر ریوالور کا گھوڑا دبا دیا۔ اس آواز کو سُنتے ہی سب لوگ کمرہ میں پہنچے۔ دیکھا تو ہمارا نوجوان تڑپ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں ملک عدم کو سدھار گیا۔ کپڑے اُتارتے وقت اسکی جیب سے وہ خط نکلا۔

کیوپڈ و سایک

(بسلسلہ تمدن ماہ نومبر)

(۷)

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو، کیونکہ اُسکی بلند چوٹیاں نہ صرف اسوجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تجلی گاہ تھیں، بلکہ اسوجہ سے بھی کہ اُنکو آباد کرنا اک انسانی قوت سے باہر تھا۔ ہمیشہ ویران اور سنسان رہیں۔ ناقابل پیمائش غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے چشموں کی اُسمیں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آوازِ بازگشت اور بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ۔ یہ تھا کوہ اولمپس، جہاں کیوپڈ نے سایک کے ساتھ رہنا پسند کیا اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کیوپڈ سب دیوتاؤں میں بہت کمسن، ناتجربہ کار اور نازک دیوتا...... تھا تو یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اُس نے کیوں ایسے زہرہ گداز مقام کو سایک کے قیام کے لیے منتخب کیا۔ مگر نہیں یہ انتخاب اُس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جب اُسکی ماں وینس کو خبر ہو جائے گی تو وہ کوئی دقیقہ سایک کی ہلاکت کے لیے نہ اُٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟

کوہ اولمپس ہی اک ایسا ٹھکانا تھا، جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سایک کے ساتھ امن وسکون میں بسر کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب نازل

کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹیوں پر اُتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بارہا اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپٹر کا غصہ آگ بنکر نکلا اور دور دور کی آبادیوں کو بھی تباہ کر دیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے قہر کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا۔ یا کس کو ہمت ہو سکتی تھی کہ وہاں جانے کا نیاں دلمیں لائے مگر کیوپڈ چونکہ جیوپٹر کا محبوب ترین فرزند تھا اور اپنی خدمات کے لحاظ سے نہایت اہم دیوتا تھا اسلیے وہ وہاں پہنچ سکا اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں مانفیس وزفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زریں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جو اُس نے سائیک کو مسرور کرنے کے لیے تیار کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے موصلت کی مسرت، ایک ایسی مسرت سائیک کے لیے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اُسے یہ ہوش بھی نہیں ہوا کہ وہ ہے کہاں اور نہ اسکا وہ کبھی خیال کر سکتی تھی۔ کیونکہ اب تو اُسکے دل میں صرف ایک آرزو تھی کہ وہ کسی وقت کیوپڈ سے جدا نہو، مگر پورے ایک ہفتہ تک تو اُس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائیک کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اب اُسے یہ دلشکن حقیقت معلوم ہوی کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت اُسے نہیں دے سکتا کیونکہ انھیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ رہنے سے کرۂ ارض میں بے رحمی، کج خلقی، اور زندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لیے ضرورت تھی کہ وہ اپنے تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ چند دن کام کرے اور جتنی کمی محبت کی دنیا میں ہو گئی ہے اُسے پورا کر دے۔

نہ سائیک کو اسوقت تک اس بات کا علم تھا کہ اُسکا شوہر یا عاشق کیوپڈ ہے اور نہ کیوپڈ ہی اس حقیقت کا اظہار اسپر کر سکتا تھا اس لیے اُس نے سائیک کو یہ تو بتایا نہیں کہ اُسکے فرائض کیا ہیں اور کیونکہ یہ معلوم کرنے کے بعد کون جوان لڑکی ایسی تھی جو نہ پہچان لیتی) مگر ہاں اُس نے اپنی روانگی کو نہایت اہم وجوہ کی بنا پر ضروری قرار دے کر سائیک سے اجازت طلب کی اور کہا کہ اس مختصر غیر حاضری سے اُسکی محبت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ سائیک نے

آخر کار بادل ناخواستہ اُسکو اجازت دی، لیکن سوال یہ تھا کہ جبتک وہ آئے گا
سایک کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟ اسکا
حل بیشک ذرا دشوار تھا، لیکن آخر کار سایک نے کچھ غور کرنے کے بعد کیوپڈ سے کہا کہ وہ
حوالی قصر میں اُن تمام سامان تفریح کو مہیا کردے، جنکی وہ اپنے زمانۂ دوشیزگی میں
عادی تھی۔ کیوپڈ نے فوراً فرش سے دو گلدستے لے کر زمین پر دے مارے جو زمین میں
غائب ہوگئے اور بجائے اُن کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹکے
ہوئے تھے اور جن کی عمریں چودہ سال سے زائد نہ تھیں نکلکر سایک کے سامنے
کھڑے ہوگئے، کیوپڈ نے اُنسے کہا کہ "جاؤ اور قبل اسکے کہ ملکہ سایک ؟ تھوک
دروازہ تک پہنچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کردو جو والی یونان کے
محل سے متعلق ہیں" اُن کو رخصت کرکے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے
سب کو فرش زمین پر ٹپکنا شروع کیا یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر نہایت حسین
پریوں سے بھر گیا اور سایک ان پریدار پیش خدمتوں سے گھر گئی۔ اُنکے
ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب
مشکر خوشبو پیدا ہوتی تھی، سایک اس مختصر زمانہ میں اس نوع کے عجائب و
غرائب سے اس درجہ آشنا ہوگئی تھی کہ اُسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور وہ
کیوپڈ کے شانے پر ہاتھ رکھکر پریوں کے حلقے میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اُسکی
نگاہ دروازہ سے باہر نکلکر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر رہ گئی، کیونکہ اُسکی سمجھ میں
نہ آتا تھا کہ چند لمحات میں، شاہ یونان کا باغ مع اپنی روشوں، کنجوں، درختوں،
حوضوں، فواروں، اور نہروں کے کیونکر یہاں منتقل ہوسکا، وہ اس باغ اور
اُس باغ میں سوائے اسکے اور کچھ فرق نہ پاتی تھی کہ وہاں بلور کے ٹکڑے
روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس وہاں حوض سنگ مرمر

اور بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوی چاندی کے، وہاں حوض کی مچھلیاں صرف رنگین تھیں اور یہاں رنگین بھی تھیں اور درخشاں بھی۔ سائیک خوش خوش اس باغ میں داخل ہوی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوی پھولوں کو سونگھتی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی، اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں، شام ہو گئی تھی اور چاند نکل آیا تھا اس لیے پھر سائک وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اُسنے کیوپڈ کے ساتھ اُس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اُس نے پوری ایک طویل رات نہایت حسرت و ناکامی کی حالت میں کاٹی تھی اور اسیلیے آج وہ اس چاندنی کو جلانا چاہتی تھی جس نے سائیک کو اسدن بہت تڑپایا تھا۔

صبح ہوی اور کیوپڈ کے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ ہر چند سائیک کو یہ جدائی نہایت شاق تھی، لیکن اس نے کہا "کہ اچھا جاؤ میں بھی جب تک تم نہ آؤ گے پھولوں کے ہار تمھارے لیے گوندھا کروں گی اور پھر انھیں یہ کہکر توڑ توڑ ڈالا کروں گی کہ اچھے نہیں گندھے، یہانتک کہ تم آجاؤ گے اور میں صرف ایک ناتمام ہار تمھارے محبت بھرے سینہ کے لیے پیش کرسکوں گی"۔

کیوپڈ نے جلدی سے سائیک کو آغوش میں کھینچکر
فضا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔

(۸)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گذر گیا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لیے باہر چلا جاتا تھا اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائیک کے پاس آکر رہتا ہر چند سائک بھی اُسکی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں وہ انتظار کی گھڑیاں کو مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی، لیکن، وہ کیوپڈ کی اس گھڑی

گھڑی کی مفارقت سے بسا اوقات بہت دلگرفتہ اور مضمحل ہو جاتی، کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسی کا ہمجنس مل جائے اور وہ اُس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد سے وہ ان پریوں سے اشارہ سے کام لیا کرتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کرسکتیں اور شاید کیوپڈ نے قصداً ایسی پیش خدمتیں مہیا نہیں کیں جن سے سائیک گفتگو کرسکتی ۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اسکے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اُسکے جلو میں ہوتی، لیکن وہ ان بیجان یعنی بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "مَیں تو اب بھی ویسی ہی تنہا ہوں" جسوقت تک عورت اپنی محبّت میں کامیاب نہیں ہوتی، اُسوقت تک اُسکی زندگی اِک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے نہ وہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا، لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اُسکی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کرلے، تو وہ تنہا ہونے پر بھی بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے بیزار جب تک اُسکی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں ہوتا وہ یہی آرزو کیا کرتی ہے کہ کوئی اُسے یہ بتائے کہ اُسکے حسن و شباب میں کچھ لذتیں ہیں بھی یا نہیں، لیکن جب کوئی اُسے مل جاتا ہے اور اُسکی جوانی کی لذتوں کو اپنے اعترافات فعلی سے اُسکے لیے قابل فہم بنا دیتا ہے تو پھر عورت اپنے مسرت کے بار کو برداشت نہیں کرسکتی اور اپنے ہی جنس و عمر کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے، جس سے وہ اپنی لذتوں کو بیان کرے، یعنی جسطرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اُس طرح اب اپنی مسرور شادکام حالت میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اُسپر رشک کرے۔ اسلیے سائیک بعض وقت گھبرا اُٹھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اُسکی بہنیں ہی اگلاس وکیوپڈ سے آکے دیکھیں اور اُسکی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن، جبکہ کیوپڈ خلافِ معمول کئی دن کی دیر لگا کر آیا، تو سائیک مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انھیں کو یہاں بلواؤں گی۔ وہ میرے لیے مضمحل و پریشان ہوں گی کہ خدا معلوم کس عفریت نے میرا لقمہ کیا اسلیے میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں آ کے مجھے دیکھیں اور خوش ہوں اُس نے یہ بھی کیوپڈ سے کہا کہ اب وہ تنہائی سے بہت گھبرانے لگی ہے۔ یا تو وہ کہیں جایا نکرے کہ اس صورت میں پھر اُسکو کسی چیز کی ضرورت نہیں اور اگر اُسکا جانا نہیں رک سکتا تو پھر کیوپڈ میں اور اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انھیں کے ساتھ کٹیں۔

کیوپڈ خاموشی سے سائیک کی اس ضد کو دیکھتا اور سُنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اُسنے نہایت سنجیدگی سے یہ متفکر جواب دیا کہ "اے سائیک میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کسی بات میں نہیں کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کیوپڈیس و اگلارس کا آنا میری مسرت کو خاک میں نہ ملا دے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اُنکے آنے سے تمھاری بعض ضدیں پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات پیش نظر ہو جائیں جنکے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ یہاں آ کر تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور یہی ایک چیز ایسی ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اے سائیک رحم کر اور مجھے اُنکے بلانے پر مجبور نہ کر"، مگر سائیک جسے اپنی محبتوں پر پورا اعتماد تھا اور جو اسوقت یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ آ کر کیا ایسی نئی بات پیدا کر سکیں گی جو کیوپڈ کے خلاف ہو، اپنی ضد پر قائم رہی۔ کیوپڈ نے مجبوراً مارفیس اور زفر کو پھر بلایا اور اگلارس اور کیوپڈیس کے لانے کا حکم دیا لیکن اسی کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ انپر یہ کسی طرح نہ ظاہر ہونے پائے کہ کس کے ارشاد یا حکم سے وہ طلب کیجاتی ہیں شام کا وقت تھا، آفتاب کا ارغوانی سایہ کوہ اولمپس کی چوٹیوں کو رنگین بنائے ہوئے تھا۔ سائیک اپنی بہنوں کے

انتظار میں فرشِ گل پر بیٹھی ہوئی کیوپڈ کے سامنے ساز پر گا رہی تھی کہ :-
میں اُن راتوں پر رشک نہیں کرتی جنہیں تو میرے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جب تک تو میرے
پہلو میں ہے صرف میرا ہے - لیکن ہاں جلتی ہوں میں ان راتوں سے جنہیں تو مجھ سے
بچھڑ جاتا ہے کیونکہ پھر تیری معیت انھیں کے ساتھ ہے جب تو کہیں چلا جاتا ہے تو
یہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں کیونکہ میں تو صرف تجھے پانے کی اک آرزو ہوں،
اور وہ آرزو تیرے ساتھ ساتھ ہے جہاں بھی تو ہو - پھر اگر تو مجھ سے جدا ہو کے تو میرا
خیال رکھتا ہے تو تو غلطی کرتا ہے، کیونکہ میں تو تیرے ساتھ ساتھ ہوں خیال کیسا؟
تو اپنے فرائض کے انہماک میں ایک دفعہ ناگہاں چونک کر کچھ سکوت کرتا ہے سوچنے
لگتا ہے، وہ سکوت و فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے ہٹا لیتے
ہیں - تو رات کو کسی دور دراز ملک میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے اور گھنٹوں جاگ کر
کروٹیں لیا کرتا ہے یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائیک ہے جو تیری آنکھوں
میں سما جاتی ہے اور تیرے پہلو میں لپٹ جاتی ہے - لوگ کہتے ہیں کہ محبت بُری ہے
مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لیے شاید کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے
چلایا - ...."

کیوپڈ کے بدن میں اس فقرے سے اک جنبش ہوئی اور اپنا اضطراب دور کرنے کے
لیے قطع نغمہ کرکے بولا کہ "اے سائیک کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا" سائیک
بولی "ہاں سچ ہے تمھیں نے چلایا - تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے،
کیونکہ میں نے سُنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کر سکتا، اُسکے دل میں ذرا رحم
نہیں ہے اُسکا سینہ گداز عشق سے خالی ہے وہ سفاک ہے اور تم تو مجھسے محبت
کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو" کیوپڈ - "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ میں
واقعی کیوپڈ نہیں ہوں مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی شائد

درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی روایتیں یوں ہی غلط مشہور ہو جاتی ہیں اور تمھیں کیا علم
کہ اسوقت وہ کس حالت میں ہے"
یہاں یہ گفتگو جاری تھی کہ مارفیس اور زفر، سایک کی بہنوں کو اپنے نازک ہاتھوں
پر لیے ہوے آگئیں اور انھیں جگاکر غائب ہوگئیں۔ سایک اپنی بہنوں کو قصر میں
لے گئی اور اک اک چیز وہاں کی دکھائی اور پھر وہاں سے باغ میں لائی اور اک
تفاخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ بہت کڑھیں کہ سایک ابھی تک
نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے کہ کبھی اُنکے خواب و
خیال میں بھی ... ... نہ آسکتی تھی، لیکن ظاہر میں انھوں نے سایک کو مبارکباد
دی اور پوچھا کہ یہ زروجواہر، یہ سامانِ نشاط کہاں سے آیا"؟
سایک نے جواب دیا کہ "مجھے نہیں معلوم کہاں سے آیا اور کون ہے جس نے
مہیا کیا؟"
انھوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اسوقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی
تجھے نہیں بتایا"
"آہ، میں اس کا نام نہیں جان سکتی، کیونکہ اُسکی سخت ممانعت ہے"
وہ بولیں "مگر اے بہن تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا۔ کیا بہت خوبصورت ہے"
"نہیں میں نے اُسکا چہرہ تو نہیں دیکھا کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے،
مگر ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب میں اُسکا چہرہ محبت سے روشن و منور
پاتی ہوں"
کیوپڈس بولی "اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی بدشکل عفریت ہے جو
جو کسی دن تجھے کھالے گا"
سایک نے کہا کہ "نہیں وہ عفریت نہیں ہو سکتا، مجھے اسکا یقین ہے" مگر دونوں

ہنوں نے پھر بھی کہا اور اسقدر اصرار کے ساتھ اُس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سایک بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اِس تفکر سے اُنھوں نے اور فائدہ اُٹھایا اور اسے مجبور کیا کہ ابھی جائے اور نقاب اُلٹ کر اُسکا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی اور کیوپڈ اپنی خوابگاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا۔ سایک آہستہ آہستہ گئی اور اُسکے چہرہ سے نقاب الٹ دیا، مگر بجائے اسکے کہ وہ ایک عفریت کی ڈراونی صورت دیکھتی اُس نے نہایت ہی حسین وجمیل شکل کیوپڈ کی دیکھی اور اسی اک لمحہ میں سایک کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لیے۔ کیوپڈ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ:-

اے بیوقوف سایک یہ تو نے کیا کیا۔ کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں ایک دیوتا ہوں، اور کیا تجھے یہ علم نہ تھا کہ کوئی شخص میرے چہرہ کو دیکھکر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ کہہ کر اُس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سایک نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھکر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ وہ لوٹ آئے اور اُسکی خطا معاف کرے۔ ہرچند کیوپڈ سایک کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اُسکا جی چاہا کہ اُس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رک گیا۔ کیونکہ اب ایسا کرنے سے اُسکی غیرفانی روح چھین لی جاتی۔ اس لیے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سایک کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سایک بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی، لیکن ہاں، جب اُسکی آنکھ کھلی، تو نہ وہ قصر تھا اور نہ وہ اُسکی مکلف خوابگاہ۔ نہ وہاں باغ اور نہ کوئی کنیز، وہی سنسان اور وحشتناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ قربانی کے لیے لائی گئی تھی اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جسکے تنے سے وہ باندھ دی گئی تھی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشتناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن نہیں تھوڑی دیر بعد اُسے

یہ یقین کرنا پڑا کہ خواب یہ نہیں ہے مگر خواب تو وہی تھا جس میں اس نے ایسی پُر لطف زندگی بسر کی تھی۔ مگر ایسا طویل خواب کبھی خواب نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر کیا تھا؟ آہ، وہ اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ بالکل مبہوت تھی دیوانہ پن اُسکے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا اور وہ فوراً مرجانا چاہتی تھی۔

(۹)

سایک دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے سارا بدن چوٹوں سے داغدار کراہتی تھی، روتی تھی۔ چیختی تھی اور گر پڑتی تھی، کہ ہائے اب وہ صورت کہاں ملے، ہر شخص اُسکی تباہ اور برباد حالت پر جی دکھا سکتا ہے لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا۔ اُسنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سایک کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس گئی۔ جیوپیٹر اُسکا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اُسکی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی اس لیے اس نے کچھ ایسی تدابیر حُسن افزا وینس کو بتا دیں جس سے وہ سایک کے سامنے حجاب نہ کر سکے اس نے ان تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بنکر بیٹھ گئی کہ اب اُسے سایک کے حُسن کیطرف سے ذرا کھٹکا نہ رہا باولی سایک لائی گئی، مگر وینس یہ دیکھکر کہ اس خستگی و پریشانی کے عالم میں بھی سایک کے حُسن کا وہ عالم ہے کہ اب بھی وہ اُسکا مقابلہ نہیں کر سکتی عرق عرق ہو گئی اور دل میں یہ ٹھان کر اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اُسکو مار ڈالنا ہی بہتر ہے۔ لیکن رات کو جیوپیٹر نے وینس کے خواب میں آ کر اُسکا یہ خیال بدلدیا اور سایک کی جاں بخشی کی شرط یہ قرار دی گئی کہ وہ دیوی پرسرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سایک اپنی قسمت کا فیصلہ سُنکر کانپ اُٹھی، کیونکہ اُسکی نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب سے گہرے غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی

لیکن ایک آواز اسکے کانوں میں آئی جسے سوائے اسکے اور کسی نے نہیں سُنا کہ گھبرا نہیں تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے" یہ محبت بھری آواز اُسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگئی۔ نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پرواہ کی اور نہ درندوں کی، نہ اُس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ وہاں ایک روشنی تھی، اک محبت پاش جھلک تھی جو اُسکی رہنمائی اور ان مصائب میں اُسے تسکین دیتی جاتی تھی۔ راستے میں درندے اُسے ملے مگر وہ اُسکے حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا اُس کی راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح پرآسرپاین کے دربار تک پہنچی اور اُسنے رحم کھا کر وہ صندوق سایک کے حوالہ کر دیا۔

سایک خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لاکر ڈال دیا مگر وینس سایک کے اس عزم واستقلال سے اور زیادہ جل گئی اور بدعہدی کے لیے تیار ہوگئی۔ مگر جیوپٹر اسپر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سایک کو چھوڑ دے کیونکہ جب وینس کے پاس طلسمی صندوق آگیا ہے تو اسکو کسی کے حسن سے جلنے کی ضرورت نہیں ہے آخرکار وہ بھی اسپر راضی ہوگئی اور سایک کو جیوپٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلادی جسکے اثر سے وہ بھی غیر فانی ہوکر آسمانی مخلوق میں شمار ہونے لگی۔

(۱۰)

کیوپڈ و سایک پھر اُسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سایک کی پھر وہ زندگی شروع ہوگئی جس زندگی کا خواب وہ ایکدفعہ دیکھ چکی تھی۔ اسکے بعد کیوپڈ نے کبھی اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا، مگر ہاں اُسوقت جب اُسکو انسانوں کی نگاہ سے چھپکر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا ——————

نیاز فتحپوری

۲۷ اپریل ۵۱ء کی رات تھی گرمی کا موسم تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے دل میں آیا آؤ آج تو کنگ ایڈورڈ پارک (دہلی) کی سیر کریں بس پھر کیا تھا حضرت دل کے نادر شاہی حکم کا اقلیم ہستی میں اعلان ہو گیا۔ فوراً حواس خمسہ کی تار برقی پاؤں کی سفر مینا کو پہنچا دی گئی کہ ہاں بڑھے چلو۔ سینے کے ہوادار پر جلالت مآب سلطان الاعضا دل خلد اللہ ملکہ و حشمتہٗ سوار تھے جلو میں شوق ہمرکاب تھا قطع سفر کچھ منٹوں میں ہو گیا۔ یہ باغیچہ جامع مسجد کے سامنے واقع ہے اول تو یہاں کی فزا پہلے ہی سے قابل دید تھی اب اس باغیچے نے سونے پر سہاگے کا کام دیدیا ہے اس باغ کے چاروں طرف لوہے کے جنگلے لگے ہوئے ہیں ان سے ملے ہوئے پھولوں کے درخت چلے گئے ہیں پودے جتنے بد دور جو برس ڈیڑھ برس کے لگے ہوئے ہیں وہ جوان رعنا کے ہم قد نظر آتے ہیں کیاریاں گو عہد طفولیت میں ہیں مگر قرینہ بتا رہا ہے کہ شباب آنے دو قیامت کے فتنے دیکھ لینا ہمارے ہی رنگ میں پوشیدہ ہونگے دلفریبی عشوہ گری میں ہم اپنی نظیر آپ ہوں گے۔ غرض زمردی فرش پر نندہ دلان دہلی جلوہ آرا نظر آتے ہیں پیچھے قہقہے کی صداؤں نے عالم بالا کے رہنے والوں کو ہوشیار کر دیا۔ خوش گلو حضرات نے علم موسیقی کے دلکش ترانوں سے بزم تیموری کے آخری تاجدار بہادر شاہ کے شبستان عیش کا سماں پیش نظر کر دیا۔ جب حضرت دل کی سواری باغ میں داخل ہوئی ہے تو درخت تعظیم کے لیے استادہ ہو گئے۔ شاخیں جھک جھک کر آداب بجا لائیں۔ یہ سب کا سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے

نرگس سرِراہ کھڑی تھی فوراً آنکھ ماری دل اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا کسی کا تیر نگاہ پہلے ہی مجروح کر چکا تھا۔ اوس نقشے نے زخم پر پھر خط کشی کر دی ہمنشینوں نے بمشکل سنبھالا گلاب کے تختے کے پاس لیجا کر لٹا دیا۔ رفتہ رفتہ ہوش میں آئے طبیعت ٹھکانے پر آنی شروع ہوی تھی کہ قریب سے کسی غنچے کے چٹکنے کی آواز آئی یہاں خیال ہوا

کوئی بم پھینکا گیا

فوراً مصاحبوں نے حلقے میں لے لیا۔ یہ دیکھکر غنچہ مسکرایا۔ دل کو بہت ہی تاؤ آیا نہایت خفیف ہوے غنچے نے کہا آؤ میری بہار دیکھو۔ انھوں نے یاس کے انداز میں فرمایا تم میری حسرتوں کا مزار دیکھو۔ غنچے نے کہا پھر میرے اجزا پریشان ہو جائیں گے۔ جواب دیا گیا۔ تیرے پریشان ہونے سے میرے اوسان ہوجائینگے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ موتیا نے آگے بڑھکر کہا بندہ پرور آداب عرض ہے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو مست ہو گئے۔ موتیا کا کٹورا تھا کہ مئے ارغوانی کا جام۔ فرمایا آگے آؤ۔ موتیا نے کہا۔ دست شوق دراز کیجیے توڑیے اور دامن میں رکھ لیجیے۔ یہ بار بار اُسکی خوشبو سونگھتے اور حظ اُٹھاتے رہے یک بیک کچھ خیال آیا آبدیدہ ہو گئے فرمانے لگے۔ آہ تو مجھ سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ ٹوٹنے کے بعد بھی کوئی سر پہ جگہ دیتا ہے کوئی زیب گلو کرتا ہے لیکن میرے مرنے کے بعد سونگھنا تو درکنار ہزاروں من مٹی کا انبار ڈالدیتے ہیں تاکہ پھر کبھی صورت نہ دکھائی دے یہ سُن کر

پھول نے قہقہہ مارا

اور کہا آپ عاقل ہو کر نادان بنے جاتے ہیں مرنے کے بعد میں اور آپ دونوں یکساں ہیں غور فرمائیے میں شب کو کسی بت طناز کے گلے کا ہار ہو جاتا ہوں اور صبح ہی نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا جاتا ہوں۔ میری زندگی میرا شباب ہے اور شباب کے

ساتھ ہی میری قدر ہے جہاں باسی ہوا اور نظروں سے گرا۔ لیکن آپ ایک ایسی مخلوق ہیں کہ بعد جوانی بھی قدر کے قابل ہیں لوگ آپ سے پیچیدہ معاملات کو سلجھاتے ہیں آپ کی رائے کی عزت کرتے ہیں ہر محفل میں تجربہ کار آدمی کو بڑا سمجھ کر صدر بنا دیا کرتے ہیں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی یک شبی ہے اور آپ کی ہزار شبی بلکہ اُس سے بھی زائد۔ تاہم میری ہستی کا ہر ورق معرفت الٰہی کا دفتر ہے نصیحت و عبرت کی مجلد کتاب ہے اگر آپ کی آنکھیں روشن ہیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں لیجیے یہ پہلے ورق کی چند سطریں تو پڑھیے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔ یہ دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اسکے علاوہ سب سے آخری صفحہ یہ ہے ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ لیکن مجھے آپ کی حالت پر افسوس آتا ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر تمہاری آنکھیں مظاہر کے دیکھنے کی عادی نہیں اگر دیکھ بھی لیتے ہو تو حظ نفس کے لیے آپکو زیبا تھا کہ بلحاظ اپنے مرتبہ کے سب سے زیادہ خدا کی معرفت کے ساتھ قربت حاصل کرتے۔ اب مجھے چھوڑ دیجیے کمہلانے لگا ہوں میری زبان آپ کی اُنگلیوں میں مقید ہے ورنہ کچھ اور بھی کہتا یہ سُنکر دل نے ایک چیخ ماری ہاتھ پیروں میں رعشہ آگیا کپکپایا لڑکھڑایا آخر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ پھول کے ساتھ دل بھی خاک پر پڑا ہوا تھا۔

مقرب حسین مقرب دہلوی

اُردو کا طوطی

لے میری پیاری زبان۔ تیری اداؤں کے قرباں۔ تیری شیرینی و لطافت کے صدقے۔ تیری خوبیاں مجھ جیسے دلدادہ سے پوچھے۔ ہاں پوچھے مگر میں اُسکے اظہار سے عاجز۔ اُس کے بیان سے قاصر۔ قوت گویائی گو تجھپر ناز کرتی ہے مگر تیرے اوصاف کے اظہار میں سر بگریباں۔ زبان کو یارا نہیں۔ اسکی اوقات کیا اُس کی بساط ہی کیا جو دم مارے۔ اچھا میں دم بخود ہوں۔ دل خوب جانتا ہے۔ اُسکا جاننا کافی اُسکی گواہی قابل وثوق۔ تیرا لطف حُسن ادراک ہی پر منحصر ہے۔

مگر کچھ تو کہوں۔ ہاے دل کا تقاضا بھی بُرا ہوتا ہے۔ تو تیری سوانحمری بیان کروں تیرے عالم وجود میں آنے کی کیفیت لکھ ڈالوں۔ نہیں نہیں۔ یہ سب جانتے ہیں۔ اسکا بتانا۔ اس کا لکھنا کیا سیکڑوں نے لکھا۔ ہزاروں نے پڑھا۔ عالم جانتا ہے۔ تو تیری خوبیوں کو احاطہ تحریر میں لاوں ہاں کچھ کرنا چاہئیے۔ کچھ تو ہو۔

تو ایک مرغ زریں بال ہے۔ شیریں مقال ہے۔ خوش لہجہ ہے۔ خوش آواز بھانت بھانت کی بولی بولتا ہے۔ کبھی ہندی راگ الاپتا ہے۔ گاہ فارسی کی زبان میں نغمہ سرائی کرتا ہے۔ کبھی عربی لہجے اُڑتا ہے۔ تجھ سے کوئی زبان نہ بچی۔ ترکی۔ انگریزی۔ کیا کیا کہا جائے اور لطف یہ کہ پھر اُردو کی اُردو ہے اللہ رے تیرا حُسن قبول۔ غیروں سے یہ مناسبت۔ یوں شیر و شکر ہونا کہ خیال بے ربطی پیدا ہو۔ بے لطفی کا نام نہیں۔

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قربان - ہے تو عجب چیز - تیری فصاحت و بلاغت - تیری شیرینی و لطافت کا کیا کہنا - تو کہاں نہیں - تیرا سکہ چار دانگ عالم میں چل رہا ہے - بنگالے پر تیرا جادو چلا - پنجاب میں تیرے بحر بے پایاں کی روانی - کشمیر میں تیری گرم بازاری - بمبئی مدراس جہاں دیکھیے تو موجود تیرے شیدائیوں کا جم غفیر دست بستہ حاضر - اے حسن بلاغت کی دیوی تیرے مرکز بھی بتا دوں - تیرا مندر لکھنؤ میں - تیرا کلیسا دہلی میں مگر تیرے حسن عالم افروز کا کیا کہنا زمانہ فیض یاب - تیرے حسن کی جھلک - دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے - ہاں جا تیری - تیرے شیدائی - تیری پرستش کرنے والے - تیرے پوجنے والے - دور دور سے ان مرکزوں کی جانب کھنچ کر جاتے ہیں - تیری بارگاہ میں باریاب ہو کر تیرے چشمۂ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں - وہ ذائقہ حاصل ہوتا ہے کہ تا ابد نہیں بھولتے - امتیاز کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے - تیرا دیدار ٹکسالی صورت میں نصیب ہوتا ہے -

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قربان - ہے تو عجب چیز - ہاں تیرا سکہ دلوں پر چلتا ہے اور چلتا رہے - تیرا عالم فریب حسن مسخر کرتا ہے اور کرتا رہے - تیری زلف گرہ گیر کمند پھینکتی ہے اور پھینکتی رہے - ہاں ہاں تیرا طوطی بولتا ہے اور تا حشر یوں ہی بولتا رہے - آمین ثم آمین -

ناولہائے قاری ماسٹر باسط بسوانی

یعنی سعید - سعادت - شاہد رعنا

جناب قاری محمد سرفراز [illegible] صاحب عزنی دہلوی کے اخلاقی ناول جو دو مرتبہ چھپ چکے ہیں - اب پھر زیر طبع ہیں - جو صاحبان خریداری چاہیں وہ دفتر "تمدن" کو اطلاع دیں -

مینجر

ناداری

مثل مشہور ہے "پیری و صد عیب" میں کہوں گا "ناداری و صد عیب" مفلس ہونا بذاتہ کوئی عیب نہیں ہے۔ لوگوں میں مفلس مشہور ہونا مصیبت ہے۔ جہاں لوگوں کو یہ گماں ہو گیا کہ فلاں شخص غریب ہے۔ بس پھر دنیا اُس سے بچ کر نکلنے لگے گی۔ مالدار چور لباس فاخرہ پہنکر نکلے تو شریف سے شریف اُسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سر بازار نکل جائے گا۔ لیکن مفلس ساہوکار سے گلی میں بات کرتے ہوے بھی ہر شخص شرمائے گا۔ جس طرح ہندو غیر مذہب والے سے چھوت کرنے لگتے ہیں اسی طرح دنیا مفلس سے بچتی ہے۔ امیر ہوکر جو غریب ہو جائے اسکی اور بھی مشکل ہے۔ اسکے قدیم نمکخوار۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست۔ اسکے بھائی بند سب اُس سے آنکھ چرانے لگتے ہیں۔ وہ خود بھی اُن سے بچنا چاہتا ہے۔ کہاں وہ زمانہ کہ سب اُسکی جوتیاں سیدھی کرتے تھے اُسکی غلط بات کو بھی صحیح بتاتے تھے اسکے عیوب کو خوبی سمجھتے تھے کہاں یہ وقت کہ اُسکی طرف سے منھ موڑ لیتے ہیں وہ ٹھیک بات بھی کہے تو اسے جھوٹ سمجھتے ہیں اسمیں کوئی خوبی ہو تو اسمیں بھی بُرائی نکال دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ شاہان دہلی و نوابان اودھ کا عروج تھا۔ اُن سے زیادہ نہ کوئی شکیل تھا نہ اُن سے زیادہ کوئی عقیل تھا۔ دنیا بھر کی خوبیاں اُن ہی میں جمع ہو گئی تھیں۔ اُن ہی کی اولاد اب ہے کہ اُسکے پاس کچھ نہیں ناداری کی بلا میں گرفتار ہے کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا بلکہ اُنکی خوبیوں کو بُرائی سمجھتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ "ان لوگوں میں زبانی جمع خرچ بہت ہے ان سے کام نہیں ہوتا" کوئی کہتا ہے "صاحب بغیر برف کے تو ان کے حلق سے پانی نہیں

اُترتا دس روپیہ مہینے کے یہ پان کھا جاتے ہیں بھلا ان سے کیا نوکری ہونی ہے
ابھی ان کے پاس دولت ہوتی تو ان ہی عیوب کے متعلق یہ کہا جاتا "اجی ہاتھی
مرا ہوا بھی لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ کیوں نہوں شہزادے ہیں امیر ابن امیر ابن امیر
ہیں اب وقت پڑا ہے تو کیا ہے لیکن نسلی خوبیاں تو نہیں جا سکتیں طلاقت زبان
تو ملاحظہ فرمائیے۔ کسقدر فصیح کلام ہے کیسی سلیس اردو بولتے ہیں زبان تو بس ان
لوگوں کا حصہ ہے۔ کام نہیں ہو سکتا مگر اس سے معذور سمجھنا چاہیے انھوں نے
کبھی کیا اس کام کیا ہوگا" برف و پان کے متعلق کہتے "حضرت اس گئی گذری
حالت میں بھی صرف ایکدم کے لیے دس سیر روز برف آتی ہے۔ اور کچھ نہو کچھ ہو
تو بھی دس روپیہ ماہوار کے تو پان اُٹھ جاتے ہوں گے۔ آخر شہزادے
ہیں امارت کی بو کہاں سے جائے گی"

غرضکہ دنیا کا تو یہ حال ہے۔ امیر غریب سے یوں بھاگتا ہے کہ کہیں کوئی سوال
نہ کر بیٹھے غریب غریب سے یوں بچتا ہے کہ اس سے مل کر ملے گا کیا۔ دنیادار
تو دنیادار اللہ والے لوگ بھی غریب کی قدر نہیں کرتے۔ وہاں بھی امیر ہی کی
سُنائی ہے۔ مندروں پر جا کر دیکھو مزاروں و زیارات پر دیکھو امیروں کے
چڑھاوے لیے جا رہے ہیں اور غریبوں کو دھتکارا جا رہا ہے۔ مرنے کے بعد گناہوں
کی بخشش کے لیے بھی "دان چاہیے غریب کے پاس رکھا ہی کیا تھا جو اب
اسکے لیے دان دیے جائیں۔ مسلمانوں کے ہاں یہ رسم ہے کہ قضا نماز کے عوض
اسقدر گیہوں خدا کے نام غریبوں کو تقسیم کیے جائیں تو معافی مل جاتی ہے۔ امیر
تو گیہوں چھوڑ مرا وہ تقسیم ہو گئے اسکو معافی مل گئی۔ غریب کہاں سے اپنی نماز
قضا ہونے کا عوض دے۔

وہ دنیادار لوگ جو ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں پر امیر پرستی کا اعتراض کرتے ہیں

خود امیر پرستی میں پھنسے ہوے ہیں اور غریب کا حق اُسکو نہیں دیتے - فی زمانہ جسقدر
قوم کے لیڈر ہیں ان میں سے ایک ایسا نہیں کہ جو محض قوم کی محبت - ذاتی
لیاقت و دماغی قابلیت ہی کی وجہ سے لیڈر ہوا ہو اور روپیہ کی وجہ سے نہوا ہو
میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نادار ہو لیکن اسمیں گرمجوشی - محبت -
لیاقت - قابلیت سب موجود ہوں اور وہ چاہے کہ میں قوم کے فائدے کے
لیے کوئی کام کروں - قوم کے فائدہ کی کوئی بات کہوں - قوم کو ادبار زرپرستی
و خوشامدخوری سے بچاؤں تو ممکن نہیں کہ اُسکی کوئی بات پوچھے - کوئی کہے گا
میاں یہ بھی کمائی کرنے کا سلسلہ نکالا ہے کوئی - کہے گا کہ یہ چندہ تو جمع کرتے
پھرتے ہیں مگر کھا گئے تو کیا ہوگا کوئی اسکے لباس پر اعتراض کرے گا تو کوئی
اُسکے پاس سواری نہونے پر معترض ہوگا - غرضکہ اُسکی بات کوئی نہ سنے گا
کہ یہ کہتا کیا ہے اگر واقعی عقل کی بات کہتا ہے تو خواہ غریب ہی کیوں نہ ہو لیکن
اس کو اپنا رہنما بنانا چاہیے اپنا لیڈر سمجھنا چاہیے - نہیں ہرگز نہیں - قوم
کے لیڈر سرسید احمد خان تھے پنشن یافتہ سب جج تھے - مہدی علی تھے جنکو اب
بھی آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن کے ملتے تھے بعد ہزاروں روپیہ سال کی ذاتی
آمدنی ان کے پاس تھی - مولوی مشتاق حسین بھی نواب تو ہیں - جسٹس
شاہدین جج ہیں - سر فاضل بھائی کریم بھائی - آدم جی پیر بھائی - نواب سلیم اللہ
مرحوم وغیرہ وغیرہ سب مائی کیھی کے پوت ہیں - ان کے مقابلے میں سینکڑوں
اور گمنام مگر سچے ہمدرد و بہی خواہان قوم کا کوئی نام بھی نہیں جانتا - شیخ
سادہ لوح ریاست تیراگڈھ کے کامدار ہوگئے - بول وہ نہیں سکتے - لکھ وہ
نہیں سکتے - قوم کی حالت سے وہ واقف نہیں - کامدار ہونے سے پہلے کوئی
ان کے نام تک سے واقف نہیں تھا - مگر کامدار کیا ہوے دنیا بھر کی قابلیت

دنیا بھر کی لیاقت اور عقل اُن میں آگئی اور اُسی دن سے وہ لیڈران قوم میں شمار ہونے لگے۔ میر خضر الحق مدرسۂ جہل آباد میں دینیات کے مدرس تھے لوگ مسجد کا مُلّا سمجھتے تھے۔ اتفاق سے نواب صاحب کی اُن کے حال پر مہربانی ہوئی قاضی القضاۃ کر دیا جاگیر دیدی مالدار بن گئے اب کیا تھا انجمن رفیق الجہاں کا وفد اُنکی خدمت میں حاضر ہوا کہ ہمارے سالانہ جلسے کے پریسیڈنٹ ہونا منظور فرمایئے۔ کسی وجاہت پسند کالج نے دعوت دی کہ ہمارے انتظام دینیات کی تصدیق کیجیے۔ بس چشم زدن میں لیڈر قوم بن گئے۔ اب میر صاحب ہیں کہ جا دبے جا وقت بے وقت مدرسے کے لڑکوں کے بجائے دنیا بھر کو سبق پڑھاتے پھرتے ہیں اور عربی فقروں اور غلط منطق سے لوگوں کے دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔ جہاں ایک منٹ کی اسپیچ کی ضرورت ہے وہاں گھنٹوں بک بک کر رہے ہیں۔ مہذب مجلس میں نامہذب باتیں فرما رہے ہیں مگر کس کی مجال جو اُن سے آنکھ ملا سکے یا اُن کو اُن کی بیجا عنایت پر منع کر سکے اس کے برخلاف ایک معمولی حیثیت کا آدمی جس نے نہایت مطالعہ و مشقت کے بعد ایک دلچسپ و ضروری مسئلہ پر ایک مضمون تیار کیا ہے ایک جلسے میں اپنا مضمون پڑھتا ہے۔ لوگ سُنتے ہیں اور چپ ہو رہتے ہیں۔ بعض وقت سُنتے بھی نہیں کہ کیا کہتا ہے۔ بعض وقت اُسکی اسپیچ ہی بند کرا دیتے ہیں۔ اگرچہ اسی اسپیچ کے چھپ جانے کے بعد بڑے بڑے لیڈران قوم اسکے خیال کو اسکے فقروں کو اپنی دوسری اسپیچوں میں استعمال کرتے ہیں اُسوقت سب واہ وا کرتے ہیں تعریفوں کی بھرمار ہوتی ہے اور تحسین و آفرین کے نعرے آسمان تک پہنچتے ہیں۔ یہ زرپرستی کی حد ہے۔ سچ ہے ناداری بُری چیز ہے۔

م - ا - ن

ہنری ڈونان
بانی انجمن صلیب احمر

ہر قوم میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنکی قوت تفکر اور قوت عمل ہر ساعت اور ہر لحظہ قومی فلاح و بہبود میں مصروف رہتی ہے، وہ اپنی قوم کی چھوٹی سی چھوٹی مصیبت سے بھی بیچین ہو جاتے ہیں اور اُسکے دفعیہ کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے میں تامل نہیں کرتے ہیں، درحقیقت ایسے ہی لوگ اپنی قوم کے سچے ہمدرد اور حقیقی تاجدار ہوتے ہیں جنکے سہارے قومی حیات کی کشتی مقصود تک پہنچتی ہے، یہ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں مگر اُنکے سچے کارنامے ایک شفیق معلم کیطرح اُنکی قوم کی آئندہ آنے والی نسلوں کو رحم و محبت اور ہمدردی کا درس دیتے رہتے ہیں۔

ان ہی مخصوص لوگوں میں ہنری ڈونان کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس نے ابنائے جنس پر وہ بڑا احسان کیا ہے جو صفحات تاریخ پر زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ہنری ڈونان ۱۸۲۸ء بمقام جنیوا ایک نہایت مشہور دولتمند اور شریف خاندان میں پیدا ہوا، اسکی طبیعت کا میلان انسانی شفقت کیطرف بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگا تھا وہ جنگوں کے ہولناک واقعات اور مجروحوں کی کرب اور چیخیاں سُن سُنکر سخت متاسف ہوتا، ۱۸۵۹ء میں جب آسٹریا اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑی تو وہ بنفس نفیس میدان کارزار گیا تاکہ کوئی بہتر سے بہتر طریقہ مجروحوں کی امداد کا دریافت کر سکے، اسی سال بتاریخ ۲۴ر جون معرکہ ہولفرینو (Solferino) میں بھی جو مذکورہ سلطنتوں میں واقع ہوی موجود تھا، ایکدن شام کے وقت میدان کا چکر لگانا شروع کیا

یکایک کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد مجروحوں کی ہے جو خون میں لتھڑے پڑے ہیں آہ و بکا کی صدا فریاد کی آواز لبوں پر جاری ہے اور وہاں اُنکا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ کوئی پرساں حال، وہ اس عبرتناک اور دردانگیز نظارہ سے بہت متاثر ہوا اور اُسکا نہایت رحیم دل اس خونی منظر سے بھر آیا، اُسوقت اُسکی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے "ذائیں! یہ لوگ مار ڈالے گئے، اُف! کسقدر یہ عبرتناک اور تعجب خیز امر ہے کہ ایک انسان اپنے بھائیوں کے قتل کے لیے پیشقدمی کرتا ہے" اُس نے اسیوقت سے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ جنگ انسان کے لیے نہایت جانکاہ مرض ہے جس سے چھٹکارا پانا کسیطرح ممکن نہیں، اُسکا جڑ سے اُکھاڑ دینا تقریباً محال ہے، اسکے لیے کوئی ایسی دوا نہیں ایجاد ہوسکتی جو اسکو بالکل نیست و نابود کرسکے" اُس نے اپنے دل میں کہا "لیکن ہمکو ایسی چیز ضرور ایجاد کرنی چاہیے جو کم از کم اس مرض کی غیر معمولی بیچینیوں کو دور کرسکے اور مجروح دلوں کے لیے باعث تسکین ہو"

اسکے بعد ہنری ڈونان نے عہد کرلیا کہ اس مبارک تجویز کے پورا کرنے میں میں اپنی تمام کوششیں صرف کروں گا اور اپنی تمام زندگی صرف اس مقصد کی تکمیل کے لیے وقف کردوں گا، پہلے پہل اُس نے "یادگار سولفرینو" کے عنوان سے ایک زبردست مضمون لکھا جسمیں تمام متمدن قوموں کو ایک ایسی انجمن قائم کرنے کے لیے دعوت دی جسکے ذریعہ تمام مجروحین کی امداد بحسن وخوبی کی جاسکے، اس مضمون کا اثر بہت زیادہ پیدا ہوا لوگوں نے ہر چہار طرف سے اسکی دعوت کو لبیک کہا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اسکی یہ صدا پست ہونے لگی، تب اسکو معلوم ہوا کہ یہ تجویز مسلسل کوشش اور جد و جہد کی مقتضی ہے، اس غرض سے اُس نے بڑے بڑے دارالسلطنتوں کا دورہ کرنا شروع کیا اور مختلف صحبتوں اور مجلسوں میں پرزور تقریریں کیں بالآخر

ایک دن، اسکے مقصد کی بنیاد پڑ ہی کر رہی،

اس سلسل دوادوش میں اسکو بہت بڑی کامیابی پیرس میں یہ ہوی کہ وہاں اسکے بہت سے مددگار اور ہمخیال پیدا ہو گئے اور اول جس شخص نے اسکی طرف دست امداد بڑھایا وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا جس نے اُسکے تمام مضامین اپنے اخبار میں شائع کیے، بہت سے مضمون نگاروں کے قلم کو جنبش ہوی اور اُنھوں نے بھی اس عنوان پر مضامین کا دراز سلسلہ جاری کر دیا جس سے اسکے مقصد کی اشاعت اور زیادہ ہوی، اسکا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں انجمن سلیب احمر کی بنیاد مکمل ہو گئی، اس انجمن کے رکن اور ممبر بڑے بڑے شرفا اور امرا قرار پائے، اور اسکا پہلا جلسہ ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۸۶۳ء بمقام جنیوا منعقد ہوا اور پھر اسکے بعد کے اجلاسوں میں تمام متمدن دول نے اپنے اپنے نمایندے بھیجے، اسوقت سے آج تک یہ انجمن تمام مجروحین کی مرہم پٹی اور انکے آرام رسانی کا سامان کرتی آئی ہے،

ہنری ڈونان کو سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ قابل فخر انعام ملا جسکا اعلان فرڈ نوبل نے اس شخص کے لیے کیا تھا جس نے اپنے مفید معلومات زبردست تحریر و تقریر اور بہترین تجاویز کے ذریعہ انسانی خدمت ادا کرنے میں امتیازی درجہ حاصل کیا ہو، لیکن موت نے نوع بنی آدم کے اس سچے ہمدرد اور مخلص کو نہیں چھوڑا نومبر سنہ ۱۹۱۰ء میں اس شریف النفس شخص کو دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔

مولانا احمد اللہ متعلم ندوہ

رباعی

ہر ایک سے صلح و آشتی بہتر ہے	گر ہو سکے سب سے دوستی بہتر ہے
مغرور ہو اکڑ نہ تانا گردن خم کر	انسان کے لیے فروتنی بہتر ہے

حضرت واسطی

چاندنی رات

سچ ہے نیچر کے دلدادہ کو سہانی تاروں بھری رات اور تابش ماہ کا فرشِ تمام لوازمات استراحت سے بے پروا کردیتا ہے۔ کیا ہی پُر فضا وہ سین ہوتا ہے۔ جبکہ آخری شب کی آہستہ گھڑیوں میں کوئی نوجوان قدرت کی فیاضیوں کا لطف اُٹھانے کو آبادی سے باہر نکل جاتا ہے۔ شیروں کی گرج۔ جنگلی جانوروں کی خوفناک آواز نہ تو اسکا تفریح کا شوق کم کرسکتی ہے۔ اور نہ اسکو ڈرا دھمکا کر وہیں کا وہیں ساکت کرسکتی ہے۔

آخر یہ کیوں؟ ہو نہو وہ نوجوان چاندنی کے فرش سیمیں پر چلتا ہوا نسیم سحر کے پُر ناز پُر لطف و پُر ادا جھونکوں سے گفتگو کرنے میں اسقدر غرق ہے کہ وہ اُن آوازوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور یا تو یہ سبب ہے کہ گُل کے رنگ و بو نے معشوق کی یاد کو تازہ کردیا ہے اور یا یہ کہ شاید ماہ کامل کے حسن صبیح نے اسکو اسقدر متوجہ کیا ہے کہ وہ حکو رکیطرح سے اس نیچر کے عظیم نشان پر فریفتہ ہے۔

جبکہ شبنم کے موتی گلاب کی سُرخ و سفید پنکھڑیوں پر ایک عجب انداز و زینت پیدا کررہے ہوں تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک عجائب پسند طبیعت انکو سرسری نظر سے دیکھکر نظر انداز کردے یورپ والے گو جادو کو نہ تسلیم کریں مگر پھر بھی وہ کون سا دل ہوگا جو پیاری شب ماہ کے لطف اُٹھائے اور نیچر کے اس جادو کے اثر سے بچ جائے۔ شعرا اور قدرت کے دیگر دلدادہ اسی چاندنی رات یا پیاری تاروں بھری رات کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ اُنکے شاہدانہ ذہن جادو والی رات کو سیر گلزار کو بتاتے نکل آتے ہیں۔ یہی رات عشاق ناکام کو اُنکے بستر استراحت سے سیر گلزار کے لیے کشاں کشاں کھینچ لاتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فراق کے صدمہ اسی رات میں تارے گن گن کر کم ہوجاتے ہیں۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ ماہ کامل کے پُر نور چہرہ کا جادو یا حُسن دلربا اُنکے معشوق کی یاد فراموش کردیتا ہوگا۔ ورنہ یہ نہوتا۔ [illegible] دلربا کی زلف پریشان سے گھائل ہو کر سیماب کیطرح تڑپ رہا ہو۔ اسی رات کو ماہ کامل کے پُر لطف نظارہ سے آرام پاتا ہے۔ سیر و تفریح کیلیے یہ نہایت ہی مناسب رات ہوتی ہے۔ دریا کے کنارے صحرا میں ہرے بھرے سبزہ [illegible] سیر کرتے ہوئے۔ یہ رات طبیعت کو طرفہ لذت بخشتی ہے۔

محمد حسین علوی

غزلیات

حضرت وحید الدین صاحب بیخود دہلوی مدظلہ العالی

دل ہے مشتاق جدا آنکھ طلبگار جدا
خواہش وصل جدا حسرت دیدار جد

کچھ کھڑے جھومتے ہیں طالب دیدار جدا
اینڈتے پھرتے ہیں کچھ خلد میں میخوار جد

زاہدوں سے نہ بنی حشر کے دن بھی یا رب
وہ کھڑے ہیں تری رحمت کے طلبگار جد

جی جلانے کو ستانے کو مٹانے کو مجھے
وہ جدا غیر جدا چرخ ستمگار جد

تیغ و خنجر بھی ہیں انداز و ادا بھی موجود
سر کے گاہک ہیں الگ دل کے طلبگار جد

کعبہ ہو آتے ہیں دل تک ہے رسائی مشکل
سارے رستوں سے ہے یہ منزل دشوار جد

باغ میں یاد نے اُسکی مجھے ٹکنے نہ دیا
چٹکیاں لینے لگے پھول جدا خار جدا

ہر قدم پر ہے مری خاک سے کھٹکا اُنکو
ہاتھ دامن سے نہ ہوگا دم رفتار جد

بجلیاں حضرت موسیٰ پہ گریں دو اک بار
شعلۂ شوق جدا شعلۂ دیدار جد

ہمسری قال سے کب حال کی ہو سکتی ہے
خانقاہوں سے بنے خانۂ خمار جدا

دست صیاد میں ہوں خاک اُڑوں کیا بلبلو
قینچی گردن میں جدا چٹکی میں منقار جد

ہو گئے وہ سحر وصل یہ کہکر رخصت
تجھ سے کرتا ہے مجھے چرخ ستمگار جد

دلمیں الفت بھی رہی رشک کے کانٹے بھی رہے
اسنے سو بار ملے ہم ہوے سو بار جدا

قتل کرتے ہی مجھے جلوہ نمائی بھی ہوی
در پہ ہنگامہ الگ ہے پس دیوار جد ا

سختیاں عشق کی جھیلوں کہ سنوں میں دلگی
کھائے جاتا ہے محبت میں یہ غمخوار جدا

حال یعقوب کی کیونکر ہو خبر یوسف کو
کوچۂ عشق سے ہے حسن کا بازار جد ا

زاہدوں کی تری رحمت پہ چڑھائی ہے الگ
ٹولیاں باندھ کے آئے ہیں گنہگار جدا

وضع کا پاس بھی ہے بیخودمیخوارہ ضرور
کاگ بوتل سے نہ کیجیے سر بازار جدا

حضرت مولانا عزیز لکھنوی مدظلہ العالی

جو راز ہے دل میں وہ ہے اندوختہ اُنکا کچھ کہہ نہیں سکتا ہے دہن دوختہ اُنکا
اُنکی نگہ گرم ہو جب مانع فریاد کیا آہ کرے گا کوئی دل سوختہ اُنکا
کھل جائے گا جب کوئی لگا دینگے وہ ٹھوکر سب خاک کے پردے میں ہے اندوختہ اُنکا
دوزخ کے کلیجے میں بھی اک آگ لگی ہے سرگرم فغاں ہے کوئی دل سوختہ اُنکا
خود آکے بجھائیں تو لگی دل کی بجھے گی یہ عشق ہے اک شعلہ افروختہ اُنکا

کیا کیا نہ عزیز آپ کو ناصح نے پڑھایا
لیکن نہ رہا یاد کچھ آموختہ اُنکا

حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

چھری سے ہر نفس ہر ہر قدم ہے کام قاتل سے عدم کی شاہراہیں ملگئی ہیں اک رگ دل سے
کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوتا مرے دل سے نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے
تمنا کی شکایت کیا جو نکلے آہ مشکل سے یہ کس نے پھیر لیں آنکھیں کہ دنیا پھر گئی دل سے
تعجب خیز ہے معجز نمائی عشق صادق کی تمنائے دل مجنوں نکل آئی ہے محمل سے
چلیں اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں اگر دل بیٹھ جائیگا تو اُٹھ جائینگے محفل سے
زیادہ کر رہی ہے بے وفائی طول فرقت کو تمہارا فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے مرے دل سے
امید و ناامیدی کا سماں ہونا وہی جانے کہ جسنے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے
فدائے کس میری دل کا مطلب خوب ہی نکلا جنازہ مر کے بھی اُٹھتا نہیں ہے کوئے قاتل سے
فریب عشق نے حد سے بڑھایا پائے الفت کو تعلق ہو گیا آخر دل مجنوں کو محمل سے
[illegible] بیاباں گرد کو زنداں سے کیا مطلب اگر کانٹے نہ پائیگا تو اُلجھیگا سلاسل سے

نہ سمجھا معنیِ گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا — تھکا تھا مَیں لیٹ کر سو رہا دامانِ منزل
تڑپتا ہے شبِ غم یوں کہ مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا — بتالے نامرادی کونسی باتیں کروں دل سے
ادھر مَیں سر کشتہ پہنچا عدالت گاہِ محشر میں — لہو کی بو ادھر آنے لگی دامانِ قاتل سے
وہی مَیں ناخدا تھا کشتیِ دل جسکی ڈوبی — مرا قصہ کوئی کہدے سبکسارانِ ساحل سے

وہ جس دن آگئے شمعیں جلانے قبر پر ثاقب
اُسی دن روشنی داغوں کی پھوٹی پردۂ دل سے

جناب عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی مدظلہ العالی

بیکار یہ فراق کے صدمے گذر گئے — مرنا ہی تھا تو مرتے ہی ہم کیوں نہ مر گئے
عیسیٰ کو دیکھکر ترے بیمار مر گئے — صحت کا نام سنتے ہی چہرے اُتر گئے
تنہا ہم ایک رہ گئے سب آسیہ مر گئے — صدمے جہان بھر کے ہمیں پر گذر گئے
میت کے ساتھ ساتھ وہ کیوں ننگے سر گئے — ہم مر گئے آج اور بھی بہوت مر گئے
دونوں جہان ایک کیے وہ جدھر گئے — دو چار تیر اِدھر گئے دو چار اُدھر گئے
تیر اُنکے اتنے دل میں ہمارے اُتر گئے — ٹیسیں آبلوں سے دور ہوں زخم بھر گئے
انجام قرب یار تمنا سے بڑھ گیا — سو بار زندہ ہم ہوئے سو بار مر گئے
کچھ میرے ضبط عشق کی تصویر کھینچ دی — ناکام جو مرے وہ بڑا کام کر گئے
بھولے نہیں عتاب میں بھی اُنکی نازکی — جب ہم چڑھے نظر پہ نظر سے اُتر گئے
آئینہ ہم نے دے کے اُنھیں پیار کر لیا — منھ دیکھتے وہ رہ گئے ہم اپنی کر گئے
شق جا بجا زمین ہوئی اُتنے مقام کی — وحشت میں جس جگہ ترے شوریدہ سر گئے
کہنے کو یوں تو سب کا لیا اُس نے امتحاں — جو بے نشان ہو گئے وہ نام کر گئے
آنکھوں میں وہ بسے کہ نگاہوں میں وہ سمائے — دل سے مرے نکل کے نجانے کدھر گئے
سارا جہاں ہے اپنا سنبھالے ہوئے جگر — تیر نظر ترے مرے دل سے اُتر گئے

کہنے کو اک ادا ہے زمانہ کی ہے قضا — لاکھوں اُنھوں نے خون کیے اور مکر گئے
اس بدگمانیوں نے مرا ضعف کھو دیا — میں اُنکے ساتھ ساتھ رہا وہ جدھر گئے
غیروں کو میرے قتل سے ایسی خوشی ہوئی — قاتل پہ آج سیکڑوں صدقے اُتر گئے
ہو جنکو لطف زیست اُنھیں کو ہے حضور — ہم کو تو آپ ابھی سے سمجھیے کہ مر گئے
ایسا زمیں کوے صنم کا تھا اشتیاق — ہم آپ وقت دفن لحد میں اُتر گئے
سوئیں نہ آکے کیسلیے تربت میں چین سے — ہم آج امتحان میں پورے اُتر گئے

موسی نہیں کلیم جو غش کھاے طور پر
دیکھ آئے اُسکو صاف جب اہلِ نظر گئے

حضرت مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی

وہ آئیں تیغ بکف عذر امتحاں میں نہیں — لہو کی بوند مگر جسم ناتواں میں نہیں
سُنیں تو دل پہ لگے چوٹ سُننے والوں کے — یہ کیوں کہوں کہ اثر کچھ مری فغاں میں نہیں
کسی کی بزم میں یہ اعتبار کیا کم ہے — سبک نگاہ حریفاں سر گراں میں نہیں
کیا ہے کچھ تو سمجھکر یہاں کسی نے قیام — وہ کنج دل میں فضا ہے جو لامکاں میں نہیں
یہ گوشِ آہ میں جوشِ اثر نے پھونکا ہے — کہ آج تیرے برابر کوئی جہاں میں نہیں
ہلال میں خم ابرو دستاں ہے تو ہو — کشادِ تیر جگر دوز اس کماں میں نہیں
پگھل گیا مرے نالوں سے سنگ کعبہ تک — مگر نہیں تو اثر کچھ دلِ بتاں میں نہیں
کیا ہے وعدہ کسی بیوفا نے آنے کا — وگرنہ عذر ہمیں مرگ ناگہاں میں نہیں
وہ ہیں ہمارے جبین نیاز میں مضمر — جو نقش سجدہ کسی سنگ آستاں میں نہیں
ملا ہے تھوڑے دنوں کے دوستوں میں جو لطف — نصیب خضر کو وہ عمر جاوداں میں نہیں
نہیں حریص سخن ہاں یہ دیکھتا ہے مجھے — کہ دل کی طرح تو کوئی گرہ زباں میں نہیں
لب پہ آگیا جو لطف ہے [illegible] — یہ دیکھکر کہ لہو حسنِ خونفشاں میں نہیں

حرارت غم جانسوز اے معاذ اللہ   بھرا ہوا ہے دھواں مغز استخواں میں نہیں

صفی تراوش خونابۂ جگر کب تک
لہو کی بوند بھی اب چشم ناتواں میں نہیں

حضرت محشر لکھنوی مدظلہ العالی

عمر کی صرف جستجوے حبیب   اللہ اللہ ری آرزوے حبیب
ہوگا یارب وہ انقلاب کبھی   کہ بدل جاے جس سے خوے حبیب
اس سے مطلب نہیں ملے نہ ملے   ہم ہیں اب اور آرزوے حبیب
اب کہاں میں کہاں حواس مرے   ہر نفس آرہی ہے بوے حبیب
مجھسے امید و یاس کا ہے یہ قول   یے بیٹھا رہ آرزوے حبیب
اور کچھ ہوگیا دماغ مرا   جب سے کھائی ہواے کوے حبیب
انتظامات شوق کے صدقے   ہاتھ دل پر نظر ہے سوے حبیب
نکلا آنکھوں سے یوں لہو دل کا   بن کے تصویر آرزوے حبیب

محشر اٹھو چلو ذرا دیکھیں
آرہی ہے کہاں سے بوے حبیب

جناب منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی مدظلہ العالی

جلا دل پہلے جاں اب جل رہی ہے   لگی میں اور یہ کیسی لگی ہے
مئے الفت نشیلی ایسی پی ہے   کہ ساقی بیخودی سے بیخودی ہے
ہماری تلخ اب جو زندگی ہے   کسی کی ترشروئی نے یہ کی ہے
بتوں کو دیدیا ہے حسن ایسا   یہ اُسکی شان اُسکی خالقی ہے
نہ میری بات لے شیریں سخن کاٹ   زباں ہے تیری یا میٹھی چھری ہے
سمجھ رکھا ہے ناصح عشق آساں   کوئی دل کا لگانا دل لگی ہے

نہ اچھی شکل پر مائل ہو اے دل — کہ تیرے حق میں یہ صورت بُری ہے

گلے سے تو لگا لینے دے قاتل — تری تلوار کیا ہے اک پری ہے

تمھارے اچھے ہونے میں نہیں شک — مری جاں میری ہی قسمت بری ہے

دکھایا اک حسیں جو آج اُن کو — عجب نخوت سے بولے آدمی ہے

رولاتے ہیں مجھے ذکر عدو سے — جو میری چڑ ہے وہ اُنکی ہنسی ہے

امانت اپنی واعظ تم اُٹھا لو — نصیحت طاقِ نسیاں پر دھری ہے

تمھیں ہم چاہیں تم اوروں کو چاہو — یہ سُنکر بولے اپنا اپنا جی ہے

وہ یکتا شکل آنکھوں میں سمائی — جدھر دیکھو اُدھر صورت وہی ہے

نہ چوکے ظلم سے وہ پیش داور — قیامت پر قیامت ہو رہی ہے

نوا سنجان گلشن دم بخود ہیں
غزل خواں کیا خلیقِ دہلوی ہے

جناب فدا علی صاحب خنجر لکھنوی مدظلہ العالی

ہوا حیران قاتل جذبہاے شوق بسمل سے — چلا تیر نظر اور مل گیا خونِ رگ دل سے

کُھلی ہیں عشق سے آنکھیں ناصح نافہم مشکل سے — نکالی بحث بیجا تونے پھر ٹوٹے ہوے دل سے

جراحت کے مزے پوچھو دل بیتاب بسمل سے — رگوں میں دوڑنے لگتا ہے خونِ یادِ قاتل سے

کہیں ایسا نہو جل بھُنکے قالب خاک ہو جائے — بس اے سوز محبت اب دھواں اُٹھنے لگا دل سے

طلسم عالم ایجاد کیا تھا اک تماشا تھا — کُھلا یہ راز ہم پر جب اُٹھے ہستی کی محفل سے

خدا کی شان ہے وہ ذبح کرنے آئے ہیں مجھکو — اُلجھ پڑتے تھے کل تک جو صدائے نالۂ دل سے

کٹی شام جوانی آئی پیری ہمنفس اُٹھے — سمٹے جاتے ہیں ٹوٹے پھوٹے جام محفل سے

بہت تھا دعوی دیدار موسیٰ اب غشی کیسی — کچھ اُسکا ظرف دیکھو بات کی جس نے مقابل سے

بتاؤ تو سہی کیونکر دعا کیواسطے اُٹھتے — ان ہاتھوں کو ہوئی کب فرصت تھامِ دل سے

ہواؤں کے یہ سناٹے یہ طوفانِ برق و باراں کا
یہ پوچھو اُس سے جو مایوس ہو دامانِ ساحل سے

ستم ہے پھر کسی حُسنِ نظارہ سوز نے چھیڑا
سنبھالا تھا ابھی ہمنے دلِ مضطر کو مشکل سے

کچھ ایسی بیکسی سے کشتیِ عمرِ رواں ڈوبی
صدائے الرحیل آنے لگی دامانِ ساحل سے

وہ تشنہ کامِ الفت ہوں کہ میرے قتل ہونے پر
لہو تا دیر برسا دیدۂ شمشیرِ قاتل سے

زمانہ مرکزِ اصلی پہ خود پہنچائے گا خنجر
یہ کیوں تشویش بیجا ہے نہ ہو مایوس منزل سے

جناب … واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی مدظلہ العالی

چراغِ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا

دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلانا کیا
نہ کوئی شعلہ اُٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا

سُنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دلِ مرحوم
ادھر سے ملکِ عدم کا جو کارواں نکلا

تڑپ کے آبلہ پا اُٹھ کھڑے ہوے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

ہو نگاہ کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

لگا ہے دل کو اب انجامِ کار کا کھٹکا
بہارِ گل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا

زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا اُلٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

ہمارے صبر کا کھاتے ہیں اب قسم اغیار
جفا کشی کا مزہ بعدِ امتحاں نکلا

خوشی سے ہو گئے ہم خواہ میر … ہو گئی
کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

حریمِ ناز میں شاید کسی کو دخل نہیں
دلِ عزیز بھی ناخواندہ میہماں نکلا

نہاں تھا خانۂ دل ہی میں شاہدِ معنی
جو بے نشاں تھا وہ دیوارِ درمیاں نکلا

ہے فنِ عشق کا اُستاد بس دلِ وحشی
مریضِ غم کا یہی اک مزاجداں نکلا

دکھا گیا کوہ کمند رنے بڑھ کے آئینہ
جو سر اُٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا

عدسے بڑھکے نہیں کوئی گوشۂ رحمت — قیامت آئی جو اس گھر سے میہماں نکلا
ب اپنی روح ہے اور سیر عالم بالا — کنوئیں سے یوسف گم کردہ کارواں نکلا

کلام یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہمزباں نکلا

جناب کنور محمد حیات علی خانصاحب آتش رئیس اترولی مدظلہ العالی

تیغ کے ٹکڑے ہوئے شل دست قاتل ہوگیا — سخت جانی سے خجل ہو کر میں بسمل ہوگیا
عشق میں پورا محبت میں وہ کامل ہوگیا — لطف جسکو وصل کا فرقت میں حاصل ہوگیا
بسکو خلوت میں بھی آنکھیں چار کرتے شرم تھی — خیر سے اب وہ زمانہ بھر کا قاتل ہوگیا
رتے کرتے وعدۂ دیدار پورا رہ گئے — ہوتے ہوتے شادماں پژمردہ یہ دل ہوگیا
درسہ میں عشق کے دو حرف جس نے پڑھ لیے — ہوگیا ماہر ہر اک فن میں وہ کامل ہوگیا
ل فرشتہ خو مرا الفت میں اُسکے غرق ہے — آپکا چاہ زقن بھی چاہ بابل ہوگیا
ہر کرم میں بھی مجھے ملنے لگا لطف ستم — مائل ذوق مصیبت اسقدر دل ہوگیا
بسکو دیکھا جاں کا خواہاں نظر آنے لگا — اپنا گھر اپنا محلہ۔ کوئے قاتل ہوگیا

جی جلاتا تھا جو میرا خاک کرتا تھا سبھے
آج اے آتش وہ آکر شمع محفل ہوگیا

ابن مسلم

ندن" کے پرانے کرمفرما جناب سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) نے ابن مسلم نامی ایک ناول د سال کی مسلسل کوشش سے تیار کیا ہے جسکا حجم دوسو سوا دوسو صفحہ کے قریب ہے ہمکو علوم ہوا ہے کہ ناول زیر طبع ہے۔ ناظرین "تمدن" جنھوں نے مسٹر جوش کے سفا میں پڑھے ہیں ضرور اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ناول کیا چیز ہوگا۔

سفرنامہ میں غلطی سے بعض جگہ ۱۹۱۴ء کی جگہ ۱۹۱۵ء چھپ گیا ہے ناظرین صحت کرلیں
(سفرنامہ کے سلسلے کے لیے اکتوبر نمبر ملاحظہ ہو)

میرا پہلا لیکچر نگاساکی میں بدھ مذہب کے مشہور مندر سمی ہو جو شوجی میں انگریزی میں ہوا - اُس کا مختصر ذکر "نگاساکی پریس" مورخہ ۱۹ - دسمبر ۱۹۰۵ء نے حسب ذیل الفاظ میں کیا :

ترجمہ

نگاساکی پریس ۱۹ دسمبر ۱۹۰۵ء

"کل محمد سرفراز حسین نے جیشوجی کے مندر میں ایک لیکچر دیا - لیکچر کا عنوان "خدا کا خیال" تھا - دو سو کے قریب پادری لیکچر میں موجود تھے - جلسہ کے صدر مسٹر سوزوکی ایڈیٹر توہوشنودے تھے جنہوں نے لیکچر کا ترجمہ بھی کیا کیونکہ لیکچر انگریزی زبان میں تھا -

لیکچرار مسلمان ہے اور اُس نے نہایت دلچسپ پیرایہ میں ثابت کیا کہ توحید جو کسی نہ کسی صورت میں ہر مذہب و فلسفہ میں موجود تھی اسلام میں درجۂ تکمیل کو پہنچی - اسی کے ضمن میں لیکچرار نے کل مشہور مذاہب اور فلسفوں کا ذکر کیا -

میں مسٹر سوزوکی کا نہایت ممنون ہوں - اُنہوں نے کوشش سے یہ لیکچر ہوا علاوہ ترجمہ کرنے کی تکلیف اُٹھانے کے انھوں نے نہایت از حد محبت کا اظہار کیا

نگاساکی سے کوبے پہنچا اور وہاں ایک ہفتہ قیام کر کے دار السلطنت ٹوکیو میں پہنچا - وہاں کے اخبارات نے میرا خیر مقدم نہایت عمدہ الفاظ میں کیا - ہندوستان میں اخبار وکیل نے حسب ذیل نوٹ شائع کیا -

از اخبار وکیل امرتسر مورخہ ۲ فروری ۱۹۰۶ء

سفر جاپان	ناظرین یہ خبر نہایت مسرت سے سُنیں گے کہ اسلام کے سچے خادم

اور ہمارے کرمفرما قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی جو ایک سال کی فرلو لے کر جاپان تشریف لے گئے ہیں ۱۱ دسمبر کو ناگاساکی پہنچے اور ۱۸ دسمبر کو بُدھ مذہب کے مندر چوشوجی میں توحید پر انگریزی میں لیکچر دیا۔ جسکا ترجمہ جاپانی زبان میں ایک لائق جاپانی جنٹلمین نے کیا۔ دو سو کے قریب حاضرین تھے جنھوں نے لیکچر مذکور کو دو گھنٹہ تک نہایت توجہ اور غور سے سُنا۔ ایک امریکن لیڈی مس رینڈلف گوڈ بھی موجود تھیں۔ اگلے روز انگریزی اور جاپانی اخباروں نے آپکے لیکچر پر نہایت معقول ریویو کیا۔ اور کلمات تحسین کے بعد لکھا کہ "یہ پہلا موقعہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی توحید کا وعظ جاپان میں کیا گیا ہے" کثرت سے لوگ آپ سے ملنے آئے اور اسلام کی حقانیت کی باتیں نہایت شوق سے سُنتے رہے۔ ناگاساکی سے آپ شہر کوبے میں پہنچے جو دوسرا بندرگاہ ہے وہاں سے اب آپ ٹوکیو دارالسلطنت جاپان میں پہنچ گئے ہیں۔ امید ہے اشاعت اسلام کے متعلق قاری صاحب کی کوششیں بارآور ہوں گی اور آپ وقتاً فوقتاً اپنی قابل قدر مذہبی خدمات کے نتائج سے ہمیں کے کالموں کو مزین فرماتے رہیں گے۔

ٹوکیو میں ایک ماہ کے قریب رہا۔ وہاں اُن ہندوستانی طلباء نے جو وہاں پڑھتے تھے مجھ پر بہت عنایت کی۔ مسلمان طالبعلم تو صرف ایک تھے باقی طلبہ ہندو اور بنگالی تھے۔ ان سب نے خلوص کا برتاؤ کیا۔ ٹوکیو کے اخبارات نے بھی مروت کا برتاؤ کیا۔ اور میری آمد کی خبر اور مقصد کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا مگر وہ انجمن جسکی تلاش میں مَیں نکلا تھا نہ ملنی تھی نہ ملی۔ ناچار مَیں نے وہاں بطور خود لیکچروں کا بندوبست کیا ایک لیکچر یونی ٹیرین چرچ میں ہوا لیکچر انگریزی میں تھا۔ ترجمان صاحب ایک ایک فقرہ کا ترجمہ جاپانی زبان میں

کرتے جاتے تھے۔

دوسرا لیکچر سوسائٹی برائے انسداد مظالم بر حیوانات میں ہوا۔ اخبارات نے میرے لیکچروں پر بہت معقول ریویو کیے۔

۱۷ فروری سنہ ۱۹۰۶ء کے وکیل میں میرے متعلق حسب ذیل نوٹ شائع ہوا

از اخبار وکیل امرتسر مورخہ ۱۷ فروری سنہ ۱۹۰۶ء

قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی جاپان میں اسلام کی منادی کرنے کو پہنچ گئے ہیں اور وہاں کے لوگ ان کے لیکچر دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ اخبارات میں خاص طور پر ان کی تقریروں کا اقتباس درج ہوتا ہے۔

اُسی تاریخ یعنی ۱۷ فروری سنہ ۱۹۰۶ء کے اخبار روزگار میں میرے متعلق حسب ذیل مضمون شائع ہوا جس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں۔

جاپان میں اشاعت اسلام

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

قاری سرفراز حسین ایک مسلمان مشنری

قاری سرفراز حسین صاحب مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے ایک پرانے طالبعلم اور ہمارے دیرینہ کرمفرما دوست ہیں۔ انسپکٹر جنرل سپلائی و ٹرینسپورٹ ایسٹرن کمانڈ نینی تال کے دفتر میں ملازم ہیں۔ عربی زبان اور علوم دینیات کے بہت اچھے ماہر اور انگریزی زبان میں اعلےٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے ہیں اور قومی ترقی کے جدوجہد کے میداں میں ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں اسوقت جس اولوالعزمی اور ہمت کا کام اُنھوں نے کیا ہے وہ قرن اولیٰ کے

مسلمانوں کی ہمت اور جوانمردی کا ایک نمونہ ہے۔ جاپان میں اشاعت اسلام کی ضرورت کے چرچوں کو سُن کر یہ جوان ہمت اور محب اسلام بزرگ بغیر کسی شور و شغف کے چپ چاپ اُٹھکر ملازمت سے رخصت لے کر اپنے خرچ سے جاپان پہنچ گیا ہے اور اشاعت اسلام کے متعلق جاپان کی نبض پر جا ہاتھ رکھا ہے۔ جاپان سے انھوں نے اپنا پہلا خط حسب ذیل لکھا ہے جو پیسہ اخبار میں چھپوایا گیا ہے۔

از مقام کوبے ملک جاپان۔ محل مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء

برخوردار عباس حسین طول عمرہ۔ بعد دعا کے معلوم ہو کہ میں نے ایک پوسٹ کارڈ مقام ناگاساکی سے ڈالا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ میں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہوں اور ہر طرح سے آرام و آسایش میں ہوں۔ سردی ابھی تک نینی تال ہی کے مثل پڑ رہی ہے۔ اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔ برف ابھی تک یہاں شروع نہیں ہوئی۔ جنوری میں پڑے گی۔ صحت کے اعتبار سے آب و ہوا جاپان کی نہایت عمدہ ہے اور مجھے موافق ہے۔ میں ۱۱ دسمبر کو ناگاساکی پہنچا تھا اور دس روز وہاں رہ کر ۲ تاریخ کو روانہ ہو کر کل صبح کو یہاں پہنچا۔ ہندوستان میں جو خبر تھی کہ ناگاساکی میں مذہب کی کمیٹی ہے وہ مجھے وہاں نہ ملی۔ دس روز تک میں نے ہر قسم کی کوشش کی۔ لوگوں سے ملاقات کی۔ اخبارں میں اشتہار دیے۔ مگر اسکا پتہ نہ چلا۔ غالباً کسی دوسرے شہر میں ہو گی۔ جس کا حال مجھے آیندہ معلوم ہو جاوے گا۔ ۱۸ تاریخ کو میں نے ناگاساکی کے ایک مشہور مندر میں انگریزی میں توحید پر لکچر دیا۔ دو سو سے زیادہ آدمی تھے۔ اور لوگوں نے بہت پسند کیا اُس کا ترجمہ جاپانی زبان میں کر کے ایک دوسرے شخص نے سُنایا۔ دوسرے دن کے

اخباروں نے میرے لکچر کی اللہ کے فضل سے بہت تعریف چھاپی اور ایک
جاپانی اخبار نے لکھا کہ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ جاپان میں اسلام کا لکچر سنایا گیا
اُسکے بعد جو میں دو دن وہاں رہا۔ تو لوگ مجھے ملنے میرے ہوٹل میں اتے رہی
اور ایک جاپانی جنٹلمین اور ایک امریکن لیڈی نے بعد چندے مطالعہ کے
اسلام قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے اب میں انشاء اللہ دار السلطنت ٹوکیو کو
جا رہا ہوں تاکہ اس کمیٹی کے آدمیوں سے مل کر اور اپنا کام وہاں جاکر تقریر
و تحریر کی کارروائی وہاں سے شروع کروں اور پھر دوسرے شہروں میں لکچر
دینے نکلوں۔ جاپانی لوگ پڑھنے کے لیے رسالے مانگتے ہیں۔ ٹوکیو پہنچ کر
رسالے بھی تصنیف کرکے چھپوا دوں گا۔ اس کام میں بڑا خرچ درکار ہے
بغیر اسکے یہاں گذارہ نہیں ہے۔ کل یا پرسوں انشاء اللہ میں ٹوکیو روانہ ہوجاؤنگا
اب تک تمھارے پاس سے کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ آئندہ خطوط ٹوکیو بھیجنا۔
جو خط نگاسا کی پہنچیں گے۔ وہ مجھے ٹوکیو بھیج دیے جائیں گے۔ اسکا انتظام
میں نے کردیا ہے۔ مجھے اس لکچر میں بہت تقویت ہوگئی ہے اور اللہ کے
فضل سے ہر طرح امید ہے کہ ٹوکیو پہنچ کر میں اپنے مقاصد میں اچھی طرح
کامیاب ہوں گا۔ خدا کے فضل سے میرا دل زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ ایک
پادری صاحب سے جہاز میں مباحثہ ہوا۔ اور دو جاپانی عیسائی شدہ پادری
بعد لکچر کے مجھ سے گفتگو کرنے ہوٹل میں آئے۔ ان تینوں کو میں نے اللہ کے
فضل سے قوی دلائل سے بند کردیا۔ ان لوگوں کو کچھ جواب بن نہ آیا۔
یہاں پادریوں کا زور ہے۔ اور دن بدن ہوتا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے
مشن کے کام پر خرچ کر رہے ہیں اور گرجا اور مدرسے اور سوسائیٹیاں قائم
ہیں۔ اسلام کے ایک باقاعدہ مستقل مشن کی یہاں اشد ضرورت ہے۔ ٹوکیو پہنچ کر

اس مضمون پر ایک مفصل تحریر ہندوستان بھیجوں گا"
قاری صاحب کے اس خط کے پڑھنے کے بعد کون سا ایسا مسلمان ہوگا جسکے دل سے احسن و مرحبا کی صدا اس نیک اور سچے اور باہمت مسلمان کی نسبت نہ نکلے گی اور کون سا ایسا مسلمان دل ہوگا جس سے قاری صاحب کے اس پاک اور عظیم الشان مقصد اور مدعا کی کامیابی کی دعا نہ نکلے گی۔ لیکن جہاں تحسین و تعریف کی جاوے گی اور دعائیں مانگی جاینں گی۔ وہاں اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قاری صاحب کو جو احتیاجات پیش آئیں گی ان کے پورے کیے جانے کے لیے وہ مسلمانان ہندوستان کی امداد کے مستحق ہیں یا نہیں۔ اس امر کی نسبت ہم اپنے ذاتی علم اور واقفیت سے مسلمانان ہندوستان کو یقین اور اطمینان دلا سکتے ہیں کہ قاری صاحب نے جو کام اختیار کیا ہے اور جس نیک اور اہم مقصد کے پورا کرنے کے واسطے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ اسکے کرنے کے وہ بہمہ وجوہ قابل ہیں۔ ہر ایک مسلمان کو ان کی عالی ہمتی اور اس سب سے بڑے قومی اور اسلامی خدمت کا دل سے مشکور ہونا چاہیے لیکن قاری صاحب کی قوت ایمان نے جس امر کا ان کو تقاضا کیا اس کو وہ اپنی طرف سے پورا کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا گھر چھوڑا۔ عزیز واقارب کو چھوڑا۔ آرام و آسایش کو چھوڑا۔ اپنا وقت اپنے پاک اور پیارے دین کی خدمت کے واسطے وقف کر دیا۔ اور اپنے مقدور کے موافق اپنی گرہ سے خرچ بھی برداشت کیا۔ لیکن ممالک غیر میں اشاعت اسلام کا کام ایسا کام نہیں ہے جس کے واسطے ضروریات مصارف کی حاجات کو قاری صاحب اپنی گرہ سے پورا کر سکیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے واسطے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپیہ کی ضرورت ہے اور اگر محض اس وجہ سے کہ روپیہ کی

امداد نہیں مل سکتی اس بزرگ کام کے متعلق کوششوں کو ترک کردینا پڑیگا
تو اس سے بڑھکر شرمناک پست ہمتی کے اظہار کا کوئی امر مسلمانان ہندوستان
کے واسطے نہیں ہوگا۔ مسلمانان ہندوستان نے اپنی قومی ضرورت کے
کاموں میں اب تک جو امداد دی ہے وہ گو توقع سے کم ہو مگر پھر بھی قابل
تعریف ہے۔ ہرایک قومی ضرورت جو مسلمانوں کے سامنے پیش کی گئی ہے
اس میں ان تمام مسلمانوں نے جنھوں نے اس ضرورت کو سمجھا ہے بہت عمدہ امداد
دی ہے۔ تو اشاعت اسلام کے عالیشان مقصد کے واسطے اگر مسلمان امداد
دینے میں تصور یا کوتاہی کریں تو اسکے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ مسلمانان
ہندوستان اشاعت اسلام کے کام کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم یقین
کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے کروڑوں مسلمانوں میں گو ایسے مسلمان موجود ہوں
جو اپنے دیگر اسلام کے حوائج سے ناواقف اور بے خبر ہوں مغربی علوم و
فنون کے حصول کی ضرورت کو نہ سمجھتے ہوں۔ اقوام یورپ کے نقش قدم
پر چل کر اپنے حالات کی اصلاح کے گر سے بے علم ہوں لیکن کوئی مسلمان
باعلم و باخبر یا جاہل ایسا نہیں ہوگا جو اشاعت اسلام کے مقدس کام کی
ضرورت سے انکار کرے یا جسکے دل میں اس نیک کام کے کرنے کا شوق نہو۔
اور اگر یہ امر صحیح ہے تو اس ضرورت کے مانے جانے اور شوق کا ثبوت صرف
ایک ہی طریق یہ دیا جاسکتا ہے کہ تمام مسلمان اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے
مطابق اس مدعا کے حاصل کیے جانے کی کوششوں کے لیے روپیہ سے
امداد کریں۔ ہم گذشتہ تحریروں میں بیان کر چکے ہیں کہ یہی ایک ایسا
کام اور مقصد مسلمانوں کا ہے جسمیں ہر طبقہ اور ہر فرقہ اور ہر قسم کے
مسلمان بلا اختلاف رائے شامل اور شریک ہو سکتے ہیں پس جس چیز کی

ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک مقام پر ایسے اہل دل مسلمان پائے
جائیں جو اس کار خیر کے واسطے چندہ جمع کریں۔ چندہ دینے والوں کی کمی
کی شکایت کہیں بھی پیش نہیں آئے گی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے جن
دوستوں اور جن محبان دین پاک کے کانوں میں ہماری یہ صدا
پہنچی ہے انھوں نے اپنے اس سب سے بزرگ اور ضروری کام کے
واسطے کیا کچھ کیا ہے اور آخر میں ہم خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا
کرتے ہیں کہ وہ رب کریم و رحیم جس کے کرم و فضل پر قاری سرفراز حسین
بھروسہ اور توکل کر کے اس نیک اور پاک کام کے واسطے پردیس جا
پہنچے ہیں مسلمانوں کے دلوں میں ان کی امداد کا خیال ڈالے اور
ان کی امداد کی ہمت اور توفیق عطا کرے اور قاری صاحب کو اپنے
اس مہتم بالشان کام میں کامیابی اور بارگاہ باری تعالےٰ سے اجر
عظیم حاصل ہو۔ آمین "

۳ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کے روزنگار میں مسٹر محمد دین صاحب کا حوصلہ افزا
خط شائع ہوا جسکو شکریہ کے ساتھ درج کرتا ہوں وھوھذا

اشاعت اسلام

مکرم بندہ جناب قاضی صاحب زاد لطفہٗ۔

سلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالےٰ و برکاتہ۔ روزنگار کے پرچہ مورخہ ۱۷
فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں جاپان میں اشاعت اسلام کے مضمون کو پڑھکر
جسقدر مسرت ہوی ہے۔ اسکو میں احاطہ بیان سے باہر پاتا ہوں قاری
سرفراز حسین صاحب نے جس جوش محبت داد و اولوالعزمی سے یہ مقصد اعلےٰ